Urdu Department
CCS University Meerut

شعبۂ اردو
چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ

ہماری آواز

ہماری آواز

شعبۂ اردو چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ

ہماری آواز

Urdu Department
CCS University Meerut

हमारी आवाज़

हमारी आवाज़

Urdu Department
CCS University Meerut

Included in UGC Care List

آزادی کے ۷۵ سال

آزادی کا امرت مہوتسو

اتر پردیش اردو اکادمی کی اسکیمیں

اردو طلباء کو وظائف ☆ اشاعت کتب ☆ صوبے کے رجسٹرڈ عوامی کتب خانوں/دارالمطالعوں کو مالی امداد ☆ اردو ادباء کو مجموعی ادبی خدمات اور اردو کتب پر انعامات ☆ مسودات کی طباعت کے لیے مالی امداد ☆ مصنفین کو ماہانہ مالی امداد ☆ اردو کتابت اسکول ☆ اردو کوچنگ سینٹر ☆ اردو کمپیوٹر سینٹر ☆ اردو کی مطبوعات کی فروخت ☆ سہ ماہی ''اکادمی'' اور ماہانہ ''خبر نامہ'' کی اشاعت ☆ سیمینار سمپوزیم اور مشاعروں کا انعقاد ☆ اقلیتی طلباء کو سول سروسیز کی کوچنگ کے لیے اردو آئی۔اے۔ایس اسٹڈی سینٹر واقع 'پارہ' موہان روڈ، لکھنؤ ☆ بچوں کا رسالہ ''باغیچہ'' کی اشاعت، اردو ماس کمیونیکیشن اینڈ میڈیا سینٹر، واقع وبھوتی کھنڈ، گومتی نگر، لکھنؤ ☆ ☆ ☆

اتر پردیش اردو اکادمی کی اہم مطبوعات

نمبر شمار	کتاب کا نام	مصنف کا نام	قیمت	نمبر شمار	کتاب کا نام	مصنف کا نام	قیمت
۱۔	ساغر خیامی	ناشر نقوی	215/=	۲۱	تنقیدی نظریات (دوم)	سید احتشام حسین	183/=
۲۔	مظہر امام	امام اعظم	208/=	۲۲	توبتہ النصوح	ڈپٹی نذیر احمد	92/=
۳۔	انتظار شناسی	ڈاکٹر اسلم جمشید پوری	270/=	۲۳	گاندھی جی اور زبان کا مسئلہ	عشرت علی صدیقی	107/=
۴۔	پیغام آفاقی	خان محمد آصف	224/=	۲۴	ابن الوقت	ڈپٹی نذیر احمد	126/=
۵۔	سالک لکھنوی	پروفیسر مظفر حنفی	216/=	۲۵	بادشاہ نصیر الدین	مرزا وجاہت حسین	42/=
۶۔	متین طارق باغپتی	ڈاکٹر زکی طارق	216/=	۲۶	حیات سعدی	خواجہ الطاف حسین حالؔی	100/=
۷۔	پروفیسر قمر رئیس	پروفیسر توقیر احمد خاں	245/=	۲۷	ناٹک ساگر	نور الٰہی و محمد عمر	163/=
۸۔	ڈاکٹر اسعد بدایونی	حسیب سوز	245/=	۲۸	تنقید اور عملی تنقید	سید احتشام حسین	183/=
۹۔	حفیظ میرٹھی	ڈاکٹر تابش مہدی	245/=	۲۹	پنجاب میں اردو	محمود شیرانی	150/=
۱۰۔	عابد سہیل	ڈاکٹر صبیحہ انور	245/=	۳۰	انتخاب مضامین سید سلیمان ندوی	مرتبہ صباح الدین عبدالرحمٰن	30/=
۱۱۔	جوگیندر پال	ڈاکٹر اسلم جمشید پوری	287/=	۳۱	انتخاب کلام فراق گورکھپوری	مرتبہ ڈاکٹر افغان اللہ خاں	86/=
۱۲۔	تعلیم نسواں	نسرین احمد	170/=	۳۲	عصمت شناسی	ڈاکٹر اسلم جمشید پوری	248/=
۱۳۔	معیاری نثر و نظم (اول)	حامد ندیم	73/=	۳۳	ادب پارے نثر	سید احتشام حسین	45/=
۱۴۔	معیاری نثر و نظم (دوم)	حامد ندیم	85/=	۳۴	ادب پارے نظم	سید احتشام حسین	45/=
۱۵۔	مثنوی سحر البیان	میر حسن	108/=	۳۵	منتخب غزلیں	مجلس مشاورت	65/=
۱۶۔	مثنوی گلزار نسیم	دیا شنکر نسیم	70/=	۳۶	منتخب نظمیں	مجلس مشاورت	60/=
۱۷۔	اعتبار نظر	سید احتشام حسین	105/=	۳۷	ملک زادہ منظور احمد	انور جلال پوری	263/=
۱۸۔	انیسیات	سید مسعود حسن رضوی	91/=	۳۸	کلیم عاجز	پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی	173/=
۱۹۔	پریم چند نئے تناظر میں	پروفیسر علی احمد فاطمی	80/=	۳۹	ندا فاضلی	پروفیسر علی احمد فاطمی	278/=
۲۰۔	تنقیدی نظریات (اول)	سید احتشام حسین	196/=	۴۰	سید حامد	ڈاکٹر عبید اقبال عاصم	140/=

اکادمی کی مطبوعات کی خریداری و دیگر تفصیلات کے لیے رابطہ کریں:
سکریٹری، اتر پردیش اردو اکادمی، وبھوتی کھنڈ، گومتی نگر، لکھنؤ-226010
فون نمبر: 0522-4022924 سیلس ڈپو موبائل: 7081007078
E-mail:upurduakademi3@gmail.com

उर्दू विभाग, चौ. चरण सिंह विश्वविद्यालय, मेरठ

Urdu Department
CCS University
Meerut

شعبۂ اردو
چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ

ہماری آواز

ہماری آواز

شعبۂ اردو چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ

ہماری آواز

Urdu Department
CCS University
Meerut

हमारी आवाज़

Urdu Department
CCS University
Meerut

हमारी आवाज़

उर्दू विभाग, चौ. चरण सिंह विश्वविद्यालय, मेरठ

یو جی سی کیئر لسٹ میں شامل جرنل   ISSN : 2394-7381

ہماری آواز

Hamari Aawaz

شمارہ: 23   جولائی تا دسمبر 2023

سرپرست اعلیٰ : پروفیسر سنگیتا شکلا (شیخ الجامعہ، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ)

سرپرست : پروفیسر سنجیو کمار شرما (ڈین فیکلٹی آف آرٹس، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ)

مدیر اعلیٰ : پروفیسر اسلم جمشید پوری (صدر، شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ)

مدیر : شاہ زمن (ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ)

نگراں : ڈاکٹر آصف علی (اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ)

: ڈاکٹر شاداب علیم (اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ)

مشیر : ڈاکٹر ارشاد سیانوی (شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ)

ایڈیٹوریل بورڈ : عرفان عارف (ریسرچ اسکالر)، ماہِ عالم (ریسرچ اسکالر) عظمیٰ سحر (ریسرچ اسکالر) شہناز پروین (ریسرچ اسکالر)
سیدہ مریم الٰہی (ریسرچ اسکالر) علما ملک (ریسرچ اسکالر)، محمد طلحہ (ایم۔اے سال دوم)، محمد ساجد ربّانی (ایم۔اے سال اول)

کمپوزنگ : سعید احمد سہارنپوری، محمد شمشاد (سی، سی، ایس، یونیورسٹی، میرٹھ)

قانونی مشیر : پروفیسر انجلی متّل (پرنسپل، میرٹھ کالج، میرٹھ) ڈاکٹر محمد شعیب (ایڈوکیٹ)

مجلس ماہرین : EXPERT PANNEL

☆ پروفیسر یوسف عامر (جامعہ ازہر، مصر) ☆ پروفیسر ارتضیٰ کریم (شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی)
☆ پروفیسر محمد غلام ربانی (ڈھاکہ یونیورسٹی، بنگلہ دیش) ☆ پروفیسر ناصرہ بصری (صدر، شعبہ اردو، راجستھان یونیورسٹی) ☆ پروفیسر کوثر مظہری (جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی) ☆ پروفیسر قدوس جاوید (سابق صدر، کشمیر یونیورسٹی)

قیمت: تازہ شمارہ: -/Rs. 400 مجلد: -/450 بیرونی ممالک 5 امریکی ڈالر

ناشر : پروفیسر اسلم جمشید پوری

شعبۂ اردو : چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ

URL: http://ccsuniversity.ac.in/ccsu/adminSdept/

duccsumrt@gmail.com, aslamjamshedpuri@gmail.com,

muhammadshamshadinfo@gmail.com

Mobile: 09456259850, 9759238472

Ravi Publications, Meerut-9319564620

فہرست

ہماری آواز

مدیر اعلیٰ کے قلم سے	پروفیسر اسلم جمشید پوری	6-7
اداریہ	شاہِ زمن	8-9

مضامین

اختر کاظمی کی شخصیت اور صحافت: ایک جائزہ	پروفیسر اسلم جمشید پوری	10-15
بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیاں اور خواتین افسانہ نگار	پروفیسر ریشما پروین، لکھنؤ	16-25
فاروق بخشی کی فکری جہتیں: عظمت نسواں کے حوالے سے	پروفیسر آمنہ تحسین، حیدرآباد	26-34
ذوقی مظفرنگری، نواب ناظم میو کی نبیرۂ ذوق کے آئینے میں	سید ضیاء حسین، لاہور	35-40
رقیہ جمال کے افسانچے	ڈاکٹر کہکشاں لطیف، حیدرآباد	41-45
اردو شاعرات کی عصری حسّیت	پروفیسر ہما مسعود، میرٹھ	46-70
شاہد احسن مرادآبادی کا غزلیہ اختصاص	ڈاکٹر آصف علی، میرٹھ	71-78
مراثی انیسؔ کے کرداروں میں ہندوستانی عناصر	ڈاکٹر شاداب علیم، میرٹھ	79-85
پروفیسر خورشید الاسلام کی مایہ ناز تخلیق: تھری مغل پوئٹس	ڈاکٹر ظفر گلزار، حیدرآباد	86-91
ستاروں سے آگے ایک تجزیاتی مطالعہ	ڈاکٹر ارشاد سیانوی، میرٹھ	92-101
میرٹھ کی چند غیر معروف شاعرات	ڈاکٹر وصی اعظم انصاری، لکھنؤ	102-109
۱۹۵۰ء کے بعد دبستانِ میرٹھ	سراج انور محمد میراں نانڈیر	110-125
دکھیارے: تہذیب اودھ کا نوحہ گر	پروفیسر ریشما پروین، لکھنؤ	126-132
قومی یکجہتی اور اردو شاعری	ڈاکٹر آصف علی، میرٹھ	133-138
سہرے کی ادبی معنویت	ڈاکٹر شاداب علیم، میرٹھ	139-141
آنکھ جو سوچتی ہے، پر ایک نظر	ڈاکٹر ارشاد سیانوی، میرٹھ	142-153
غیاث احمد گدی کے افسانے	ڈاکٹر فہیمہ الیاس، رانچی	154-167

ماہنامہ آجکل کی ادبی خدمات: ایک جائزہ	ڈاکٹر شبستاں آس محمد	168-172
عابد سہیل کی خاکہ نگاری	مفتی راحت علی صدیقی، کھتولی	173-179
مجتبیٰ حسین کی طنز و مزاح سے پر کچھ تحریریں	فرح ناز، میرٹھ	180-184
مولانا عاشق الٰہی میرٹھی کی مذہبی شاعری	سیدہ مریم الٰہی، میرٹھ	185-189
الفاظ کے نفسیاتی برتاؤ کے منفرد شاعر: احمد شناس	عرفان عارف، جموں	190-199
تقابلی تنقید کی روایت اور موجودہ صورت حال	شاہ زمن، میرٹھ	200-204
ہمارے مدارس اور عصری تعلیم	اطہر خان، میرٹھ	205-208
زبان کی ترقی میں ترجمہ کا کردار	لائبہ، میرٹھ	209-212
گوشۂ سر سید		213
سر سید اور پنجاب	پروفیسر صغیر افراہیم، علی گڑھ	214-224
''سر سید مشن'' وقت کی اہم ضرورت	پروفیسر اسلم جمشید پوری، میرٹھ	225-231
سر سید تحریک اور اخبار 'الجمعیۃ'	ڈاکٹر ساجد علی، بلند شہر	232-235
سر سید احمد خاں اور رسالہ ''تہذیب الاخلاق''	ڈاکٹر شبستاں آس محمد، میرٹھ	236-241
سر سید کا نظریۂ تعلیم	عظمیٰ سحر، میرٹھ	242-244
عصر حاضر میں سر سید اور رفقائے سر سید کی معنویت	علما نصیب، سہارنپور	245-249
سر سید کے ہم خیال علماء کے دینی نظریات	شہناز پروین، میرٹھ	250-252
غزل بہ یاد سر سیدؒ	راشد طرازؔ، دربھنگہ	253
افسانے		254
لاک ڈاؤن	ڈاکٹر کہکشاں پروین، رانچی	255-259
مزدور کا دن	ڈاکٹر فرخندہ شمیم، کراچی	260-262
لوِان ریلیشن سے پرے	پرویز شہریار، دہلی	263-273
ریلا	پروفیسر اسلم جمشید پوری، میرٹھ	274-289

وہ لڑکا ڈاکٹر شاداب علیم، میرٹھ 290-292
وکاس کی گنگا محمد فرحت حسین، مظفر پور 293-296

افسانچے

بوجھ رقیہ جمال، اڈیشہ 297
کورونا کا نتیجہ عارف نقوی، جرمنی 298

نظمیں

299
فاصلے طالبؔ زیدی، میرٹھ 300
فاصلہ زندگی کا ضامن ہے سید اطہر الدین اطہرؔ، میرٹھ 301-302
تعلیم و تربیت نذیر میرٹھی 303
اپنے ہونے کا دکھ عادل رضا منصوری، جے پور 304
بھائی روبینہ میر، کشمیر 305
خدا کی نعمت رُخسار مظفر نگری 306-308

غزلیں

309
پروفیسر کوثر مظہری، دہلی 310
رومانہ رومیؔ، کراچی 311
ظفر اقبال ظفرؔ، فتح پور 312
سید احمد شمیم، جمشید پور 313
رفیعہ شبنم عابدی، ممبئی 314
رؤف رضا، ایم پی 315
جمیل مظہرؔ سیانوی 316
ڈاکٹر ذکی طارق، غازی آباد 317
عشرت معین سیما، جرمنی 318

	ڈاکٹر فریاد آزر، دہلی	319
	ڈاکٹر ارشاد احمد شرر، میرٹھ	320
	سلیم اختر سلیم، سیانہ	321
	ڈاکٹر قمر سرور، مہاراشٹر	322
کتابوں پر تبصرے		323
گئودان سے پہلے	ہما، ریسرچ اسکالر، ڈی۔یو	324-326
اسلم جمشید پوری: فن اور فن کار، مرتب ڈاکٹر ارشاد سیانوی	ایم۔خالد فیاض، پاکستان	327-329
علی گڑھ سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی تک	فرحت اختر، میرٹھ	330-331
اردو کا آغاز وارتقا اور مدھیہ پردیش	نزہت اختر، میرٹھ	332-333
شعبہ اردو کی سرگرمیاں	ادارہ	334-356
ہندی سیکشن		

☆☆☆

مدیراعلیٰ کے قلم سے

’’ہماری آواز‘‘ کا تازہ شمارہ جولائی تا دسمبر 2023ء آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔ یہ ایک عام شمارہ ہے لیکن پھر بھی اس میں ایک چھوٹا سا سر سید احمد خاں پر گوشہ شامل ہے۔ واضح ہو کہ شعبۂ اردو تقریباً بیس سال سے جنرل ’’ہماری آواز‘‘ نکالتا آ رہا ہے۔ اس کے تقریباً 25 شمارے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ ہم نے کوشش کی ہے کہ مغربی اتر پردیش خاص کر میرٹھ اور گرد و نواح کے ایسے شعرا و ادبا جن پر بہت کم کام ہوا ہے ان کو اس جنرل کے ذریعے از سر نو منظر عام پر لا سکیں۔

گذشتہ دنوں ہم نے کئی خاص نمبر مثلاً انتظار حسین، حفیظ میرٹھی، نئی صدی کی دو دہائیوں کا اردو فکشن، غالبؔ اور دبستان میرٹھ۔ شاعری نمبر شائع کیے ہیں۔

یہ خوشی کی بات ہے کہ ’’ہماری آواز‘‘ جنرل کو 2015ء میں ISSN نمبر مل گیا تھا اور 2021ء میں اسے یو جی سی نے اپنی کیئر لسٹ میں شامل کر لیا تھا۔ ہمیں یہ کہتے ہوئے مسرت کا احساس ہو رہا ہے کہ چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی کے مختلف شعبوں سے رسالے اور جنرل نکلتے ہیں لیکن ’’ہماری آواز‘‘ جنرل یونیورسٹی کا ابھی تک واحد جنرل ہے جسے یو جی سی کیئر لسٹ میں شامل کیا گیا ہے۔

یوں تو اس شمارے میں محترم عارف نقوی، جرمنی، پروفیسر آمنہ تحسین، حیدرآباد، ڈاکٹر کہکشاں لطیف، حیدرآباد، محترم سراج انور، مہاراشٹر، ڈاکٹر اعظم انصاری، لکھنؤ، ڈاکٹر آصف علی، ڈاکٹر شاداب علیم، ڈاکٹر ارشاد سیانوی، ڈاکٹر ظفر گلزار، حیدرآباد اور ڈاکٹر شبستاں آس محمد کے مضامین شامل ہیں۔

افسانوں کے کالم میں ڈاکٹر فرخندہ شمیم، کراچی، ڈاکٹر کہکشاں پروین، ڈاکٹر پرویز شہر یار، محمد فرحت حسین ساتھ ہی رقیہ جمال کے دو افسانچے، طالبؔ زیدی، سید اطہر الدین اطہرؔ، نذیر میرٹھی، عادل رضا منصوری، روبینہ میر اور رخسار مظفر نگری کی نظمیں اور پروفیسر کوثر مظہری، ظفر

اقبال ظفر، رومانہ رومی، سید احمد شمیم، مظہر سیانوی، ڈاکٹر قمر سرور، ڈاکٹر ذکی طارق، عشرت معین سیما، رفیعہ شبنم عابدی، رؤف رضا وغیرہ کی غزلیں بھی شامل ہیں۔ ساتھ ہی سر سید کے گوشے میں کئی اہم مضامین شامل اشاعت ہیں۔

بہت دنوں کے بعد جنرل کا عام شمارہ منظر عام پر آرہا ہے۔ دراصل اس طرح ہم لوگ ہندی کے ساتھ ساتھ اردو کی خدمت کے لیے کمر بستہ ہیں۔ آئندہ ہمارا منصوبہ دبستان میرٹھ: نثر اور مشاہیر میرٹھ نمبر نکالنے کا ہے تا کہ میرٹھ کے ادباء، شعرا، صحافی، سیاست داں، معروف شخصیات، مشہور عمارتیں، تاریخی مقامات وغیرہ کو عوام کے سامنے لایا جا سکے اور ادب کا ایک ایسا ماحول بنایا جائے جس میں مصنفین آزاد ہوں، ان پر کسی نظریے کا دباؤ نہ ہو۔ یوں بھی مابعد جدیدیت کے بعد نئی صدی میں جدید ترقی پسندی کے رجحان نے اپنی جگہ بنانی شروع کر دی ہے۔ اس میں خاص کر دلت ڈسکورس، اقلیتی ڈسکورس کے علاوہ کولاژ تکنیک کا استعمال ادب کی نثری اصناف کے ساتھ ساتھ شعری اصناف میں بھی ہو رہا ہے۔ کولاژ تکنیک پر ناول اور افسانے لکھے جا رہے ہیں۔ اردو شاعری اور فکشن میں اقلیتوں اور دلتوں پر ہونے والے مظالم کا بیان کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ آج ادیب سماج میں ہونے والی ہر بے انصافی کو نہ صرف اپنی تخلیقات میں ظاہر کر رہا ہے بلکہ بے انصافی اور ظلم کے خلاف علم احتجاج بھی بلند کر رہا ہے۔

''ہماری آواز'' کا یہ شمارہ آپ کو کیسا لگا ہمیں اپنی آرا سے ضرور نوازیں۔

☆☆☆

پروفیسر اسلم جمشید پوری
صدر، شعبۂ اردو
چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ

اداریہ

تسلیمات!

معزز قارئین کرام

شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ کا شمارہ جولائی تا دسمبر 2023ء ''ہماری آواز'' آپ کی خدمت میں حاضری کا شرف حاصل کر رہا ہے۔ ہمیں بے حد خوشی ہے کہ شعبۂ اردو تقریباً بیس سال سے جنرل ''ہماری آواز'' پابندی سے نکالتا آ رہا ہے۔ واضح ہو کہ یہ ایک عام شمارہ ہے۔ لیکن پھر بھی اس میں سرسید احمد خاں پر شامل ایک مختصر سا گوشہ اس کو خاص بناتا ہے۔ تقریباً اس کے 25 شمارے اب تک منظر عام پر آ کر خراج تحسین و آفرین حاصل کر چکے ہیں۔

ہماری کوشش یہی ہے کہ شعبۂ اردو مغربی اتر پردیش خصوصاً میرٹھ اور اس کے گرد و نواح کے وہ شعرا و ادبا جن پر بہت کم کام ہوا ہے یا پھر وہ گردشِ حالات کا شکار ہو کر گمنامی کے اندھیروں میں غائب ہو چکے ہیں، ان کو شعبۂ اردو ''ہماری آواز'' جنرل کے توسط سے ازسرِنو منظر عام پر لانے کا فریضہ انجام دے رہا ہے تاکہ ہمارے قارئین، شعبے کے طلبا، ریسرچ اسکالرز ہماری موجودہ اور آئندہ آنے والی نسلیں ان شعراء و ادبا سے واقف اور فیض یاب ہو سکیں۔

گذشتہ دنوں ہم نے کئی خاص نمبر مثلاً انتظار حسین، حفیظ میرٹھی، نئی صدی کی دو دہائیوں کا اردو فکشن، غالبؔ اور دبستان میرٹھ: شاعری نمبر شائع کیے ہیں۔ شعبۂ اردو کی یہ خوش بختی اور بلند قسمتی ہے کہ ہماری آواز جنرل یو جی سی کیئر لسٹ میں شامل ہے اور ساتھ ہی یونیورسٹی کا واحد رسالہ ہے جو اس لسٹ میں شامل ہیں۔

یوں تو اس شمارے میں محترم عارف نقوی جرمنی، استاد محترم پروفیسر اسلم جمشید پوری، پروفیسر ریشما پروین، ڈاکٹر وصی اعظم انصاری، لکھنؤ، پروفیسر آمنہ تحسین، ڈاکٹر کہکشاں لطیف، ڈاکٹر ظفر گلزار حیدرآباد، پروفیسر ہما مسعود، ڈاکٹر آصف علی، ڈاکٹر شاداب علیم، ڈاکٹر ارشاد سیانوی، ڈاکٹر شبستاں آس محمد، محترم سراج انور محمد میراں، ناندیر، ڈاکٹر فہیمہ الیاس، مفتی راحت علی صدیقی، کھتولی، فرح ناز، سیدہ مریم الٰہی، اطہر خان، شاہ زمن، طاہر پروین، میرٹھ اور عرفان عارف،

جموں وغیرہ کے مختلف موضوعات وعنوانات پر تنقیدی مضامین شامل ہیں۔

زیرِ نظر شمارے میں گوشۂ سر سید کے تحت سر سید احمد خاں کی علمی، ادبی وصحافتی خدمات پر پروفیسر صغیر افراہیم، پروفیسر اسلم جمشید پوری، ڈاکٹر ساجد علی، ڈاکٹر شبستاں آس محمد، شاہِ زمن، عظمیٰ سحر، علما نصیب شہناز پروین کے مضامین کے ساتھ ہی راشد طراز کی سر سید پر غزل شامل ہے۔

گوشۂ سر سید کے بعد افسانہ وافسانچہ میں قومی و بین الاقوامی سطح پر مقبول ومعروف افسانہ نگاروں مثلاً ڈاکٹر کہکشاں پروین، ڈاکٹر فرخندہ شمیم، ڈاکٹر پرویز شہر یار، پروفیسر اسلم جمشید پوری، محمد فرحت حسین، ڈاکٹر شاداب علیم اور رقیہ جمال کے چھ افسانے اور چار افسانچے شامل اشاعت ہیں۔ بعد ازاں نظموں اور غزلوں میں محترم طالب زیدی، سید اطہر الدین اطہر، نذیر میرٹھی، عادل رضا منصوری، روبینہ میر اور رخسار مظفر نگری کی نظمیں اور پروفیسر کوثر مظہری، رومانہ رومی، ظفر اقبال، سید احمد شمیم، وغیرہ کی غزلیں شامل ہیں۔ آخر میں کتابوں پر تبصرے اور شعبۂ اردو کی سرگرمیاں بھی شامل ہیں۔

ہم بے حد ممنون ومشکور ہیں اپنے تمام اساتذہ کرام اور شعبے کے سبھی اراکین کے کہ انہوں نے ہر ممکن تعاون کیا اور قدم قدم پر ہماری رہنمائی فرمائی اور ہماری مشکلات کو آسان بنایا۔ ''ہماری آواز'' کا تازہ شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ آپ کی مفید وکارآمد اور قیمتی آرا کا انتظار رہے گا جو بلاشبہ مستقبل میں ہمارے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوں گی۔

☆☆☆

شاہِ زمن
ریسرچ اسکالر
شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ

پروفیسر اسلم جمشید پوری
میرٹھ

اختر کاظمی شخصیت اور صحافت: ایک جائزہ

صحافت ایسا شعبہ ہے جس میں بہت کم لوگ ایسے ملیں گے جن کو اردو نثر پر دسترس ہو۔ یوں تو بے شمار صحافی ہیں جن کا کام دن رات خبریں لکھنا ہی ہے۔لیکن اس کے باوجود معیاری اور اچھی نثر لکھنے والے بہت کم لوگ ہیں۔جن کی شناخت اچھے نثر نگار کے طور پر ہوتی ہے۔مولانا ابو الکلام آزاد، محمد علی جوہر، حسرت موہانی، حیات اللہ انصاری، خواجہ احمد عباس، عشرت علی صدیقی، احمد سعید ملیح آبادی، موہن چراغی، پروانہ ردولوی، ہارون رشید، شاہد صدیقی، عبدالودود صدیقی، شاہد لطیف، وسیم الحق، حسن کمال، ابراہیم علوی، سعید سہروردی،، زاہد علی خان، جلیل احمد، معصوم مراد آبادی، زاہد زیدی، چندر بھان خیال، شکیل حسن، ندیم صدیقی، ظفر آغا، خلیل الرحمٰن، منصور آغا، اسد رضا، شکیل رشید، حقانی القاسمی اور اختر کاظمی وغیرہ کا شمار معیاری صحافیوں میں ہوتا ہے۔یہ وہ صحافی ہیں جن کی تحریریں قارئین پر ایک سحر سا طاری کر دیتی ہیں۔اور قاری اس کی تحریریں پڑھ کر مضطرب ہو جاتا ہے۔

اختر کاظمی برسوں سے اردو صحافت کے باغیچہ کو اپنے خون جگر سے سینچ رہے ہیں۔ان کی خبریں، مضامین و مقالات مہاراشٹر کے اردو اخبارات کی زینت بنتے رہتے ہیں۔ان کی تحریر میں ایک قسم کی کشش اور گہرائی ملتی ہے۔موجودہ عہد کے صحافیوں میں ایک معتبر نام اختر کاظمی کا ہے۔

آپ کا تعلق دربھنگا جیسے مردم خیز علاقے سے ہے۔آپ کے بڑے بھائی ڈاکٹر منظر کاظمی افسانے کے تعلق سے پوری اردو دنیا میں محتاج تعارف نہیں۔آپ نے تقریباً ۴۰ سالہ ادبی سفر کے دوران ایک افسانوی مجموعہ ''لکشمن ریکھا'' اردو کو دیا۔اتنے کم افسانے لکھنے کے باوجود

اردو ڈاکٹر منظر کاظمی کو افسانے میں ید طولیٰ حاصل ہے۔اردو میں پہلی بار حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر جدید لب ولہجہ میں ’’سیاہ غلاف اور کالے جرنیل‘‘ لکھ کر شہرت دوام حاصل کی۔اختر کاظمی کو بھائی کی صحبت حاصل رہی۔اور انہوں نے اپنی تعلیم کا بڑا حصہ جمشید پور میں حاصل کیا۔آپ ممبئی کے بھیونڈی علاقے میں قیام پذیر ہیں اور اردو کے بہت سے روزنامہ اخبارات و ہفت روزہ اخبارات سے منسلک رہے۔آپ کی پوری زندگی اردو صحافت کی خدمت کرتے ہوئے گزری۔ آپ کی تحریروں میں ایک خاص وصف ہے جو انہیں اپنے ہم عصروں میں ممیز و ممتاز کرتا ہے۔اختر کاظمی کی شخصیت اور کارناموں کو سمجھنے کے لئے کامریڈ عبدالجلیل انصری اور سیماب انور مومن کے مضامین کے اقتباسات ہی کافی ہیں۔ان کے مطالعے سے اختر کاظمی کی شخصیت کے کئی گوشے عیاں ہوتے ہیں۔

’’اس کے ساتھ ہی دینی ،علمی ، ادبی ، ثقافتی اور سماجی پروگراموں کی رپورٹنگ کرنے کا ان کا ایک منفرد انداز ہے۔جتنی تفصیل کے ساتھ اور جس سلیقے سے وہ ان پروگراموں کی رپورٹ لکھتے ہیں وہ قابلِ تعریف ہے۔مجھے یہ کہنے میں قطعی عار نہیں کہ اختر کاظمی کی اس طرح کی رپورٹنگ کا انداز ہمارے شہر کے کسی بھی نامہ نگار کو میسر نہیں آ سکا۔اختر کاظمی اپنی تحریروں میں مشکل اور ثقیل الفاظ کا استعمال کرنے سے ہمیشہ پرہیز کرتے ہیں۔‘‘

(کامریڈ عبدالجلیل انصاری۔ص ۳۵،اختر کاظمی:شخصیت اور صحافت،مرتب،عابد عثمان مومن)

’’شہرت ،عزت اور مرتبہ جہد مسلسل کے بعد میسر آتا ہے۔کچھ لوگ بزرگوں اور اپنے بڑوں کا نقشِ پا تلاش کرتے ہوئے منزل تک پہنچتے ہیں اور کچھ وہ، جو اپنی محنت اور زمانے کے نشیب وفراز سے گزرنے کے بعد خود اپنا راستہ بنا لیتے ہیں۔ظاہر ہے اس طرح کی کامیابی زیادہ مستحکم اور مضبوط ہوتی ہے۔کیونکہ بیساکھیوں کے بغیر انتھک محنت کے بعد جو راہِ دشوار آسان ہوجاتی ہے وہ ہمیشہ پائیدار اور دوسروں کے لیے مشعلِ راہ ہوتی ہے۔

اپنی مٹی سے نکل کر دیارِ غیر میں اجنبی کی طرح داخل ہونا اور پھر بہت ہی آہستگی کے

ساتھ اپنی شناخت کو مستحکم کرتے ہوئے الگ شناخت بناتے ہوئے شخص سے شخصیت بن جانا بڑی جانفشانی اور صبر طلب مرحلہ تھا، جسے اختر کاظمی جیسا جی دار انسان ہی طے کرسکتا ہے۔''

(سیماب انور مومن، ص ۱۱۰، اختر کاظمی: شخصیت اور صحافت، مرتب، عابد عثمان مومن)

''اختر کاظمی شخصیت اور صحافت'' نامی کتاب اس سال منظر عام پر آئی۔ کتاب کے مرتب عابد عثمان مومن ہیں۔ جنھوں نے اختر کاظمی کو بہت قریب سے دیکھا، پرکھا اور سمجھا ہے۔ یہ کتاب سامنے لانے کا مقصد مرتب کا یہی ہے کہ وہ ایک اچھے صحافی کو قومی اور بین الاقوامی سطح پر متعارف کرانا چاہتے ہیں۔ کتاب کو بہت سلیقہ سے مرتب کیا گیا ہے۔ کتاب ہذا میں اختر کاظمی کی شخصیت اور صحافتی فن پر ڈھائی درجن مضامین شامل ہیں۔ جن میں شمیم طارق، شاہ صغیر اشرف، مولانا ظفر احسان ندوی ازہری، مفتی سید محمد حذیفہ قاسمی، شکیل رشید، محمد رفیع انصاری، قطب الدین شاہد، امام اعظم، امیم مبین، ظفر انور شکر پوری، فرحان حنیف وارثی، یٰسین مومن، شکیل احمد شکیل، سہیل اختر انصاری، شمع اختر کاظمی وغیرہ کا نام ہندوستانی اردو صحافت میں احترام سے لیا جاتا ہے۔

درج بالا حضرات کے مضامین سے اختر کاظمی کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ ان کے بچپن کے حالات، تعلیمی سفر، بڑے بھائی کی صحبت، معاش کے لئے جدوجہد، شادی خانہ آبادی، صحافت کی طرف بڑھتے قدم، ماہنامہ 'تخلیق نو' کی ادارت، انقلاب، اردو ٹائمز اور دیگر اخباروں سے وابستگی، اردو قبیلہ میں سرگرم فعالیت، عوام کے مسائل کو اخبار کے ذریعہ دوسروں کو پہنچانے کا عمل، بچوں کی تعلیم کے تئیں سنجیدگی، اخبارات اور رسائل میں مضامین ومقالات کی اشاعت، سیاسی لوگوں سے قربت، ادبی جلسوں یں شرکت، معروف شعراء وادباء سے ملاقات وغیرہ کا علم اس کتاب کے مختلف مضامین سے ہوتا ہے۔ 'تخلیق نو' کے مدیر کی حیثیت سے اختر کاظمی ی فکر مندی ،دیکھیں۔ اختر کاظمی اردو میں اکاڈمیوں کے سبب اردو کتابوں کی اشاعت میں اضافے کو طنز کا نشانہ بناتے ہیں۔

> ''ایک زمانہ تھا کہ شاعروں اور ادیبوں کو اپنے مسودے کی اشاعت کا خیال ایک خواب جیسا نظر آتا تھا۔ کسی افسانوی یا شعری مجموعے کی طباعت ناشر کے لئے گھاٹے کا سودا ہوتی تھی اور مصنف اپنے طور پر اس کا انتظام کرنے میں ناکام رہتا تھا۔ لیکن اکاڈمیوں کے قائم ہوتے ہی ادبی کتابوں کے انبار لگ گئے۔ آج کوئی ادیب یا شاعر مالی دشواریوں کو

اپنی کتاب کی عدم اشاعت کا بہانہ نہیں بنا سکتا۔ بلکہ ایسا بھی ہوا ہے کہ اس
ریلے میں بعض غیر معیاری کتابیں بھی شائع ہوگئیں۔جن پر اظہار افسوس
کے بجائے بہترین کتابوں کی اشاعت پر خوش ہونا زیادہ بہتر ہے۔''
(اداریہ،تخلیق نو،اختر کاظمی،ص۳۳،اختر کاظمی: شخصیت اور صحافت،مرتب، عابد عثمان مومن)

اس کتاب میں مرتب نے اختر کاظمی کے مختلف مضامین ،خاص خبر میں اور بعض رپورٹوں کے اقتباسات بھی شامل کئے ہیں۔ اختر کاظمی کے تقریباً ۴۰ سالہ دورِ صحافت کے ۵۷ مضامین اور خاص خبروں کا انتخاب کتاب کے مرتب عابد عثمان مومن نے کیا ہے۔ان تمام مضامین اور خبروں کے تراشوں کے مطالعے سے جہاں اختر کاظمی کی اردو صحافت سے گہری وابستگی کا پتہ چلتا ہے وہیں مہاراشٹر، ممبئی اور خاص کر بھیونڈی کی ادبی، سیاسی ،سماجی اور معاشی زندگی بھی عیاں ہوتی ہے۔ بھیونڈی کے شب و روز، فسادات کا درد و کرب، بنکروں کے مسائل، پاور روم صنعت کے نشیب وفراز کا بھی پتہ چلتا ہے۔ان مضامین وخبروں میں سے بعض کے عنوانات بہت ہی پرکشش ہیں۔مثلاً کہ ناداں گر گئے سجدے میں جب وقت قیام آیا، فرقہ وارانہ فسادات اور صحافتی ذمہ داریاں،اقبال کا عشق انسان کی فلاح کا ضامن ہے،اردو کسی کے رحم وکرم پر زندہ نہیں ہے،موہے پنگھٹ پہ نند لال چھیڑ گیو رے، اونٹ رے اونٹ تیری کون سی کل سیدھی، پاور لوم صنعت کی زبوں حالی ۔۔۔ بے سمت سفر کا سانحہ، دنیا کا آٹھواں عجوبہ بھیونڈی میں، روٹھے روٹھے میاں مناوں کیسے،منظر کاظمی کے افسانے جدید تقاضوں کو پورا کرتے ہیں۔ بھیونڈی میں کتوں کی دہشت سے عوام وحشت زدہ، جہاں رہے گا وہیں روشنی لٹائے گا وغیرہ عنوانات سے ہی خبر کی سنجیدگی اور مسائل کا علم ہوتا ہے۔ یہاں اختر کاظمی کی بعض خبروں کے اقتباسات دیے جا رہے ہیں، جو عابد عثمان مومن نے اس کتاب میں انتخاب کے طور پر شامل کئے ہیں۔ان کے مطالعے سے اختر کاظمی کی زبان اور اندازِ بیان کا علم ہوتا ہے۔درج ذیل دونوں خبروں کا تعلق، بابری مسجد انہدام معاملے سے ہے۔

''بابری مسجد کے حتمی فیصلے کے بعد مسلم تنظیموں نے عموماً اور مسلم پرسنل لاء
بورڈ نے خصوصاً ایک خاموشی اختیار کر رکھی تھی۔ اسباب وہی لوگ جان
سکتے ہیں لیکن ۱۹۹۲ء میں بابری مسجد ڈھائے جانے کے نامزد ملزمین کی
رہائی کے بعد مسلم تنظیموں اور پرسنل لاء بورڈ میں حرکت کے آثار شروع

ہوگئے ہیں۔ جس کی شروعات لکھنؤ میں پرسنل لاء بورڈ کے اجلاس سے
ہوئی۔ جس میں یہ طے کیا گیا کہ اس فیصلے کے خلاف عدالت کا دروازہ
کھٹکھٹایا جائے گا۔ چلیے اتنا تو ہوا کہ ایک ہلچل پیدا ہوئی اور یہ تاثر دیا گیا
لوگوں کو کہ پرسنل لاء بورڈ مسائل کو چھوڑنے والا نہیں ہے اور شاید اسی میں
بورڈ کی بھی زندگی ہے اور عوام کی بھی۔ ورنہ یہ بات صحیح ہے کہ ہاتھ پر ہاتھ
دھرے منتظر فردا ہے۔''

(ص ۱۳۲، اختر کاظمی: شخصیت اور صحافت، مرتب، عابد عثمان مومن)

''۹۳-۱۹۹۲ء کے دسمبر اور جنوری کے ہولناک فرقہ وارانہ فسادات کے
بعد جب سرکاری سطح پر فسادات کے خلاف ڈاکیومینٹری فلم بنانے کے
لیے فلم ڈویژن کے افراد نے مجھ سے انٹرویو لیا تو اس وقت بھی ہم نے
یہی اپیل کی تھی کہ صحافی چاہے ہندو یا مسلمان، سکھ ہو یا عیسائی، اسے
صرف صحافی ہونا چاہیے اور فرقہ پرست قوتوں کو اپنے قلم کا سہارا نہیں دینا
چاہیے۔ یہ صحافت کے ساتھ بے ایمانی اور بد دیانتی ہوگی۔ یہ فلم انیس
(۱۹) ہندوستانی زبانوں میں ڈب کر کے نہ صرف پورے ملک میں دکھائی
گئی بلکہ اٹلی اور جرمنی کے عالمی فلمی میلے میں بھی وہاں کی زبان میں دکھائی گئی۔''

(ص ۱۳۶، اختر کاظمی: شخصیت اور صحافت، مرتب، عابد عثمان مومن)

دراصل اختر کاظمی نے صرف سیاسی اور سماجی جلسوں کی خبروں تک محدود نہیں رکھا بلکہ وہ ادبی محفلوں میں بھی برابر شرکت کرتے تھے اور ایسے جلسوں کی خبریں، بڑے شوق سے اور ادبی زبان میں کرتے تھے۔ کئی ادبی جلسوں کی مقبولیت ان کی خبر کی مرہون ہوتی تھی۔ شمیم طارق، جو بین الاقوامی شخصیت کے مالک، ماہر اقبال و ٹیگور ہیں، کے ایک جلسے میں اقبال کے عشق کے فلسفے کے تعلق سے ان کے بیان کو اختر کاظمی کی زبانی دیکھیں:

''غالبؔ جیسے اہم اور زبان و زمین کے شاعروں پر اپنا غلبہ ثابت کرنے
والے شاعر کے یہاں بھی عشق کبھی تو نکما بنا دینے کا سبب بنتا ہے کبھی
عاشقی صبر طلب کا احساس دلا کر ایک مکمل تہذیب بلکہ تہذیب نفس آشنا کر
دینے کا مگر مشاہدہ حق کی گفتگو غالب عشق ہی کے حوالے سے کرتے

ہیں۔ اقبال کی شاعری کی طرح ان کا تصورِ عشق بھی دوسرے شاعروں سے مختلف ہے۔ وہ عشق وجذبہ کے بجائے وجدان یا ایک داخلی قوت کی شکل میں پیش کرتے ہیں۔ یہ قوت عقیدہ سے جلا پاتی ہے۔ اس لیے اقبالؔ کے عشق میں وہم وشک کے بجائے یقینِ محکم کی، غیض وغضب کے بجائے عدل وصداقت کی اور خوف وتردد کے بجائے بے خوفی اور ہمت کی کارفرمائی ہے۔''

(ص ۱۴۵، اختر کاظمی: شخصیت اور صحافت، مرتب، عابد عثمان مومن)

بھیونڈی میں پیش آنے والے ایک حادثے کی خبر دیکھیں۔ خبر کو پڑھ کر آپ کی آنکھیں بھیگ جائیں گی اور دل روئے گا۔ سیاست دانوں کی بے رخی اور بے حسی کا بھی پتہ چلے گا کہ کس طرح سیاست داں صرف کھوکھلے وعدے کرتے ہیں۔ انہیں کسی کی موت اور زندگی سے کوئی لینا دینا نہیں۔ وہ تو صرف اپنی سیاست چمکاتے ہیں۔

''پاورلوم صنعت کے سب سے بڑے مرکز بھیونڈی میں ۵/اگست ہر سال سیاہ دن کے طور پر منایا جاتا رہے گا کہ اسی دن اسی تاریخ کو ۱۹۹۶ء میں دھوبی تالاب روشن باغ علاقہ کی ایک بستی (کھاناول میں) دن کا کھانا کھانے والے ۱۰۵/ پاورلوم مزدور زہر خورانی کا شکار ہوئے اور آناً فاناً موت کے منہ میں چلے گئے۔ یہ سانحہ ایک اتفاقی حادثہ ہے یا پھر ایک سوچی سمجھی سازش کا نتیجہ؟ کسی کو نہیں معلوم۔ لیکن سب سے زیادہ افسوس اور حیرت کا مقام یہ ہے کہ ۲۰/سال کا عرصہ گزر جانے کے باوجود ان مہلوک پاورلوم مزدوروں کے ورثاء کو آج تک انصاف نہیں ملا۔''

(ص ۲۷۷، اختر کاظمی: شخصیت اور صحافت، مرتب، عابد عثمان مومن)

کتاب کے آخر میں اختر کاظمی کی ذاتی زندگی، صحافتی کارنامے، ادبی جلسوں میں شرکت، سیاسی شخصیات سے ملاقات، سماجی پروگراموں میں شمولیت، مذہبی رہنماؤں سے قربت کو تصویروں کی زبانی پیش کیا گیا ہے۔ بہت سے لوگوں کو یہ خبر نہیں کہ اختر کاظمی اچھے فوٹو گرافر بھی ہیں۔ آپ کی فوٹو گرافی کے بعض نمونے بھی اس کتاب میں شامل ہیں۔

مجموعی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ کتاب اختر کاظمی کی شخصیت اور کارناموں کو سمجھنے کے لئے کافی ہے۔ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اختر کاظمی شناسی میں یہ کتاب سنگ میل کا درجہ رکھتی ہے۔

☆☆☆

پروفیسر ریشما پروین
لکھنؤ

بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیاں اور خواتین افسانہ نگار

ادب سماج کا آئینہ ہے زندگی کی تلخ حقیقتیں عموماً اس کا موضوع رہی ہیں پھر چاہے وہ کسی زمانے کے حالات ہوں یا اس دور کے سماج میں رہنے والے افراد سب ادب کا موضوع بنے ''عورت'' ابتداء سے ہی ادب میں مختلف صورتوں میں جلوہ گر رہی کبھی حسین شہزادی تو کبھی محبوبہ اور کبھی دل و دماغ کو فرحت بخشنے والی بیسوہ یا پھر نیک دل محبت کرنے والی خاتون خانہ۔ لیکن یہ سب وہ روپ تھے جو عموماً مرد حضرات کے ذریعہ پیش کیے گئے۔ خود عورت نے اپنے لیے کیا کہا، کیا لکھا، اردو ادب میں اس کی تخلیقات کی کیا صورت رہی؟ یہ سارے سوالات اکثر ذہن میں آتے ہیں۔ انیسویں صدی دراصل خواتین کے لیے علمی و ادبی اعتبار سے خاصی مایوس کن تھی وہ نانی، دادی ماں بہن اور خاتون خانہ تھی کہانی سنا تو سکتی تھی مگر اسے لکھ نہیں سکتی تھی۔ لکھنا مذہبی اور معاشرتی رسوائی کا باعث تھا مگر علم کے لیے اس کی تڑپ نے ہر مشکل مرحلے کو سر کر لیا اور آخرکار انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں میں خواتین کے لکھنے کی ابتداء اصلاحی قصوں سے ہوئی۔ قصہ گو خواتین میں عباسی بیگم، محمدی بیگم، اکبری بیگم، صغریٰ ہمایوں، خاتون اکرم، مسز عبدالقادر اور نذر سجاد ظہیر قابلِ ذکر ہیں۔ ان خواتین کی خود اعتمادی نے مزید خواتین کی حوصلہ افزائی کی۔ پہلی بار عورتوں کے لیے شائع کیے جانے والے رسالوں نے عورتوں کو اعتماد اور گویائی عطا کی۔ نتیجتاً خواتین فنکاروں کی خاصی تعداد سامنے آئی۔ انھوں نے اپنے احساسات و جذبات، اپنے افکار و مسائل کے اظہار کے لیے اردو ادب کی مختلف اصناف کو اپنایا۔ اکبری بیگم نے گلدستہ محبت (۱۹۰۳) اور ''گودڑ کا لال'' (۱۹۰۷) میں لکھے۔ ''گودڑ کا لال'' کا بنیادی موضوع عورت، پردے کی مخالفت، اور مخلوط تعلیم کے فوائد تھے۔ ''گودڑ کا لال'' کو ایک انقلابی آواز قرار دیا جا سکتا ہے۔ اکبری بیگم کے علاوہ صغرا ہمایوں مرزا کا تمثیلی قصہ ''مشیر نسواں'' حیدرآباد دکن سے ۱۹۰۶ء

میں شائع ہوا جس کا موضوع خواتین کی اصلاح اور فلاح و بہبود ہے۔ نذر سجاد کے تمثیلی قصہ ''اختر النساء بیگم'' کی ہیروئین تعلیم یافتہ لڑکیوں کی آئیڈیل اور قوم پرست ہندوستانی عورت ہے، مذکورہ خواتین اپنی تحریروں میں مولوی نذیر احمد اور راشد الخیری کی مقلد نظر آتی ہیں مگر بین السطور میں ان کا اضطراب اور کشمکش نمایاں نظر آتا ہے وہ ان پابندیوں اور چار دیواری کے تصور کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں جس کا درس مولوی نذیر احمد اور راشد الخیری دیتے ہیں ''گودڑ کا لال'' کی ہیروئن میڈیکل کالج بے پردہ جاتی ہے۔ مسئلہ بے پردہ رہنے کا اس کا شوق نہیں بلکہ لیبوریٹری میں کام کرتے وقت آنے والی مشکلات ہیں۔ اکبری بیگم کا وہ جذبہ ہے کہ کسی طرح وہ میڈیکل کالج جا کر پڑھے ان قصوں کی ہیروئن مرد سے برابری کا خواب دیکھتی ہے۔ ان نمائندہ خواتین نے گھریلو زندگی کے بہت سے مسائل کو موضوع بنایا۔ مثلاً بچپن کی شادی، مرد کی دوسری شادی، بیوہ عورت کے مسائل وغیرہ البتہ ان سب میں مسز عبدالقادر افسانہ نگار خواتین کی افسانوی روایت سے بالکل الگ نظر آتی ہیں انھوں نے آواگون، مسئلہ تناسخ اور حیات بعد الممات کو اپنی کہانیوں کا موضوع بنایا۔ ربابہ، لاشوں کا شہر، معلم کا راز ان کی دلچسپ اور حیرت انگیز کہانیاں ہیں وہ دل دہلانے والی کہانیاں بڑی مہارت سے تحریر کرتی ہیں، بہر حال مسز عبدالقادر سے قطع نظر اس دور کی خواتین افسانہ نگاروں کے یہاں ایسی عورت کا تصور ابھرتا ہے جو آنے والے وقت کی اہم ضرورت تھی۔

نذر سجاد یلدرم کو اردو کی پہلی رومان پسند خاتون کہا جا سکتا ہے ان کے علاوہ اکبری بیگم، آمنہ نازلی، شائستہ اختر اور دوسری خواتین بھی اس سلسلے میں آگے آئیں۔ یہ دور رشیدۃ النساء اور محمدی بیگم سے ذرا بعد کا ہے جس تک آتے آتے محسوس ہوتا ہے کہ سرسید، مولوی نذیر احمد اور راشد الخیری کے اصلاحی و مقصدی مشن سے ذرا ہٹ کر خواتین قلم کاروں نے اپنے وجود کے احساس پر زور دیا۔ ان کے دل و دماغ میں جو سوالات سر اٹھا رہے تھے وہ ان کے جواب کی منتظر تھیں ان کی اسی ذہنی کشمکش اور تصادم نے انھیں اس عہد کے مصلحین کے سامنے کھڑا کر دیا اصلاحی قصہ لکھنے والی خواتین کے بیدار ہوتے ذہن و دماغ نے بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں میں رومانوی تحریک کے زیر اثر بہت کچھ کہنا چاہا۔ حجاب امتیاز علی کی کہانی ''پاداش عمل'' اس کی خوبصورت مثال ہے۔ کہانی ''بیمار غم'' میں امتیاز علی کا باغیانہ انداز صاف نظر آتا ہے وہ لکھتی ہیں۔

''اللہ! کیا مشرقی لڑکی محض اس لیے پیدا ہوتی ہے کہ وہ دوسروں کی خوشیوں پر بھینٹ چڑھا دی جائے؟ کیا اسے خود اپنی زندگی کے معاملے میں بھی دخل

دینے کا اختیار نہیں؟ کدھر ہیں وہ ریفارمر جو قوم کے آگے لمبی لمبی تقریریں کرتے اور بہبودی قوم کا ترانہ بڑے زور شور سے گاتے ہیں۔ اسٹیجوں پر کھڑے ہو کر اپنے سینے پر ہاتھ رکھ رکھ کر قومی درد جتانے والے ریفارمر کدھر ہیں؟ وہ گریبانوں میں منہ ڈال کر دیکھیں کہ انھوں نے اپنی ماؤں کے لیے کیا کیا؟ لڑکیوں کے لیے کیا کیا؟ جو کل قوم کی مائیں بننے والی ہیں۔ کیا ان کا ہمدردی اور قوم کے عشق سے لبریز دل مظلوم لڑکیوں کی آہ سے تھرا نہیں اٹھتا۔ کیا ان کی تمام ہمدردی، تمام درد محض فرقۂ رجال ہی تک محدود ہے؟ اگر ان کے احساسات صرف مردوں کے دکھ درد تک ہی محدود ہیں تو پھر یہ بزرگ کس منہ سے قوم کے امام بنے پھرتے ہیں؟ پھر وہ کیوں اس نام سے منسوب کیے جاتے ہیں؟ کیا وہ عورت کو قوم سے خارج سمجھتے ہیں؟ کیا قوم صرف مردوں ہی کے احتجاج کا نام ہے؟ اے خدا! ان بزرگوں نے ہمارے لیے کیا کیا؟ کچھ نہیں کیا۔ آہ۔ کچھ بھی نہیں کیا۔ ان سے اتنا بھی نہ ہوسکا کہ ہم کو زندگی کے اس نازک ترین مسئلہ میں رائے دینے کا اختیار دے دیں۔ جس پر ہر مرد اور عورت کی آئندہ خوشیوں اور امیدوں کا انحصار ہوتا ہے اور میں دخل دینا انسانی فطرت ہے یہ لوگ لڑکیوں کی یونیورسٹیوں کے لیے جھگڑتے ہیں۔ اپنی انجمنوں کے لیے بھیک مانگتے ہیں اپنی شہرت کے لیے تقریریں کرتے ہیں۔ مگر ہمارے لیے آج کسی بزرگ نے کسی ریفارمر نے یہ قانون نہیں بنایا کہ خود زندگی کے مسائل میں ہماری رائے ضروری سمجھی جائے۔''[1]

یہی باغیانہ رویہ تقریباً اسی زمانے میں ''انگارے'' کی واحد خاتون مصنفہ رشید جہاں کے افسانوں میں نظر آتا ہے۔ سجاد ظہیر کا مرتب کردہ دس کہانیوں کا مجموعہ انگارے دسمبر ۱۹۳۲ء میں منظرِ عام پر آچکا تھا۔ رشید جہاں (انگارے والی) کے خلاف فتوے تک جاری ہوئے۔ رشید جہاں پیشے سے ڈاکٹر تھیں معاشرے میں روتی بلکتی مظلوم عورتوں سے ان کا روز کا سابقہ تھا۔ جنس پر لکھتے ہوئے انھیں کوئی خوف نہ تھا۔ ان کے افسانے دیوار کے پیچھے، سودا، چھدّا کی ماں، بے زبان عورتوں کے جنسی، معاشرتی مسائل کے غمّاز ہیں۔ رشید جہاں کی کہانیوں کی ہیروئن اپنی شناخت چاہتی ہے وہ کسی کی بیوی اور بیٹی بن کر نہیں بلکہ معاشرے میں اپنے وجود کی

طالب ہے۔ ان کے ڈرامے ''پردے کے پیچھے'' سے بھی ان کے تصور عورت کو بخوبی سمجھا جا سکتا ہے، انگارے میں شامل ان کا نشانہ ''دل کی سیر'' عورت کی کم علمی، بے چارگی اور پسماندگی کی حقیقی تصویر پیش کرتا ہے۔

اردو افسانے کے ارتقائی سفر میں اصلاحی نقطۂ نظر کے علاوہ حقیقت نگاری اور رومانیت کا غلبہ رہا۔ حقیقت نگاری کے علمبردار پریم چند تھے اور رومانیت سجاد حیدر یلدرم کی رہنمائی میں آگے بڑھ رہی تھی، حجاب امتیاز علی اور رشید جہاں دو متضاد رجحانات سے وابستہ ہونے کے باوجود ایک موقع پر یکجا نظر آتی ہیں اور وہ موقع ہے حقوق نسواں کا حصول، اس کی تعلیم و تربیت، معاشرہ میں اس کی شناخت، حالانکہ ان دونوں ہی کو وہ اہمیت نہیں مل سکی جس کی وہ حقدار تھیں مگر بعد کی افسانہ نگار خواتین پر ان کا گہرا اثر پڑا۔ خواتین کی اس مسلسل جد و جہد کا اعتراف کرتے ہوئے افتخار عارف نے لکھا ہے۔

> ''عورت اور لفظ کا رشتہ معلوم تاریخ میں تقریباً ساڑھے تین ہزار برس سے قائم ہے۔ قدیم مصری تہذیب میں محفوظ شاعری کے نمونوں سے لے کر آج تک انفس و آفاق کے درمیان پھیلی ہوئی اس دنیا میں جو سوچا ہے، محسوس کیا ہے اور بیان کیا ہے وہ ہماری ادبی تاریخ کا بہت اہم حصہ ہے۔ مظلومی اور محرومی کی منزلوں سے شعور و آگہی اور اختیار و اعتبار کا یہ سفر اپنی جلو میں جد و جہد کی ایک روشن تاریخ لیے ہوئے ہے۔ ممکن ہے اس سفر میں فریاد کی لے، کہیں کسی کو تیز محسوس ہوئی ہو تو بھی ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کی اہمیت اور اس کے حق کا اعتراف کیا جائے۔ ہندوستان و پاکستان میں گذشتہ پچاس پچپن برسوں میں ہماری خواتین نے اپنے حق اور من حیث القوم بنیادی حقوق کے لیے بہت محنت اور بہت کام کیا ہے مگر ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔''[1]

یقیناً خواتین نے انیسویں صدی کے آخر سے عہد حاضر تک اپنے علمی وجود کو ثابت کرنے کی ہر ممکن سعی کی ہے یہی سبب ہے کہ یہ کارواں صرف حجاب امتیاز علی اور رشید جہاں تک محدود نہیں ہوا بلکہ ان کے بعد عصمت چغتائی، واجدہ تبسم، خدیجہ مستور، جیلانی بانو، قرۃ العین حیدر،

جیسے اہم نام اردو افسانے کے دامن کو تحریروں سے وسیع کرتے ہیں، شکیلہ اختر، صالحہ عابد حسین، تسنیم سلیم چھتاری، صدیقہ بیگم سیوہاروی، زمانی طور پر رشید جہاں کے زمانے سے تعلق رکھتی ہیں لیکن رشید جہاں کے ساتھ جو خاتون ترقی پسند تحریک سے براہِ راست متاثر ہوئیں وہ رضیہ سجاد ظہیر ہیں ان کے افسانوی مجموعوں ''اللہ کی مرضی''، ''رنگ روتے ہیں'' سے ان کا نقطۂ نظر واضح ہوتا ہے۔ رشید جہاں اور رضیہ سجاد ظہیر کے افسانوں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ اپنی بات کہنے کے لیے وہ رشید جہاں کی طرح بے باکانہ انداز اختیار نہیں کرتیں بلکہ بے حد نرم اور خوبصورت لہجہ میں عورت کی معاشی آزادی کی طلبگار ہیں۔ وہ عورت کو خودکفیل دیکھنے کی خواہشمند ہیں۔ اس کے برعکس رشید جہاں روایت سے بغاوت کرنے والی پہلی مسلم خاتون تھیں۔ شیخ عبداللہ کی بیٹی، ایم بی بی ایس ڈاکٹر کمیونسٹ پارٹی کی سرگرم رکن اور ساتھ ہی ادیب و افسانہ نگار۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں وہ سب کچھ لکھا جو اس زمانے میں لکھا جانا ممکن نہ تھا بقول قمر رئیس ''اب تک اردو افسانے میں جو ناگفتنی تھی رشید جہاں نے اسے گفتنی بنا دیا۔'' قدیم وجدید کی روایت خورشید جہاں نے یکجا کر دیا۔ ''قلم کی بے باکی'' نے ہی انھیں عصمت چغتائی کا آئیڈیل بنا دیا۔ عصمت لکھتی ہیں۔

> ''غور سے اپنی کہانیوں کے بارے میں سوچتی ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ میں نے صرف ان کی بے باکی اور صاف گوئی کو گرفت میں لیا ہے ان کی بھرپور سماجی شخصیت میرے قابو میں نہ آئی۔ مجھے روتی بسورتی، حرام کے بچے جنتی ماتم کرتی ہوئی نسوانیت سے ہمیشہ نفرت تھی۔ خواہ مخواہ کی وفا مجھے لعنت معلوم ہوتی ہے۔ جذباتیت سے مجھے ہمیشہ کوفت ہوتی۔ عشق میں محبوب کی جان کو لاگو ہو جانا، خودکشی کرنا، واویلا کرنا میرے مذہب میں جائز نہیں۔ یہ سب میں نے رشیدہ آپا سے سیکھا اور مجھے یقین ہے رشیدہ آپا جیسی لڑکی سو لڑکیوں پر بھاری پڑ سکتی ہے۔''

(آپ بیتی فن اور شخصیت)

خود عصمت چغتائی کی شخصیت مختلف رنگوں کا مجموعہ تھی ان کی تعلیم و تربیت علی گڑھ میں ہوئی سرسید تحریک، تحریک نسواں سے وہ براہِ راست متاثر ہوئیں۔ خواتین سے ہمدردی، ان کے مسائل کا احساس یقیناً تحریک نسواں کی دین ہے مگر ان مسائل کو خوف و بیم سے بے نیاز ہو کر تحریری

شکل دینا ترقی پسند تحریک خصوصاً رشید جہاں کا عطیہ ہے۔''لحاف''، ''دو ہاتھ''، ''ننھی کی نانی''، ''بچھو پھوپھی''، اور''ہندوستان چھوڑ و''اس کی خصوصی مثال ہیں،عصمت نے معاشرے کے ناسوروں پر قلم اٹھایا نتیجتاً لحاف اور بعض دوسرے افسانوں کی وجہ سے انھیں فحش نگار قرار دیا گیا مگر اس کے باوجود عصمت کا حوصلہ کم نہیں ہوا،عصمت،عصمت تھیں وہ ساری زندگی عورت اور اس کے مسائل کو موضوع بناتی رہیں،''جڑیں''، ''مٹھی مالش'' جیسے افسانے اسی سلسلے کی یادگار ہیں۔ عصمت نے خواتین کے جنسی مسائل کو اپنی کہانیوں کا موضوع بنایا آزادی نسواں کی بنیادوں کو مستحکم کیا۔

جنس نگاری میں عصمت کی پیروی واجدہ تبسم نے کی ان کی کہانیوں کا مجموعہ اترن حیدرآباد کے نوابوں کی مریضانہ جنسیت کو پیش کرتا ہے مگر واجدہ اپنے افسانوں میں وہ نفاست و پاکیزگی باقی نہ رکھ سکیں جو عصمت کی خاصیت تھی اس لیے ان کا نام مقبول عام ادب میں تو نمایاں ہے مگر رشید جہاں،عصمت چغتائی کی صف میں انھیں کھڑا کرنا مشکل ہے۔ان کے افسانے، ''اترن''، ''جھوٹن''، ''ذرا ہور اوپر''اور''نولکھا ہار''اسی قبیل کے افسانے ہیں۔

کرشن چندر کی بہن سرلا دیوی نے اسی دور میں متوسط طبقے کی محروم و مجبور عورتوں کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا،کلنک،اور''چاند بجھ گیا''،ان کے اہم افسانوی مجموعے ہیں جس میں عورت کا کرب واضح ہے۔

خدیجہ مستور کی افسانہ نگاری کا آغاز ۱۹۳۸ء سے ہوا۔خدیجہ مستور نے روایت سے استفادہ کرتے ہوئے منفرد راہ اختیار کی۔ان کے افسانوں کی ہیروئن تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ سیاسی شعور رکھتی ہے۔اپنے افسانوی مجموعوں 'کھیل'اور'بوچھار'میں خدیجہ مستور عورت کی آزادی، جنسی گھٹن اور طبقاتی تقسیم جیسے موضوعات کے ساتھ اس کی سیاسی فہم وبصیرت کو بھی موضوع بناتی ہیں۔ان کے افسانے'راستہ' کی ہیروئن یا پھر افسانے''بھورے'' کی ''ظہورن'' اپنے عہد کی عورتوں کی کسمپرسی،بے چارگی اور حالات سے سمجھوتہ کرنے کی داستان ہیں۔

رشید جہاں،عصمت،واجدہ تبسم،سرلا دیوی،خدیجہ مستور کے علاوہ ہاجرہ مسرور بھی ۱۹۴۲ء تک''ہائے اللہ''،''موہنی''،''تل اوٹ پہاڑ''،''نیلم''،میرا بھائی،فروزاں اور''بندر کا گھاؤ'' جیسے افسانوں کے ذریعہ ۱۹۴۷ء سے قبل کی افسانہ نگاروں میں اپنا مقام بنا چکی تھیں۔ان کی کہانی''بندر کا گھاؤ'' اپنا ہی زخم کرد ینے کی داستان ہے۔اس کہانی کی ہیروئن عزم نا کردہ کی

ایسی سزا پاتی ہے کہ جس کو سوچ کر آج ہماری روح کانپ جاتی ہے۔۲۴ سال کی لڑکی کے جنسی ارمان گھٹ گھٹ کر ختم ہونے کی صورت میں اسے ٹی بی کا مریض بنادیتے ہیں، بیمار بندر کے زخم کو جب اس کے ساتھی بندر کریدتے ہیں تو اسے محسوس ہوتا ہے کہ وہ خود بیمار بندر ہے اور اس کے گھر کے لوگ اسے کریدنے والے دوسرے بندر۔''دونوں کتنے ہم آہنگ ہیں''۔ ہاجرہ مسرور معاشرے پر کاری ضرب لگاتی ہیں جہاں مرد کا ہر گناہ معاف ہے مگر عورت اسے تو ناکردہ گناہ کی سزا بھی بڑی ایمانداری سے دی جاتی ہے۔ملاحظہ کیجیے۔

> ''کتنے ہی مہینے گزر گئے اس واقعے کو وہ سمجھتی تھی کہ جس طرح بڑے بھائی کی عیاشیاں ''سیانا ہے''، یہ عمر ہی ایسی ہوتی ہے، کہہ کر بھلا دی جاتی ہیں۔اسی طرح اس کے عزم گناہ کو بھی فراموش کردیا جائے گا۔ لیکن پگلی! عورت کی حیثیت کو بھول گئی۔عورت ایک کٹھ پتلی ہے جس کی ڈور سماج کے کوڑھی ہاتھوں میں ہے اور ان کوڑھی ہاتھوں میں جب چل ہونے لگتی ہے تو ڈور کے جھٹکوں سے یہ کٹھ پتلی نچائی جاتی ہے۔لیکن اگر اس کٹھ پتلی میں جان پڑ جائے تو سماج کا لوتھ پڑا ہوا سڑاندھ جسم۔کس سے دلچسپی لے؟''وہ سوچتی تھی کہ جس طرح اس کے گھر والے اس کی جوانی کے تقاضوں کی طرف سے کان بہرے کرکے بیٹھ رہے۔اسی طرح اس واقعے کو بھول کر اپنی غلطی کو تسلیم کرلیں گے۔لیکن یہ محض اس کا خیال تھا۔اس کے فرشتہ صفت سرپرستوں کی نظر میں اس کی زندگی پر گناہ کی جو خراش آ گئی تھی۔بھلا وہ کبھی مندمل بھی ہوسکتی تھی۔''

عورت کی نفسیات کے تعلق سے ان کا افسانہ ''میںنوں لے چلے بالا'' خاصا اہم ہے کہ عورت خراب سے خراب حالات میں بھی زندگی گزارنے کا حوصلہ رکھتی ہے۔

منفرد افسانہ نگار اور ناقد ممتاز شیریں کو اس پس منظر اور روایت سے الگ کرکے نہیں دیکھا جاسکتا ان کا پہلا افسانہ ''انگڑائی'' رسالہ ساقی میں ۱۹۴۲ء میں شائع ہوا یہ افسانہ معاشرے کی اس نفسیاتی و جنسی گھٹن کو پیش کرتا ہے جہاں مرد ایک شجر ممنوعہ ہے۔ممتاز شیریں فرانسیسی اور انگریزی ادب وتنقید اور ہم عصر عالمی مصنفین کی تحریروں سے شناسا خاتون تھیں۔انگڑائی کا موضوع

ایک ''نفسیاتی بیماری''، ہم جنسی Lesbianism ہے ممتاز شیریں کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''اپنی نگریا'' کے عنوان سے شائع ہوا مگر ''میگھ ملہار'' تک آتے آتے ان کے فن نے پختگی اختیار کر لی۔ ممتاز شیریں کی تنقیدی صلاحیت نے انکے افسانوں کو سنوارا اور پختگی عطا کی۔

رشید جہاں، عصمت، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور اور ممتاز شیریں کے علاوہ جیلانی بانو اور قرۃ العین حیدر نے بھی 'نئی عورت' کی تلاش کی، جیلانی بانو نئی عورت کو تعلیم یافتہ اور خود کفیل دیکھنا چاہتی ہیں، قرۃ العین حیدر نے ۱۹۴۶ء سے پہلے لکھنا شروع کیا ان کے افسانوی مجموعے 'ستاروں سے آگے' میں شامل کہانی 'یہ باتیں' رسالہ ہمایوں میں ۱۹۴۴ء کے شمارے میں شائع ہوئی۔ قرۃ العین حیدر کے افسانوں کی عورت جذباتی اور ذہنی طور پر طاقت ور ہے، جو مرد اور امرد کی دنیا، دونوں کے ساتھ بلا جھجھک قدم بڑھا رہی ہے بقول جیلانی بانو۔

> ''قرۃ العین حیدر نے افسانے کو عورت کے ایسے کردار دیے جو دنیا کی تہذیب کو اور ان کی تبدیلیوں کو سمجھتی ہے۔ وہ باشعور، صاحب رائے اور عالمی ادب اور تاریخ پر نظر رکھتی ہے۔ ایسی عورت جو ایک طرف زندگی کی تیز رفتاری میں شریک ہے اور دوسری طرف اپنی ذات کے دکھ اور خاندان اور معاشرے کے دباؤ کو بھی سہتی ہے۔ ان کے افسانوں خصوصاً ''ہاؤسنگ سوسائٹی''، ''سیتا ہرن'' اگلے جنم موہے بٹیا نہ کیجیو'' میں ہمیں زندگی کے اثرات کھوجتی ہوئی ہندوستانی عورت کے مختلف کردار ملتے ہیں۔''

تقسیم اور ہجرت کے موضوع پر لکھے گئے افسانوں میں جمیلہ ہاشمی کے آتش رفتہ اور ''بن باس'' خصوصاً قابل ذکر ہیں۔ عورت کی روحانی تنہائیوں کو ان افسانوں میں جس طرح موضوع بنایا گیا وہ کسی عورت افسانہ نگار کے لیے ہی ممکن تھا۔

۱۹۴۷ء سے قبل لکھنے والی ان افسانہ نگار خواتین کے مختصر جائزے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ خواتین افسانہ نگار پہلی ہی منزل سے مرد حضرات کے ساتھ ساتھ اصلاحی، رومانی، حقیقت پسند مختلف نقطۂ نظر سے لکھتی آ رہی ہیں، بدلتے حالات اور زمانے کے ساتھ ان کی فکر، احساسات و جذبات میں تبدیلی آئی ہے، آہستہ آہستہ گھر کی چار دیواری سے نکل کر ایک ذہین، تعلیم یافتہ، باشعور عورت ان کی کہانیوں کا موضوع بنتی ہے لیکن اس کڑی جدوجہد کے باوجود

خواتین آج بھی فرسودہ سماجی قدروں کا شکار ہیں، مرد قلم کاروں کی بھیڑ میں ان کے علمی و ادبی کارناموں کو اوسط درجہ کا تمغہ دے کر نظر انداز کر دیا جاتا ہے، جس کا اعتراف عہد حاضر کے مرد ناقدین نے بھی کیا ہے شمس الرحمٰن فاروقی نے ایک فنکار عورت کی اہمیت و معنویت کو تسلیم کرتے ہوئے تانیثی تنقید کے حوالے سے لکھا ہے۔

> ''تانیثی تنقید کے کئی مدارج یا مراتب ہیں مثلاً اول اور سب سے زیادہ مبدیانہ مرتبہ تو یہ ہے کہ عورتوں کے بنائے ہوئے متون کا مطالعہ اس طرح کیا جائے کہ ان کو وہ اہمیت مل سکے جس کے وہ مستحق ہیں اور جو انھیں اب تک نہیں مل سکی تھی۔ مثلاً شروع شروع کی عورت ناول نگاروں/افسانہ نگاروں نذر سجاد حیدر، راحت آرا بیگم، بیگم ریاض، حسن صغرا ہمایوں مرزا وغیرہ کا مطالعہ کر کے انھیں اردو فکشن کی تاریخ میں بنیادی مقام کا اہل ثابت کیا جائے۔ ایک صورت یہ بھی ہے کہ اگر کسی نسبت کم گم نام عورت مصنف (خواہ وہ ادبی مصنف ہو یا غیر ادبی مثلاً تاریخ نگار، فلسفہ داں وغیرہ) کا مطالعہ کر کے بتایا جائے کہ اس کے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا اور اسے وہ شہرت نہ دی گئی جس کی وہ مستحق تھی اور اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ عورت تھی۔ ایک صورت یہ بھی ہے کہ گمنام یا مشہور، اہم یا غیر اہم بہتر ہو کہ گم نام اور غیر اہم عورتوں کی غیر مطبوعہ نجی تحریریں روزنامچہ، خطوط، یادداشتیں، دریافت کر کے شائع کی جائیں اور ان کا مطالعہ اس نقطۂ نظر سے کیا جائے کہ ان کے ذریعہ اس زمانے کے حالات خاص کر عورت کے حالات، عورتوں کے معاملات کے بارے میں لوگوں کا رویہ وغیرہ دریافت ہو سکے۔''

شمس الرحمٰن فاروقی کی رائے سے اتفاق ممکن ہے حالانکہ مولوی نذیر احمد، راشد الخیری اور پریم چند نے اصلاح خواتین میں اہم رول ادا کیا مگر یہ حضرات عورت کے ذہن کے نہاں خانوں تک نہیں پہنچ سکے۔ عورت کی نفسیات کی نباضی سب سے پہلے خود عورت نے کی۔ عورت کے شعور، لاشعور اور تحت الشعور کی دریافت میں یہ مصلحین و مصنفین قاصر رہے۔ رشید جہاں اور

عصمت چغتائی نے خواب وخیال سے دور جا کر اصلاحی نقطۂ نظر کو نظر انداز کرتے ہوئے جس طرح عورت کی نفسیات کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا وہ یقیناً اردو افسانہ کی تاریخ میں ایک Turning Point (نیارخ) تھا جس کا آغاز انگارے میں شامل رشید جہاں کی کہانی اور ڈرامے سے ہوتا ہے، بظاہر یہ ایک عورت کی سماج کی مروجہ اقدار کے خلاف آواز ہے مگر یہ کوئی عام عورت نہیں بلکہ زندگی کے تلخ ترین حالات کا مشاہدہ کرنے والی عورت ہے جو کسی بات کو بغیر دلیل وثبوت کے تسلیم نہیں کرتی وہ ایک تعلیم یافتہ سمجھدار تجربے کار اور جہاندیدہ عورت ہے اسی لیے سماج سے بغاوت پر آمادہ ہے عورت کا یہ باغیانہ روپ ترقی پسند تحریک کی دین ہے اور اسی روپ نے مستقبل میں خدیجہ مستور، ہاجرہ مسرور، ممتاز شیریں، قرۃ العین حیدر کو وہ انفرادیت عطا کیا جس نے خواتین کے صرف کہانی کہنے کی روایت کو ختم کر کے اسے کہانی لکھنے والا بنا دیا۔ مگر اب قلب وجگر کو خون کر کے حاصل کی گئی اس نعمت کو سنبھالنے کے ساتھ اسے مستقل وسعت عطا کرنے کی ضرورت مزید خواتین قلم کاروں کی بے صبری سے منتظر ہے۔

☆☆☆

ہماری آواز کے خصوصی شمارے ''دبستانِ میرٹھ'' کے اجراء کے موقع پروفیسر اسلم جمشید پوری خطاب کرتے ہوئے۔ اسٹیج پر موجود ہیں پروفیسر وائی وملا، پروفیسر ارتضی کریم، پروفیسر ایم۔ کے گپتا اور پروفیسر فاروق بخشی

پروفیسر آمنہ تحسین

حیدرآباد

فاروق بخشی کی فکری جہتیں: عظمتِ نسواں کے حوالے سے

پروفیسر فاروق بخشی کی علمی و ادبی کارکردگیوں کے متعلق کچھ لکھنے کا خیال کیا تو سب سے پہلے ان کی شاعرانہ حیثیت سامنے آ گئی۔ چنانچہ میں نے ''اداس لمحوں کے موسم'' کی ورق گردانی کرنی شروع کی تو ایک شعر پر نظر رک گئی۔

مجھ سے میرا پتہ پوچھتا کون ہے
میرے اندر مجھے ڈھونڈتا کون ہے

مجھے یہ شعر حیرت میں ڈال گیا اور سوچنے پر مجبور کر گیا کہ کیا فاروق بخشی صاحب کی شخصیت میں کوئی اور انسان بھی بستا ہے؟ جو ان کی ظاہری شناخت سے کچھ الگ ہے۔ جسے وہ بڑی احتیاط کے ساتھ اپنے ساتھ لیے چل رہے ہیں اور جس کی تلاش کی خواہش موصوف کے اندر بیدار ہے۔

ایک مدّت سے ساتھ ہوں اپنے
اور میں خود کو جانتا بھی نہیں

جب کہ حقیقت یہ ہے کہ پروفیسر فاروق بخشی کی شخصیت اور علمی و ادبی فتوحات سے اردو دنیا اچھی طرح واقف ہے۔ وہ تدریس، تحقیق و تنقید کا طویل تجربہ رکھتے ہیں۔ ماہر استاد، ترقی پسند نقاد اور ممتاز شاعر کی حیثیت سے مقبول ہیں۔ ان کے شعری مجموعے ''پلکوں کے سائے''، ''اداس لمحوں کے موسم''، ''وہ چاند چہرہ سی ایک لڑکی'' اور تنقیدی مضامین کے مجموعے ''مفاہیم''، ''ساغر نظامی حیات اور کارنامے''، ''ماضی: ایک تجزیاتی مطالعہ''، ''معانی و مطالب''، ''تفہیم و ترسیل'' شائع ہوئے اور اکابرینِ اردو نے ان کتابوں کو داد و تحسین سے نوازا۔ باوجود اس شہرت و مقبولیت کے بخشی صاحب کی شخصیت کے اندر چھپے مختلف انسانی پہلو شاید کچھ الگ شناخت کے متقاضی نظر آتے ہیں۔

مجھے پروفیسر فاروق بخشی کو جاننے کا موقع 2017ء سے حاصل ہوا، جب ان کی آمد شعبہ اردو، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں ہوئی۔ شعبہ اردو سے وابستگی کے کچھ ہی عرصہ کے اندر مختلف علمی وادبی پروگراموں کے انعقاد، اپنے مہذب طرزِ عمل اور پرخلوص گفتگو کے ذریعہ انھوں نے نہ صرف شعبہ اردو بلکہ دیگر شعبہ جات کے افراد کو بھی اپنے حلقۂ احباب میں شامل کرلیا، بلکہ اپنے ساتھ شاگردوں اور ریسرچ اسکالرز کی بھی بڑی تعداد اکھٹا کرلی۔ حدتو یہ ہے کہ فاروق بخشی صاحب کی شخصیت اور علمیت کی یہ سحر کاری صرف مانو کے احاطہ تک محدود نہیں رہی بلکہ شہرِ حیدرآباد کے ادبی ماحول کو بھی اپنی لیاقت وشعری محاسن سے خوب متاثر کیا اور بہت جلد اپنے لیے ایک مخصوص جگہ بنالی۔ انجمن ترقی پسند مصنفین، تلنگانہ سے ان کی وابستگی یوں تو برسوں سے رہی لیکن جب تلنگانہ حلقہ کی ذمہ داری ان کو سونپی گئی تو انھوں نے نہایت خوش اسلوبی اور جانفشانی سے مختلف پروگرامس منعقد کیے اور اس تنظیم کو نہایت فعال بنادیا۔ کمال کی بات تو یہ ہے کہ اس پورے عرصہ میں اپنے حلقۂ احباب میں نہ جانے کتنی خواتین کو بھی شامل کرلیا۔ ان میں ایک میرا نام بھی شامل ہے۔

میں گرچہ شعبہ مطالعاتِ نسواں سے وابستہ ہوں، لیکن اردو کی طالب علم ہونے کے ناطے پروفیسر فاروق بخشی سے میرا علمی رشتہ بنتا چلا گیا۔ وقت کے ساتھ اس رشتہ میں ذہنی ہم آہنگی پیدا ہوئی اور استقامت بھی آتی گئی۔ اس کی بنیادی وجہ پروفیسر فاروق بخشی کی فکر کے وہ مخصوص زاویے رہے جس سے وہ عظمتِ نسواں کو دیکھنے کی کوشش کرتے اور پھر میری فکر اور عمل کے دائرے اس سے میل کھانے لگتے۔ ہماری گفتگو کا محور جب جب ''نسائی ادب'' رہا یا سماج میں عورت کے مقام ومرتبہ اور اس کی پسماندگی کی بابت اظہارِ خیال رہا انھوں نے نہایت سچّائی کے ساتھ ہمیشہ اپنی تشویش کا اظہار کیا۔ یہ صرف وقتی یا زبانی اظہار نہیں تھا بلکہ عملی طور پر بھی انھوں نے نسائی ادب کے حوالے سے کئی سمینار وتوسیعی خطبات کے انعقاد سے یہ ثابت کردیا کہ وہ ان کم ذہن افراد، استاد یا نقادوں میں شامل نہیں ہیں جو خواتین کی فکری وعملی حصّہ داریوں کو بالکل بھی قابلِ اعتناء نہیں سمجھتے اور اپنے ہی ''تشکیل کردہ نظریات'' کو معیار بناکر عورت کے وجود کو جانچنے پرکھنے کی سعی کرتے رہتے ہیں۔

عظمت انساں بالخصوص 'عظمتِ نسواں' کے حوالے سے جب جب فاروق بخشی ''قسم خدا کی میں سچ بول رہا ہوں'' کے ساتھ دلّی سے لے کر میرٹھ اور پھرا ودے پور کی کہانیاں سناتے تو میں

ابتداء میں انھیں ''صحیح اور غلط'' کے پیمانے پر رکھ کر پرکھنے کی کوشش ضرور کرتی کہ ان خیالات و نظریات میں کس حد تک سچائی ہے؟ لیکن ان کہانیوں کے بیانیہ میں فاروق بخشی صاحب کے اندر چھپے ایسے انسان کی شبیہ واضح ہونے لگتی جو انسانیت کا شیدا اور ہر فرد کی خیر خواہی کا متمنّی ہے۔ جب یہ خدوخال واضح ہوئے تو محسوس ہوا کہ بخشی صاحب ''انسان پرست'' فرد ہیں جو انسان کو مذہب، ذات پات، طبقہ اور جنس وصنف کے خانوں میں بانٹ کر نہیں دیکھتے، بلکہ وہ تو انسان کے ہر روپ سے خلوص و پیار کا رشتہ استوار کرتے ہیں۔ ان کی تعظیم کرتے ہیں۔ ان کے رنج والم کو کچھ اس طرح سے اپنے درد وغم کے ساتھ ہم آہنگ کر لیتے ہیں کہ وہ سب ان کے ہی وجود کا حصہ بن جاتے ہیں اور ان کی فکر واحساس میں رچ بس جاتے ہیں۔ ان ساجھے احساسات کو بخشی صاحب الفاظ کے پیکر میں کس طرح ڈھالتے ہیں ملاحظہ کیجیے ۔

میں اب بھی لفظ لکھتا ہوں\
میں ان لفظوں میں جیتا اور مرتا ہوں\
میں ان لفظوں میں اپنا غم\
کچھ اس صورت سموتا ہوں\
کہ میرا غم بھی سب کو\
اپنا غم معلوم ہوتا ہے\
تمھیں فرصت ملے تو آ ؤ اور دیکھو\
مری سانسوں میں بسنے والا اک پل بھی\
تمہارے ذکر سے خالی نہیں ہوتا!

(نظم شکایت)

عصرِ حاضر میں فرد کے المیے، سماج کے عدم مساویانہ رویے، پامال ہوتے اقدار اور انسانیت سوز کہانیوں کے مختلف کرداروں پر گفتگو کے درمیان بیشتر اوقات بخشی صاحب ان کی اپنی زندگی سے وابستہ ایک اہم کردار ''شہناز'' کا ذکر ضرور کرتے۔ جب میں نے اس کردار کے متعلق تفصیلی سنا اور یہ جانا کہ ان کی بیگم شہناز برسوں سے حد درجہ علیل ہیں، جب کہ ان کی مکمل دیکھ ریکھ بخشی صاحب کی روزانہ کی ذمہ داریوں میں شامل ہوگئی ہے تو مجھے سخت حیرت ہوئی۔ وہ اس لیے کہ بخشی صاحب اپنی بیگم کا ذکر جس محبت اور عزت کے ساتھ کرتے وہ مجھے حیرت زدہ ضرور کرتا

اور میں اپنے ہی سوالات کے دائروں میں گردش کرنے لگ جاتی۔''عورت و مرد کے رشتہ کو لے کر سماج کے تشکیل کردہ صدیوں سے چلے آرہے جو'روایتی صنفی رول ماڈل'' ہیں ان کے مطابق آخر بخشی صاحب اپنا رول کیوں ادا نہیں کر پا رہے ہیں؟ کیا فی زمانہ ان کی شکلیں بدل رہی ہیں؟ کیا انھیں بخشی صاحب جیسے افراد بدلنے کا حوصلہ رکھتے ہیں؟ پھر خود کو یہ تیقن دینے کی کوشش کرتی کہ شاید ایسے ہی کشادہ قلب و ذہن چند افراد ہر دور میں رہے ہیں جو اپنے عمل سے صنفی تصورات و نظریات کو تبدیل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور''صنفی مساوات'' کی ایک نظیر قائم کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے بخشی صاحب نہ صرف بہت پیار سے اپنی بیگم کی تمام تر ذمہ داریوں کو نبھاتے ہیں بلکہ انھیں اپنی فکر اور احساس میں ہمیشہ تازہ دم رکھتے ہیں۔تب ہی تو وہ ساتھ نہ ہو کر بھی ان کی شاعری کا اور ان کی گفتگو کا ہمیشہ حصہ ہوا کرتی ہیں۔لکھتے ہیں:

یہ نظمیں غزلیں گیت مرے کس سمت اشارہ کرتے ہیں
تیرے ساتھ گزارے لمحوں کی تصویر اتارا کرتے ہیں

....

مہکتے لفظوں میں شامل ہے رنگ و بو کس کی
یہ میرے شعروں میں ہوتی ہے گفتگو کس کی

بالعموم ممتا، ایثار،قربانی ،صبر،محبت، شفقت، ہمدردی' جیسی خصوصیات کو نسوانیت کا لازم جز بنادیا گیا اور سماج نے اسی کے مطابق عورت سے عمل پیرا ہونے کی توقعات باندھ لیں نیز ان کی تکمیل کو عورت کے فرائض میں بھی شامل کردیا جب کہ بخشی صاحب نے سماج کی جانب سے دیئے گئے' مردانہ روایتی کردار' سے انحراف کیا اور یہ ثابت کردیا کہ جن خصوصیات کو عورت کے وجود سے جوڑ دیا گیا ہے وہ اگر مرد چاہے تو اپنی شخصیت میں بھی پیدا کرسکتا ہے۔اور عورت کو ایک بہترین 'ہم سفر' کا صحیح مفہوم سمجھا سکتا ہے۔دراصل کوئی انسان فکر و عمل کے اس اعلیٰ درجہ پر اس وقت ہی پہنچ سکتا ہے جب' پیار و محبت' اس کے لیے صرف ایک ہی رشتہ کے پیمانے میں قید ہونے والا جذبہ نہیں ہوتا بلکہ وہ بے غرض ہو کر لامحدود اور بیکراں ہو جاتا ہے۔اس کے دائرے میں کئی ایک رشتے سمٹ آتے ہیں اور ایک ہی وجود میں مجسم ہو جاتے ہیں۔بخشی صاحب کا کلام ایسی ہی عظیم محبت کا ترجمان محسوس ہوتا ہے۔

ہم دونوں میں پیار بہت ہے

اتنا جتنا!
ایک بہن کو بھائی سے اپنے
اِک عاشق کو معشوقہ سے
اِک بیٹی کو باپ سے اپنے
اِک ماں کو بیٹے سے اپنے
ہم دونوں میں پیار بہت ہے
ہم دونوں کے بیچ کا منظر بہت حسیں ہے
دل کو یقیں ہے
چاہت کے ہر رُوپ کو ہم بھرپور جئیں گے
ساتھ جئیں گے ساتھ مریں گے
ہم دونوں میں پیار بہت ہے

(نظم ''ہم دونوں میں پیار بہت ہے'')

اس حوالے سے ایک اور انوکھی مثال ملاحظہ کیجیے

وہ چاند چہرہ سی ایک لڑکی
محبتوں کی مثال جیسے
ذہین آنکھوں میں نور ایسا
ذہن میں شاعر کے جیسے آئے
حسیں غزل کا خیال کوئی
وہ چاند چہرہ سی ایک لڑکی
کسی جنم میں وہ ماں تھی مری
کسی جنم میں بہن بنی تھی
مگر وہ اب کے بنی ہے ہمدم
تمام رشتے نبھا رہی ہے
مجھے بھی جینا سکھا رہی ہے
وہ چاند چہرہ سی ایک لڑکی

فاروق بخشی صاحب کی تحریروں کا مطالعہ اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ ان کی نظر میں عورت ''جسم کا استعارہ'' نہیں ہے۔ بلکہ پیار ومحبت، عزت ووقار سے گندھا ایک ایسا وجود ہے جو اپنا تشخص رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فاروق بخشی کے کلام میں عورت کے متعلق پیکر تراشی نظر نہیں آتی بلکہ وہ اس کے جذبات واحساسات کی قدر کرتے اور اس کے تشخص کی حفاظت کرتے محسوس ہوتے ہیں۔ اس کی محبت اور اپنے جذبات کو رسوا نہیں کرتے بلکہ ہمیشہ اظہار کو تہذیب کے دائرے سے باہر آنے نہیں دیتے۔ ایسی چند مثالیں ملاحظہ کیجیے ؎

بچھڑ نا مجھ سے تو خوابوں میں سلسلہ رکھنا
دیارِ ذہن میں دل کا دِیا جلا رکھنا
پلٹ کے آئیں گے موسم تو تم کو لکّھوں گا
کتاب دِل کا ورق تم ذرا کُھلا رکھنا

بخشی صاحب اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ تہذیب وتمدن کے ارتقاء کے نام پر صدیوں کے دوران عورت کے وجود کو کس کس طرح سے مسمار کیا گیا۔ اس سے اس کی انسانی شناخت چھین لی گئی اور اس کی جنسی پہچان کی بنیاد پر اس کا ہر سطح پر استحصال ہوتا رہا۔ جیسا کہ وہ لکھتے ہیں:

''ایک ایسے معاشرے میں جہاں عورت کو صدیوں سے پیر کی جوتی سمجھ کر حقارت سے دیکھا جاتا رہا۔ اُسے ناقص العقل کہا گیا۔ بہت ہوا تو اس کے حسن کی بدولت ایک شے سمجھا جاتا رہا......گلوبلائزیشن' کے نام پر اس کے ساتھ جو مذاق ہورہا ہے اس کے حسن کا سہارا لے کر اسے پھر اسی بھنور میں پھنسایا جارہا ہے جو صدیوں سے مرد اساس معاشرہ کا شیوہ رہا ہے''

(پروفیسر فاروق بخشی: معانی ومطالب، ص:102)

بخشی صاحب کو اس بات کا بھی بھرپور احساس ہے کہ عورت کی سماج میں جو فرسودہ حالی اور ارزانی ہے، اس پر عورت کی جانب سے تخلیقی اظہار زیادہ موزوں ومناسب ہوتا ہے۔ وہ اس نکتہ کو صدیوں کے تہذیبی پس منظر میں عورت کی حیثیت کے حوالے سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جیسا کہ وہ رقم طراز ہیں:

''کہ ایک عورت ہی عورت کے جذبات، اس کے احساسات، اس کی

محرومیوں، نارسائیوں اوراس کی زندگی کی نفسیاتی پیچیدگیوں کو بہتر طور پر سمجھنے اوراس کے اظہار کے اسالیب تلاش کرسکتی ہے۔ میرے نزدیک بات کسی حد تک درست ہے کیونکہ ہزاروں سال سے یہ سماج جن اصولوں، قانونوں اور ریتوں کے سہارے آگے بڑھتا رہا ہے وہ سب مرد کے بنائے ہوئے ہیں۔ یہاں نظام نے عورت کے حقوق کی بات تو کی ہے مگر بالکل اس انداز میں کہ قفس بھی سلامت رہے اور صیاّد بھی خوش رہے''

(پروفیسر فاروق بخشی: معانی ومطالب، ص:94)

بخشی صاحب کی تحریروں کے مطالعے کے بعد یہ کہا جاسکتا ہے کہ سماج میں عورت کے وجود اوراس کے انسانی وقار کے متعلق وہ بڑا واضح تصوراور روشن خیال نظریہ رکھتے ہیں۔ حسبِ ضرورت ادبی متن کی قرأت اور تجزیہ میں اس نظریہ کا استعمال بھی کرتے ہیں اور بین السطور میں پوشیدہ حقائق کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ اس ضمن میں عصمت چغتائی کے افسانہ ''ننھی کی نانی'' کے تجزیے کی ایک مثال یہاں پیش کرنا کافی ہے۔ مذکورہ افسانے میں عصمت ''ننھی کی نانی'' کا تعارف یوں کرواتی ہیں:

''ننھی کی نانی کے ماں باپ کا نام تو اللہ جانے کیا تھا، لیکن لوگوں نے کبھی انھیں اس نام سے یاد نہیں کیا۔ جب چھوٹی سی گلیوں میں ناک سڑسڑاتی پھرتی تھیں تو بقاتن کی لونڈیا کے نام سے پکاری گئیں۔ پھر کچھ تو بشیرے کی بہو کہلائیں، پھر بسم اللہ کی ماں کے لقب سے یاد کی جانے لگیں اور جب بسم اللہ جاپے کے اندر ہی ننھی کو چھوڑ کر چل بسی وہ ''ننھی کی نانی'' کے نام سے آخری دم تک پہچانی گئیں۔''

(پروفیسر فاروق بخشی: تفہیم وترسیل، ص:۔۔۔)

مذکورہ بالا سطور میں عصمت چغتائی نے دراصل عورت کے مسخ شدہ وجود اوراس کی پہچان کے کرب کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ مرد اساس سماج میں عورت کا اپنا کوئی آزاد وجود نہیں ہوتا ، بلکہ وہ کسی نہ کسی رشتے کے حوالے سے ہی پہچانی جاتی رہی ہے اوران ہی رشتوں کی کسوٹی پر پرکھی بھی جاتی رہی ہے۔ اسی کرب کو عصمت نے بالواسطہ طریقے سے افسانہ کی چند سطور میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ تاہم قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ بخشی صاحب نے افسانہ کے تجزیہ میں اس

اہم نکتہ کو سمجھا، بلکہ عصمت کے ذہن کو بڑی خوبی سے پڑھ لیا اور اس کے بین السطور میں چھپے پیغام تک رسائی حاصل کر لی۔ ان سطور کا تجزیہ ملاحظہ کیجیے:

''یہ تعارف ننھی کی نانی کا نہیں ہے بلکہ صدیوں سے استحصال زدہ معاشرے میں اس عورت کا ہے جو اپنی پہچان کی جستجو میں بھٹک رہی ہیں.....آخر یہ سماج عورت کو ایک جاندار کب سمجھے گا۔ کب تک ننھی استحصال کا شکار ہوتی رہے گی اور کب تک نانی اپنی غربت کے بوجھ تلے دبی اوپر کا کام کرنے والی نسل کی آبیاری کرتی رہے گی۔''

(پروفیسر فاروق بخشی: تفہیم و ترسیل، ص: 91 تا 93)

درجہ بالا سطور کے حوالے سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ عورت کے وجود اور اس کی شناخت کے کرب تک بخشی صاحب کی رسائی یہ ظاہر کرتی ہے کہ وہ روایتی نقاد کی ذہنی سطح سے اوپر اٹھ کر ایک بالغ نظر و روشن خیال نقاد کی نگاہ سے ''نسائی ادب'' کو سمجھنے کی قابلیت رکھتے ہیں۔ تاہم انھوں نے اس جانب کم کم ہی توجہ دی ہے۔ باوجود اس کے کہ انھوں نے نسائی ادب پر بہت ہی کم لکھا ہے لیکن جو لکھا ہے وہ اس بات کی نشاندہی کر رہا ہے کہ تانیثی تنقید کے میدان میں بھی وہ نمایاں مقام بنا سکتے ہیں۔

پروفیسر فاروق بخشی کی شخصیت، ان کی شاعری و مضامین کے مطالعے و تجزیے سے یہ وضاحت ہو جاتی ہے کہ ان کی شخصیت پہلودار ہے۔ ان کی ظاہری شخصیت کے علاوہ ایک اور شخص بھی ان کے اندر بستا ہے، جو انسانیت کا پرستار ہے اور عظمتِ نسواں کا قائل ہے۔ جو عورت کے وجود کی تکمیلیت کو سمجھتا ہے۔ اس کی عزت اور وقار کو ٹھیس پہنچانے والے اسباب کو باشعور فرد کی طرح سمجھنا چاہتا ہے اور اپنے عمل سے یہ ثابت کرتا ہے کہ عورت صرف ایک جسم نہیں ہے۔ بلکہ وہ محبت کا ایک ایسا احساس ہے، جو بیکراں ہے اور احترام کے قابل ہے۔ عصرِ حاضر میں عورت کی ترقی، کامیابی اور اس کی خود مجازیت کا وہ کھلے ذہن سے استقبال کرتا ہے۔ ذیل کی سطور میں اس کی مثال ملاحظہ کیجیے:

''اب اس کی فکر محض اس کی ذات تک محدود نہیں ہے۔ نئے مسائل، ان مسائل کی گونج، کیریر کی فکر اور ایک روشن مستقبل کے لئے جدّ و جہد اس کے لئے اوّلیت کا درجہ رکھتے ہیں اور وہ میدان جو اب تک صرف مردوں کے لئے مخصوص تھے عورت نے وہاں بھی اپنی اہلیت کے سہارے اپنی

اہمیت کا سکّہ جمالیا ہے۔اب وہ ایک مکمّل انسانی وجود ہے اور اپنے وجود
کی نفی اسے کسی قیمت پر برداشت نہیں ہے۔بے جا تفریق اور امتیاز کے
جبر کے خلاف احتجاج اس کے مزاج کا حصّہ بن چکا ہے۔''

(پروفیسر فاروق بخشی:معانی ومطالب،ص:101)

الغرض جب یہ تاثرات قلم بند ہوئے تو صفحات پر بخشی صاحب کی شخصیت کا جو خاکہ نمودار ہوا ہے اس کو دیکھ کر میں ان کا شعر دہرانے لگی ہوں۔

مجھ سے میرا پتہ پوچھتا کون ہے
میرے اندر مجھے ڈھونڈتا کون ہے

پھر خود سے سوال کرنے لگی ہوں کہ کیا میں بخشی صاحب کے اندر چھپے اس شخص کو ڈھونڈ پائی؟ جس کی شناخت کے وہ متمنی تھے۔

شعبۂ اردو میں پروفیسر فاروق بخشی کا استقبال کرتے ہوئے محترم شاہد چودھری اور پروفیسر ارتضیٰ کریم ساتھ میں کھڑے ہیں پروفیسر اسلم جمشید پوری،صدر شعبۂ اردو اور یونیورسٹی کے سینئر پروفیسر مردل کمار گپتا۔

☆☆☆

سید ضیاء حسین
لاہور

ذوقی مظفرنگری، نواب ناظم میو کی نبیرۂ ذوق کے آئینے میں

حافظ محمود الحسن صدیقی ۱۵ جنوری ۱۹۲۱ء کو بھارت کے علاقے اُتر پردیش کے شہر مظفر نگر میں پیدا ہوئے۔ آپ مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے استاد شیخ محمد ابراہیم ذوق دہلوی کے پڑنواسے ہیں۔ اسی نسبت سے آپ نبیرہء ذوق کہلائے اور اسی حوالے سے انہوں نے قلمی نام ذوقی مظفرنگری اختیار کیا اور اسی نام سے شہرت پائی۔ ابتدائی تعلیم مظفر نگر میں ہی حاصل کی۔ تین سال کے قلیل عرصے میں قرانِ پاک حفظ کرنے کی سعادت حاصل کی۔ دارالعلوم دیو بند سے قرأت کی تعلیم حاصل کی۔ یہیں آپ نے مولانا حسین احمد مدنیؒ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ آپ کے والدِ گرامی محمد عمر صدیقی بھی حافظِ قران اور صاحبِ کرامت بزرگ تھے۔ تقریباً سات سال اسلامیہ ہائی سلول بٹھنڈہ میں تدریس کے فرائض ادا کئے۔ آپ نے ۱۹۴۶ء میں تحریکِ پاکستان میں حصہ لیا اور جیل کی ہوا بھی کھائی۔ آپ کچھ عرصہ انبالہ میں مسلم لیگ کے سالار بھی رہے۔ ۱۹۴۷ء میں ہجرت کر کے پاکستان آگئے اور لاہور شہر کے محلّہ تیزاب احاطہ میں رہائش اختیار کی۔ یہیں دومنزلہ مکان میں اپنی بقیہ زندگی گزار دی۔ پاکستان میں بھی درس و تدریس کے شعبے سے وابستہ رہے۔ آپ ۷ امئی ۲۰۱۳ء کو اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

پاکستان میں آپ کی زندگی علم و ادب کی خدمت میں گزری۔ نظم و نثر کی آپ کی دس کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں نعتوں کے دو مجموعے، غزلوں کے چار مجموعے، نظموں کے دو مجموعے اور دو نثری کتب (تسنیمِ فصاحت والعروض اور ادبی سفر نامہ) شامل ہیں۔ ایک نعتیہ مجموعہ غیر مطبوعہ شکل میں موجود ہے۔ ان کا نعتیہ مجموعہ نجمِ سحر ۱۹۸۰ء میں سیرت النبی ایوارڈ حاصل کر چکا ہے۔ زندگی کے آخری ستائیس سال آپ بینائی سے محروم رہے مگر آپ نے اس کمی کو اپنی معذوری

نہیں بننے دیا اور ادب کی خدمت میں اسی طرح مصروفِ عمل رہے۔ آپ مزدور شاعر احسان دانش کے شاگردِ خاص تھے۔ آگے خود ذوقی صاحب کے درجنوں کے حساب سے شاگرد تھے جن میں سے کئی اب خود استاد کے مرتبے پر فائز ہیں۔ اس طرح یہ فیض کا سلسلہ جاری وساری ہے۔ آپ کے ایک شاگرد جناب اکرم سحر فارانی نے جنہیں ذوقی صاحب نے اپنا جانشین مقرر فرمایا تھا، ذوقی صاحب کے چھیاسٹھ شاگردوں کی فہرست تیار کر رکھی ہے۔ جن میں سے چند ایک کو تو میں ذاتی طور پر بھی جانتا ہوں۔ ان میں فارانی صاحب کے علاوہ محمد ممتاز راشد لاہوری، بشیر رحمانی، نوید مرزا اور نواب ناظم میو شامل ہیں۔

آج کل کے اس مادی دور میں استادی شاگردی کا تعلق بہت کمزور پڑ چکا ہے۔ اکثر شاگرد جیسے ہی اپنے پاؤں پر کھڑے ہوتے ہیں، اپنے استاد کے احسانات بھول جاتے ہیں۔ کتنا خوش قسمت ہے وہ استاد جس کے شاگرد اسے اس کے اس دنیا سے اُٹھ جانے کے بعد بھی یاد رکھیں اور کتنے وفا شعار اور لائق تحسین ہیں وہ شاگرد جو اپنے مرحوم استاد کے نام کو زندہ رکھنے کے لئے اپنا قیمتی وقت اور سرمایہ خرچ کریں۔ گزشتہ دنوں ذوقی مظفر نگری کے ایک شاگرد نواب ناظم میو کی تحریر اور مرتب کردہ کتاب 'نبیرہ ءِ ذوق' کی تقریبِ رونمائی شانِ شایان طریقے سے ان کے ایک اور شاگرد محمد ممتاز راشد لاہوری کی جانب سے پیلاک لاہور میں منعقد کی گئی جس میں ذوقی صاحب کے چند اور شاگردوں اور ان کو جاننے والوں نے اس کتاب پر اور ذوقی صاحب کی شخصیت اور شاعری کے حوالے سے اظہارِ خیال کیا۔ گویا ان کے شاگردوں نے شاگردی کا حق ادا کر دیا۔ یہیں یہ کتاب مجھے بھی ملی جس کا مطالعہ کرنے سے ذوقی صاحب کے زندگی کے مختلف پہلوؤں سے آشنائی ہوئی اور بحثیت استاد، شاعر، ماہرِ عروض اور نثر نگار ان کے بارے میں جاننے میں مدد ملی۔

نبیرۂ ذوق کے مصنف ومولف نواب ناظم پاکستان کے سرحدی گاؤں واہگہ کے رہائشی ہیں۔ ان کا تعلق بھی درس وتدریس کے شعبے سے ہے۔ انہوں نے صحافت اور اشاعت کے شعبوں میں بھی قدم رکھا۔ آج کل روزنامہ سسٹم اور بارڈر لائن کے چیف ایڈیٹر ہیں۔ اچھے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے انسان بھی ہیں۔ نبیرہ ءِ ذوق ان کے اپنے ادارے سسٹم پبلیکیشنز نے بڑے اہتمام سے شائع کی ہے۔ دوسو آٹھ صفحات کی اس کتاب کا انتساب نواب صاحب نے دو نامور شعراء اسلم کولسری اور شہزاد احمد کے نام کیا ہے۔ کتاب کو اٹھاون مختصر ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اکثر ابواب دو یا تین صفحات پر مشتمل ہیں۔ شروع کے چند ابواب میں ذوقی صاحب کی زندگی

یا شاعری کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ کچھ ابواب ناظم صاحب کے اپنے تحریر کردہ ہیں اور کچھ ذوقی صاحب کے شاگردوں یا ان کے ہم عصر دوستوں نے لکھے ہیں۔ پھر کچھ ابواب معروف نقاد حضرات کی ذوقی صاحب کی شاعری پر دی گئی رائے پر مبنی ہیں۔ ان میں ذوقی صاحب کی مختلف کتابوں پر لکھے گئے پیش لفظ یا مقدمے بھی شامل ہیں۔ ایک ایک باب ان کی ہر ایک کتاب کے بارے میں تعارفی مضمون کے طور پر شامل ہے۔ آخری چند ابواب ذوقی صاحب کے منتخب کلام پر مبنی ہیں۔ گویا یہ کتاب ذوقی مظفرنگری کی شخصیت اور ان کے فن پر ایک مکمل دستاویز ہے۔ چونکہ اس کتاب میں کئی لکھنے والوں کے مضامین شامل ہیں، اسلئے بعض باتوں کی تکرار بھی ہوگئی ہے
ابتدائیہ میں نواب ناظم میوذوقی صاحب کے بارے میں فرماتے ہیں کہ استادِ محترم شعر کی نگری کے نمایاں انفرادی اور مثالی شخصیت تھے جبکہ وہ مستند قاری اور حافظِ قرآن بھی تھے۔ بس یوں سمجھیے کہ فردِ واحد بے مثال اوصاف اور خوبیوں کا مجسمہ تھا اور ان کی شخصیت ہمیشہ مرجع خلائق رہی لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ امر بھی کس قدر افسوس ناک ہے کہ۔۔۔۔۔ان کے منہ سے ان کی اولاد کی بے اعتنائی کا اکثر ذکر سنتے رہے۔ استادِ محترم کی طرف سے ہم پر یہ پابندی سختی سے لگائی گئی اور حکم دیا گیا کہ فلاں شاعر فلاں ادبی شخصیت کے متھے نہ لگنا۔ ایک اور مضمون میں نواب ناظم صاحب اپنے استاد کی غصیلی طبیعت کے بارے میں رقم طراز ہیں کہ بعض لوگ انہیں غصہ و دشنام بدکلام اور بگڑے لہجے کا شاہسوار قرار دیتے ہیں مگر اس دانشور کی اندر کی لطافت، نرمی اور محبت کو دیکھتا ہوں تو بے اختیار کہہ اٹھتا ہوں، 'میرے استادِ محترم کے لہجے پر نہ جایئے۔ ان کے کلام کی کرامات دیکھیے جس سے محبتوں کی ضیا پھوٹتی ہے'۔

جناب عابد کمالوی ایک جگہ لکھتے ہیں کہ ذوقی مرحوم نے اپنی شاعری میں کہیں کہیں اپنوں اور غیروں کے ناروا سلوک کا ذکر منفرد تشبیہوں اور استعارات کے ساتھ کیا ہے۔ ذوقی صاحب کے چند اشعار دیکھئے:

پے بہ پے کرتا ہے جو آدابِ فرزندی کا خوں ایسے نافرمان کو لختِ جگر کیسے کہوں
شفقتوں کی چھاؤں سے جلتی ہے ان کی خودسری نفرتوں کی دھوپ کو نورِ نظر کیسے کہوں
ضعیفی میں یوں میرے بیٹے الگ ہیں جدا جیسے پتے ہوں سوکھے شجر سے
کوئی دے گیا غم کوئی درد ذوقی رفیقوں نے دی ہے دغا کیسے کیسے
میں نے جس جس کو پلایا ہے رگِ جاں کا لہو کوئی نشتر کوئی خنجر کوئی پیکاں نکلا

اس آخری شعر کے حوالے سے نواب ناظم لکھتے ہیں، 'استادِ محترم اپنی زندگی میں اس شعر کی تشریح کرتے ہوئے کہتے تھے کہ میرے تین شاگرد ایسے ہیں جو میرا دماغ چاٹ گئے اور ان سے مجھے ماسوائے پریشانی کے کچھ نہ ملا'۔ ذوقی مظفر نگری کا ایک نعتیہ شعر دیکھئے:

چراغاں کیجئے فکر و عمل کے شہر میں ذوقی یہ سرکارِ دوعالم کی ولادت کا مہینہ ہے

ذوقی صاحب کا رجحان مذہب کی طرف تھا جبکہ شاعر جاوید قاسم کمیونزم کی طرف مائل تھے اور ان کی دوستی ذوقی صاحب کے شاگرد بشیر رحمانی صاحب کے ساتھ تھی۔ ذوقی صاحب بشیر رحمانی صاحب کے ہاں جاوید قاسم کی آمد کو خطرہء دین و ایمان قرار دیتے تھے۔ اس موضوع پر دونوں میں تُو تکار چلتی رہتی تھی۔ ذوقی صاحب علمِ نجوم اور انسانی نفسیات کے بھی ماہر تھے۔ اس سلسلے کی محافل میں مرد و زن کی خوب حاضری ہوتی تھی اور ان میں مردوں کی نسبت عورتوں کی تعداد زیادہ ہوتی تھی۔ ذوقی صاحب نے اپنی بیشتر کتب کے نام اپنے بچوں کے نام پر رکھے۔

علامہ ذوقی مظفر نگری کا آخری شاگرد ہونے کے دعویدار جناب فرزند علی شوق کا کہنا ہے کہ استاد کی طبیعت میں غصہ اور جذباتی پن ضرور تھا مگر اس کے باوجود شاعروں کو مشورہء سخن انتہائی ایمانداری سے دیتے تھے اور اصلاحِ سخن شاگرد کی ذہنی استعداد اور اپروچ کے مطابق دیتے ۱۹۸۶ء کے لگ بھگ استاد کی بینائی مکمل ختم ہوگئی تھی تاہم اس کے باوجود استاد کی یادداشت سلیقہ شعاری اور صفائی ستھرائی کے حوالے سے مجھے اکثر ایسے محسوس ہوتا تھا کہ جیسے استاد کی نظر ہم آنکھوں والوں سے زیادہ کام کرتی ہے اور ہم چشمِ بینا کے باوجود نابینا اور اندھے ہیں۔

علامہ ذوقی مظفر نگری کے شاگردِ خاص اور جانشین اکرم سحر فارانی صاحب اپنے طویل مضمون میں رقم طراز ہیں کہ ذوقی مظفر نگری اس ادبی قافلہ سالار کا نام ہے جس کا حسنِ رہنمائی رہروانِ ادب سے تھکن کا احساس چھین لیتا ہے اور منزلوں کا حسن خود قدم لینے کے لئے بیتاب نظر آتا ہے۔ ذوقی مظفر نگری کے تلامذہ کی فہرست پر نظر ڈالیں تو تصورات کے نہاں خانوں میں ماضی کے درخشاں افق کے ساتھ ساتھ عہدِ حاضر کے ادبی افلاک پر اتنے کواکب تاباں اور ضوفشاں نظر آتے ہیں کہ نظر ورطہء حیرت میں ڈوب جاتی ہے اور ناطقہ سر بہ گریباں ہوجاتا ہے کہ کسے یاد رکھیں کسے بھول جائیں۔

اب اس کتاب میں شامل چند معروف ناقدینِ فن کی آراء پر نظر ڈالتے ہیں۔ ڈاکٹر سید عبداللہ علامہ ذوقی کی غزلیات کے مجموعے تنویرِ فن کے دیباچے میں فرماتے ہیں: ذوقی نے

اساتذہ کا کلام پڑھا ہے۔ وہ غزل کی لے اور لہجے سے بخوبی آشنا ہیں۔ وہ اس ایمانی زبان پر بھی دسترس رکھتے ہیں جو غزل کے ایک شعر کو رودادِ چمن بنا دیتی ہے۔ غزل کے محبوب استعارے، محبوب کنائے، محبوب تلازمات اور محبوب مجازات ان کے یہاں موجود ہیں جن پر ان کی گرفت مضبوط ہے۔۔۔ میں نے جتنی مرتبہ یہ کلام پڑھا مجھے یہی محسوس ہوا کہ میں پختہ غزل کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ ذوقی کی غزل کی تاثیر میں ردیفوں کی موسیقی کا بھی بڑا حصہ ہے۔

ڈاکٹر منیر الدین چغتائی علامہ ذوقی کے شعری مجموعے خونِ انسانیت کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں: اِس (کتاب) میں شاعر نے نہایت موثر انداز میں مقامی اور بیرونی اخلاقی اور معاشرتی خرابیوں کی نشاندہی کی ہے اور بھارت، کشمیر، صومالیہ، چیچنیا میں مسلم کشی پر خون کے آنسو بہائے ہیں۔ اپنی کئی نظموں میں شاعر نے ملتِ اسلامیہ کے حالات کے صحیح رُخ کو سمجھنے اور اس کی بقا کے لئے تفکر و تدبر اور اتحاد کی راہ اختیار کرنے کا پیغام دیا ہے۔

ڈاکٹر وحید قریشی ذوقی صاحب کے شعری مجموعے توقیرِ ادب کے پیش لفظ میں یوں رقم طراز ہیں: ذوقی ایک ذود گو صاحبِ فن شاعر ہیں۔۔۔ان کے کلام میں قدیم و جدید کا حسین امتزاج نمایاں ہے۔ جدتِ افکار، شوکتِ الفاظ، حالات و ماحول کی تصویر کاری، چست بندشیں، التزام قوافی، بامعنی اور بولتی ہوئی ردیفیں ان کے کلام کی قابلِ تحسین خصوصیات ہیں۔ محاورہ بندی اور روزمرہ کا استعمال بھی سلیقے سے ہے۔

ڈاکٹر انور سدید ذوقی صاحب کے مجموعہء غزلیات ذوقیات کے پیش لفظ میں فرماتے ہیں کہ میں نے گزشتہ پچاس برس کے دوران ان کے شعری کمالات کا مطالعہ کیا اور ان سے گراں قدر استفادہ بھی کیا۔ میں انہیں خضرِ راہِ ادب تسلیم کرتا ہوں۔ ان کی شاعری کا مطالعہ نئے دروازے ہی نہیں کھولتا بلکہ یہ مطالعہ ان دروازوں سے آگے نئے راستوں پر چلنے کی دعوت بھی دیتا ہے۔

خود ذوقی صاحب اپنے مجموعہ غزلیات کے پیش لفظ میں گزارشاتِ شاعر کے عنوان کے تحت لکھتے ہوئے اپنے شعری فلسفے کی وضاحت کچھ یوں کرتے ہیں: کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ادب برائے ادب ضروری ہے۔ بعض مفکرین ادب برائے زندگی کو ترجیح دیتے ہیں۔ میں اپنا نظریۂ ادب، ادب برائے زندگی، زندگی برائے انسانیت رکھتا ہوں۔۔۔ میں خالص قدامت کے بھی خلاف ہوں اور مادر پدر آزاد، مہمل، غیر مربوط اور بے معنی جدت کو بھی ادبی ارتقاء کے لئے انحطاط کا باعث سمجھتا ہوں۔ عزیزوں کی کج ادائی اور دوستوں کی بے وفائی ہمیشہ فکرِ سخن کا باعث بنی رہی

ہے۔اس لئے میری تمام تخلیقات میں میرے ذاتی تجربات ومشاہدات،تنہائی،رنج وآلام،درد وغم نمایاں ہیں۔میں اس مضمون کا اختتام ذوقی مظفرنگری کے اپنے بارے میں کہے ہوئے اس شعر پر کرتا ہوں:

اہل فن کہتے ہیں ذوقیؔ مجھ کو استادِ سخن
مجھ سے پوچھو تو ابھی ناقص ہوں میں کامل نہیں

(بشکریہ:تنویر گوہر،مظفرنگر)

شعبۂ اردو اور بین الاقوامی نوجوان اردو اسکالرز انجمن کے مشترکہ اہتمام میں منعقد ہونے والا ہفت واری ''ادب نما'' کے 100 ویں پروگرام میں بعنون ''سوشل میڈیا: افادیت اور نقصانات'' سے آن لائن جڑے اسکالرز۔ بائیں سے جرمنی سے محترم عارف نقوی، پروفیسر اسلم جمشید پوری، ممبئ سے اسلم پرویز، دہلی سے پروفیسر محمد کاظم، لکھنؤ سے پروفیسر ریشما پروین، پروفیسر جمال احمد صدیقی، سنبھل سے پروفیسر عابد حسین حیدری، ڈاکٹر ودیا ساگر، ڈاکٹر ریاض انور، کشمیر سے ڈاکٹر ریاض توحیدی، پروفیسر پرشانت کمار، ڈاکٹر آصف علی، ڈاکٹر شاداب علیم، ڈاکٹر ارشاد سیانوی ڈاکٹر الکا وششٹھ، سعید احمد سہارنپوری، محمد شمشاد اور سیدہ مریم الٰہی۔

ڈاکٹر کہکشاں لطیف

حیدر آباد

رقیہ جمال کے افسانچے

یہ حقیت ہے کہ فکشن میں ناولوں کے حوالے سے اڑیسہ کی بڑی مستحکم روایت رہی ہے یہاں کے دو ناول نگاروں کو گیان پیٹھ ایوارڈ سے نوازا جا چکا ہے۔ان میں گوپی ناتھ موہنتی کو امرتا را سونتا نا پر 1973 میں اور پرتی بھا رائے کو 2011 میں یا جنا سیری پر دیا گیا۔انعام یافتہ تخلیقات جہاں تخلیقی کاوشوں کی حوصلہ افزائی کرتی ہیں وہاں فن کار کے اندر زبان وادب کے لئے کارہائے نمایاں انجام دینے کی ترغیب دیتی ہیں۔یہ خوش آئید بات ہے کہ رقیہ جمال اڑیسہ میں اردو ادب کے فروغ میں فعال کردار ادا کر رہی ہیں نیز اردو میں اڑیہ سے اردو میں تراجم کو ان کے توسط سے تقویت مل رہی ہے۔جہاں تک ان کے افسانچوں کا تعلق ہے تو ان میں معاشرتی مسائل کی بھرپور تصویر پیش کی گئی ہے۔ان میں متوسط طبقے اور نچلے طبقے کی زندگی کا منظر نامہ دیکھا جا سکتا ہے۔ انہوں نے ان مسائل کی جانب قاری کو متوجہ کیا ہے تا کہ ان کے حل کا لائحہ عمل عوامی سطح پر تلاش کیا جا سکے۔

ان کے یہاں موضوعاتی گفتگو کی وسعت نظر آتی ہے۔جس طرح نئے لکھنے والوں کی زبان میں اردو کے الفاظ کی جگہ انگریزی کے الفاظ اور جملوں کو کوڈ switching کی شکل میں دیکھا جا سکتا ہے۔مثال کے طور پر:

اچھا وہ!۔۔۔۔ایکچولی میں نا اینیمل لور ہوں۔۔۔مجھے جب بھی وقت ملتا ہے تو اپنے ڈاگی کا کھانا بڑے پیار سے بنا لیتی ہوں۔ (جھٹکا،ص۔53)

واضح رہے کہ جدید دور میں عالمی سطح پر جانوروں کو پالنے کا جو رجحان نظر آتا ہے اسے Pet's Culture سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔متعدد سیاست داں اور اربابِ دانش بھی کسی نہ کسی جانور سے اپنی قربت کا اظہار کرتے ہوئے دیکھے جا سکتے ہیں یہاں تک کہ گھر میں رہنے والی خواتین بھی کسی نہ کسی چھوٹے جانور کی طرف ملتفت معلوم ہوتی ہیں۔وہ جانور کم از کم سسرال

والوں سے زیادہ عزیز تر ہوتے ہی ہیں۔خواہ ان میں شوہر کے والدین ہی کیوں نہ شامل ہوں۔ کیا یہ رویے معاشرتی اقدار کے ٹوٹنے کی نشاندہی نہیں کرتے؟ دیگر تخلیق کاروں کے یہاں بھی یہ پہلو بآسانی دیکھا جا سکتا ہے مگر صد فیصد کسی بھی نظریے کا اطلاق نہیں کیا جا سکتا ہے تاہم زیادہ تر یہ نظریہ جا بجا نظر آتا ہے۔اس کے پہلو بہ پہلو استثنائی کیفیت بھی سماج میں دکھائی دیتی ہے کہ ایسی خواتین بھی ہیں جو تلخ رویوں کو برداشت کرتے ہوئے بھی اعلیٰ کردار اور اقدار کی امین نظر آتی ہیں مگر بعض اوقات ان کے ساتھ سماجی رویوں میں ان کے کردار کے برعکس آزمائش اور حالات کی ستم ظریفی بھی نمایاں طور پر دیکھی جا سکتی ہے۔اس پہلو کو قطعاً نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ان سب حقائق کے باوجود خواتین کا ایسا حسنِ اخلاق بھی نمودار ہوتا ہے کہ جس کی نظیر نہیں ملتی۔

پلیز فار گاڈ سیک ان بے زبانوں پر ظلم کرنا بند کیجئے۔(بے زبان،ص۔54)

ہیلو،کلاس کی سب سے ڈیسینٹ لڑکی! کیسی ہیں آپ؟

اچانک اس دن کلاس فیلو اسد نے اسے فون کر دیا۔(دھوپ چھاؤں،ص۔55)

''پاپا،پاپا! لیبراڈر، جرمن شیفرڈ، بل ڈاگ کا نام آپ نے کبھی سنا ہے؟ یہ ہیں کچھ فارین بریڈ کے کچھ ڈاگیز کے نام۔۔۔میں نے پوری طرح ریسرچ کر لی ہے۔۔۔ان میں سے ہم کسی بھی ایک نسل کے ڈاگی کو گھر لا سکتے ہیں۔''(نسل،ص۔58)

اس کے علاوہ ان کے افسانچوں میں انگریزی اور ہندی کے متعدد الفاظ اور جملے دیکھے جا سکتے ہیں جو Code Switching or Code Mixing کے زمرے میں آتے ہیں۔

ماشاءاللہ بہت مبارک نام ہے۔۔۔تمھیں کس نے یہ نام تجویز کیا؟ اس کا مطلب بھی معلوم ہے؟

مطلب تو گوگل نہیں کیا، پر اسلام کو سمجھنے کے لئے میں نے پریگنینسی میں کثرت سے پاکستانی ڈرامے دیکھے تھے، وہاں کی ٹوپ کی مسلم ہیروئن کا نام ہے۔(حرارت،ص۔64)

مشاطہ۔دراصل ان لوگوں کو ایسا رشتہ چاہئے جہاں لڑکے کی نہ ماں ہو نہ بہن۔(رشتے کی ڈور،ص۔66)

دانش علی کے روبرو دو دلدوز منظر تھے۔مگر بحیثیت انسان وہ پرندوں کے

غول کے سامنے شرم سار تھے۔(غول،ص۔38)

دوسرے دن رانی نے ان سے ہار واپس مانگا تو ان کا دماغ گھوم گیا کون سا ہار؟ تم جیسے چھوٹے لوگوں سے بھلا کیوں لوں ہار؟

(چھوٹے لوگ،ص۔35)

اسی طرح رقیہ جمال کے افسانچوں میں یہ خوبی بدرجہ اتم موجود ہے ۔اس کے علاوہ رقیہ جمال کے افسانوں میں انسان کا نفسیاتی کرب،ٹوٹتی ہوئی قدریں،بکھرتا ہوا خاندانی نظام، جانوروں کی پرورش کو انسانوں کی ساتھ حسنِ سلوک سے زیادہ اہمیت دینا،طبقاتی انانیت اور موجودہ دور میں موبائل ٹیکنالوجی کے تباہ کُن اثرات،افراد میں احساسِ عدم تحفظ کی کیفیات کو جا بجا دیکھا جاسکتا ہے۔مثال کے طور پر:

اب جب بھی اسے جھلستی دھوپ کا احساس ہوتا وہ چھاؤں میں آکر بے سکون ہوجاتی۔(دھوپ چھاؤں،ص۔55)

وہ سوچ رہی تھیں : کاش کاش ہم بوڑھے ماں باپ کو تم بچے بے زبان جانور ہی سمجھ لیتے۔(بے زبان،ص۔54)

و۔۔و۔۔وہ ایکچو لی پاپا۔۔۔میں نے ایک گے سے شادی کرلی ہے ۔۔۔ہمارا دیش اس کی اجازت نہیں دیتا ہے۔(پرورش،ص۔95)

ان افسانچوں میں چھوٹے لوگ،غول،داؤ پیچ،آئینہ،آزادی،خاندانی لوگ،احتساب بے زبان،نسل،پناہ گاہ،رشتے کی ڈور،،احساس،غیرت،خاموشی کا کرب،حد،حوالہ،بیٹا وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

ارے کیا طاہر بھائی !اسلامی ویڈیو بھیجتا ہوں ۔۔۔تم کیسے مسلمان ہو،جو تمہیں پسند نہیں آتے۔۔۔۔اچھا ٹھیک ہے اس بار ایک تڑپتی پھڑکتی ویڈیو بھیج رہا ہوں جاکر آرام سے دیکھو ۔۔۔ماں قسم لائک شیئر کئے بنا نہیں رہ پاؤ گے۔

میں نے ان کی آخری ویڈیو سمجھ کر اوپن کردیا۔پر اس نے تو ساری حدیں پار کردیں یہ کسی نوجوان کی لائیو خودکشی ویڈیو تھی۔(حد،ص۔103)

میرا بیٹا عمر اس وقت نویں کلاس کا طالب علم ہے۔پڑھنے میں بہت ذہین اور کافی سمجھ دار ہے ۔میں چاہتی تھی کہ ابھی سے وہ نماز کی پابندی

کرے، لیکن وہ نہیں کر رہا تھا۔ موبائل پر گیم کھیلنے کی بری عادت اسے تھی۔
(چھ نمازیں، ص۔36)
وہ سوشل میڈیا پر کوئین کے طور پر جانی جاتی تھی۔ اس کے ایک ایک ریل
کے بدلے ہزاروں لائیکس ملتے تھے۔ لوگ اس کو دل سے چاہتے تھے۔
(کوئین، ص۔119)

اس طرح سوشل میڈیا پر لائیکس ملنا اس کو معیارِ زندگی کی شناخت معلوم ہوتا تھا جو کہ آج کل ہر کس و ناکس کے یہاں دیکھا جا سکتا ہے۔

المختصر رقیہ جمال کے افسانچوں میں متعدد موضوعات سماجی حقائق کو نہایت فطری انداز میں پیش کرتے ہیں۔ گو بعض اوقات ان کے اسلوب سے اختلاف کیا جا سکتا ہے مگر اختراعی خصوصیات قاری کو اعتماد میں لے لیتی ہیں۔

اس سے پیشتر منٹو نے بھی سیاہ حاشیے کے عنوان سے مختصر افسانے لکھے تھے اور ان میں افسانچے کے اجزائے ترکیبی بخوبی دیکھے جا سکتے تھے مگر اس وقت یہ اصطلاح وجود پذیر نہیں ہوئی تھی اس لئے انہیں مختصر افسانوں کا نام ہی دیا گیا تھا۔ تبدیلیِ زمانہ انسان کو نئے نئے عوامل سے آشنا کرتا ہے چنانچہ ہر شے کا پس منظر یکسر بدل جاتا ہے اور زمینی حقائق فن کار کو نہ صرف نفسیاتی طور پر بلکہ اسلوبیاتی سطح پر ان زمانی مادی حقائق کی جانب توجہ دلاتے ہیں جو اس سے پیش تر واضح نہیں تھے۔ منٹو نے ہمیشہ ان نفسیاتی اور مادی حقائق کو ملحوظِ خاطر رکھا جن کا اظہار اس وقت معیوب سمجھا جاتا تھا مگر اب حالات بدل چکے ہیں۔ خود محمد حسن عسکری جو فرانسیسی ادب سے بہت زیادہ متاثر تھے اور کم و بیش منٹو کی طرح انسانی نفسیاتی تصورات کی پیش کش میں انفرادی حیثیت کے حامل ہیں سیاہ حاشیے کے دیباچے میں یہ خوبی جا بجا نظر آتی ہے۔ مندرجہ ذیل اقتباس ملاحظہ ہو:

چونکہ منٹو کے افسانے سچی ادبی تخلیقات ہیں اس لئے یہ افسانے ہمیں
اخلاقی طور پر چونکاتے ہیں، حالانکہ منٹو کا بنیادی مقصد یہ نہیں تھا، بلکہ
صرف تخلیق۔ غیر معمولی حالات میں اگر ہمیں کوئی چیز چونکا سکتی ہے تو غیر
معمولی حالات یا افعال نہیں، بلکہ بالکل معمولی یا روزمرہ کی سی باتیں.....
مزید رقم طراز ہیں کہ
غیر معمولی حالات میں غیر معمولی حرکتیں ہمیں یہ بتا سکتی ہیں کہ حالات

انسان کو حیوان کی سطح پر لے آتے ہیں ۔لیکن غیر معمولی حرکتیں معمولی
باتوں کی طرف توجہ ہمیں انسان کے متعلق ایک زیادہ گہری اور زیادہ
بنیادی بات بتاتی ہے ۔۔۔۔۔وہ یہ کہ انسان ہر وقت اور بیک وقت
انسان بھی ہوتا ہے اور حیوان بھی۔

(ص۔13، 14 دیباچہ سیاہ حاشیے از محمد حسن عسکری)

رقیہ جمال جیسی کیفیات جوگندر پال، سلام بن رزاق، بل راج مینرا و دیگر افسانہ نگاروں کے یہاں موجود ہیں۔ بلراج مین را کے بارے میں شمیم حنفی رقم طراز ہیں:

مین را کا ادراک شہری ہے۔وہ ہمیں جس فرد کی آپ بیتی سناتا ہے یا جس
کی ذاتی ڈائری کے ورق ہمارے سامنے لاتا ہے اس کے تمام تر تجربوں کا
کلیدی حوالہ شہری تمدن سے ہے۔پورٹ ان بیلیک اینڈ بلڈ، ساحل کی
ذلت ریپ، بس اسٹاپ، واردات، وہ شہر کی رات، غرض یہ کہ آپ ایک
کے بعد ایک ورق الٹتے جائیے، اس تصویر کا کوئی نہ کوئی رُخ سامنے آتا
جائے گا۔

(چھلاوہ، شمیم حنفی ، بحوالہ سرخ وسیاہ، ترتیب وتعارف سرور الہدیٰ، ص۔509)

رقیہ جمال کے افسانچوں میں دیہی اور شہری دونوں زندگیوں کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے ،انہیں افسانچوں سے موسوم کیا گیا ہے مگر موضوعات وہی ہیں جو جدید افسانوں میں نظر آتے ہیں۔

☆☆☆

ہندی تنظیم ''کتھارنگ'' غازی آباد میں ایوارڈ حاصل کرتے ہوئے پروفیسر جمشید پوری۔

پروفیسر ہما مسعود

میرٹھ

اردو شاعرات کی عصری حسّیت

مجموعی طور پر خواتین کی شاعری معاشرے کے تمام سماجی، اقتصادی، تہذیبی اور سیاسی پہلوؤں پر اثر انداز ہوئی ہے۔ اپنے جذبات و احساسات، خیالات اور نظریات کو فن کارانہ انداز سے پیش کرتے ہوئے انہوں نے بخوبی معاشرے پر جو اثرات مرتب کیے ہیں۔ خواتین شاعرات کی ایک اچھی خاصی تعداد شاعری میں قابل قدر اضافے کا باعث بنی ہے۔ ان کے ذریعے اٹھائی گئی ہر آواز ہمارے سماجی عمل میں نہ صرف اہمیت کی حامل ہے بلکہ ان تمام مسائل اور انسانی نفسیات کے اظہار کا ذریعہ بنی جو غیر انسانی رویوں، قوانین، رواجوں اور ظالم معاشرے کی دین ہے۔ ان شاعرات نے معاشرے کو ایک نئی سوچ، ایک نئی سمت اور انسانی رشتوں کو ایک نئی پہچان عطا کی۔ انہوں نے ان تمام امکانات پر خصوصی توجہ دی جس نے ان کے اندر خود اعتمادی کے جذبے کو پنپنے نہیں دیا۔ خود اظہاری کا موقع نہیں دیا۔ معاشرے میں ان کی شناخت، ان کی نفسیات اور ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو ابھرنے یا منفی رویوں کے خلاف احتجاج کرنے کا حوصلہ نہیں بڑھایا۔ لہٰذا وہ برابر سماجی نابرابری کا شکار ہوتی رہیں۔ خواتین پر ظلم و ستم اور جبر و استبداد کی روایت پرانی سہی مگر اس سمت توجہ بھی بہت تاخیر سے مبذول ہوئی۔ مردوں کی بالا دستی اور خواتین کی محکومی کے خلاف ابھرنے والی باغی آواز کی گونج جب باشعور انسانوں تک پہنچی تو ایک تہلکہ مچ گیا۔ ان کی صلاحیتیں نگاہوں میں کھٹکنے لگیں مگر خواتین شاعرات نے اپنا تخلیق سفر جاری رکھا۔ آج ادب کی تاریخ ان کے شعری و ادبی کارناموں کا ذکر کیے بغیر ادھوری ہے۔ اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے عوض وہ انعام یا ایوارڈ سے بھی محروم رکھی گئیں مگر ان کی تخلیقات سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں خود بینی کے ساتھ ساتھ جہاں بینی کا ایک نیا انداز اور طرزِ فکر موجود ہے۔ اپنے لب و لہجے سے انہوں نے اپنی منفرد شناخت بھی بنائی ہے۔ ان میں ادا جعفری، کشور ناہید، فہمیدہ ریاض،

پروین شاکر، بلقیس ظفیر الحسن، شہناز نبی، ساجدہ زیدی، زاہدہ زیدی، رفیعہ شبنم عابدی، شبنم عشائی، نسیم سید، سارا شگفتہ وغیرہ کے نام پیش پیش ہیں۔اس پس منظر میں اردو شاعری پر جب نظر ڈالتے ہیں تو شاعرات کے کلام میں نسوانی موضوعات، نسوانی تہذیب اور نسوانی لب و لہجے کے بے شمار رنگوں کے ساتھ ساتھ حیات و کائنات کے کئی پہلو سامنے آتے ہیں۔ان کا اپنا ایک وژن ہے۔ان کے اشعار پر اس دور کے معاشرے اور ادبی رجحانات کے اثرات کو بھی دیکھا جا سکتا ہے اور زندگی کے بارے میں ان کے اس وژن کا مطالعہ و مشاہدہ بھی بخوبی کیا جا سکتا ہے۔

ادا جعفری جدید نسائی شاعری کی صفِ اول کی معتبر شاعرات میں ادا جعفری کا شمار ہوتا ہے۔تخلیقی صلاحیتیں کٹھن راستوں کو عبور کرتی ہوئی غور و فکر کے نئے دریچے وا کرتی ہوئی جس مقام پر پہنچیں وہ قابل توجہ ہے۔ سماجی و تہذیبی زندگی کی بنتی بگڑتی قدریں ہمہ وقت بے چین رکھتیں۔''میں ساز ڈھونڈتی رہی'' میں اس کی پرچھائیاں نظر آتی ہیں۔ان کا دوسرا مجموعہ ''شہر درد'' ماضی و حال کے دائرے سے نکل کر مستقبل کی طرف گامزن ہونا چاہتا ہے۔

میری آغوش میں یہ ہمکتا ہوا چاند فردا کے خوابوں کی تعبیر ہے
یہ نئی نسل کے حوصلوں کا امین آنے والے زمانے کی تقدیر ہے

اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ادا جعفری وہ معتبر نام ہے جن کی رہبری اور پیش قدمی نے بعد میں آنے والی دوسری شاعرات، زہرا نگاہ، کشور ناہید، عرفانہ عزیز، فہمیدہ ریاض، پروین شاکر وغیرہ کو راہ دکھائی جنہوں نے اس روایت کو مضبوط کیا اور اس صنف کا اہم حصہ بنیں۔فرمان فتح پوری ان کی شاعری کے حوالے سے رقم طراز ہیں کہ ان کے موضوعات و محرکات کا حلقہ صرف خواتین تک محدود نہیں بلکہ انہوں نے ہر اس جذبہ اور مسئلہ پر خصوصی توجہ دی جس کا تعلق عام انسانی زندگی سے تھا۔بقول ان کے:

> ''اس سے انکار نہیں کہ ادا جعفری نے ایک خاتون کی حیثیت سے انسانیت کے بعض نفسیاتی کوائف اور جذبوں کی ترجمانی بھی کی ہے جو کسی مرد شاعر سے ممکن نہ تھا۔لیکن وہ اسی دائرے میں گھر کر نہیں رہ گئیں۔انہوں نے نسوانی فضا سے آگے بڑھ کر اور ذات کے حصار سے باہر نکل کر عام انسانی فضائے حیات اور مسائل کائنات کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے اور اس خوبصورتی و تواتر کے ساتھ کہ ان کا شمار عصر حاضر

کے نمائندہ ومعتبر شعراء میں کیا جاتا ہے۔''

[ادا جعفری:فن اور شخصیت،ص 87]

''شہر درد'' مجموعے کی اس نظم کے چند اشعار دیکھئے جس سے ان کی عصری حسیت اپنی تمام تر سچائی کے ساتھ نمایاں ہے ۔

کن تمناؤں دعاؤں کی سحر
آج جاگی ہے اُجالے کا سندیسہ لے کر
سترہ دن کی کہانی ہمدم!
صدیاں لمحوں میں گزر جاتی ہیں قوموں کے لیے
اور کبھی ایک ہی لمحے کا فسوں
بے کراں ہوتا ہے آفاق پہ چھا جاتا ہے
قوم کو رسم و رہ درد سکھا جاتا ہے
بے حسی موت ہے، انساں کو سکھا جاتا ہے
سترہ دن کی کہانی ہمدم!

میں ساز ڈھونڈتی رہی، شہر درد، غزالاں تم تو واقف ہو، سازِ سخن بہانہ ہے جیسے شعری مجموعوں کی خالق ادا جعفری کی شاعری میں سماجی بے انصافی اور بے حسی، سیاسی نوعیت کے ظلم وستم اور خواتین پر ہونے والے ظلم و جبر کے خلاف احتجاج اور مزاحمت کے جو رویے ملتے ہیں اس سے ان کی قدر و قیمت کا تعین بآسانی کیا جا سکتا ہے۔'' سانجھ سویرے'' نظم ملاحظہ ہو جس میں آنے والے زمانے کی پہچان اور جھلک بھی ہے تجربات میں وسعت بھی۔ شاعری ذاتی دکھ درد کی عکاسی ہی نہیں کی بلکہ ملک وقوم، آس پاس بسنے والے لوگ ان پر بیتے خوشیوں اور دکھوں کے لمحات کو انھوں نے شاعری میں اس طرح منعکس کر دیا کہ زندگی ہر روپ اور ہر زاویے سے اشعار میں زندہ ہو گئی ۔

بھیگی بھیگی پلکوں والی
جتنی آنکھیں ہیں میری ہیں
دکھ کی فصلیں کاٹنے والے
جتنے ہاتھ ہیں میرے ہیں
شاخ سے ٹوٹی کچی کلیاں

آگ میں جھلسے کومل مکھڑے
الجھی الجھی لٹ بھی میری
دھجی دھجی آنچل بھی
کل رات کی چادر اوڑھے
آج دن کا رستہ دیکھ رہی ہوں

ادا جعفری کے ان خیالات سے پتہ چلتا ہے کہ شاعری میں ان کی خاص ترجیحات کیا ہیں۔ وہ خواتین کی حیثیت اور حقیقت ہی نہیں کھولتیں بلکہ مستقبل میں ایک نمایاں تبدیلی کے امکانات بھی واضح کر دیتی ہیں۔ پُر یقیں، پُر امید اور اعتماد سے بھر پور لہجہ آنے والے وقت کی تصویر دکھا رہا ہے۔ بقول سحر انصاری:

''ادا جعفری کی شاعری میں یہی حوصلہ زندگی کا اثبات کرتا ہے اور کہیں بھی ان کی شاعری مریضانہ انداز بیان کا شکار نہیں ہونے پاتی۔ ان کی رجائیت فرضی اور برائے بیت نہیں ہے بلکہ اس کی قوت انہیں اپنے نظریاتی ایقان سے ملی ہے۔ وہ آبلہ پائی کی زنجیر لیے ہر نئے دشت سے گزرنے کا حوصلہ رکھتی ہیں اور جب یہ حوصلہ شاعری میں ڈھل جائے تو شاعر کی ذات تنہا نہیں رہتی وہ ایک آفاق گیریت اجتماعی کا حصہ بن جاتی ہے۔ ادا جعفری کی شاعری کا سفر بہت کامیاب ہے اور ان کے فنی ارتقاء کے سنگ میل ان کے شعری مجموعے ہیں جو اردو کی جدید شاعری میں اپنا اعتبار قائم کر چکے ہیں اور جن کے تذکرے کے بغیر ہم جدید اردو شاعری کی منفرد آوازوں کے ساتھ انصاف نہیں کر سکیں گے۔ ادا جعفری کہیں یکسانیت کا شکار نہیں ہوئیں۔ ان میں تازہ کاری کی ایک ایسی لگن ہے جو سچے فن کار کو ہمیشہ زندہ اور تازہ دم رکھتی ہے۔''

[ادا جعفری: فن اور شخصیت، ص 282]

پروین شاکر خوشبو، صد برگ، انکار، خود کلامی اور کف آئینہ جیسے شعری مجموعوں کی خالق، معمولی سے معمولی تجربوں کو انوکھے انداز میں بیان کر دینے والی، زبان و الفاظ کے در و بست پر قدرت رکھنے والی پروین شاکر عہد حاضر کی ان شاعرات میں سے ہیں جن کی فکری اور حسی گہرائی

ہر شعری مجموعے میں بڑھتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اپنی ذات اور اس معاشرے کی ناہمواریوں کو شائستہ لہجے میں جب بیان کرتی ہیں تو ایک دبے دبے باغیانہ لہجے کی گونج بھی سنائی دیتی ہے۔ مزاحمتی اور انحرافی رویہ کی جھلک کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ، نچلے پسماندہ متوسط طبقے کے انسانوں کی زندگی اور ان کے مسائل جس فنی بصیرت، گہرائی اور باشعور انداز میں پیش کرتی ہیں وہ ایک باعمل اور سرگرم عورت کے تجربات ومشاہدات کا آئینہ دار بن کر ان کی شاعری کا جز بن جاتا ہے۔ زندگی کے مختلف مراحل، معاشرتی ناہمواریوں کے ساتھ پس منظر میں آج کی عورت کی ذہنی کیفیات کا اظہار جب کرتی ہیں تو بعض حقیقتیں کس قدر حقیقی پیرائے میں اجاگر ہوتی ہیں۔ ان کی نظم ''ورکنگ وومین'' میں تعلیم یافتہ عورت کی طاقت ملاحظہ کیجئے ۔

کیسے غرور کی بات ہوئی ہے
میں اپنی ہریالی کو خود اپنے لہو سے
سینچ رہی ہوں
میرے سارے پتوں کی شادابی
میری اپنی نیک کمائی ہے
میرے ایک شگوفے پر بھی
کسی ہوا اور کسی بارش کا بال برابر قرض نہیں ہے
میں جب چاہوں کھل سکتی ہوں
میرا سارا روپ میری اپنی دریافت ہے
میں اب ہر موسم سے سر اونچا کر کے مل سکتی ہوں
ایک تناور پیڑ ہوں اب میں
اور اپنی زرخیز نمو کے سارے امکانات کو بھی پہچان رہی ہوں
لیکن میرے اندر کی
یہ بہت پرانی بیل
کبھی کبھی جب تیز ہوا ہو
کسی مضبوط شجر کے تن سے لپٹنا چاہتی ہے:

وہیں ''بشیرے کی گھر والی'' نظم پسماندہ طبقے سے تعلق رکھنے والی ایک عورت کی ذات

بھی ایک حوالہ بننے کی صلاحیت رکھتی ہے جسے انہوں نے بطور علامت استعمال کر کے ایک عورت کے احساسات نہ صرف پیش کیے ہیں بلکہ اپنا احتجاج بھی ظاہر کیا ہے۔

ہے رے تری کیا اوقات!
دودھ پلانے والے جانوروں میں
اے سب سے کم اوقات
پرش کی پسلی سے تیرا جنم ہوا
اور ہمیشہ پیروں میں تو پہنی گئی
جب ماں جایا پھلواری میں تتلی ہوتا
تیرے پھول سے ہاتھوں میں
تیرے قد سے بڑی جھاڑو ہوتی
سمے کے ہاتھوں ہوتا رہے گا
کب تک یہ اپمان
ایک نوالہ روٹی
ایک کٹورے پانی کی خاطر
دیتی رہے گی کب تک بلیدان

نظم کا محور عورت کی ذات ہے جو ہر مقام پر قربانی دینے کے لیے تیار رہتی ہے مگر اس کا دامن دکھوں اور کانٹوں سے ہی بھرا رہتا ہے۔ ہر لمحہ اس کے ساتھ حق تلفی ہوتی ہے۔انہوں نے سماج کو حقیقت کا آئینہ دکھانے کی کوشش کی ہے۔ چھوٹی چھوٹی سطروں میں بڑی بڑی باتیں کہہ دینا آپ کی خاصیت ہے۔ آپ کی نظمیں باشعور اور مہذب سماج کو دعوتِ فکر بھی دیتی ہیں اور خود احتسابی کا موقع بھی فراہم کرتی ہیں۔

ڈاکٹر فرحت یاسمین پروین شاکر کی شاعری کے حوالے سے رقم طراز ہیں:

''پروین شاکر خواتین شاعرات میں اپنے منفرد لب و لہجے اور عورتوں کے نفسیاتی مسائل کو پیش کرنے کے باعث اردو شاعری میں ایک نئی جہت دیتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ان کے اسلوب کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ بے باک لہجہ استعمال کرتی ہیں اور انتہائی جرأت کے ساتھ جبر و تشدد کے

خلاف احتجاج کرتی ہیں۔ وہ ان عورتوں میں سے نہیں جو اپنے حقوق پر
شرم وحیا کے دبیز اور تہہ دار پردے ڈال دیں۔''

[پروین شاکر: فکروفن، ص 114]

پروین شاکر نے اپنی شاعری کے ذریعے دکھوں اور زندگی کے دیگر مرحلوں سے باہر نکلنے کا راستہ دکھایا۔ اس کو اپنی شخصیت کی پہچان عطا کی۔ آج وہ کسی کی ملکیت، جائیداد یا کنیز نہیں بلکہ اپنے اندر اعتماد و یقین کی روشنی رکھتی ہیں۔ اپنی منزل آپ تلاش کرنے کا حوصلہ رکھتی ہیں۔ وہ پُر امید ہیں کہ آج نہیں تو کل یقیناً حالات بدلیں گے۔ اپنی نظم ''ننھی سی امید میں کہتی ہیں۔

ہاں لمحوں کی تیز رفتاری نے مجھ کو بھی سمجھایا ہے
بھولے بھٹکے رستوں کے وہ سارے چراغ بجھا دیئے
جو نم ہوا سے لڑ کر روشنی رکھا کرتے تھے
کیا کوئی ننھی سی کرن میری ہوگی

کشور ناہید ہمارے عہد کی اہم شاعرہ، مضمون نگار، کالم نگار اور آزادیِ نسواں کی سرگرم کارکن کے طور پر اپنی واضح شناخت رکھتی ہیں۔ آپ کی شاعری کے متعدد مجموعوں، نثری تراجم نے ہمارے ادبی سرمائے میں اضافہ کیا۔

کشور ناہید کی شاعری کی اساس کیا ہے ان کی نظم ''مکافات'' سے واضح ہو جاتی ہے جس کا مرکز ومحور عورت رہی ہے۔

میں شاعری کرتی ہوں
کیونکہ میں نے خودکشی نہیں کی
میں زندگی کرتی ہوں
کیونکہ میں نے دلبری نہیں کی
میں نوکری کرتی ہوں
کیونکہ میں نے سرداری نہیں کی
میں آگے ہی آگے چلتے رہنا چاہتی ہوں
کیونکہ پیچھے مڑ ویرانی نقش پا دیکھنے کی ہمت نہیں ہے
میں ناگفتی کرتی ہوں

کیونکہ میں نے گفتی نہیں کی

کشور ناہید موضوعات کے انتخاب میں وسعتِ نظر اور تنوع سے کام لیتی ہیں، مظالم پر احتجاج کرتی ہیں۔ کبھی عورتوں کے حقوق اور اختیارات کے حصول کے لیے آوازیں بلند کرتی ہیں ، بندشوں میں جکڑی زندگی کا کرب بیان کرتی ہیں تو اپنے وجود کی اہمیت کو سمجھنے کی ترغیب بھی دیتی ہیں۔ ''منحنی عورت'' نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں جو انہوں نے (عاصمہ جہانگیر کے لیے جب اسے عالمی انعام ملا تھا) لکھی۔ انگوٹھا لگا کے اپنا حق دے دینے والی عورت کمزور نہیں، وہ انصاف کروانا بھی جانتی ہے اور لینا بھی، تعزیر سیاست کے پردے چاک کرتی ہے تو واعظوں اور فتویٰ فروشوں کو بے نقاب بھی کرتی ہے، بے رحم قاتلوں کو تلاش کر لیتی ہے۔ اس کی آواز کی بازگشت پورے عالم میں معتبر ٹھہرتی ہے۔

سلام اے منحنی عورت
تو نے اس ملک کے اندھیرے میں
قندیل روشن کی ہے
وفا کی، صلابت حق کی
ہمت کفر اور جذبۂ عوام کی
دنیا سوچتی تھی
کیا کبھی سورج مغرب سے نکلے گا
دنیا دیکھ لے سورج مغرب سے نکلا ہے
اے منحنی عورت ساری دنیا تجھے سلام کرتی ہے

کشور ناہید کی نظموں میں وہ کرب بھی ہے جو محرومیوں اور ناکامیوں کے بطن سے پھوٹتا ہے اور عزم و حوصلہ کے وہ سارے رنگ بھی ہیں جو عصری حسّیت سے عبارت ہیں۔ ''دعوتِ سخن'' نظم کے آخری اشعار ملاحظہ ہوں ؎

امن کا طشت لیے پھرتے ہو قریہ قریہ
کوئی آئے کہ محبت کے گلابوں کو بچائے
دونوں ملکوں کے جوانوں کو سکھائے
کہ یہ بارود، یہ نفرت کی ہزیمت ہی تو

تقدیر نہیں
آؤ بانہیں کھولے ہوئے آؤ
کہ محبت کو درِ خواب سے آزاد کریں
اور دکھائیں کہ یہ دنیا
محض بارود کی تحریر نہیں

کشور ناہید کی شاعری ان پہلوؤں سے آشنا کراتی ہے جہاں پہنچ کر عورت میں احتجاج کی ایک نئی آواز، نیا جذبہ ابھرتا ہے۔ڈاکٹر طاہرہ پروین کے خیال میں:

''کشور ناہید کی شاعری ان معنوں میں نئی ہے کہ اس میں عورت کے احتجاج، اس کی فکر، اس کی سوچ اور سب سے بڑھ کر اس کی انا جو کہ سب کچھ کرنے کے لیے مجبور کرتی ہے۔ایسی تمام باتیں کشور کے یہاں ملتی ہیں۔کشور ناہید بدلتے ہوئے سماج اور ایک نئی سوسائٹی کی پروردہ ہیں جنہوں نے عورت کے دکھ درد، اس کی ہمدردی اور اس کی فکری بلندی سب کو محسوس کیا اور ان کو آگے بڑھانے میں اپنا خاصا کردار نبھایا۔عورت کی یہ نئی آواز موجودہ سماجی نظام سے ٹکراتی ہے اور اس معاشرے کو بدلنا چاہتی ہے جس نے صدہا سال سے عورتوں پر ظلم کیے ہیں اور ان کو اپنا غلام ہی نہیں بنایا بلکہ ان کا جی بھر کر استحصال بھی کیا ہے۔''

[جدید شاعراتِ اردو نئی فکر اور نئے راستے، ص90]

کشور ناہید کی نظموں میں ایک نیا عزم و حوصلہ، نیا فکری احتجاج اور سادگی بھری معصومانہ صاف ستھری زندگی کے ساتھ جو محرومیوں اور ناکامیوں کے ساتھ ساتھ وہ تمام رنگ بھی ہیں جو عصری حسّیت سے عبارت ہیں۔مردوں کی بنائی ہوئی دنیا اور ان کے اصول، ظلم و جبر اور استحصال کے خلاف باغیانہ روش بھی اختیار کرتی ہیں اور اپنی دنیا آپ بنانے کا حوصلہ بھی رکھتی ہیں۔ان جذبوں کو کشور ناہید کن لفظوں میں ادا کر رہی ہیں۔دیکھیے ؎

اب تو فرخندہ جفا کار ہیں ہم
اب تو پڑھ لیتے ہیں سادہ ورق کی تحریر
اب نہیں کرتے وفا کی تقصیر

اب ہر اک شخص سے ملتے ہیں بدل کر شکلیں
اپنے قابو میں ہیں اب فتنۂ شب کی سوچیں
اب ہمیں خوف ہلاکت بھی نہیں
اب کوئی آئینہ معیار عدالت بھی نہیں

کبھی ''اے میری قوم میری بنتی سن'' میں ایک نئے انداز سے عورت کے جرأت مندانہ قدم اور مرد کی بنائی ہوئی سوسائٹی کی منہ بولتی تصویریں پیش کر کے آگہی فراہم کرتی نظر آتی ہیں ؂

انہیں عورت سے نفرت ہے
گویا انہیں اپنی ماں اور بیٹی سے نفرت ہے
وہ عورت کی ہر شکل میں شہوت دیکھتے ہیں
اور یوں اپنے خوابوں کو آراستہ کرتے ہیں
دنیا پہ کوئی مصیبت آجائے
وہ نہیں بولیں گے
سارے ملک کے سارے افسر
راشی، شرابی اور بدکردار ہو جائیں
وہ نہیں بولیں گے
ہر ہر قدم پر گلے کاٹے جائیں
لوگ خریدے اور بیچے جائیں وہ نہیں بولیں گے
ہاں کوئی عورت ہاتھ میں علم لے کے نکلے فوراً بولیں گے

کشور ناہید ہر ہر قدم پر، خود پر اعتماد، یقین پیدا کر کے آگے بڑھنے کا حوصلہ فراہم کرتی ہیں۔ ان کے نزدیک اپنے حق کے لیے آواز اٹھانا بہت ضروری ہے۔ ایک باشعور، باخبر اور حساس عورت ہی اپنے اختیارات کا صحیح استعمال کر سکتی ہے۔ بقول انور سدید:

> ''کشور ناہید کو اردو کی پہلی باغی عورت شمار کیا جاتا ہے۔ کشور کی بغاوت اس سماجی رویے کے خلاف ہے جس نے عورت کا منفعل کردار مرتب کیا ہے۔ وہ نسوانی دکھ کے اظہار کی منفرد شاعرہ ہیں ''گلیاں دھوپ

دروازے'' کی نظموں میں نرم روی بھی ہے اور احتجاج کی کرختگی بھی''

[اردو ادب کی مختصر تاریخ، ص523]

فہمیدہ ریاض ہمارے عہد کی وہ شاعرہ ہیں جو عورت کو ایک ''شے'' سمجھ کر ان کے ساتھ کی جانے والی ناانصافیوں کے خلاف احتجاج بلند کرتی ہیں۔ فہمیدہ ریاض اپنے خیال کا اظہار اس طرح فرماتی ہیں:

''جن لوگوں نے کبھی احتجاج کا نعرہ نہ لگایا ہو وہ
کبھی نہیں جان سکتے کہ یہ جگر خراش صدا کیسی
ہے...''

[جدید اردو شاعرات، ص65]

اس لیے اپنی شاعری کے ذریعے عورتوں کو اپنے وجود سے مکمل ادراک سے محروم رکھنے والے روایتی معاشرے کے دوغلے پن کی مخالفت کرتی ہیں۔ ان کے نزدیک ذہین اور باشعور عورت صرف جسم نہیں اس کا رشتہ زندگی کے رنگارنگ پہلوؤں سے مرتب ہے۔ وہ کہیں بیوی ہے تو کہیں محبوبہ اور کہیں صرف ماں بھی۔ ابر بہار، برف باری کی رات، پلاٹ اس قدر تر و تازہ وغیرہ نظمیں عورت کی زندگی کے تجربوں کی ایک دھنک رنگ مثال ہیں۔ اس سلسلے میں ان کی بہت سی نظمیں بطور مثال پیش کی جاسکتی ہیں۔ ''چار دیواری'' کی یہ سطریں ملاحظہ ہوں جو زندگی کے مختلف روپ اجاگر کر رہی ہیں۔

کہ اس زمین پر وجود میرا نہیں فقط اک نشان شہوت
حیات کی شاہ راہ پر جگمگا رہی ہے مری ذہانت
زمیں کے رخ پہ جو ہے پسینہ تو جھلملاتی ہے میری محنت
یہ چار دیواریاں یہ چادر سڑی گلی نعش کو مبارک
کھلی فضاؤں میں بادباں کھول کر بڑھے گا مرا سفینہ
میں آدم نو کی ہم سفر ہوں
کہ جس نے جیتی مری بھروسے بھری رفاقت

فہمیدہ اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ آج کا سماج، اس کے ریتی رواج، اس کے تقاضے ایک ایسا دائرہ ہیں جو ایک عورت کے چاروں طرف کھینچ دیا گیا ہے۔ انہوں نے ہر اس نکتے

کونشانہ بنایا جس سے انسانیت پامال ہورہی تھی۔ان مسائل پر قلم اٹھایا جوسماج میں نا قابل بحث ہوا کرتے تھے۔شاعر اورفن کار کا تعلق خواہ کسی زمانے سے ہو وہ اپنے عہد کے محرکات کو ہی اپنا موضوع بناتا ہے۔اسی کے تحت اسلوب بیان اختیار کرتا ہے۔ان کا ماننا ہے کہ ناسازگار حالات کی ان دیکھی زنجیروں کو عورت یقیناً توڑے گی اور اپنے وجود کی حقیقت کو منوا سکے گی۔''ایک لڑکی''نظم میں عورت کے تجربات کی سچائیوں اور اس کی قوت کا بے باکانہ اظہار اس کے شعور کی پختگی کا اعلان کرر ہا ہے جہاں مایوسی اور اداسی کی جگہ ایک ایسی کیفیت لے لیتی ہے جسے یقین ہے کہ وہ کبھی ہار نہیں مانے گی۔اس کا رشتہ زندگی کے رنگارنگ پہلوؤں سے قائم ہے ۔

تو ہے وہ زن زندہ
جس کا جسم شعلہ ہے
جس کی روح آہن ہے
جس کا نطق گویا ہے
بازوؤں میں قوت ہے
انگلیوں میں صناعی
ولولوں میں بے باکی
لذتوں کی شیدائی
عشق آشنا عورت
وصل آشنا عورت
مادر خداوندی
آدمی کی محبوبہ

فہمیدہ ریاض کی نظموں میں پیش کردہ موضوعات بہت نئے نہیں ہیں تاہم انہیں سماجی ردعمل کا نام دے کر نظرانداز بھی نہیں کیا جاسکتا۔سماج جن حالات سے گذرتا ہے اس کے اثرات اس عہد کے شعرا کے یہاں نمایاں طور پر پائے جاتے ہیں۔یہی اثرات فہمیدہ ریاض کی نظموں میں جگہ جگہ احتجاجی رویوں کی شکل میں نمودار ہوتے ہیں۔فرمان فتح پوری فہمیدہ ریاض کے اہم ترین موضوع سے جڑے مختلف پہلوؤں پر نظر ڈالتے ہوئے جو زندگی کے مختلف سیاسی وسماجی پہلوؤں کو اپنے دامن سے سمیٹے ہوئے ہیں، اپنے خیال کا اظہار اس طرح فرماتے ہیں:

''فہمیدہ ریاض نے نسوانی احساسات کو احتجاجی رویے سے پیش کیا۔ پتھر کی زبان، بدن دریدہ اور دھوپ میں انہوں نے مشرقی عورت کے مذاق کی کوک کو بدن دریدہ عورت کی آواز بنا دیا ہے۔ فہمیدہ ریاض آزادانہ اظہار کی شاعرہ ہیں۔ ان کے اکہرے الفاظ جذبے کو فاصلے سے سلگاتے ہیں۔''

[اردو ادب کی مختصر تاریخ،ص 524]

فہمیدہ ریاض کی شاعری ایک نئے زاویے کی جانب سفر کرتی نظر آتی ہے جس میں عورت اپنا ایک وجود رکھتی ہے خود کو ایک مکمل شخصیت کے طور پر پیش کرتی ہے۔ ان نظریوں کے خلاف احتجاج کرتی ہے جو صدیوں سے چلے آرہے ہیں ۔

سنگ دل رواجوں کے
خستہ حال زنداں میں!
ایک صدائے مستانہ!
ایک رقص رندانہ!
یہ عمارتِ کہنہ!
ٹوٹ بھی تو سکتی ہے
یہ اسیر شہزادی
چھوٹ بھی تو سکتی ہے

نسائی حسّیت کے لیے انہوں نے جو آواز بلند کی وہ ان کی تخلیقی تحریروں میں بخوبی نظر آتی ہے۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ ''پتھر کی زبان'' منظر عام پر آیا۔ اس کے بعد بدن دریدہ، دھوپ، کیا تم پورا چاند نہ دیکھو گے، حلقہ میری زنجیر کا، ہم رکاب، ادھورا آدمی، اپنا جرم ثابت ہے، کلیات میں مٹی کی مورت ہوں، آدمی کی زندگی ان کی دیگر تصانیف ہیں۔

ان مجموعوں میں تانیثی حسّیت ،نسائی کیفیات، سماجی مسائل، سیاسی ظلم و جبر کی آئینہ گری اہل نظر کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں۔

نسرین انجم بھٹی پنجابی شاعرہ ہیں لیکن اردو شاعری میں بھی اپنے دوٹوک اور احتجاجی اسلوب سے پہچانی جاتی ہیں۔ اس معاشرے میں عورت کتنی محروم اور کتنی مظلوم ہے اس کا اندازہ

لگایا جاسکتا ہے کہ اس کا استحصال کرتا یہ معاشرہ آج بھی سر اٹھائے کھڑا ہے۔ نسرین انجم نے اپنی ایک پہچان بنالی ہے۔ ان کی نظم ''آخر آخر'' اسی احساس کی ترجمان ہے۔

بہت سی عورتوں کی طرح
جاہل، خودغرض اور ایک سی بہت سی عورتوں کی طرح
سنگ میل، جامد مگر دہکتی ہوئی
ایک نظم بنتی ہے تو ساری دنیا سمٹتی جاتی ہے
سورج تو میرے بیٹے کا نام ہے اور چاند ابھی پیدا نہیں ہوا
ایک عورت نے کہا
عورت کا میکہ سب سے خوبصورت اور سب سے عزیز ہوتا ہے
ایک اور عورت نے کہا
مجھے پھولوں سے گوندھ کر اس کے لیے روٹی پکادو کہ پھر وہ
مجھے کبھی نہ بھول سکے
آنسوؤں کے ڈھیر میں سے مجھے اٹھالے، میں صرف ایک بوند ہوں
ایک عورت نے کہا اور کسی مرد نے نہیں سنا

یہاں عورت اپنے کئی روپ لیے سامنے آتی ہے۔ اسے یہ لگتا ہے کہ امید کی کوئی کرن ضرور پھوٹے گی حالانکہ وہ جانتی ہے پھر بھی ناامید نہیں۔

دعائیں گونگی بیٹیاں ہوتی ہیں جن کی زبان صرف ان کی مائیں سمجھتی ہیں
اور باپ
تو وہ چٹان ہوتے ہیں جہاں سے گر کر کوئی نہیں بچتا۔

رفیعہ شبنم عابدی کی نظمیں اپنے اندر وہ تمام سماجی اور عصری حسیّت رکھتی ہیں جن کی بنیاد پر ایک تہذیب عروج و زوال کا آئینہ دار بنتی ہے۔ قومیں بنتی اور بگڑتی ہیں اور مخصوص سماجی حالات سے گزر کر نئی تہذیب، نیا سماج وجود میں آتا ہے۔ خوں ریزی، جنگ و جدل، فرقہ پرستی، نسل پرستی، تشدد، ذات پات، بھید بھاؤ وغیرہ جیسے واقعات کے زیر اثر ان کی نظموں کا کینوس نہ صرف وسیع ہوا ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ اس صورت حال سے پیدا شدہ غم و غصہ ان کی نظموں میں موجود ہے جو ان کی شدت احساس کی ترجمانی مؤثر انداز میں کرتا ہے۔

رفیعہ شبنم عابدی کی نظم ''ناگفتنی'' کی سطریں ملاحظہ ہوں جن میں جنگ کے حالات اور خطرات کو بڑے واضح ڈھنگ سے پیش کیا ہے۔

کہوں کس سے؟
فضا بارود کی بو سے منغض ہے
تو بچے خوف سے
ماؤں کے سینے ڈھونڈتے کیوں ہے؟
کہوں کس سے؟
کہ ایک شب کی بیاہی دُلہنیں
مانگوں کی افشاں کیوں چھڑاتی ہیں؟
کہوں تو کیا کہوں؟
کس سے کہوں؟
کیوں کر کہوں آخر؟
فضا میں ہر طرف اک دھند ہے، کہرا لہو کا ہے
عجب اک شور بے آواز سناٹوں سے پیدا ہے

نظم نسائی حسّیت کے ساتھ عصری حالات سے پیدا شدہ کرب کو بخوبی ظاہر کر رہی ہے۔

''جو چپ رہے گی زبان خنجر'' جیسی نظموں میں عصری صداقتوں کو برہنہ کیا ہے۔ رفیعہ شبنم عابدی کی نظمیں سچائی کو پرت در پرت کھولتی جاتی ہیں۔ حادثات پر نظر بھی ہے اور حالات پر رائے زنی بھی۔ سرزمین بھاگل پور کے نام معنون یہ نظم فساد کے پس منظر میں ڈوب کر لکھی گئی جہاں سچائی دم توڑتے ہوئے بھی حادثوں کی امین بن گئی۔ نظم کا آخری حصہ ملاحظہ ہو۔

امیر شہر! کچھ بتا
امیر شہر! کچھ بتا
کہ اس کی میز پر چُنے ہوئے
تمام ذائقے لہو کے ہیں
کہ اس کی آستین میں سجے ہوئے
تمام رنگ ہی لہو کے ہیں

کہ اس کی آنکھ میں بسے ہوئے
تمام عکس ہی لہو کے ہیں
امیر شہر کیا کہے!!

تشدد خواہ کسی بھی قسم کا ہو۔ اس کی کوئی بھی صورت ہو، لیکن عورت کی ذات ہی سب سے زیادہ متاثر ہوتی ہے۔ رفیعہ شبنم عابدی نے اپنی تحریروں اور تخلیقات کے ذریعے روایتی عورت کو جدید عورت سے نہ صرف روشناس کرایا بلکہ اس نتیجے پر بھی پہنچا دیا کہ نئی دنیا، نیا سماج تشکیل دینے میں عورتیں سنگ میل کا درجہ رکھتی ہیں۔ رفیعہ شبنم عابدی کی نظم کے حوالے سے رقم طراز ہیں۔

آج بربریت نے
نفرت نے
سرزمین سورت نے
مرد کی شقاوت نے
آئینہ دکھایا ہے
نیند سے جگایا ہے

ڈاکٹر طاہرہ پروین رفیعہ شبنم عابدی کی نظم کے حوالے سے رقم طراز ہیں:

''اس طرح سے رفیعہ شبنم عابدی کی شاعری میں ایک نئی عورت جو نئے سماج اور نئی فکر کی تعمیر کرتی نظر آتی ہے۔ وہ سچائیوں کے ساتھ ساتھ زندگی کی حقیقتوں کو پیش کرنے کی بھی کوشش کرتی ہیں اور یہی کوشش آگے چل کر ہمارے اندر کے مشاہدۂ فن کو بھی ظاہر کرتی ہے۔''

[جدید شاعرات اردو نئی فکر اور نئے راستے، ص 58]

شاعری میں ان کا اپنا ایک جداگانہ لب ولہجہ ہے جو ان کے فکر وفن اور ان کے زاویۂ نظر کو ظاہر کرتا ہے۔ نظم ''خود فریبی'' میں ایک نئی سوچ اشاریت کا انداز اپنا کر ابھرتی ہے اور صدیوں سے عورتوں پر ہونے والے جبر کو احتجاجی آہنگ کے ساتھ پیش کرتی نظر آتی ہیں۔

تم آخر اسے کب تک
رسیوں سے جکڑ سکو گے یہ کھیل بہت ہو چکا
اب اسے آزاد کر دو

کیا تم نہیں جانتے کہ چناب کی لہریں
بندرابن کی گلیاں
کھجوراہوں کی ساری تصویریں
ایلورا جنتا کے غار
تاج محل
انارکلی
نور جہاں، رضیہ سلطانہ اور چاند بی بی کے مقبرے
سب ایک جل تھل دھرتی پر بنے ہیں
کسی صحرا میں نہیں

رفیعہ شبنم عابدی کی سوچ سماجی نظام سے ٹکرانے کا حوصلہ بھی فراہم کرتی ہے اور نئے راستوں کی تلاش کی طرف راغب بھی کرتی ہے۔

بلقیس ظفیر الحسن ہندوستان کی ایک ہمہ جہت شخصیت ہیں۔ان کو کئی کتابوں پر اردو اکادمیوں سے ایوارڈ مل چکے ہیں۔دیگر تصانیف کے علاوہ دو شعری مجموعے ''گیلا ایندھن'' اور'' شعلوں کے درمیان'' شائع ہو چکے ہیں۔عہد حاضر کی عورت، اس کے جذبات و احساسات، اس کے دکھ، سکھ، اس کی ذات کے نفسیاتی پیچ و خم، معاشرے کا جبر، اس کی بے چینی، سیاسی و سماجی حالات کی ناہمواریوں کو ہندوستان میں منظر عام پر لانے والی شاعرہ بلقیس ظفیر الحسن کا نام قابل ذکر ہے۔ان کا لہجہ پُرعزم، دوٹوک، بے باک اور مؤثر ہے۔ ہمارے عہد کے سماجی، سیاسی اور نفسیاتی مسائل پر ان کی پکڑ مضبوط ہے۔ایک منفرد اور پُر اعتماد انداز میں عورت کے مسائل،، فرسودہ رسم و رواج کے خلاف نہ صرف آواز بلند کرتی ہیں بلکہ ان کے بدلنے کا حوصلہ بھی رکھتی ہیں۔کشور ناہید کے نام لکھی گئی ان کی نظم فکری اور فنی بصیرت کا عمدہ ثبوت ہے۔ان کی یہ نظم ملاحظہ کیجئے۔

دشنام ملے یا انعام مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا
مجھے تو اپنے آزاد ہاتھوں سے اپنے پیروں کی بیڑیاں ہٹا کر
اس ملگجے اندھیرے کو اپنی پلکوں سے بٹور کر
کنارے لگانا ہے

دروازے تک جانا ہے
کہ ان بند پٹوں سے باہر ایک کھلی فضا
میرا انتظار کررہی ہے
جہاں میں کم از کم آزادی سے سانس لے سکوں گی
ہاں میں شہر میں داخل ہونے والی پہلی عورت ہوں
کہیں بھی پہنچنے کے لیے اٹھایا ہوا ''پہلا قدم''

ایک عورت کی فکر، اس کی سوچ سماج کو یا گھریلو زندگی کو بدلنے کا حوصلہ ہی نہیں رکھتی بلکہ اپنی دنیا آپ بنانے پر آمادہ ہے۔ یہ وہ قدم ہے جہاں سے عورت روایتی تصور اور اصولوں کو توڑ کر ایک نئے تصور کی طرف گامزن ہونا چاہتی ہے۔ اس کی تعمیری سوچ اگلا قدم اٹھانے کی کوشش کی طرف واضح اشارے کررہی ہے۔

کولکتہ سے تعلق رکھنے والی شاعرہ شہناز نبی کی نظموں نے عورت کی سماجی حیثیت کو ایک نئی جہت سے روشناس کرایا ۔

مجھے کمرے کی اس کالی کثافت سے ذرا باہر نکالو
دھوپ میں رکھو
ہوائے تازہ میں کھلنے دو
شبنم سے نہانے دو
میرے رگ رگ میں پنہاں کلوروفل کا سرمایہ
اسے ملنے دو سورج کی سنہری گرم کرنوں سے
نمو آسا ہونے دو مجھ کو اپنی مٹی سے
کہ میں زندہ رہوں گی تازہ کرنوں کے خزانے سے
ہواؤں سے
مجھے کمرے کی تاریکی سے باہر تو نکالو

عورت نکھرنے، سنورنے، ترقی پذیر ہونے کے مواقع چاہتی ہے۔ یہ احساس، یہ موضوع ایک زندہ حقیقت بن کر ابھرا ہے۔ ان کی نظموں میں سیاسی معاملات، تانیثی مسائل، انقلابی خیالات، تبدیلی کی خواہش، زمانے کے نامساعد ہونے کا تجربہ اور شکستگی کی جلوہ گری ملتی ہے ۔

مجھے مت اس طرح دیکھو
کہ جیسے کوئی دیمک سے اٹی لکڑی کو تکتا ہے
کسی سنسان کمرے کے درو دیوار پر لکھی ہوئی تنہائی
پڑھتا ہے
کھنڈر سے تارِ عنکبوت کا رشتہ سمجھنے کے لیے
خود سے الجھتا ہے
مجھے مت اس طرح روؤ
اچانک موت پر جس طرح روتے ہیں
عزیزوں کو
فلک پر ٹوٹے تاروں کو جیسے چاند روتا ہے
سمندر خالی سیپی کے لیے جیسے تڑپتا ہے
وہ رستے
جو کہ کترا کر نکل جاتے ہیں منزل سے
وہ صحرا جن کی وسعت پر گلستاں ناز کرتا ہے
وہ سپنے جو کہ شرمندہ نہ ہوں تعبیر کے
ہاتھوں
انہیں رویا نہیں کرتے

نظم ''تھوڑی سی مہلت'' میں کچھ کر گزرنے کی چاہ بھی ہے اور تبدیلی لانے کا حوصلہ بھی ہے

مجھے تھوڑی سی مہلت چاہئے
کہ میں وہ سب کر سکوں
جسے کرنے کی تمنا میں
اب بھی ایک حصہ انسان
مجھ میں زندہ ہے.....!

ابہام اور استعاروں سے سجی ان کی نظمیں ایک پیچیدہ ذہن اور باشعور ہستی کا پتہ دیتی ہیں۔ جدید اردو شاعرات میں شبنم عشائی نئی فکروں، نئی تمناؤں کے ہندوستانی عورت کے

جذبات واحساسات کی ترجمان بن کرابھری ہیں۔ان کے یہاں عورت سراپا عشق ہی نہیں بلکہ اپنی دنیا آپ پیدا کرنے کا ہنر جانتی ہے۔منزلوں پر پہنچنے کا فن جانتی ہے۔

تمہاری بے رحم سوچ کی سوئیاں
میرے وال کلاک میں دھڑک رہی ہیں
پر میں کمرے میں نہیں
من کی عبادت گاہ میں بیٹھی ہوں
اور اس عورت کی آہٹ
سن رہی ہوں
جو اپنے دکھ
خود بھوگ کے
ایک کائنات تخلیق کرتی ہے
وال کلاک سے باہر
سوچ کی سوئی بن کر
منزلوں کی گھڑی دھڑک رہی ہے

شبنم عشائی براہ راست اس سماج پر چوٹ کرتی نظر آتی ہیں اور اس رویے پر احتجاج کرتی ہیں جو لڑکیوں کی پیدائش پر ایک عام سماجی سوچ بن کر روایت کا حصہ بن گیا ہے۔

وہ جب پیدا ہوئی
اس کے کانوں میں
تابع داری کی آذان دلوا دی گئی تھی
جب سے اب تک
وہ تابع داری کرتی رہی!

شبنم عشائی اپنے تجربات کو سادہ اور سہل انداز میں پیش کرتی ہیں۔آپ نے تشبیہات کا برمحل استعمال سے کلام کو دلکشی عطا کی ہے۔اس معاشرے کے خلاف جہاں عورت کے اندر بیداری کی لہر پیدا کرنے کی کوشش کی وہیں مردوں کی بالادستی کے خلاف ایک احتجاج بھی ملتا ہے۔ ایک نظم پیش ہے جو ان کے دھیمے احتجاج کو ظاہر کر رہی ہے۔

میرے ناخن مت کاٹنا
مدافعت کے لیے
ایک ہتھیار ضروری ہے

سارا شگفتہ نثری نظموں میں معاشرے کی پرتیں بے رحمی اور تلخی سے کھولتی ہیں اور طنزیہ انداز میں عورت کی مظلومیت ظاہر کرتی نظر آتی ہیں۔ ''آنکھیں''، نظم ملاحظہ ہو۔

تجھے جب بھی کوئی دکھ دے
اس دکھ کا نام بیٹی رکھنا
تیرے گالوں پر آن نہیں، رو لینا
میرے خواب کے دکھ پہ سو لینا
میرا جنم تو ہے بیٹی
اور تیرا جنم تیری بیٹی
تجھے نہلانے کی خواہش میں
میری پوریں خون تھوکتی ہیں

اردو نثری نظم کی معتبر آواز سارہ شگفتہ نے سماج کی روایات کو بھی چیلنج کیا ہے اور بطور ایک خاتون کے بے باک انداز میں اپنے احساسات کو نمایاں کیا ''عورت''، نظم انہیں احساسات کی نمایاں مثال ہے۔

عزت کا سب سے چھوٹا اور سب سے بڑا حوالہ عورت ہے
گھر سے لے کر فٹ پاتھ تک کچھ بھی ہمارا نہیں
عزت ہمارے گزارے کی بات نہیں
عزت کے نیزے سے ہمیں داغا جاتا ہے
عزت کی کنی ہماری زبان سے شروع ہوتی ہے
کوئی رات ہمارا نمک چکھ لے
تو ایک زندگی ہمیں بے ذائقہ روٹی کہا جاتا ہے

سارا شگفتہ کی شاعری اور شخصیت کے حوالے سے امرتا پریتم لکھتی ہیں:

''وہ تو ضمیر سے جاگ چکی تھی پر۔ اس دنیا میں جس کے پاس بھی ضمیر ہے،

اس ضمیر کے کان ضرور ہوں گے اور وہ ہمیشہ اس کی آواز سن پائیں گے کہ
میں تلاوت کے لیے انسانی صحیفہ چاہتی ہوں..........میں نہیں جانتی یہ
انسانی صحیفہ کب لکھا جائے گا۔ پر یہ ضرور جانتی ہوں کہ اگر آج کا اِتیہاس
خاموش ہے تو آنے والے کل کا اِتہاس ضرور گواہی دے گا کہ انسانی صحیفہ
لکھنے کا الہام صرف سارا کو ہوا تھا......''

[امرتا پریتم، ص10]

غریب خاندانی پس منظر، کم عمری میں شادی اور پھر مزید شادیوں نے انہیں زندگی سے دور کر دیا۔ سارہ شگفتہ کو ذہنی اذیت میں مبتلا کرنے والے شوہروں نے انہیں دماغی مریض بنا دیا۔ موت نے ان کی شاعری کو ایک نئی جہت عطا کی۔ مرد اساس معاشرے کے غیر مساوی اور غیر انسانی رویہ جو ساؔرا کے لیے روا رکھے گئے اس کے خلاف انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعے احتجاج اور مزاحمت کا راستہ اختیار کیا۔

نسیم سید کی شاعری کا موضوع اس عہد کے تقاضے اور درپیش مسائل ہیں۔ ان کی شاعری معاشرے میں عورت کے احساسات و جذبات اور حوصلہ مندانہ اقدام کی عکاس ہے۔ اسے کن مسائل سے سابقہ پڑتا ہے انہیں مؤثر انداز میں قلم بند کرتی ہیں۔ ''آدھی گواہی'' اور ''سمندر راستہ دے گا'' ان کے تخلیقی مزاج کا آئینہ دار ہیں۔ عورت دوہرے جبر کا شکار ہے بحیثیت ایک فرد اور وہ بھی ناتواں ۔

کچے دھاگے میں یہی احساس ابھر کر سامنے آتا ہے

عورت اپنی ذات کو دانہ دانہ
ایک ہی ہستی کے دھاگے میں گوندھے
گوندھ کے سمجھے
اس کی ذات کی سب بکھری کڑیاں زنجیر ہوئیں
دھاگے کی بس ایک گرہ کے بل پر
اپنی ہستی کی تکمیل کے امکانات پرودے
کچے دھاگے
گرہ لگا دینے سے کب مضبوط ہوئے

جب چاہیں
جس طرح سے چاہیں
پھر سے اس تسبیح کو توڑے
ذات کو دانہ کر دیں

دوسری طرف ''میرے فن کار'' نظم جبر و نا توانی کے احساسات پس پشت ڈالتی، خود کو مضبوط بناتی نظر آتی ہے۔ ہمت اور حوصلے کے نقوش ثبت کرتی نظر آ رہی ہے۔ یہ نقوش ایک نئی تبدیلی، ایک بیداری اور ایک نئے عزم کا احساس دلا رہے ہیں۔

میرے فن کار!! مجھے خوب تراشا تو نے
آنکھ نیلم کی
بدن چاندی کا
یاقوت کے لب
یہ ترے
یہ ترے ذوقِ طلب کے بھی ہیں
معیار عجب

آگے نسیم ہمیں ایسے جہانوں سے متعارف کرانا چاہتی ہیں جس کا ادراک پہلے نہیں تھا۔ حوالے معتبر ہیں اور نئی روش کا پتہ دے رہے ہیں۔

میرے فن کار
ترے ذوق
ترے فن کا کمال
میرے پندار کی قیمت
نہ چکا پائے گا
تو نے بت یا تو تراشے
یا تراشے ہیں خدا
تو بھلا کیا مری تصویر بنا پائے گا
تیرے اوراق سے

یہ شکل مٹانی ہوگی
اپنی تصویر
مجھے آپ بنانی ہوگی

نسیم سید کی یہ نا قابل یقین کوشش اپنے اردگرد کے ماحول سے متعارف ہی نہیں کراتی بلکہ صنف نازک میں ایک تبدیلی کا احساس بھی فراہم کرتی ہے ۔

ہوش بھی، جرأت گفتار بھی، بینائی بھی
جرأت عشق بھی ہے، ضبط کی رعنائی بھی
جتنے جوہر ہیں نمو کے میری جاگیر میں ہیں
دیکھ یہ رنگ تازہ جو میری تصویر میں ہیں

نسیم سید کی شاعری اس معاشرے کے اجتماعی دکھ، معاشرے کی روایات اور صنف نازک کے گمبھیر مسائل کی ترجمان ہے تو دوسری طرف ظلم سے مقابلے کا عزم، احتجاج اور مزاحمت کی صورت میں جھلک رہا ہے۔

ان کی نظم ''آدھی گواہی'' ضیاء الحق کے عہد حکومت میں بنائے جانے والے ''قانون شہادت'' کی مخالفت میں لکھی گئی

عظیم منصف!!
ہماری قسمت کی ہر عدالت کا فیصلہ ہے
کہ ہم
جب اپنے بدن کی
بے حرمتی کی
فریاد لے کر جائیں
تو اپنا کوئی گواہ لائیں
''گواہ'' ایسی گھڑی کا
جب وحشتوں سے وحشت پناہ مانگے
''گواہ''
ایسے گناہ کا
جس کے تذکرے سے گناہ کانپے

ہماری ہی سب گواہیوں پر
یہ بے یقینی کی مہر کیوں ہے؟
سبھی صحیفوں میں یہ لکھا ہے
ترے ترازو کا
کوئی پلڑا جھکا نہیں ہے
تو کیا یہ سمجھیں......؟
ہمارا کوئی خدا نہیں ہے........؟

اپنی تصویر مجھے آپ بنانی ہوگی۔ظلم وستم کا نشانہ ہوتے ہوئے بھی شاعرہ جب اس موضوع پر بات کرتی ہے تو اس کے سامنے معاشرے کا تمام دکھ بھی شامل ہو جاتا ہے۔ امید کا دامن بھی ہاتھ سے نہیں چھوٹتا۔ وہ ہمیں ایسے معاشرے سے متعارف کراتی ہیں جو فرد پر باوقار زندگی کے تمام راستے بند کر کے نہ صرف ان کا استحصال کر رہے ہیں بلکہ انہیں فرسودہ عقیدوں اور سماجی روایات کی بھینٹ چڑھا رہے ہیں۔

اردو کے ادبی سرمائے کے اضافے میں خواتین کا بہت بڑا حصہ رہا ہے۔شاعرات نے اپنے زمانے کے نمایاں اثرات قبول کیے۔زندگی کو دیکھنے اور سمجھنے کے جو مواقع ملے شاعری میں اس کے اظہار سے ذہنوں کو نئی روشنی بخشی۔زندگی کی بدلتی قدروں سے ان میں نہ صرف اپنے وجود کی اہمیت کا احساس پیدا ہوا بلکہ اسی احساس نے انہیں ایک باغیانہ رخ اختیار کرنے پر اُکسایا۔ شاعری میں بے باکانہ طرزِ اظہار کو اپنا کر اپنے حق کے لیے جدوجہد کے راستے کھولے۔عورت کو عورت بن کر جینا سکھایا جس نے شاعرانہ سطح پر ایک نئی جہت کا اضافہ کیا۔شاعرات نے اپنے عہد کی نمائندگی کی۔نسائی اور عصری حسّیت سے مزین شاعری قابل غور وفکر ہے جن کا اثر تمام طبقوں پر بہت گہرا پڑا۔باوجود اس کے مساوی حقوق کے حصول سے وہ ابھی بھی محروم ہے پھر خواتین کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کو انھوں نے ادبی خوبیوں اور شاعرانہ لطافتوں سے کام لیتے ہوئے بڑے مؤثر انداز میں پیش کیا، تمام اہم موضوعات پر قلم اٹھایا۔ان پر ایک فعال مستقبل کے دروازے بھی کھول دیئے۔خواتین شاعرات روشنی کا وہ منبع ہیں جن سے نئی نسل نہ صرف اپنے ذہن منور کرے گی بلکہ ان کے تئیں اپنی سوچ میں ایک مثبت تبدیلی بھی پیدا کرے گی۔

☆☆☆

ڈاکٹر آصف علی

میرٹھ

شاہد احسن مراد آبادی کا غزلیہ اختصاص

ضلع مراد آباد پیتل کی مصنوعات ہی نہیں ادبی روایات بالخصوص اردو غزل کے حوالے سے بھی بین الاقوامی سطح پر اپنی انفرادی شناخت رکھتا ہے۔ یہاں ہر عہد میں ایسے شعرا پیدا ہوتے رہے ہیں جنہوں نے نہ صرف اردو غزل کی روایت کو زندہ رکھا بلکہ اس کے دامن کو وسیع بھی کیا ہے۔ صنف غزل کو نئے نئے تجربات سے روشناس کرا کر اس کے عہد بہ عہد ارتقا میں اہم کردار ادا کرنے والوں میں لالہ لعل رائے وفاؔ، علی محمد خاں امیرؔ، علی شاہ پروانہ، وحشتؔ، شیخ مہدی ذکیؔ، مولوی کفایت علی کافیؔ، مولوی محمد حسین تمناؔ، قاضی سید محمد علی جویاؔ، منشی محمد امداد حسین اخگر، قاضی محمد شوکت حسین شوکتؔ، علی سکندر جگرؔ، قاضی متین الحق کیفؔ، سراج الحق قمرؔ، احمد علی سحرؔ، الیاس ثمرؔ، محمد احمد عثمانی گوہرؔ، محمد سلیم سلیمؔ کیفی وغیرہ کے ساتھ ساتھ شاہد احسنؔ مراد آبادی کا نام بھی اہمیت کا حامل ہے۔

شاہد احسنؔ مراد آبادی کا اصل نام سید شاہد علی اور احسنؔ تخلص تھا مگر ادبی دنیا میں وہ شاہد احسن مراد آبادی کے نام سے مشہور ہوئے۔ آپ مراد آباد کے ایک انتہائی معزز سید اور عالمی شہرت یافتہ تجارتی گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ آپ کی پیدائش 25/ مارچ 1925ء کو جے پور راجستھان میں ہوئی۔ دراصل آپ کے والد سید حامد علی 1924ء میں سیلاب کا پانی آبادی میں آجانے کے سبب جے پور منتقل ہو گئے تھے مگر سال بھر کے اندر ہی وطن کی خوشبو انہیں واپس کھینچ لائی پھر یہیں آپ کی پرورش ہوئی۔ آپ کے والدین مشرقی علوم کے دلدادہ تھے اس لیے آپ کو مدرسہ جامعہ قاسمیہ المعروف بہ شاہی میں داخل کرا دیا گیا جہاں آپ نے اردو، فارسی اور عربی کی ضروری تعلیم حاصل کی۔ اسی دوران آپ کا شعری ذوق پروان چڑھا اور مشق شروع کر دی۔ یہاں تک کہ اپنے بقول لگ بھگ 16-15 سال کی عمر یعنی 1940ء میں باقاعدہ شعر گوئی کا سلسلہ شروع کر دیا۔ سب سے پہلے معروف شاعر مرزا طاہر بیگ سے اصلاح لی۔ ان کے انتقال کے بعد

عظیم فن کار رئیس امروہوی اور ان کے پاکستان ہجرت کر جانے کے بعد استاد شاعر علامہ کیف مراد آبادی سے کسب فیض کیا۔ یہ تینوں استاد آپ کی خداداد شعری صلاحیت اور منفرد طرز فکر کے معترف تھے۔ مثال کے طور پر ان کے درمیانی استاد رئیس امروہوی ایک جگہ لکھتے ہیں:

''ان کی غزلوں کا انداز بیان، اسلوب و ادا، طرز و فکر اور پیمانۂ احساس اپنے معاصرین سے منفرد تھا۔''

[ثبات، شاہد احسن مراد آبادی، 12]

شاہد احسن مراد آبادی نے اپنا شعری سفر جیسا کہ ذکر کیا جا چکا 1940ء میں شروع کر دیا تھا مگر ملک کے حالات شادی، تقسیم ملک، والد کے انتقال، والدہ اور چار چھوٹے بہن بھائیوں کی کفالت اور ان سے بڑھ کر اس پر آشوب دور میں اپنی خاندانی تجارت کی ساکھ بنائے رکھنے کے سبب اپنے کلام کی نشر و اشاعت پر توجہ نہ دے سکے۔ یہ سلسلہ 1950 میں رسائل و اخبارات کے ذریعے شروع ہوا اور 1987ء میں آپ کا پہلا مجموعہ ''ثبات'' کے نام سے زیور طباعت سے آراستہ ہوا۔ اس کے بعد 1990ء میں ''دریچہ''، 1996ء میں ''معیار''، 2002ء میں ''صندل''، 2006ء میں ''طوبیٰ'' اور 2009ء میں ''شام ہونے تک'' مجموعے منظر عام پر آئے جن میں پانچواں مجموعہ یعنی ''طوبیٰ'' نعتیہ مجموعہ ہے باقی چار مجموعے محض خالص غزلوں پر مشتمل اور چھٹے مجموعے ''شام ہونے تک'' میں کچھ دوہے بھی شامل ہیں۔ اس کے علاوہ ان کا کچھ کلام بشکل بیاض اور کچھ کاوشیں اخبارات و رسائل کی فائلوں میں دفن ہیں۔ ان کے غیر مطبوعہ کلام میں حمد، نعت، منقبت، سہرے اور رخصتی وغیرہ دیگر شعری اصناف کثرت سے شامل ہیں جن سے ان کے قادر الکلامی اور فنی مہارت کا اندازہ ہوتا ہے۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہد احسن مراد آبادی غزلوں اور نعتیہ مجموعوں کی طرح مختلف اصناف پر مبنی مجموعے شائع کرنے کے خواہش مند تھے مگر اس کی تکمیل سے قبل ہی 15/ اکتوبر 2011ء کو ان کی زندگی بے وفائی کر گئی لہٰذا اب اہل خانہ اور ادب نواز دوستوں کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ شاہد احسن مراد آبادی کے اس منتشر کلام کو یکجا کر کے منظر عام پر لائیں تاکہ قارئین کو استفادے کا موقع ملے اور ادبی تاریخ میں شاہد احسن کے صحیح مرتبے کا تعین ہو۔

شاہد احسن مراد آبادی نظم کے ساتھ ساتھ نثر پر قدرت کاملہ رکھتے تھے۔ وہ اگرچہ اپنی تجارتی، سماجی اور شعری مصروفیات کے سبب اس طرف زیادہ توجہ نہ دے سکے اور صرف ایک ہی

نثری کاوش ''دستاویز'' سامنے لائے مگراسی سے ان کی فنی مہارت، تنقیدی بصیرت، تحقیقی نظر اور انداز بیان کی ندرت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ ان کی یہ نثری تخلیق 1906ء میں منظر عام پر آئی تھی۔ اس میں مرادآباد کے 28 عہد ساز شعرا کے سوانحی کوائف مع نمونۂ کلام موجود ہیں جن میں سے کئی شاعر تو ایسے ہیں کہ جن کا تذکرہ اگر اس میں نہ آیا ہوتا تو دست و برد زمانہ کا شکار ہوکر ادبی تاریخوں اور اہل علم کے ذہنوں سے محو ہوگئے ہوتے۔

مذکورہ تذکرے کے بعد یہ فیصلہ کرنا آسان ہے کہ شاہد احسن مرادآبادی کو اگرچہ نثر اور تمام مروجہ شعری اصناف پر قدرت حاصل تھی مگر ان کا خاص میدان غزل تھا بالخصوص تغزل سے ان کے مزاج کو فکری مناسبت تھی۔ انہوں نے اپنی غزلوں میں روایتوں کے احترام کے ساتھ ساتھ عصری رجحانات کو پیش نظر رکھا ہے اور جدید طرز فکر میں ان علامتوں کو زیادہ پسند کیا ہے جس میں روایتوں کے احترام کے ساتھ موضوعات کا نیاپن بھی موجود ہو۔ عمل کے ساتھ ساتھ اپنی زبان سے بھی انہوں نے اس کا اعتراف کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''میں روایتی ادب میں عصری رجحانات کا حامی ہوں لیکن جدید طرز فکر کی ان علامتوں کو زیادہ پسند کرتا ہوں جن میں روایتوں کے احترام کے ساتھ موضوعات کا نیاپن بھی ہو۔''

[ثبات، شاہد احسن مرادآبادی، ص 16]

ان کی غزلوں کے بالاستیعاب مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی غزلوں میں کلاسیکی اقدار کا احترام، شگفتہ بیانی اور فکری سطح پر نئی فضا کا احساس پایا جاتا ہے۔ غزلیں جذبات کی چاشنی سے لبریز ہیں اور قاری زبان کے لطف کے ساتھ ساتھ غور و فکر پر مجبور ہو جاتا ہے۔ شاہد احسن مرادآبادی کے تمام ناقدین نے یہ اعتراف کیا ہے کہ ان کا خاص موضوع عشق ہے مثلاً ڈاکٹر عارف حسن خاں نے لکھا ہے:

> ''ان کی غزلوں کا خاص موضوع عشق ہے لیکن اس عشق میں نہ تو کوئی چھچھوراپن ہے، نہ سستی جذباتیت ہے اور نہ روحانیت و ماورائیت کے دبیز پردے ہیں بلکہ یہ ایک مہذب انسان کا شائستہ عشق ہے جس میں جذبات واحساسات کی گرمی بھی ہے اور اپنی روایت کا احترام بھی۔''

[شام ہونے تک، شاہد احسن مرادآبادی، ص 23]

یعنی اس عام موضوع میں بھی شاہد احسن مرادآبادی کے یہاں ایک امتیاز واختصاص ہے اور وہ ہے کیفیت وجذبات کے اظہار میں سلیقہ، بانکپن اور نئے پن کا اظہار۔ ثبوت کے لیے یہ چند نمونے ملاحظہ کیجئے ۔

بزم میں میرے علاوہ اور کوئی سمجھا ہی نہیں حسن کی نیچی نگاہوں میں بھی ایک پیغام تھا
حسن تو رات کی آغوش میں سو جاتا ہے شام سے عشق تڑپتا ہے سحر ہونے تک
نظر سے چھپ کے بھی وہ خود کو باہر چھوڑ جاتے ہیں دریچے بند کر لیتے ہیں منظر چھوڑ جاتے ہیں

اس وقت ٹھیٹ غزل گو شعرا کے یہاں عشق کے بیان کے دو نظریے موجود تھے ایک لکھنوی اور ایک دہلوی۔ شاہد احسن مرادآبادی کے یہاں لکھنوی نظریے کی بڑی دلکش مثالیں ملتی ہیں۔ انہوں نے اپنے اشعار میں محبوب کے ظاہری حسن کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ چند شعر بطور نمونہ ملاحظہ ہوں ۔

تیرے عارض صبح کے تازہ گلاب موسموں کا ہار ہیں آنکھیں تری
لبوں کو پنکھڑیوں نے نزاکتیں دی ہیں گلوں کا رنگ بھرا ہے تمہارے گالوں میں
لکھنؤ کی شام ہے زلف سیاہ مصر کا بازار ہیں آنکھیں تری

یہاں یہ عرض کر دینا بھی ضروری ہے کہ اگرچہ یہ موضوع اور انداز بیان ہی روایتی نہیں بلکہ الفاظ بھی روایتی، تشبیہات بھی بندھی ٹکی، استعارات بھی سجے سجائے اور تلمیحات بھی پرانی ہیں مگر اظہار کے پیرائے میں جو ندرت اور تازگی ہے وہ ان کی اپنی ہے جس نے ان کی غزلوں کو شوکت وشادابی کے لحاظ سے بالکل منفرد بنا دیا ہے۔ ذرا یہ اشعار ملاحظہ کیجئے ۔

اس سے آیا میری سانسوں کے توازن میں خلل جو دھواں دل میں ترے آگ لگانے سے اٹھا
وہ اس ادا سے مرے دل کی انجمن میں رہے کہ اک لطیف کسک بن کے جان وتن میں رہے
ہم تو سمجھے تھے کہ آ جائے گا اب دل کو قرار درد کچھ اور زیادہ تیرے آنے سے اٹھا
مجھ سے پیمان وفا توڑ کے جانے والے کیا کہیں گے جو سنیں گے زمانے والے

حسن وعشق کے موضوعات اور اس خصوص میں اپنے جذبات واحساسات اور تجربات ومشاہدات کا اظہار غزل کا روایتی اسوہ رہا ہے اور تمام غزل گو شعرا کے یہاں اس کی پابندی ملتی ہے مگر ہجر وغم کی شدت کے بیان میں عموماً شعرا کے یہاں نالہ بازاری اور جنون کی کیفیت ایسی صورت اختیار کر لیتی ہے جس سے واسوخت کا انداز نمایاں ہونے لگتا ہے مگر شاہد احسن نے غم کی

اس شدت میں بھی ایک وقار اور بانکپن پیدا کیا ہے۔ان کے اشعار مصائب کو سہنے کا حوصلہ دیتے ہیں۔محبت کی توقیر کا احساس دلاتے ہیں۔محبوب کے موقف کی پاسداری، اس کی مجبوریوں اور تہذیبی عذرداریوں کو ملحوظ رکھنے کی تبلیغ کرتے ہیں ؎

آنسو نہ گرے کوئی میرے دیدہ تر سے — اے ضبط محبت، ہے میری شرم ترے ہاتھ
اپنی آنکھوں میں وہ اعجاز کہاں سے لاؤں — جو میرے دل میں محبت کا تاثر بھر دے
لیکن کبھی گذرا جو تیری راہ گذر سے — اب تجھ سے نہ ملنے کی میں کوشش تو کروں گا
عشق صادق ہوا تو یہ رتبے میسر آئے ہیں — ہجر میں بھی پارہا ہوں وصل کی لذتیں

عشق کو صادق کرنے کی صلاح دے کر شاہد احسن نے عشق کے اس روایتی جذبے کو فکر کے ایک ایسے دھارے کی طرف موڑ دیا ہے جو کائنات کی بنیاد ہے۔اس کی تصدیق اس سے بھی ہوتی ہے کہ آپ کے یہاں عشق حقیقی کے بھی بہترین نمونے ملتے ہیں جن سے ان کے پختہ ایمان اور غیر متزلزل نظریے کا ادراک ہوتا ہے۔مثال کے طور پر وہ کہتے ہیں ؎

ہم نے کہیں ایسا کوئی دلبر نہیں دیکھا — مخفی ہے مگر اس کی حکومت ہے دلوں پر
اب جو دل کی آنکھ سے دیکھا تو جلوہ نما تھا — آج تلک شاید میرا ذوق نظر ہی خام تھا
مگر سوال کریں تو جواب آتا ہے — کمال ہے کہ ہمیں وہ نظر نہیں آتا

مذکورہ مفروضے پر ایک طویل گفتگو کی ضرورت ہے جس کی بہر حال یہاں گنجائش نہیں تاہم یہ ضرور عرض کروں گا کہ اگر ہم شاہد احسن مرادآبادی کے اس جذبے کو فکر کا نام نہ بھی دیں تب بھی یہ ضرور تسلیم کریں گے کہ انہوں نے ترکِ الفت کے موضوع کو عام ڈگر سے ہٹ کر نئے معنی دیے ہیں جس سے محبوب یا عاشق پر بے وفائی کا الزام عائد ہونے کی بجائے حالات کی ستم ظریفی، معاشرے کی چیرہ دستی اور غم روزگار میں اس کی جڑیں پیوست نظر آتی ہیں اور یہ ایک ایسا کارنامہ ہے جو روایتی ہوتے ہوئے بھی معانی کے نئے در کھولتا ہے۔

شاہد احسن مرادآبادی کا ایک شاعرانہ امتیاز وانفراد یہ بھی ہے کہ عشق کے موضوع کو جس طرح کامیابی کے ساتھ برتا ہے اسی آب وتاب کے ساتھ ان کے یہاں سماجی قدریں بھی روشن نظر آتی ہیں یعنی انہوں نے اپنے فن کے دامن میں روح عصر کو بھی ہر ممکن سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ دراصل وہ اپنی ہی کھال میں مست رہنے والے فن کار نہیں تھے بلکہ دنیا کے حوادثات کا وسیع تجربہ رکھنے والے فرد تھے اس لیے انہوں نے اپنے عہد کے بیشتر اہم مسائل کو موضوع بنایا ہے۔انہوں

نے خود بھی اس کا اعتراف کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

''ایسا بھی نہیں کہ عصری مشاہدات میری نظروں سے اوجھل رہے ہوں۔ میں کسی بھی منظر، کسی بھی واقعے، کسی بھی حادثے کو شعر میں ڈھال دینے پر قادر ہوں۔''

[شام ہونے تک، شاہد احسن مرادآبادی، ص72]

اوران کی اس قدرت کا کمال ان کی شاعری میں ہر جگہ نظر آتا ہے۔ مثال کے لیے یہ چند نمونے ملاحظہ ہوں ۔

میں اگر آج کے حالات رقم کر دیتا
حاکم وقت میرے ہاتھ قلم کر دیتا

قاتل قصور وار تو ثابت نہ ہو سکا
اب بے قصور ہوں گے گرفتار دیکھنا

زمین دل سے اکھاڑو جڑیں تعصب کی
یہ پودا صحن تعلق میں پھول پھل نہ سکے

میرا چمن بھی نشانہ ہے عصر حاضر کا
کہ اپنی اپنی صنعت پھول میں نہ خار میں

ہونٹوں پہ مسکراتے ہیں کیا ایکتا کے پھول
اوردل اٹے ہوئے ہیں تعصب کی زنگ سے

شاہد احسن مرادآبادی نے اپنے عہد کے اس اقداری بحران کی تصویر کشی کہیں ایمائی اور اشاراتی اور کہیں براہِ راست انداز میں کی ہے بالخصوص انسان پرستی اور انسان دوستی کا اظہار جس ہنرمندی کے ساتھ کیا ہے اس کی مثال کم شاعروں کے یہاں ملتی ہے۔ تقسیم ملک کے المیے کو اپنی نظر میں رکھئے اور یہ شعر ملاحظہ کیجئے ۔

ہم نہ سمجھے تھے کہ ایسا بھی زمانہ آئے گا
خون کے رشتوں کی پہچانیں بھلا دی جائیں گی

پھول سے معصوم بچے ہوں گے وجہِ اختلاف
گھر کے آنگن میں بھی دیواریں اٹھا دی جائیں گی

بضد ہیں بانٹنے کو اپنی ماں کے جسم ٹکڑوں میں
محبت یوں تو، ماں کے ساتھ کوئی بھی نہیں کرتا

تقسیم کے اس المیے کو گذرے تقریباً پون صدی گذر چکی ہے مگر اس کی کڑوی یادیں آج تک معاشرے میں زہر گھول رہی ہیں۔ اہل سیاست اپنی ناک کی لمبائی کے سہارے اس کا حل چاہتے ہیں مگر اہل دانش اور ادباء وشعرا نے ہمیشہ ان زخموں کو محبت کے ذریعے مندمل کرنے کی وکالت کی ہے۔ شاہد احسن مرادآبادی کے یہاں بھی اس کی بڑی موثر مثالیں ملتی ہیں اور یہ شعر تو اس تناظر میں ہندوپاک میں ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گیا ہے ۔

ایک شجر ایسا محبت کا لگایا جائے
جس کا ہمسایہ کے آنگن میں بھی سایہ جائے

معاشرتی زندگی کے دوسرے مصائب اور درد وغم کو بھی شاہد احسن مرادآبادی نے اپنی غزلوں میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ وقت کی قلت کے تحت الگ الگ عنوان پر تبصرے کی جگہ بلا تبصرہ کچھ اشعار ملاحظہ کیجئے اور خود فیصلہ کیجئے کہ کیا ان اشعار میں بعض معاشرتی ناہمواریوں اور تلخیوں کو بہ تمام وکمال محسوس نہیں کیا جاسکتا ہے۔

اب انساں بد سے بدتر ہو گیا ہے — برائی سے سمندر ہو گیا ہے
ڈالئے جب نظر اخبار پر — خون سے لکھی ہوئی ہیں سرخیاں
کیا قیامت ہے کہ اخبار کا ہاکر احسن — روز رکھ جاتا ہے لاشیں میرے دروازے پر
زندگی کے دور میں راحت کا کوئی پل کہاں — مسئلے ہی مسئلے ہیں مسئلوں کا حل کہاں
اک تو اس بڑھتی آبادی نے چھینا ہے سکون — اور سیاست کے یہ لیجے روز ہنگامہ کریں
فقط جمہوریت ہے تذکروں میں — حکومت اختیاری ہو رہی ہے
خواہش سیر وسیاحت تھی کہ دولت کی ہوس — میرے بیٹے کو سمندر پار کس نے کردیا
سر سے اونچا قرض تھا مشکل میں تھی جان — ڈھوتے ڈھوتے تھک گیا کھو بیٹھا اوسان
ایک پرندہ شاخ پر، زخموں سے ہے چور — اس کے سو ہمدرد ہیں لیکن سب مجبور
دلوں کے آئینہ خانوں پر دھند ہے طاری — ضمیر ہوگئے مردہ کسی سے کچھ نہ کہو
زمیں پاؤں کے نیچے نہ آسماں سر پر — یہ لگ رہا ہے کہ جیسے خلا میں زندہ ہیں
گونگوں کے اقتدار میں بہروں کے راج میں — ہم وقت کھو رہے ہیں عبث احتجاج میں

کہا جاتا ہے کہ شاہد احسن کے یہاں اپنا کوئی فلسفہ نہیں ہے مگر ان کے کلام کے بغور مطالعے سے اس کی نفی ہوتی ہے اور یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں بعض فلسفوں پر عبور تھا جس کا رنگ ان کے اشعار میں جگہ جگہ جھلکتا ہے۔

بارش بھی ہو کر تھم گئی بادل بھی چھٹ گئے — آج تک ٹپک رہی ہے درختوں سے بوند بوند
یہ کیوں جھپٹتی ہیں مجھ پر بشر نما چیلیں — میرے بدن میں ابھی زندگی کی خوشبو ہے

یہی نہیں بلکہ بعض اشعار سے تو پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنے عہد ہی نہیں بلکہ آنے والے عہد کا بھی ادراک رکھتے تھے۔ مثال کے طور پر طبقۂ نسواں کی اہمیت اور ان کی آزادی کو لے کر آج جس طرح بحث جاری ہے اس نے باقاعدہ ایک منظّم فلسفے کی شکل اختیار کرلی ہے مگر زیادہ تر بحث صرف بحث تک محدود ہے کوئی جامع حل پیش نہیں ہوسکا ہے لیکن شاہد احسن مرادآبادی نے دیکھئے کتنی موثر

بات کہی ہے۔

نوجوان بیٹوں کو گھر کے مسئلوں سے کیا　　والدین کے غم کو بیٹیاں سمجھتی ہیں

اردوغزل میں نا امیدی اور یاسیت کی فضا قدرے زیادہ ملتی ہے۔شاہد احسن مراد آبادی کے یہاں بھی ایسے کچھ نمونے مل جاتے ہیں لیکن وہ بنیادی طور پر رجائیت پسند ہیں۔انہیں انسان اور انسان کی قوت عمل پر بھروسہ ہے۔ان کے نزدیک آنے والا دور خوشیوں، محبتوں اور مسرتوں سے معمور ہوگا۔یہی ان کی انفرادیت ہے اور یہی ان کے بقا کی ضمانت!

شعبۂ اردو، سی سی ایس یونیورسٹی کے منٹو دار المطالعہ میں شعبے کے طلبہ و طالبات مطالعے میں مصروف۔

شعبۂ اردو کے طالب علم فریشر پارٹی کے بعد شعبے کے اساتذہ وارا کین کے ساتھ گروپ پوز دیتے ہوئے۔

☆☆☆

ڈاکٹر شاداب علیم

میرٹھ

مراثی انیسؔ کے کرداروں میں ہندوستانی عناصر

واقعہ کربلا سیدنا حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ اوران کے ۷۲ اعزہ اور رفقاء کی شہادت اسلامی تاریخ کا ایسا المناک سانحہ ہے جس کا غم چودہ سو سال گزر جانے کے باوجود ہر مسلمان کے دل میں اس طرح تازہ ہے جیسے یہ ابھی رونما ہوا ہے۔ کربلا کے میدان میں حضرت امام حسین کی شہادت اور خانوادۂ نبی کی تاراجی نے اس عہد کے پورے اسلامی سماج کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ حسین کا غم فرزندان توحید و رسالت کے لیے کائنات کا سب سے بڑا غم بن گیا۔ شاعری انسانی جذبات کے اظہار کا سب سے بڑا وسیلہ ہے۔ خاص طور پر عربوں میں شاعری ابلاغ کا ذریعہ تھی۔ انسانی جذبات واحساسات، خوشی وغم کا اظہار موزوں کلام کے ذریعے کرنا عربوں کی فطرت میں شامل تھا

سانحۂ کربلا کے بعد غم حسین نے وہ شدت اختیار کی کہ یہ ہر مسلمان کے لیے رثائی کلام کا بنیادی مقصد و موضوع بن گیا۔ حسین کا غم ملت اسلامیہ کا اجتماعی المیہ ہونے کی وجہ سے 'رثائی شاعری' ادب کی اہم صنف کی طرح عروج پائی۔ عربی کے بعد فارسی، ترکی اور اردو میں مرثیہ گوئی مسلمانوں کی دینی عقیدت اور رسول وآلِ رسول سے محبت کے اظہار کا موثر وسیلہ بن گئی۔

اردو مرثیہ کے تمام واقعات و کردار عرب کی اسلامی تاریخ سے ماخوذ ہیں۔ ان میں کچھ بھی ہندوستانی نہیں۔ لیکن مرثیے کو جو فروغ ہندوستان میں حاصل ہوا وہ عرب ممالک یا ایران میں نہیں ہوا۔ اردو مرثیے دکن میں لکھے گئے اور دہلی میں بھی لیکن لکھنؤ میں مرثیہ اپنے عروج کو پہنچا۔ لکھنؤ میں اردو مرثیے کے توسیع و ترقی وہاں کے ثقافتی اور معاشرتی تقاضوں کے تحت ہوئی۔

اردو مرثیے میں ہندوستانی تہذیب و ثقافت کی عکاسی اگر چہ انیس سے بیشتر بھی بکثرت کی جاتی رہی لیکن انیس نے اردو مرثیے کو خاص طور سے ہندوستانی ثقافتی رنگ میں رنگ کر

واقعات کربلا کی فطری اجنبیت کو اس طرح اپنائیت میں بدل دیا کہ یہ واقعات سرزمین عرب سے متعلق ہوتے ہوئے بھی خالص ہندوستانی سرزمین کے معلوم ہوتے ہیں۔ صالحہ عابد حسین کے الفاظ میں انیس کے یہاں کربلا کے مرد مجاہدوں میں ہندوستانی رنگ نسبتاً ہلکا ہے مگر خواتین میں یہ رنگ گاڑھے اور شوخ ہیں۔ مرثیوں میں عورتوں اور بچوں میں ہندوستانی رنگ رچا بسا کر پیش کیا گیا ہے۔ کرداروں کا لب ولہجہ، رسم و رواج، محبت و پیار کی باتیں، اپنائیت کے مظاہرے، گلے، شکوے اور خاندانی زندگی کی دل کش مرقع کشی میں بہت کچھ ہندوستانی گھرانوں کی عکاسی ہے۔ دلوں کے تاروں کو چھونے اور گہری اپنائیت کا احساس پیدا کرنے کے لیے شاید یہ چیزیں ضروری تھیں۔

جب حضرت امام حسین اسلحہ زیب تن کر کے وداع لینے کے لیے حرم میں تشریف لاتے ہیں تو زینب سمجھ جاتی ہیں کہ اب بھائی کے بچنے کی کوئی صورت نہیں۔ گھر والوں کی آنکھوں میں دنیا اندھیر ہو رہی ہے ۔

خیمے میں جا کے شہ نے یہ دیکھا حرم کا حال
چہرے تو فق ہیں اور کھلے ہیں سروں کے بال
زینب کی یہ دُعا ہے کہ اے رب ذوالجلال
بچ جائے اس فساد سے خیر النساء کا لال
بانوئے نیک نام کی کھیتی ہری رہے
صندل سے مانگ بچوں سے گود بھری رہے

ان اشعار میں واضح طور پر ہندوستانی خواتین کے احساس و جذبات کی عکاسی ہے۔ صندل سے مانگ بھرنا صرف ہندوستانی رسم ہے۔ کھیتی ہری رہے اور بچوں سے گود بھری رہے یہ خالص ہندوستانی تہذیب کی وہ دعائیں ہیں جو ساس، نند کے دل سے بہو اور بھاوج کے لیے نکلتی ہیں۔ خیر النساء کے لال کا تصور بھی ہندوستانی معاشرے سے مخصوص ہے۔

مراثی انیسؔ میں حضرت فاطمہ صغریٰ کا کردار بڑے ہی دلچسپ پیرائے میں پیش کیا گیا ہے۔ اس موقعے پر ان کی زبان سے جو باتیں کہی گئی ہیں ان کا گہرا تعلق بھی ہندوستانی سماجی رویوں بالخصوص لکھنؤ کے ثقافتی تہذیب سے ہے۔ ہر ہندوستانی بہن کی طرح ان کے دل میں بھائی کی شادی کے بہت سے ارمان مچل رہے ہیں۔ وہ دہلیز روکتی ہیں، نیگ مانگتی ہیں، دولہا بنے بھائی پر ڈوپٹے کا آنچل ڈالتی ہیں، یہ سب ہندوستانی لڑکیوں کے امتیازی سماجی رویے ہیں۔ اظہر

علی فاروقی نے درست ہی کہا ہے" فاطمہ صغریٰ کے کردار میں وہی روح پائی جاتی ہے جو ایک ہندوستانی لڑکی کے کردار میں ملتی ہے۔" [اردو مرثیہ، ص 161]

ایک جگہ علی اصغر سے وہ اس طرح استدعا کرتی ہیں۔

جلد آن کے بہنا کی خبر لیجئے بھائی
بے میرے کہیں بیاہ نہ کر لیجئے بھائی

روایت ہے امام حسن کی وصیت پوری کرنے کی غرض سے حضرت قاسم کا عقد حضرت امام حسین کی صاحب زادی فاطمہ کبریٰ کے ساتھ شہادت کربلا سے ایک روز قبل کر دیا گیا تھا۔ قاسم سے دلہن سے رخصت کا سماں دیکھئے جس میں عرب کی دلہن کی رتی بھر بھی پر چھائی نظر نہیں آتی۔ یہ خالص لکھنؤ کی دلہن کی تصویر ہے۔

خاموش تھی گھونگھٹ میں دلہن صورت تقدیر
دولہا کا سخن سن کے کلیجے پہ لگا تیر
تصویر بنی غم کی، دلہن بن کے سراپا
پیشانی کا صندل بھی ہوا خاک کا چھاپا
پوشاک سے پیدا تھا، کہ رنڈ سالہ ہے تن میں
کنگنے سے یہ ثابت تھا کلائی ہے رسن میں
آنکھوں کو رنڈا پے کا نظر آ گیا ساماں
سینے پہ چلی وصل میں تیغِ غم ہجراں
خود ہوگئے سب گوندھے ہوئے
ماتھے سے ستاروں کی طرح گر گئی افشاں
آ پڑتے تھے اشک آنکھوں سے رخساروں پہ ڈھل کر
رہ جاتی تھی وہ مہندی لگے ہاتھوں کو مل کر

یہی نہیں انیس اس سے بھی آگے بڑھ جاتے ہیں۔

کچھ منہ سے نہ کہہ سکتی تھی وہ نازوں کی پالی
یہ ہونٹ چبائے کہ اڑی پان کی لالی

....

وہ کہتی تھی اب ناک سے نتھ کوئی اتارلے
اور رو کے سکینہ سے یہ کرتی تھی اشارے
اس تاش کے جوڑے کو کوئی آگ لگادو
سادے ہوں جو کپڑے وہ مجھے لا کے پہنادو
کھولو اسے کنگنے سے بس اب ہاتھ اٹھایا
کیوں ہائے یہ کنگنے سے بس مجھے اماں نے پہنائے

حضرت عباس حضرت امام حسین کے سوتیلے بھائی ہیں جو ان کے سچے جانشین ہیں اور وفادار بھی۔ واقعہ کربلا میں ان کی شجاعت، انکے کارنامے، ان کی جاں نثاری، تاریخی حقیقت کا اہم حصہ ہے۔ ایسے وفا شعار مرد مجاہد کی بیوی کیسی ہونی چاہئے تھی؟ انیس نے اس کی سیرت کشی بڑی خوبی سے کی ہے، جس میں ہندستانی تہذیب کی جھلک نظر آتی ہے جو بالکل فطری اور بناوٹ سے عاری ہے۔ شوہر سے الفت ہے، خاندانی روایت کا پاس ہے، بچوں کا درد ہے، بھتیجے کی محبت ہے، شوہر کے خاندان پر فخر ہے اور اس کی فکر ہے کہ ان کا اعزاز بڑھے، ان کو نام وری اور شہرت ملے۔ صبح عاشور، فوج حسین کا علم، عباس بن علی کو ملتا ہے۔ اس سے سب خوش ہیں مگر جو فخر و مسرت ان کی بیوی کو ہے وہ قدرتی طور پر ان سب سے بڑھ کر ہے وہ کہتی ہیں۔

یہ سن کے آئی زوجہ عباس نامور
شوہر کی سمت پہلے کنکھیوں سی کی نظر
لیں سبط مصطفیٰ کی بلائیں بچشم تر
زینب کے گرد کے یہ بولی وہ نوحہ گر
فیض آپکا ہے اور تصدق امام کا
عزت بڑھی کنیز کی، رتبہ غلام کا

یہ سن کر حضرت زینب بے ساختہ گلے لگا کر دعا دیتی ہیں۔

سر کو لگا کے چھاتی سے زینب نے یہ کہا
تو اپنی مانگ کوکھ سے ٹھنڈی رہے سدا
کی عرض مجھ سی لاکھ کنیز بھی ہوں فدا
بانوئے نامور کو سہاگن رکھے خدا

مانگوں کے جو وہ دوں گی، کہ لونڈی سخی کی ہوں

آگے کہتی ہیں ۔

گھر مرا جب سے لٹ گیا، اس گھر میں آئی ہوں
شکوہ کا کوئی ، حرف کبھی لب پہ لائی ہوں
کسریٰ کی گو کہ پوتی ہوں سلطاں کی جائی ہوں
لونڈی ہوں آپ کی علی اکبر کی دائی ہوں
صدقہ یہ آپ کا ہے کہ شہ کی عزیز ہوں
بھاوج نہ جانئے مجھے ادنیٰ کنیز ہوں

حضرت زینب اپنے بھتیجے علی اکبر سے بیٹوں سے بھی زیادہ پیار کرتی ہیں۔شہادت کے بعد جب علی اکبر کی لاش خیمہ میں لائی جاتی ہے تو بی بی زینب بین کرتی کہتی ہیں ۔

ہے ہے ، نہ تیرا بیاہ رچا نا ہوا نصیب
ہے ہے ، دلہن نہ بیاہ کے لانا ہوا نصیب
پوتے کو گود میں کھلانا ہوا نصیب
شادی کے بدلے خاک اڑانا ہوا نصیب
ندی لہو کی چاندسی چھاتی سے بہہ گئی
بہنوں کی نیگ لینے کی حسرت ہی رہ گئی

علی اکبر کی والدہ شہر بانو کے اس موقع پر جذبات ملاحظہ ہوں ۔

ہنس ہنس ، کے اب یہ ماں کسے دولہا بنائے گی
واری جواب دولہن اب کس کی آئے گی
اب سالی کس کے ہاتھ میں مہندی لگائے گی
ماں بیاہنے کو دھوم سے اب کس کو جائے گی
بستی میری اجڑ گئی ویرانہ ہو گیا
بیٹھوں کہاں یہ گھر تو عزا خانہ ہو گیا

میر انیس نے ہندستانی معاشرت کی ترجمانی صرف شادی بیاہ کی رسموں تک محدود نہیں رکھی بلکہ بچپن میں پالنے کی معصوم مسکراہٹ سے لے کر موت تک تمام مراحل کی معاشرتی ترجمانی

کا حق ادا کیا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ مرثیے کے کرداروں کے ذریعے آج سے دوسو سال پہلے کی ہندستانی معاشرت کی تصویریں ان مرثیوں میں ہمیشہ کے لیے محظوظ ہوگئی ہیں، گہوارے میں علی اصغر کا ہمکنا، کاجل لگانا، نظر بد کا ٹیکا لگانا، کالا دانہ اتارنا، بلائیں لینا، گھونگٹ کا رواج، ہاتھ جوڑ کر بات کرنا، قبروں پر جانا، چراغ روشن کرنا وغیرہ سبھی سماجی تصورات اور رسومات کی تصویریں مراثی انیسؔ میں جابجا دکھائی دیتی ہیں۔

بیوہ کا لال بچ گیا صدقے حسین پر
اسپند کوئی ، کردے، مرے نور عین پر
روئی جو سکینہ ، قدم شہہ سے لپٹ کر
کبریٰ بھی لگی پیٹنے گھونگھٹ کو الٹ کر
مسند کو شہہ دیں نے منور کیا جاکر
لینے لگی بھائی کی ، بلائیں ، بہن آکر

میر انیسؔ نے ہندستانی عورت کے لہجے اور طرز گفتار کو جس کمال فن کے ساتھ اپنے شعروں میں کھپایا ہے۔ اس کی اتنی متنوع اور متحرک تصویر کہیں اور نہیں ملتی۔ انہوں نے ہندستانی خواتین کی امیدوں، آرزوؤں، تمناؤں، دعاؤں، ان کے آداب، حفظ مراتب، لہجے، روزمرہ محاورات اور ذہنی وجذباتی رویوں کی ایسی تصویر کشی کی ہے کہ پوری اردو شاعری میں اسکا جواب نہیں، چند اشعار میں لہجہ اور خطاب دیکھئے جن میں مکمل طور پر اودھ کی فضا سامنے آجاتی ہیں۔

لو اپنے دودھ کی ، تمہیں دیتی ہوں قسم
اب کچھ کہو گے منہ سے ہوگا مجھے بھی غم
پوچھے تو کوئی گھٹنیوں جس روز چلے تھے
ان تلوؤں سے یہ دیدۂ تر کس نے ملے تھے
راتوں کو رہا کون چھٹی چلوں میں بیدار
کس نے کہو سرمہ دیا، ان آنکھوں میں ہر بار
پہلو میں رہا، دل کی طرح کس کے یہ دل دار
کس بی بی نے گیسو ہیں، یہ منت کے رکھے چار؟
بے میری اجازت جو یہ مرنے کو چلے ہیں

پوچھے تو کوئی کس کی مرادوں کے پلے ہیں

الغرض شمالی ہندستان کی خواتین کے ثقافتی رویوں اور سماجی روایتوں کے ہزار جلوے میر انیسؔ کے مرثیوں میں بیش قیمت جواہرات کی طرح بکھرے پڑے ہیں۔لیکن ہمارے کچھ ناقدین نے اعتراضات کیا کہ انہوں نے عربی فضا میں ہندستانی کرداروں کو پیش کیا ہے۔میری ناقص رائے میں دنیا کا کوئی ادب ایسا نہیں جس میں مقامی تہذیب وثقافت کو نظر انداز کر دیا گیا ہو اور عصری ماحول سے ہم آہنگی کو اہمیت نہ دی گئی ہو۔اس لیے کسی بھی ادبی شاہکار کو اس وقت تک معیاری تخلیق نہیں مانا گیا ہے جب تک اس میں مقامی تہذیب وثقافت کے گہرے نقوش نہ پائے گئے ہوں۔

مرثیہ کا فن تحریر سے زیادہ تقریری تھا۔مسند سے مرثیہ نگار مجالس عزا میں مرثیہ خوانی کیا کرتے تھے۔مقصد یہی تھا کہ مجلس میں موجود ہر شخص غم حسین کو ذاتی غم تصور کرے اور ایسا تبھی ممکن تھا جب انسان کے سامنے وہ تصاویر پیش کی جائیں جو ان کی زندگی کا حصہ ہوں۔غیر ملکی تہذیب رویے اور اجنبی سماجی روایت کے باعث مرثیہ خوانی کا مقصد ہی فوت ہوسکتا تھا۔میر انیسؔ کے اس ہنر سے بخوبی واقف تھے ۔اسی لئے ان کی لفظی تصاویر کے نقش ونگار کے باعث غم حسین ذاتی غم بن جاتا ہے۔یہی میر انیسؔ کی عظمت کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔

☆☆☆

شعبۂ اردو میں پروفیسر فاروق بخشی کو اعزاز سے نوازتے ہوئے بائیں سے ڈاکٹر معراج الدین، محترم آفاق خاں، ذیشان خاں، پروفیسر ارتضیٰ کریم، پروفیسر اسلم جمشید پوری، ڈاکٹر شاداب علیم اور ڈاکٹر الکا وشِشٹھ۔

ڈاکٹر ظفر گلزار

حیدر آباد

پروفیسر خورشید الاسلام کی مایہ ناز تخلیق: تھری مغل پوئٹس

''تھری مغل پوئٹس'' کا شمار خورشید الاسلام کے اہم کارناموں میں ہوتا ہے جسے انہوں نے برطانیہ کے مشہور و معروف اور صاحب نظر اور محقق رالف رسل (Ralf Russel) کے ساتھ تصنیف کی تھی۔ ''تھری مغل پوئٹس'' کے صاحب کتاب نے سلطنت مغلیہ کے تین ایسے نامور اور معروف شعرا کے کلام کا مطالعہ کرتے ہوئے اُن پر خامہ فرسائی کی ہے جنہوں نے اپنے اپنے میدان میں ان مٹ نقوش چھوڑے ہیں، اگر یوں کہا جائے کہ قصیدہ میں سودا جیسا باکمال شاعر، مثنوی میں میر حسن جیسا مثنوی گو اور غزل کی دنیا میں میر تقی میر جیسا عظیم شاعر پیدا نہیں ہوا تو بے جا نہ ہوگا۔

خورشید الاسلام نے اس کتاب میں 18 ویں صدی کے تین ایسے شعرا کو موضوع بحث بنایا ہے جن کی شاعری اپنے عہد کی بڑی فن کاری اور چابکدستی سے ترجمانی کرتی ہے۔

''تھری مغل پوئٹس'' کو خورشید الاسلام نے چھ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے باب میں اٹھارویں صدی کا پس منظر پیش کیا گیا یعنی ہندوستان کے سیاسی و سماجی پس منظر اور پیش منظر پر سیر حاصل گفتگو کرتے ہوئے اس بات کو اجاگر کیا ہے کہ وہ کون سی وجوہ تھیں جنہوں نے اٹھارویں صدی میں اردو شاعری کو سودا، میر حسن اور میر تقی میر جیسے شاعر عطا کیے۔ کیونکہ اردو شاعری کی اہم اصناف غزل، قصیدہ اور مثنوی ہیں لیکن ان میں 'غزل' کو جس قدر مقبولیت حاصل ہوئی وہ کسی اور صنف کو حاصل نہ ہو سکی۔ غزل کو اُس کے ابتدائی دور میں بھی وہی شہرت حاصل تھی جو آج ہے۔ اردو شاعری نام ہے غزل کا کیونکہ جب جب اردو شاعری کا ذکر آتا ہے اسی کے ساتھ غزل کا تصور بھی ابھرنے لگتا ہے۔ گو کہ اردو شاعری اور غزل ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔

اس باب میں خورشید الاسلام نے نہ صرف یہ کہ میر، سودا اور میر حسن کے تعلق سے اس

وقت کے سیاسی وسماجی حالات کا جائزہ لیا ہے بلکہ ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کب اور کس نے قائم کی اس کا بھی تذکرہ ملتا ہے۔اس کے بعد یکے بعد دیگرے مغل بادشاہوں نے کس طرح سے اپنی حکومت کی حدود میں اضافہ کیا اس پر بھی روشنی ڈالی ہے۔مغل بادشاہوں میں اکبر کا دور سب سے شاندار رہا۔مزید یہ کہ خورشید الاسلام اور رالف رسل نے مغل سلطنت کا برطانوی سلطنت سے موازنہ بھی کیا ہے اور اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ سلطنت مغلیہ کے عظیم بادشاہ اکبر اُس وقت کا سب سے امیر ترین بادشاہ تھا اور طرز رہائش کا معیار بھی اعلیٰ وارفع تھا۔

مغل سلطنت کو عروج کم و بیش ڈیڑھ سو سال یعنی 1556 سے 1707 کے درمیان اکبر، جہانگیر، شاہ جہاں اور اورنگ زیب کے زمانے میں حاصل ہوا۔اکبر، جہاں گیر اور شاہ جہاں کے عہد میں مغل سلطنت کا پایہ تخت آگرہ رہا۔لیکن شاہ جہاں نے پایہ تخت کو آگرہ سے دہلی منتقل کرنے کا ارادہ کیا اور ایک نیا شہر بسایا جس کا نام شاہ جہاں آباد رکھا اور دیکھتے ہی دیکھتے دہلی کو وہ عظمت و وقار نصیب ہوا جو کسی اور شہر کو نہ مل سکا۔اسی دوران نادر شاہ نے دہلی پر حملہ کیا اور دہلی کو بری طرح تخت و تاراج کر دیا جس نے مغلیہ سلطنت کی بنیاد ہلا دی اور اس حملہ کے بعد مغلیہ سلطنت اندرونی اور باہری حملے، رسہ کشی محلوں کی سازشوں کا شکار ہو کر زوال کی طرف گامزن ہوئی۔

جس زمانے میں نادر شاہ نے حملہ کیا اس وقت سوداؔ بالغ تھے لیکن میر تقی میرؔ کی عمر سولہ سترہ سال کی تھی اور میر حسنؔ گیارہ برس کے۔سوداؔ اور میر حسنؔ کی پیدائش دہلی میں ہوئی تھی جب کہ میرؔ آگرہ میں پیدا ہوئے تھے۔لیکن نادر شاہی حملے سے کچھ قبل دہلی آنا ہوا تھا۔

میر تقی میرؔ اور سوداؔ نے عنفوان شباب اور پیری دونوں زمانوں میں دہلی کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔اُن پر جو گزری تھی اس کے نقوش ان کی شاعری میں جا بجا ملتے ہیں۔دہلی کو تمام شہروں میں ایک الگ مقام حاصل تھا، جیسا کہ میرؔ نے کہا کہ ؎

اس عہد کو نہ جانتے اگلا سا عہد میرؔ
وہ دور اب نہیں وہ زمیں آسماں نہیں

میرؔ، سوداؔ اور میر حسنؔ کے کلام سے ان کی اپنے عہد سے وابستگی اور لگاؤ کا احساس ہوتا ہے۔بالخصوص انہیں سلطنت مغلیہ کے زوال کا بے حد افسوس ہوا۔سوداؔ نے سماجی اقدار کے زوال اور مغلیہ سلطنت کے زوال کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا مگر میر حسنؔ نے خاموش رہ کر احتجاج کیا اور میر تقی میرؔ نے ذاتی تجربات کے ذریعہ۔اسی لیے میرؔ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ میرؔ نے آپ

بیتی کو جگ بیتی بنا دیا۔

کتاب ہٰذا کے دوسرے باب میں خورشید الاسلام نے سوؔدا کی قصیدہ نگاری سے بحث کی اور قصیدہ کی ان فنی باریکیوں سے بحث کی ہے جس سے سوؔدا نہ صرف 18 اویں صدی کا عظیم قصیدہ گو شاعر کی حیثیت سے مستحکم ہوا بلکہ آنے والے زمانے میں بھی ایک بڑے شاعر کے طور پر بلند و بالا مقام حاصل کیا۔

سوؔدا کی شاعری کی ایک خصوصیت صاف گوئی ہے۔ سوؔدا کے قصیدہ میں سودا کی شخصیت واضح طور سے نظر آتی ہے۔ سوؔدا نے اپنی فطرت کے خلاف کوئی بات نہیں کہی بلکہ انہوں نے وہی کہا جو اُن کی فطرت میں شامل تھا۔ سوؔدا نے اپنی اس طبیعت کے بارے میں اپنی کلیات میں لکھا ہے کہ:

"I am neither Famous For virtue nor notorious for vice....
I seek nobody's favours, and want nobody to seek
mine. People may think well or ill of me as they
please. I act as my nature prompts me." 1

سوؔدا نے اپنے قصیدے میں اپنے معاصرین کا بھی بہت مذاق اُڑایا ہے اور یہی سوؔدا کی شاعری کا انداز ہے۔ خورشید الاسلام نے اس ضمن میں ایک واقعہ نقل کیا ہے۔ یعنی میر حسؔن کے والد میر ضاحکؔ سے ان کی ملاقات مرزا سلیمان شکوہ جو کہ شاہ عالم کے بیٹے تھے، کے گھر ملاقات ہوئی۔ سوؔدا پہلے سے موجود تھے۔ میر ضاحک نے سودا سے تازہ کلام کی فرمائش کی۔ سوؔدا نے تازہ کلام کے لیے معذرت کی مگر وہاں موجود ایک دوسرے شاعر سکندر نے کہا کہ ابھی ابھی تازہ کلام کہا، میں سناتا ہوں۔

یا رب تو مری سن لے یہ کہتا ہے سکندر
ضاحک کے اڑا دیوے کسی بن میں قلندر
گھر اس کے تولد ہوا گر بچۂ بندر
گلیوں میں نچاتا پھرے وہ بنگلے کے اندر
روٹی تو کما کھائے کسی طور مچھندر

کلام سنتے ہی میر ضاحکؔ کو غصہ آ گیا اور سکندر کو ایک لات ماری، سودا مسکراتے ہوئے اُٹھے اور کہا کہ یہ کلام سکندر کا نہیں ہے بلکہ میرا ہے۔

سوداؔ نے اپنے وقت کے تقریباً تمام بڑی شخصیات پر قصیدے لکھے اور معاصرین پر بھی لکھے۔ بالخصوص انہوں نے ہجویہ قصیدے لکھے ہیں۔ یہ قصیدے معاصرین، استاد زمانہ، مغلیہ سلطنت کو ہدفِ تنقید بناتے ہیں۔ سوداؔ کے قصائد سے اس وقت کے سیاسی وسماجی حالات کا بخوبی علم ہوتا ہے اور یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اس وقت کی ادبی روایات کس طرح کی تھیں غرض کہ اس باب میں خورشید الاسلام نے سوداؔ کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کر کے ان کی قصیدہ گوئی کا جائزہ لیا۔

سوداؔ کے بعد خورشید الاسلام نے میر حسن کی مثنوی نگاری کا تفصیل سے جائزہ لیا ہے۔ سوداؔ قصیدہ گوئی کے باکمال شاعر تھے، میر تقی میرؔ غزل کے اور میر حسنؔ مثنوی کے۔ میر حسن نے کم و بیش ۱۱ مثنویاں رقم کی ہیں مگر انہیں شہرت شہرۂ آفاق مثنوی ''سحر البیان'' سے ملی۔ جسے انہوں نے 1758 میں اپنی موت سے دو سال پہلے مکمل کیا تھا۔ سحر البیان 2000 اشعار پر مشتمل ہے۔ میر حسن کی پیدائش دہلی میں ہوئی مگر نادر شاہ کے حملے کے بعد میر ضاحک کے ساتھ دہلی چھوڑ فیض آباد منتقل ہو گئے۔

میر حسنؔ کی مثنوی ''سحر البیان'' اپنے قصے کی وجہ سے اور پیرایہ بیان کی بنا پر اتنے سال گزر جانے کے باوجود آج بھی اتنی ہی مقبول ہے جتنا کہ اپنے عہد میں۔ شاید میر حسنؔ کو اپنی مثنوی کی سحر بیانی کا احساس ہو گیا تھا۔ اسی لیے اس کا نام ''سحر البیان'' رکھا۔ خورشید الاسلام مثنوی کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "The appeal of the poem owes much to the skill with which Mir Hasan has blended romanticism with realism with realism literary methods that are too often regarded as mutually exclusive. All critics have agreed that the masnavi is a romantic poem; but generally all they have meant by this is that it is a love story with a happy ending." 2

خورشید الاسلام نے میر حسن کا ذکر ''سحر البیان'' کے حوالے سے کرنے کے بعد اردو کے مشہور اور عظیم شاعر میر تقی میرؔ کی عشقیہ شاعری پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ میرؔ نے بھی میر

حسن کی طرح مثنویاں کہی ہیں مگر میؔر کی مثنویاں میر حسن کی مثنویوں سے قدر مختلف ہیں۔عام طور پر دوطرح کی مثنویاں لکھی گئی ہیں۔ایک میر حسن کی مثنویوں کی طرح جس میں رومانی قصہ کا بیان ہے۔لیکن عاشق اور معشوق الگ الگ طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔دوسری وہ مثنویاں جن میں زندگی کی سچائی اور حقیقی کہانی کو پیش کیا گیا ہے۔جس کی عمدہ مثال میر تقی میؔر کی مثنویاں ہیں۔

میؔر کی سبھی مثنویاں عشقیہ ہیں۔جس میں واردات عشق کو بڑی خوبصورتی اورفن کاری کے ساتھ بیان کیا ہے۔مثلاً ''معاملات عشق'' میں میؔر نے اپنے عشق کی داستان کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ بیان کیا، وہ عشق جو سر چڑھ کر بولا۔یعنی 80 سال کی عمر میں ایک بیاہتا سے عشق کر بیٹھے۔اسی طرح میر نے مثنوی 'خواب وخیال' میں عشق کے جزبات وواردات کو بیان کیا ہے۔

میؔر کا عشق المیہ ہے جس کا عکس ان کی مثنویوں اور غزلوں میں ملتا ہے۔بالعموم اردو مثنوی کی بنیاد المیہ پر ہے۔اس کے بارے میں خورشید الاسلام کہتے ہیں:

> "This is not because the poets select only the tragic stories for their themes, but because in the society in which they lived, love was a tragedy." 3

یعنی کہ ہندوستانی معاشرہ بالخصوص مسلم معاشرے میں محبت (عشق) اور شادی دو جدا شے ہیں۔دونوں کو ایک ساتھ کم دیکھنے کو ملتا ہے اور جس معاشرہ اور عہد سے میر کا تعلق تھا اس میں ایسا تصور ہی غلط تھا۔اسی لیے ان کی مثنویاں عشق کے المیہ کو پیش کرتی ہیں۔اسی لیے میؔر نے کہا کہ

زنداں میں پھنسے طوق پڑے قید میں مرجائے
پر دامِ الفت میں گرفتار نہ ہووے
آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم
اب جو ہیں خاک انتہا ہے یہ
وصیت میؔر نے مجھ کو یہی کی
کہ سب کچھ ہونا تو عاشق نہ ہونا

خورشید الاسلام نے میؔر کی عشقیہ شاعری پر قدر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔میؔر کے یہاں عشق کا جو تصور تھا اور عشق کے متعلق جس قدر تجربات تھے ان اشعار کے حوالے سے میؔر کی

عشقیہ شاعری کی فنی خوبیوں کو اُجاگر کیا ہے۔

میؔر نے اپنے کلام میں اپنے ذاتی مشاہدات، تجربات، معاملات کو اردو شاعری کی فنی خوبیوں کے ساتھ پیش کیا ہے۔ میر کے بارے میں کہا بھی جاتا ہے کہ میؔر نے آپ بیتی کو جگ بیتی بنادیا۔ میؔر کہتے ہیں:

مجھ کو شاعر نہ کہو میؔر کہ صاحب میں نے
درد و غم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا
اس پردے میں غمِ دل کہتا ہے میؔر اپنا
کیا شعرو شاعری ہے یارو شعار عاشق

خورشید الاسلام نے اخیر میں میؔر کی مکمل غزل نقل کی ہے اور اس کی تشریح بھی کی ہے جو غنائیت سے پُر ہے۔

الٹی ہوگئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماریِ دل نے آخر کام تمام کیا

مختصر یہ کہ Three Mughal Poets خورشید الاسلام کی اہم تصنیف ہے جس میں اٹھارویں صدی کے تین بڑے اور عظیم شعرا کے کلام کا جائزہ لیتے ہوئے اس بات کو واضح کیا ہے کہ قصیدہ گوئی میں سوؔدا۔ مثنوی میں میر حسؔن اور غزل میں میر تقی میؔر جیسا شاعر پیدا نہ ہوا۔ تینوں اپنے اپنے میدان میں عظیم شاعر کہلانے کے مستحق ہیں۔ خورشید الاسلام اور رالف رسل نے Three Mughal Poets کے ذریعہ اٹھارویں صدی کے اردو کے تین مشہور و معروف کلاسیکی شاعر مرزا محمد رفیع سوؔدا، میر حسؔن اور میر تقی میؔر کو مغربی دنیا سے آشنا کرایا۔

☆☆☆

حوالے:

1 : 'تھری مغل پوئٹس' خورشید الاسلام اور رالف رسل، ص 39، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، نئی دہلی، 2006

2 : 'تھری مغل پوئٹس' خورشید الاسلام اور رالف رسل، ص 92، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، نئی دہلی، 2006

3: 'تھری مغل پوئٹس' خورشید الاسلام اور رالف رسل، ص 98، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، نئی دہلی، 2006

ڈاکٹر ارشاد سیانوی

میرٹھ

''ستاروں سے آگے'' ایک تجزیاتی مطالعہ

بیسویں صدی کے ممتاز فکشن نگاروں امتیاز علی تاج، عصمت چغتائی، خدیجہ مستور جیلانی بانو، انتظار حسین، خواجہ احمد عباس، وغیرہ میں ایک اہم نام قرۃ العین حیدر کا بھی ہے جن کے کئی ناول اور افسانے کلاسک کا درجہ حاصل کر چکے ہیں۔عینی آپا نے اپنے ناول اور افسانوں میں خاص طور سے ہجرت کا کرب، تقسیم وطن کی واردات اور ملک کے بٹوارے سے پیدا شدہ مسائل کا خاصا ذکر کیا ہے۔اردو ادب میں بات نثر کی ہو یا نظم کی اردو ادبا نے ایسے ادبی نقوش چھوڑے ہیں جن کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔اگر اردو نظم کی بات کی جائے تو علامہ اقبال کی غیر معمولی خدمات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔علامہ اقبال کے بعد قرۃ العین حیدر بھی ایسی ہی شخصیت ہیں جنھیں افسانوی ادب کی بڑی قلم کار کہنا غلط نہ ہوگا۔جس طرح اقبال نے قومی اور بین الاقوامی سطح پر شعر و ادب پر غور و خوض کیا۔اسی طرح قرۃ العین حیدر نے بھی بین الاقوامی سطح پر افسانوی ادب میں فنی تکنیک، وقت اور تاریخی شعور کو اپنی تخلیقات میں پیش کیا اور ممتاز قلم کار کہلائیں۔

قرۃ العین حیدر کی فنی تکنیک اور فکر و فن پر بہت سے مضامین اور کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں جن میں ڈاکٹر محی الدین بمبئی والا کی کتاب 'قرۃ العین حیدر اور ناول کا جدید فن (1983)، پروفیسر عبدالمغنی کی کتاب 'قرۃ العین حیدر کا فن (1985) پروفیسر ارتضیٰ کریم کی مرتبہ کتاب 'قرۃ العین حیدر ایک مطالعہ' (1992)، قرۃ العین حیدر کے ناولوں میں تاریخی شعور (2004)، خورشید انور کی کتاب ''قرۃ العین حیدر: شخصیت اور فن'' (2008) وغیرہ سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ قرۃ العین حیدر نے افسانوں کے میدان میں کتنا وسیع کام کیا ہے۔خود قرۃ العین حیدر نے آٹھ ناول 'میرے بھی صنم خانے'، سفینۂ غم دل، آگ کا دریا، کار جہاں دراز ہے اول، کار جہاں دراز ہے دوم، آخر شب کے ہم سفر، گردش رنگ چمن، چاندنی بیگم اور آخری ناول شاہراہِ حریر لکھے۔ان

ناولوں نے ناول نگاری کے میدان کو مزید وقار عطا کیا۔ان ناولوں کے علاوہ عینی آپا نے چار افسانوی مجموعے لکھے۔''ستاروں سے آگے''(1946)،''شیشے کا گھر''(1954)،''پت جھڑ کی آواز''(1965)اور چوتھا افسانوی مجموعہ'روشنی کی رفتار'(1982)۔ان افسانوی مجموعوں نے قرۃ العین حیدر کی افسانہ نگاری کو چمکایا اور افسانہ نگاری کے میدان میں اضافہ کیا۔پہلے دو افسانوی مجموعے'ستاروں سے آگے'اور'شیشے کا گھر'فنی چابکدستی میں ڈھیلے نظر آتے ہیں جب کہ آخری دونوں افسانوی مجموعے'پت جھڑ کی آواز'اور'روشنی کی رفتار'میں تکنیک اور فنکارانہ چابکدستی نظر آتی ہے مگر یہاں پر میرا مقصد صرف قرۃ العین حیدر کے پہلے مجموعہ'ستاروں سے آگے'کا تجزیہ کرنا ہے۔

قرۃ العین حیدر کو بچپن سے ہی کہانی سے شغف تھا اور یہ شغف ان کو ورثے میں حاصل ہوا تھا۔والدین بھی اچھے قلم کار تھے۔ماں باپ نے ان کی تعلیم پر بھی خوب توجہ مرکوز کی۔عینی آپا خود بھی اپنے والدین کے افسانوی ادب کے تعلق سے بہت سی باتیں کرتی تھیں اور ان کے افسانوں کے امتیازات کو بتاتی تھیں۔قلم کار والدین کی بیٹی بھی اچھی قلم کار بنیں۔انھوں نے جب شعوری آنکھیں کھولیں تو اپنے اردگرد کا جائزہ لیا اور دیکھا کہ ان کے آس پاس اینگلو انڈین ماحول اور معاشرہ تھا جس کی خوشبو ان کی کہانیوں اور ناولوں میں محسوس ہوتی ہے۔ان کی کہانیوں میں بھرپور قصے ہوتے ہیں۔افسانے طویل ہوتے ہیں۔کوئی بھی افسانہ دس بارہ صفحے سے کم کا نہیں ہوتا۔کوئی افسانہ تو اتنا طویل ہوجاتا ہے کہ تقریباً ایک سو صفحات پر پھیل جاتا ہے۔مثلاً افسانہ'ہاؤسنگ سوسائٹی'ایک سو اٹھارہ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ان کے افسانوں میں زندگی کی مختلف پرتیں دکھائی دیتی ہیں۔

بیسویں صدی کے نصف آخر میں اردو افسانوی ادب کو جو ترقی عطا ہوئی اس میں قرۃ العین حیدر کا اہم رول ہے۔طالب علمی کے زمانہ سے ہی کہانیاں لکھنا شروع کردیں۔افسانہ نگاری سے ہی اپنے تخلیقی سفر کا آغاز کیا۔بعد میں ناولوں کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا۔لیکن فطری طور پر عینی آپا افسانہ نگاری میں دلچسپی رکھتی تھیں اور بہت کم عمر میں انھوں نے کہانیاں لکھنا شروع کردیا تھا۔پہلی کہانی 'بی چوہیا کی کہانی(1944)میں شائع ہوئی۔اس وقت عینی کی عمر صرف چودہ برس تھی۔یہیں سے ان کی افسانہ نگاری کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ان کے افسانوں کی بہت سی اہم خصوصیات ہیں۔جیسے وہ روایتی واقعہ نگاری پر توجہ نہیں دیتیں۔رسمی پلاٹ سازی اور کردار نگاری کو پسند نہیں کرتیں۔بناوٹی کرداروں کے طریقہ کار کو پیش کرنا انھیں پسند نہیں۔وہ مغربی علوم سے بھی واقف تھیں لیکن مغربی

تعلیم کے ساتھ ساتھ وہ تاریخ، وقت اور شعور کی گرہوں کو بھی ٹٹول رہی تھیں۔نئی تہذیب، نئی تکنیک، نیا ذہن نوابوں اور رئیسوں کے نئے نئے رجحانات سے وہ اپنی آنکھیں چار کر رہی تھیں۔بورژوا طبقات کے نوجوان لڑکے لڑکیاں آنکھوں میں بڑے بڑے سنہری خواب سجائے ہوئے تھے۔محفلیں گھنٹوں تک سجتی رہتی تھیں۔الگ الگ مذاہب کے لڑکے لڑکیاں ایک ساتھ زندہ دلی اور مستی کے ساتھ رہتے تھے۔ان کا ایک ساتھ مل بیٹھنا اور سچی پکی دوستی کرنا عینی آپا کی نظروں میں کوئی نئی بات نہیں تھی۔سبھی لوگوں کے ذہنوں میں ملک کی آزادی کے خواب بسے ہوئے تھے۔قرۃالعین حیدر کے سبھی کردار غلام ہندوستان میں آزادی حاصل کرنے کی جستجو کرتے رہتے ہیں۔جاگیرداراور زمیندارانہ نظام اپنے آخری پڑاؤ پر تھا لیکن پورا معاشرہ ان سبھی حالات سے بخوبی واقف نہیں تھا۔ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کے پہلے افسانوی مجموعے'ستاروں سے آگے' کی کہانیاں منظر عام پر آئیں تو قارئین نے ان کے افسانوں کو اسی لیے نہیں پڑھا تھا کہ یہ اچھی کہانیاں ہیں بلکہ اس لیے کہ کہانیاں لکھنے والی کہانی کار سجاد حیدر یلدرم اور نذر سجاد صاحبہ کی بیٹی ہیں لیکن جب یہ اولین کہانیاں ناقدین اور قارئین کی آنکھوں سے گذریں تو پتہ چلا کہ یہ کہانیاں اسلوب اور فنی نقطۂ نظر سے کمزور ہیں لیکن بعد کے افسانوی مجموعوں میں ان کی فنی تکنیک، فنی چابکدستی اور تخلیقی نقطۂ نظر کے عناصر نظر آتے ہیں۔مصنفہ کی کہانیاں مغربی تعلیم کے اثرات سے پُر ہیں۔تاریخ اور بدلتے وقت کی کروٹیں ان کی تحریروں میں دکھائی دیتی ہیں۔نیا کلچر، جدید تکنیک اور ہجرت کا کرب ان کی تخلیقات کے پس منظر میں محسوس ہوتا ہے۔مشرقی اور مغربی اقدار سے بھی عینی آپا واقفیت رکھتی ہیں۔یہ تمام تر منظرنامے ان کے افسانے اودھ کی شام میں دکھائی دیتے ہیں۔افسانہ'اودھ کی شام' کا یہ اقتباس دیکھیے:

> ''انگریز ہوتے ہوئے بھی تم نے ہال روم میں فلور پر سب سے پہلے میرے روپہلے غرارے کو نوٹس کیا تھا تو تم کو معلوم ہونا چاہیے کہ تم لکھنؤ میں ہو جہاں شامِ اودھ ہوتی ہے۔یہ اودھ دراصل ایک بڑے رومینٹک سی سلطنت تھی۔تاریخ کے سنہری صفحات پلٹو تو معلوم ہوگا اور اس کے بادشاہ اور روز پر سنگیت سبھاؤں میں راجہ اندرا اور جوگ بنا کرتے تھے۔بڑے نالائق اور نکمے تھے وہ لوگ جبھی تو جگمگاتی ہوئی پرستان جیسی سرزمین ان سے چھین لی گئی اور یہ جو بے کار اور بے مصرف سے تعلق دار ان کے

زمانے کی یادگار باقی رہ گئے ہیں۔ان کی ریاستیں اور زمینیں ہماری نئی
جمہوری اور نمائندہ حکوت اب بے چارے مظلوم کسانوں کو دے دی گئی
کیونکہ یہ جنتا راج کا نیا زمانہ ہے۔''

(افسانہ 'شام اودھ'،آئینہ جہاں جلد اول،ص 194،NCPUL،نئی دہلی 2006)

قرۃ العین حیدر کے افسانوں کا پہلا افسانوی مجموعہ صرف بیس سال کی عمر میں 'ستاروں سے آگے' 1946 میں منظر عام پر آیا۔ جس میں کل چودہ افسانے ہیں۔عینی آپا کے ان ابتدائی افسانوں میں ایک ایسے ذہنی توازن کی تلاش کی گئی ہے جو موجودہ حال سے ماضی کے تعجب خیز تجسس کو دیکھنے کا خواہش مند طریقہ ہے۔اس مجموعے کے افسانے 'یہ افسانے' یہ باتیں،ستاروں سے آگے، دیودار کے درخت، پرواز کے بعد، سنا ہے عالم بالا میں کوئی کیمیا گر تھا، آہ اے دوست، ٹوٹتے تارے،لیکن گومتی بہتی رہی،ایں دفتر بے معنی،اودھ کی شام،ہم لوگ،رقص شرر،مونا لیزا، جہاں کارواں ٹھہرا تھا، ہیں جنھوں نے قرۃ العین حیدر کی افسانوی جہات کو آگے بڑھایا۔ان افسانوں میں نئی طرز ادا تخلیقی دنیا کے محدود ہونے کا احساس ہوتا ہے۔رومانی خیالات اور تخیلات کی دنیا میں ڈوبا معاشرہ اور ماحول سے لبریز یہ کہانیاں ایک ذات کی ہموار نظر آتی ہیں۔ مجموعۂ ستاروں سے آگے' کے یہ افسانے عام انسانوں کی روایت سے قدر مختلف تھے۔افسانوں کی زبان فطری بھی تھی اور تخلیقی بھی۔قرۃ العین حیدر نے اس مجموعے میں انگریزی زبان کا استعمال بھی کثرت سے کیا ہے۔ان کے فکروفن کے نقطۂ نظر سے دیکھیں تو ان افسانوں میں بہت سی کمیاں ہیں اور موضوعات بھی محدود ہیں۔ان کہانیوں میں عینی آپا کے خاندان کے پس منظر، ان کے عزیزوں کی باتیں اور گھر خاندان کی شان وشوکت کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔فکروفن کے نقطۂ نظر سے بھی قرۃ العین حیدر ان افسانوں کو افسانوی ادب میں لاکر کھڑا کردینے میں مجبور ہیں۔ان افسانوں پر بہت سی 'تنقیدی' تحریریں لکھی گئیں جس کی بہت سی وجوہات تھیں۔سب سے اہم وجہ تو یہ تھی کہ اس عہد میں نہایت بلند پائے کے افسانہ نگار وناول نویس تھے۔دوسری وجہ یہ تھی کہ مصنفہ کے افسانوں کے موضوعات وعنوانات ایسے تھے جو عام قاری کی سمجھ سے دور تھے اور فنی قلت عیاں ہورہی تھی۔

عینی آپا کے افسانوں میں پرلطف اسلوب نگارش کی شناخت محدود تھی۔حالانکہ افسانوں کے قارئین ستاروں سے آگے کے افسانوں میں شاعرانہ اسلوب بھی دیکھتے ہیں۔کرداروں اور

موضوعات میں انفرادیت کو دیکھتے ہوئے عام قارئین اور ناقدین نے تنقیدی تحریریں شروع کردیں۔کردار نگاری کے تمام پہلو کمزور نظر آتے ہیں۔بیشتر کردار خوابوں کی دنیا میں ڈوبے نظر آتے ہیں اور جب ان کے یہ خواب وخیال سچ ہوتے نظر آتے تو جذبات میں بہہ جاتے ہیں اور جذباتی بن کر آنسو بہاتے ہیں،افسانہ جہاں کارواں ٹھہرا تھا کا یہ اقتباس دیکھئے:

> ''اس سنسان اکیلی روش کی پتیوں کا سایہ جھک گیا ہے۔بے کراں رات کی خاموشی میں چھوٹے چھوٹے خداؤں کی سرگوشیاں منڈلا رہی تھیں۔پیانو آہستہ آہستہ بجتا رہا اور اسے ایسا لگا جیسے ساری دنیا،ساری کائنات،ایک ذرّے کے برابر بھی نہیں ہے اور اس وسیع خلا میں صرف اس کا خیال،اس کی یاد اس کا تصور لرزاں ہے۔''

(افسانہ'جہاں کارواں ٹھہرا تھا' آئینہ جہاں جلد اول،جمیل اختر،این سی پی یو ایل،نئی دہلی 2006)

جس وقت قرۃ العین حیدر کا یہ مجموعہ منظر عام پر آیا،اس وقت یا اس سے ذرا قبل لڑکے لڑکیاں ایک ساتھ کانونٹ اسکولوں میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔امیر،غریب،اعلیٰ اور متوسط طبقہ کے لڑکے لڑکیاں صرف اپنی خواہشات میں مگن تھے۔ان کی فکریں کھوکھلی اور بے سود تھیں۔چاروں جانب چرچ اور گرجا کا ماحول پھیلا ہوا تھا۔اس وقت ترقی پسند تحریک بھی عروج پر تھی۔زیادہ تر افسانہ نگار صرف ایک ہی مقصد کے تحت اپنی کہانیاں لکھ رہے تھے۔کارل مارکس کے اثرات سے اس وقت کے ادیب متاثر تھے جن کے واضح نشانات ان کی کہانیاں تھیں۔ترقی پسند تحریک کی موجودگی میں بھی عینی آپا کے افسانے ترقی پسند تحریک سے الگ تھے۔ایسے وقت میں مصنفہ کے افسانوں کے کردار زندگی کو جی بھر کر جینا چاہتے تھے۔ان کے لیے زندگی ایک تماشے کے مانند تھی۔اسی عہد میں قرۃ العین حیدر کی کہانیاں اسلوب اور فکر وفن کے تعلق سے بالکل نئی تھیں۔اور حد تو یہ تھی کہ افسانوں کے اجزائے ترکیبی پر بھی کوئی دھیان نہیں دیا گیا تھا۔کہانیوں کے کردار خوشحال گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے اور اپنی خواہشات کو پورا کرنے کے لیے ستاروں کو چھونا چاہتے تھے مگر افسوس ان کے کرداروں کی زندگی کا فلسفہ صرف کھوکھلا اور بے معنی ہے۔قرۃ العین حیدر کی فنی صلاحیت بھی قابل داد ہے کہ انھوں نے کئی کہانی کسی تحریک کو سامنے رکھ کر یا کسی تحریک کے مقصد کو سامنے رکھ کر نہیں لکھی۔ان کی شخصیت کے مانند ان کے افسانے بھی سبھی دیگر افسانہ نگاروں سے مختلف تھے جن میں فن کی کمی تھی۔

'ستاروں سے آگے' کے افسانوں میں نہ تو منشی پریم چند کا دیہاتی پس منظر دکھائی دیتا ہے اور نہ ہی عصمت چغتائی کے جنسی ماحول کی تصویریں ہیں۔ کیونکہ ہماری زندگی کا تجربہ تو کچھ اور ہی تھا جس کے اشارے ہمیں عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی اور سعادت حسن منٹو کی کہانیوں میں ملتے ہیں۔ بیدی کا افسانہ 'گرہن' اور منٹو کی کہانی 'ہتک' کے ذریعے ہم زندگی کی اصل حقیقت کو جان لیتے ہیں، لیکن عینی آپا کے افسانوں میں خاندانوں کا شیرازہ بکھرا بکھرا نظر آتا ہے۔ مشترکہ تہذیب ریزہ ریزہ ہوتی نظر آتی ہے۔ کرشن چندر ترقی پسند تحریک کے حامی تھے۔ مگر ان کی ترقی پسندی کا جادو قرۃ العین حیدر پر نہ چل سکا۔ منٹو نے افسانوں میں جنسی نسوانی کردار بڑی عمدگی سے پیش کیے ہیں۔ لیکن عینی آپا کے افسانوں میں ایسے کردار دور دور تک نظر نہیں آتے۔ مصنفہ کے کرداروں میں تفکرات کیکمی ہے۔ صرف ذہنی دلچسپی اور تفریح کے لیے کردار نگاری نبھائے ہیں۔ اپنے معاصرین افسانہ نگاروں سے الگ ہو کر عینی آپا نے ایسے ماحول کو پیش کیا جو انگریزی کلچر سے پیدا شدہ اینگلو انڈین کلچر تھا۔ اسی لیے اس مجموعے پر ممتاز ناقد پروفیسر عبد المغنی لکھتے ہیں:

> ''لڑکے اور لڑکیاں سبھی عام طور سے اپنے اپنے خیالوں میں مگن اور تمناؤں میں الجھے ہوئے ہیں، وا پنے گرد و پیش پھیلی ہوئی زندگی، خاص کر فطرت کا پورا حسن پی جانا اور لطف و مسرت کا ایک ایک قطرہ نچوڑ لینا چاہتے ہیں۔ یہ اعلیٰ متوسط طبقے کے خوشحال اور خوش باش نونہال ہیں جو زندگی کو ایک تفریح، ایک کھیل اور ایک تماشا سمجھتے ہیں، امنگوں سے بھرے ہوئے ہیں اور ستاروں پر کمند ڈالنا چاہتے ہیں لیکن ان کا فلسفۂ حیات بالکل کھوکھلا، بنجر اور بانجھ ہے۔ یہاں تک کہ ان میں جو افراد تفکّر کا مظاہرہ کرتے ہیں وہ بھی کوئی اعلیٰ فکر و نظر نہیں رکھتے ہیں اور ان کے شعور و کردار میں نہ وزن ہے، نہ استقلال، تفکر بھی ان کے لیے بس ایک دماغی تفریح ہے۔''

(قرۃ العین حیدر کا فن، پروفیسر عبد المغنی، ص 44-43، موڈرن پبلی شنگ ہاؤس، دہلی 1958)

قرۃ العین حیدر نے 'ستاروں سے آگے' مجموعے میں نئے اسلوب کا استعمال کیا ہے۔ منفرد پلاٹ والے افسانوں پر تنقید کرنے والے ناقدین نے خوب تنقیدی تحریریں لکھیں، مگر اس حقیقت سے انکار کرنا ناممکن ہے کہ جو ادیب جس ماحول میں رہتا ہے، اسی ماحول اور اسی معاشرے کی تصاویر اپنی تخلیقات میں پیش کرتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ مصنفہ نے جب پہلا افسانوی مجموعہ لکھا

،اس وقت یعنی تقریباً بیس سال کی عمر تک انھوں نے جس ماحول میں زندگی بسر کی۔ وہ جاگیردرانہ اور اعلیٰ طبقے کا ماحول تھا۔اس ماحول سے وہ کافی متاثر تھیں۔اس طبقے کو انہوں نے قریب سے دیکھا تھا۔ اسی لیے ان کے پہلے افسانوں کے مجموعے کے کرداروں کا تعلق زمیندارانہ اور جاگیردارنہ گھرانوں سے ہے۔عینی آپا نے اپنے عہد کے زمینداروں و جاگیرداروں کے ذریعے ان کے رہن سہن کی سچی تصاویر قارئین کے روبروپیش کی ہیں۔'ستاروں سے آگے' میں اسلوب، کردار، خوشی وغم اور کرداروں کے احساسات پر تبصرہ کرتے ہوئے محمود ہاشمی لکھتے ہیں:

> ''ستاروں سے آگے' جدید افسانے کے طرز و اسلوب کی نشاندہی تو ضرور کرتا ہے، لیکن اس افسانوی مجموعہ کی کائنات بہت محدود ہے۔عفوانِ عہد کی رفاقتیں، واہمے اور خواب، اس مجموعے کے افسانوں کی گم شدہ، لیکن مرغوب اور محبوب منزلیں ہیں۔ یہ گم شدگی میں خود اپنی سرشت میں ایک خوابناک احساس ہے۔اس احساس کے باعث، ان افسانوں میں مسرت کی تلاش اور خوف وتحیّر کا جذبہ مسلسل موجود رہتا ہے جو اکتا دینے والی یکسانیت کو جنم دیتا ہے۔ بیشتر کردار ایسے نوجوان ہیں جو فلرٹیشن سے اکتا کر حقائق کی جانب متوجہ ہونا چاہتے ہیں یا تنہائی کے شدید احساس سے خود کو مضمحل بنا لیتے ہیں۔''

(اردو افسانہ، روایت اور مسائل، گوپی چند نارنگ، ص40-439، EPH، دہلی، 2004)

قرۃ العین حیدر رومانی تصورات کی قائل تھیں۔مزاج بھی رومانی تھا۔عینی آپا کے رومانی مزاج کا مطلب عشق ومحبت نہیں بلکہ وقت کا فلسفہ، ہندو مسلم مشترکہ تہذیبی اقدار، تاریخی وسماجی شعور کی کارفرمائی، ان کے رومانی احساسات کی منازل ہیں۔مصنفہ کے والد سجاد حیدر یلدرم رومانی افسانہ نگار تھے۔والد کے اثر سے قرۃ العین حیدر بھی رومان میں ڈوبی نظر آتی ہیں۔ان کے ابتدائی افسانوں میں رومانی نوعیت نظر آتی ہے۔عینی آپا کے اس مجموعے کے پہلے ہی افسانے 'دیوداروں کے درخت' میں رومانی برتاؤ کا سہارا لیا ہے۔ان کہانیوں میں افسانہ نگار اپنی ذات میں اسیر نظر آتی ہیں۔رومانی ناآسودگی کی کیفیت نظر آتی ہے۔ماہنامہ نیا دور قرۃ العین حیدر نمبر 2009 میں بقول علی احمد فاطمی:

> ''سچ تو یہ ہے کہ تمام تر تاریخی شعور تہذیبی معرفت اور فلسفیانہ موشگافیوں

کے باوجود قرۃ العین حیدر بھی رومانی مزاج کی فن کار ہیں‘‘۔کہانی ’دیودار کے درخت‘ میں بچے ناشپاتیوں اور آلوچوں کے سائے میں رہتے ہیں اور ہری ہری گھاس کے میدانوں میں تفریح کرتے کھیلتے کودتے رہتے ہیں۔اپنی موج مستی میں خوبانیوں کو توڑتے رہتے ہیں،موسیقی سنتے رہتے ہیں اور ڈرائنگ روم کی قالین پر دوڑتے دوڑتے یہ بچے بھی جوان ہوجاتے ہیں۔‘‘

افسانے ’دیودار کے درخت‘،’ستاروں سے آگے‘،’یہ داغ داغ اجالا‘،’جہاں کارواں ٹھہرا تھا‘ وغیرہ عمدہ افسانے ہیں۔افسانہ ’دیودار کے درخت‘،کو پڑھتے وقت قاری کو اکتاہٹ اس لیے محسوس نہیں ہوتی کیونکہ بھول بھلیوں میں قاری کی مٹھ بھیڑ خوبصورت نیلی،آنکھوں والی لڑکیوں سے ہوتی ہے۔جنھیں خود بھی زندگی کی بھول بھلیوں میں کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا۔یہ افسانے رومانیت کی بھرپور فضا سے لبریز ہیں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ عینی آپا صرف رومانی تخیلات کی دنیا میں ہی گم نہیں ہوتیں بلکہ زندگی کی حقیقت نگاری سے بھی تعلق بنائے رکھتی ہیں۔رومان کو زندگی کے حقیقی پس نظر میں تلاش کرتی ہیں۔حقیقت اور محبت کے اشاروں کنایوں سے کام لیا گیا ہے۔افسانے کی ابتدا میں ہی نئے رومانی ماحول کی فضا دکھائی دیتی ہے۔اس کہانی کے کردار اتنی دلچسپ باتیں کرتے ہیں کہ اپنی میٹھی مدھر آواز میں نہایت میٹھی اردو زبان میں،اتنی فیشن والی عمدہ گفتگو کرتے ہیں کہ طبیعت کھل اٹھتی ہے۔افسانہ ’دیودار کے درخت‘ کا یہ اقتباس دیکھئے:

’’نیلے پتھروں کے درمیان سے گذرتی ہوئی جنگلی نہر کے خاموش پانی پر تیرتے ہوئے دیودار کے سائے بیتے دنوں کی یاد کے دھندلکے میں کھو کے مٹتے جارہے ہیں۔بھیگی بھیگی سرد ہوائیں چیڑ کے نوکیلے پتوں میں سرسراتی ہوئی نکل جاتی ہیں اور دیوداروں کے جھنڈ کے پرے اس اونچی سی پہاڑی پر بنی ہوئی سرخ عمارت کی کھڑکیوں کے شیشوں پر چاندی کرنیں پڑی جھلملاتی رہتی ہیں لیکن کبھی بھول کر بھی "We met in the valley of Moon" والا محبوب گیت گانے کو دل نہیں چاہتا۔ناشپاتی اور خوبانی کی جھکی ہوئی شاخوں کے نیچے سہ پہر کی چائے اب بھی ہوتی ہے مگر امی کی نظر بچا کے کچّی خوبانیاں نہیں توڑی

جاتیں۔ نیچے وادی میں رات کے نو بجے والی ٹرین روز اسی طرح بل کھاتی
ہوئی گذرتی ہے لیکن اس کی آواز سنتے ہی بے تحاشا بھاگتے ہوئے جا کر
مسافروں کو شب بخیر کہنے یا روشنیاں گننے کی اب قطعی ضرورت محسوس نہیں
ہوتی۔''

(افسانہ'دیودار کے درخت' آئینہ، جہاں جلد اول، ص88، ڈاکٹر جمیل اختر، NCPUL، دہلی)

قرۃ العین حیدر ایک اچھی مصورہ بھی تھیں۔ تخیلات کی تازگی سے خوابوں کی دنیا میں بسنے والے کو تراشنا انہیں خوب آتا ہے۔ یہ خصوصیات ان کے افسانوں میں دیکھنے کو ملتی ہے لیکن ان افسانوں کے کردار صرف اپنی دنیا میں، اپنے خوابوں میں اور اپنے تخیلات میں ڈوبے رہتے ہیں۔ ان کے اندر تہہ داری اور گہرائی بھی نہیں ہے جو افسانوں میں تاثر قائم کر سکے۔ ان عناصر کو ذہن میں رکھتے ہوئے یہ اندازہ کر لینا آسان ہو جاتا ہے کہ یہ عینی آپا کے اپنے ہی گھر کی روداد ہے اور ان کی ڈائری میں لکھی کہانی کے اوراق ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کہنے کے لیے ان کے پاس کوئی کہانی ہی نہیں ہے۔ ان افسانوں کے کرداروں کی زندگی بھی کھوکھلی ہے۔ کہانیوں میں فن کی قلت ہے۔ کردار بھی احساس برتری کے شکار نظر آتے ہیں۔ کبھی کبھی ان کے مزاج سے احساس کمتری کی بو آتی ہے اور کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے عشق ومحبت اور رومان ہی مصنفہ کے لیے سب کچھ ہے۔ کہیں کہیں روحانی ناآسودگی ہے تو کہیں یادوں میں کھوئے ہوئے بڑے بڑے خیالات میں گم ہیں۔ مگر سب کے سب کردار کھوکھلی خواہشات میں ہی مگن رہتے ہیں، کہانیوں میں کوئی ایسا دلکش منظر دکھائی نہیں دیتا جو ایک نغمگی اور دلچسپی کا ماحول پیدا کر سکے۔ قرۃ العین حیدر کے اس مجموعے کے بیشتر کرداروں کی زندگی بے معنویت کی شکار ہے۔ ممتاز ناقد وارث علوی لکھتے ہیں:

''اس مجموعہ کے افسانے اپنی ابتدائی کشش کھو چکے ہیں تو ان کا سبب یہی
ہے کہ وہ کسی بڑے اہم تجربہ کا بیان نہیں کرتے۔ ان میں نہ کوئی بڑا کردار
ہے، نہ کوئی دلچسپ انسانی صورت حال۔ دل ٹوٹنے کی کہانیاں
ہیں۔ خوب گپ شب ہے۔ اسکینڈل مانگرنگ ہے۔ لیکن لڑکے اور
لڑکیاں اور ایک دوسرے کے سامنے نہیں آتے۔ آنکھیں چار نہیں کرتے،
ایک دوسرے کے دل میں نہیں جھانکتے۔ اس لیے کوئی ڈرامہ کوئی گہرا
جذباتی تصادم جنم نہیں لیتا۔ ہم یہ بھی نہیں جان پاتے اور اگر جان پاتے

ہیں تو بے دلی سے کہ وہ جو ایک دوسرے کے لیے بنے تھے، کیوں پائیدار
بندھن میں بندھ نہ سکے۔کیوں جدا ہو گئے اور اب افسردہ وتنہائی زندگی
گزار رہے ہیں۔''

(سہ ماہی، روشنائی، وارث علوی ص 34، نثری دائرہ پاکستان جولائی تا ستمبر 2008)

مجموعی طور پر کہہ سکتے ہیں کہ قرۃ العین حیدر افسانوی ادب کا جانا پہچانا نام ہے۔ان کے فکشن میں انسانی زندگی کی تہہ داری اور مشرقی ،مغربی زندگی کا مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔عینی آپا ایک ایسے قدامت پرست خاندان میں پیدا ہوئیں جو اپنے دور کا ماڈرن گھرانا تسلیم کیا جاتا تھا۔ملک کے بٹوارے نے اس کو کافی پریشانی کیا تھا جس کی وجہ سے وہ غمگین بھی رہتی تھیں۔لیکن اپنے غم کو چھوڑ کر انہوں نے ادبی کارناموں کے ذریعے لوگوں کے دل جیت لیے۔آپ نے ناول،افسانے ،رپورتاژ خاکے اور سرنامے کے علاوہ تراجم کے ذریعے قارئین کے دلوں میں اپنی جگہ بنائی۔بہت سے ناقدین انہیں علامہ اقبال کی مانند اچھا فنکار تسلیم کرتے ہیں مگر بہت سے ناقدین نے عینی آپا کی فنی تکنیک اور جدید اسلوب کو لے کر ان کی خصوصیت میں کمیاں نکالنا شروع کر دیا مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ مصنفہ کی افسانہ نگاری کا آغاز ایسے ماحول میں ہوا جب یہ عالم بہت سی سیاسی ، معاشی اور ذہنی اور انقلابی تحریکوں سے گذر رہا تھا۔عظیم ملکوں کی جنگوں سے انسانی زندگی منتشر ہو گئی تھی۔افسانہ 'دیودار کے درخت' میں قرۃ العین حیدر نے اپنی تخلیقی جست بھرنے کی پرزور کوشش کی ہے۔اگر ان کے ابتدائی افسانوی مجموعے کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ مجموعہ 'ستاروں سے آگے' میں کافی فنی تکنیک کی کمی ہے،مگر یہ بھی حقیت ہے کہ اس مجموعے کی کہانیوں کے مطالعے سے کہانی کار کی شخصیت کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے اور نتیجہ نکلتا ہے کہ اس مجموعے کے سبھی افسانے اردو میں پہلی بار تحریر کیے گئے جن کا مقصد صرف بیانیہ طرز کا احوال تھا۔آخر میں یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ قرۃ العین حیدر کا افسانوی مجموعہ 'ستاروں سے آگے' فنی نقطۂ نظر سے کمزور ہے۔

☆☆☆

ڈاکٹر وصی اعظم انصاری
لکھنؤ

میرٹھ کی چند غیر معروف شاعرات

دنیا کے ہر خطے میں مشرق ہو کہ مغرب، عرب ہو کہ عجم، دہلی ہو کہ دکن، لکھنؤ کہ میرٹھ خواتین نے سماجی، سیاسی، تہذیبی، مذہبی، علمی وادبی ہر میدان میں اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھائے ہیں۔ خواتین میں فنون لطیفہ سے لذت گیر ہونے کے جذبات مردوں سے کچھ زیادہ ہوتے ہیں۔ مصوری، موسیقی اور شاعری کے لئے جن لطیف احساسات، نازک خیالات اور پرکشش انداز بیان کی جو اشد ضرورت ہوتی ہے وہ خواتین میں بدرجہ اتم موجود ہوتے ہیں۔ لیکن معاشرے اور ماحول نے مستورات کے جذبات و کیفیات کو بہت کم ابھرنے، ظاہر ہونے اور انہیں منظر عام پر آنے کا موقع دیا۔ تاریخ ادبیات کے مطالعے کے بعد آپ کی جمال پرست نگاہ ایک نسوانی پیکر کی دید کو ترس جائے گی۔ عرب کے ریگستان کو شاعرات کی تخلیقات نے نخلستان میں تبدیل کر دیا۔ ایران کی سنگلاخ زمین کو فارسی شاعرات نے گلستاں بنا دیا اور برصغیر ہند تو خاتون شاعرات کی اس درجہ ممنون ومشکور ہے کہ اس کے بار احسان سے کبھی فراموش نہیں ہوسکتی ہے۔ ہمارے مورخین ادب یا ارباب نقد نے خواتین کے اتنے عظیم کارنامے اور ضخیم سرمائے سے حد درجہ بے اعتنائی برتی اور دوہرے معیار کو قائم رکھا ہے۔ اردو کے مشہور ومعروف نقاد گوپی چند نارنگ نے معاشرے میں عورتوں کے ساتھ صدیوں سے برتے جانے والے غیر مساویانہ سلوک کی تلخ حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے صدارتی خطبہ میں فرماتے ہیں:

> ’’عورت اب بھی بری طرح سماجی استبداد اور بے انصافیوں کی شکار ہے۔ جس طرح اور دبے کچلے طبقات ہیں عورت بھی ان میں سے ایک ہے۔ سماج میں، صدیوں کی تاریخ میں پورے کرۂ ارض پر بشمول ہندوستان

اور پاکستان کے معاشروں نے phallocentric تہذیبوں نے یعنی
تمام رویّوں ،فلسفوں ،ادب وفنون لطیفہ میں جو مرد کی سوچ نے قائم کئے
ہیں۔ان میں کہیں نہ کہیں عورت آپریشن کا شکار رہی ہے۔خاتون کو خدا
نے وہی sensibility دی ہے جو کسی مرد کو میسر ہے۔ایک تو ہم نے
اسے تعلیم سے دور رکھا۔ پھر ہم نے تخلیق سے دور رکھا۔ جب کسی نے کچھ
تخلیق کیا ہم نے اس کا نوٹس نہیں لیا ۔''(1)

خواتین کی دلربا اداؤں پر جان قربان کرنے والے پدرانہ نظام کے پروردہ شاعروں نے اپنے تذکروں میں شاعرات کا تذکرہ تک نہیں کیا ہے۔اردو کے ابتدائی تذکروں میں میر تقی میؔر کے نُکات الشعراء کا شمار ہوتا ہے لیکن اس میں بھی شاعرات کا تذکرہ دیکھنے کو نہیں ملتا ہے۔میؔر کی دختر نیک اختر خود شاعرہ تھی اور بیگم تخلص کرتی تھی جس کا ذکر میؔر کے تذکرہ میں دیکھنے کو نہیں ملتا ہے۔نواب مصطفیٰ خان شیفتہ نے تذکرہ گلشن بے خار' میں شاعرات کا ذکر کیا ہے اور غالباً پہلی بار کسی تذکرہ میں شاعرات کا ذکر دیکھنے کو ملتا ہے۔عبدالغفور نساخ کا تذکرہ سخن شعراء' میں بطور ضمیمہ 39 شاعرات کا مختصر تذکرہ کیا گیا ہے۔اردو شاعرات کے تذکرہ کے متعلق شاداب علیم اپنی کتاب نظم جدید کی تثلیث میں رقم طراز ہیں:

"اردو تذکرہ نگاری کی تاریخ میں صرف چھ تذکرہ نگار ایسے گذرے ہیں
جنہوں نے شاعرات کے کلام کو اردو دنیا سے متعارف کرایا۔ان میں فصیح
الدین رنجؔ میرٹھی کا تذکرہ'بہارستان ناز'،درگا پرساد ناؔدر دہلوی کا تذکرہ
'چمن انداز'،مولوی عبدالحی صفا بدایونی کا تذکرہ" شمیم سخن'،مولوی عبدالباری
آسی اُلدنی میرٹھی کا تذکرہ' 'تذکرۃ الخواتین'،مولوی محمد عباس کا تذکرہ
'تذکرۃ النساء خصوصی طور پر قابل ذکر ہیں لیکن فصیح الدین رنجؔ کو یہ فخر
حاصل ہے کہ انہوں نے اردو شاعرات کا تذکرہ اردو ادب میں پہلی بار
پیش کیا۔یہ تذکرہ پہلی مرتبہ 1864ء مطبع دارالعلوم میرٹھ سے با اہتمام
منشی علی شائع ہوا۔دوسرے تمام تذکرہ جات بارہ سال بعد یعنی 1876ء
کے بعد تحریر کئے گئے۔"(2)

یہاں پر یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ میرٹھ کے ارباب نقد یا تذکرہ نگاروں نے شاعرات کے کلام کو اردو دنیا سے متعارف کرانے (رنج میرٹھی اور مولوی آسی الدنی میرٹھی نے) میں اہم کردار ادا کیا ہے اور ان شاعرات کو بقائے دوام عطا کیا ہے۔ رنجؔ میرٹھی کے تذکرہ کو تعلیم نسواں کا پہلا منشور کہا جائے تو مبالغہ نہیں ہوگا۔

سرزمیں میرٹھ کو زمانہ قدیم سے ہی سماجی، سیاسی، تہذیبی، لسانی و ادبی اعتبار سے افتخار و امتیاز حاصل رہا ہے۔ علمی و ادبی نقطہ نظر سے بات کی جائے تو یہ علاقہ ہمیشہ سے سرسبز و شاداب رہا ہے۔ یہاں کے شاعروں اور ادیبوں نے منظوم و منثور کی مختلف اصناف سخن میں اپنی محنت و کاوش سے رنگ برنگ کے جو پھول کھلائے ہیں اس کی خوشبو سے اردو کے شیدائیوں کے اذہان و قلوب معطر ہیں۔ انہوں نے جس طرح سے چمن اردو کی آبیاری کی ہے، دنیائے اردو اس سے بخوبی واقف ہے۔ قلقؔ میرٹھی، رنج میرٹھی، اسماعیلؔ میرٹھی، بیانؔ میرٹھی، حزیںؔ میرٹھی، حفیظؔ میرٹھی، حورؔ میرٹھی، فہمیدہ ریاضؔ، ساجدہ زیدی، زاہدہ زیدی اور پاپولرؔ میرٹھی وغیرہ کے نام نامی عالمی شہرت و مقبولیت کے حامل ہیں۔ میرٹھ کے قلم کاروں میں مردوں کے شانہ بہ شانہ مستورات نے بھی کلام موزوں اور کلام غیر موزوں میں اپنی فن کاری کے جوہر دکھائے ہیں۔ ان کے کلام میں لطیف احساسات، نازک خیالات، ملک و قوم کا درد، ندرت بیان کا ذکر جگہ جگہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ انہوں نے اپنے عمیق خیالات و نظریات سے سماجی اصلاح کی کامیاب کوششیں کی ہیں۔ میرٹھ کی متعدد شاعرات نے اپنے منفرد کلام، متفرق خیالات، عصری مسائل و اسلوب بیان سے اپنی الگ شناخت قائم کی اور اپنے شہر کی شہرت و مقبولیت کو بام عروج پر پہنچا دیا ہے اور اردو ادب کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کر دیا ہے۔

صابرہ سلطان نے منظوم و منثور دونوں میں اپنی فنکارانہ صلاحیت اور ذہنی بصیرت کے جوہر دکھائے ہیں۔ آپ شاعری میں حزیںؔ تخلص کا استعمال کرتی تھیں تو نثر میں شکیبا کے قلمی نام سے اپنی فنکارانہ صلاحیت کے جوہر صفحہ قرطاس پر بکھیرتی تھیں۔ محمد اللہ کے گھر میں فروری 1919 میں صابرہ سلطان حزیںؔ کی قلقاری سنائی دی اور ڈھائی برس کی عمر میں ہی والد ماجد محمد اللہ اس دنیا سے رحلت فرما گئے۔ تحصیل علم کی پیاس ننیہال میں رہ کر بجھائی۔ خاندانی ماحول اور اطراف و اکناف میں ادبی محفلوں و مجلسوں نے انہیں علم و ادب کا شیدائی بنا دیا۔ انہوں اپنی محنت و لگن سے

پنجاب یونیورسٹی سے اپنی پڑھائی مکمل کی۔آپ بہت ہی نکھرا ہوا ادبی ذوق رکھتی تھیں جوان کی نثر نگاری سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔مکتوب نگاری میں ان کو کمال کا ملکہ حاصل تھا۔ان کے خطوط کا اسلوب بہت ہی سادہ اور پختہ ہے۔انہیں بات کو پرتکلف و پرکشش بنا کر مکالماتی انداز میں پیش کرنے کا ہنر خوب آتا ہے۔ان کی شاعری میں محبوب سے جدائی کا درد ہے جو یاس وحسرت کی طرف اشارہ کرتا ہے اوراس سے ملنے کی چاہت وآرزو بھی اپنے دل میں بسائے رکھتا ہے۔ان کے کلام میں جذبات نگاری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے،جس میں شدت اور بے قراری کا احساس بھی ہے۔ان کا طرز تکلم بہت ہی صاف اور شگفتہ ہے جس میں آبشار کی سی روانی دیکھنے کو ملتی ہے۔انہوں نے اپنے کلام میں روز مرہ کے عام بول چال کے لفظیات کو بہت سلیقے کے ساتھ برتا ہے۔جذباتی اعتبار سے آپ کا کلام بہت ہی بلند ہے۔مثال کے طور پر ان کی نظم 'میری داستان سن لے' کے یہ بند ملاحظہ ہوں جوان کی جذبات نگاری کی عکاسی کرتے ہیں ؎

تجھے قسم ہے میری بے قرارآہوں کی
تجھے قسم ہے میری اشک بار آنکھوں کی
تجھے قسم ہے مری دیوانہ وار باتوں کی
امین قلب حزیں 'میری داستان سن لے
ترے حضور میں کرلوں میں شرح آیت غم
تو آج سن لے مری خونچکاں حکایت غم
خدا گواہ! نہیں ہے مجھے شکایت غم
امین قلب حزیں' میری داستاں سن لے (3)

ان کی غزلوں میں سوز وگداز اورغم والم کی بہتات ہے جس کا ذکر ان کے کلام میں جگہ جگہ دیکھنے کو ملتا ہے جوان کی زندگی کے نشیب وفراز کا پتہ دیتا ہے۔یہاں پرغزل کے چند اشعار توجہ کے طالب ہیں ؎

یہ ربط وضبط کہاں تک نبھائے جاؤں میں — کہ دل کا خون ہواور مسکرائے جاؤں میں
جو کوئی سنتا رہے بیٹھ کر پس پردہ — تمام عمر اسی طرح گائے جاؤں میں
لبوں پہ دم ہے مگر ان کا حکم ہے یہ حزیںؔ — کہ داستان محبت سنائے جاؤں میں(4)

خورشید اقبال حؔیا میرٹھ کے بلند پایہ شاعر صوفی نذؔیر احمد کی دختر نیک اختر اور گوہر اقبال حوؔر کی ہمشیرہ ہیں۔آپ کا تعلق زبیری خانوادہ سے ہے جو میرٹھ کے قرب و جوار میں بہت ہی مقبول ومعروف ہے۔انہوں نے جس ادبی ماحول میں آنکھیں کھولیں وہاں ہر وقت شعر وشاعری کا چرچا ہوتا رہتا تھا۔لہٰذا انہوں نے بھی بہت جلد وفا کی دیوی کے قدموں میں سر جھکا دیا اور دیوی نے ایسا آشیرواد دیا کہ تاعمر شاعری کرتی رہیں۔ان کی نکھری ہوئی شاعری کے چرچے گھر کی چہار دیواری کو پار کر کے شہر میں چہار سو ہونے لگے۔حؔیا میرٹھی نے اپنے عہد کے مشہور ومعروف شاعر اور ماہر سخن سیماؔب اکبرآبادی کی شاگردی اختیار کر لی اور ان سے اپنے کلام پر اصلاح لیتی تھیں۔وہ بہت عرصے تک ’خاتون مشرق میرٹھ کی مدیرہ بھی رہیں۔وہ منظوم ومنثور دونوں میں مہارت رکھتی ہیں کیونکہ انہیں عربی،فارسی،انگریزی پر عبور حاصل تھا۔ان کا ذوق سلیم بہت نکھرا ہوا تھا جو قاری کو بہت جلد اپنی طرف متوجہ کر لیتا تھا۔قیام پاکستان کے بعد وہ کراچی چلی گئیں اور وہیں 18 /مئی 1976ء میں وفات ہوئی۔ان کے کلام میں رومانی، جذباتی، اصلاح نسواں اور قومی وملی ہر نوع کی نظمیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ان کا طرز ادا بہت ہی نکھرا ہوا اور شگفتہ اور پختہ ہوتا ہے۔ان کے کلام میں درد والم اور سوز وگداز پایا جاتا ہے اور کہیں کہیں پر کیف و پرمسرت جذبات کا امتزاج بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔عربی وفارسی کے آسان لفظوں،سادہ تشبیہات واستعارات کے استعمال نے ان کے کلام میں روانی پیدا کر دی ہے جو تسلسل مطالعہ کو دعوت دیتی ہے۔وہ آزادی نسواں کی بات کرتی ہیں اور چاہتی ہیں کہ خواتین جدو جہد کا جھنڈا اٹھائیں، بیداری پیدا کریں اور اپنے حقوق و مراعات کو حاصل کرنے کے میدان میں نکل پڑیں۔وہ قوم وملت کی آزادی کی بھی خواہاں ہیں اور خواتین سے علم بغاوت اٹھانے کی اپیل کرتی ہیں۔یہاں پر وہ کہیں نہ کہیں علامہ راشد الخیری کے نظریہ اصلاح نسواں سے متاثر دکھائی دیتی ہیں۔ان کی نظم ’خاتون وطن سے‘ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

ذرے ذرے کو چمکا دے تیرا طوفان عمل — گرمیِ احساس و ذوق بے نہایت چاہئے
کردے جو ناپید دنیا سے جمود و بیخودی — تیری رگ میں وہ طوفان قیامت چاہئے
جور و استبداد کی زنجیر کو جو توڑ دے — دست بازو میں وہ قوت اور طاقت چاہئے
تیری ہستی کو جو لے پہنچے فرازعرش پر — تیرے دل میں وہ یقین فتح ونصرت چاہئے

حیاؔ میرٹھی کی شاعری میں محبوب سے گلہ وشکوہ اور عہد وفا کے ساتھ ساتھ درد والم کا ذکر ملتا ہے۔فراق یار میں ان کی کیفیت جذباتی وجنونی ہو جاتی ہے، یہاں پر ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے۔نمونہ کلام ملاحظہ ہوں ؎

بیان قصہ قلب نزار کیوں نہ کروں | تجھی پہ درد ترا آشکار کیوں نہ کروں
مجھے جب آپ سے،اپنے سے اعتبار وفا | تو ہی بتا کہ ترا اعتبار کیوں نہ کروں
وہ آنکھ جس کو دکھایا تھا تو نے روئے جمیل | تیرے فراق میں اب اشکبار کیوں نہ کروں
جو تو ہی مجھ کو نہ بھیجے کوئی پیام سکوں | قبائے صبر کو پھر تار تار کیوں نہ کروں (6)

گوہر اقبال نام اور تخلص حورؔ ہے۔آپ میرٹھ کے زبیری خاندان سے تعلق رکھتی ہیں اور حیاؔ میرٹھی آپ کی حقیقی بہن ہیں۔گھر میں شعر وشاعری کا چرچا ہوتا تھا اور علمی وادبی موضوعات پر مباحث ہوا کرتے تھے،اسی علمی وادبی ماحول میں آپ کی شخصیت پروان چڑھی تھی۔ان کا علم و ادب سے حد درجہ لگاؤ تھا۔مذہبی اور دیگر علوم کے مطالعہ نے ان کی صلاحیت ولیاقت میں چار چاند لگا دیے۔کثرت مطالعہ نے ان کے خیالات ونظریات میں وسعت پیدا کردی۔تسکین ذوق کے لئے شاعری کرتی تھیں۔انہیں شہرت،مقبولیت ومحبوبیت کی کبھی فکر لاحق نہیں ہوئی۔ان کا بیشتر کلام غیر مطبوعہ ہونے کے سبب ضائع ہوگیا ہے۔ان کے کلام میں شگفتگی ورعنائی پائی جاتی ہے۔ان کے یہاں جذبات اور رومان کا حسین امتزاج دیکھنے کو ملتا ہے۔نمونہ کلام ملاحظہ ہوں ؎

آہستہ آہستہ مرے تخیّل میں آتا ہے تو | تسکین میں ڈوبے ہوئے نغمے سے برساتا ہے تو
اور میری نظروں میں بھی یوں مسکرا جاتا ہے تو | جیسے ہجوم ابر سے تارا چمک کر ہو عیاں

اے شاہد دور نہاں! اے شاہد دور نہاں!(7)

اسماعیل بیگم کا اصل نام اشرف زمانی ہے۔آپ میرٹھ کے نواب محمد اسماعیل خان کی شریک حیات ہیں۔عربی،فارسی اور انگریزی پر عبور حاصل تھا۔اس وقت ہندوستان میں تحریک آزادی کی تحریک چل رہی تھی اور اسماعیل بیگم اس میں برابر شریک ہوتی رہتی تھیں۔وہ اس عہد کے سماجی،مذہبی اور سیاسی نشیب وفراز سے بخوبی واقف تھیں۔وہ خواتین کو بیدار کرنے کے لئے برابر کوشاں رہتی تھی۔انہوں نے میرٹھ میں خواتین کو تعلیم یافتہ بنانے کے لیے حمیدیہ زنانہ اسکول قائم کیا تھا تاکہ عورتیں تعلیم کے زیور سے آراستہ ہوکر اپنے حقوق وآزادی کو حاصل کرنے کے لئے

جدو جہد کر سکیں۔ان کا انتقال مئی 1940ء کو ہوا تھا۔اسماعیل بیگم کو شعر و شاعری سے گہرا لگاؤ تھا۔ ان کے کلام میں زبان و بیان کی صفائی، جوش و ولولہ، سماجی زندگی کا شعور اور صداقت کو صاف طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔انہیں ادب کی افادیت و مقصدیت کا بخوبی احساس تھا اسلئے انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ قومی و ملی اصلاح کا کام لیا ہے۔بطور مثال چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

اگر دل سے رہا قانع تو شاہ خسرواں ہوگا　　تو کل دولت دارین کا طبل و نشاں ہوگا
خدا کے واسطے اے مسلم خوابیدہ اٹھ تو بھی　　ترا یہ خواب غفلت ایک دن خواب گراں ہوگا
مصیبت ہے کہ نسواں میں نہیں احساس خودداری　　نہ ہوگا اب اگر پیدا تو کب اے خواہراں ہوگا
اگر ہو جائے پیدا تیرے دل میں جذبہ خدمت　　تو اے خاتون مسلم تجھ سے روشن اک جہاں ہوگا (8)

ہمایوں کا آبائی وطن میرٹھ ہے جہاں سے انہوں نے اپنی تعلیم حاصل کی۔اردو، فارسی اور انگریزی پر عبور حاصل تھا۔ہمایوں ان کا اسم گرامی تھا اور اسی نام سے ہی تخلص کرتی تھیں۔منظوم و منثور دونوں میں اپنے فن کے جوہر دکھائے ہیں۔ان کے کلام صفحہ قرطاس کی زینت نہیں بن سکے کیونکہ وہ مشاعروں میں جانے سے گریز کرتی تھیں اور اپنے کلام شائع کرانے سے بھی احتراز کرتی تھیں۔ان کے کلام میں رومانیت، جذباتیت اور شگفتگی دیکھنے کو ملتی ہے۔انہوں نے اپنے طرز تحریر میں اردو و فارسی کے عام فہم الفاظ کا استعمال کیا اور مشکل تشبیہات و استعارات کو برتنے سے گریز کیا ہے۔آپ کے بیشتر اشعار رومانی فضا میں سانس لیتے نظر آتے ہیں۔کلام میں جذبات اور وصل کا تلاطم ہے جو نہایت شدید طور پر محسوس کئے جا سکتے ہیں۔شاعری شدت جذبات کے کیف آور اور وجدانی کیفیت کے اظہار کے سوا کچھ اور نہیں اور اس کی بہترین مثال ہمایوں کے کلام میں موجود ہے۔انہوں نے لمبی لمبی بحروں سے گریز کرتے ہوئے بیشتر چھوٹی بحروں کا استعمال کیا ہے۔ان کے کلام کے یہ نمونے پیش خدمت ہیں ؎

وعدہ وصل کر نہیں لیتے　　پھول کی طرح مسکراتے ہیں
بس تسلی نہ دو دمِ رُخصت　　جایئے آپ روز آتے ہیں
نہیں ملتے اگر غریبوں سے　　ان کو دیوانہ کیوں بناتے ہیں (9)

خطہ میرٹھ علمی و ادبی نقطہ نظر سے بہت ہی زرخیز علاقہ رہا ہے۔یہاں کے قلم کاروں نے مختلف اصناف سخن میں اپنی فنکارانہ صلاحیت و فکری بصیرت کے جوہر دکھائے ہیں۔قلق میرٹھی،

رنج میرٹھی، اسماعیلؔ میرٹھی، حفیظؔ میرٹھی، حزیںؔ میرٹھی، حورؔ میرٹھی، زاہدہ زیدی اور اسماعیل بیگم وغیرہ نے جس طرح سے اردو ادب کی آبیاری کی ہے، دنیائے اردو اس سے بخوبی واقف ہے۔ میرٹھ کے شاعروں کے شانہ بشانہ شاعرات نے بھی اپنی فن کاری کے جوہر دکھائے ہیں۔ ان کے کلام میں لطیف احساسات، نازک خیالات اور عصری مسائل کا بیان جگہ جگہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ یہاں کی متعدد شاعرات نے اپنے منفرد کلام، متفرق خیالات، مختلف طرز ادا سے اپنی الگ شناخت قائم کی اور اپنے شہر کی شہرت، مقبولیت و محبوبیت کو بام عروج پر پہنچا دیا ہے۔ شہر میرٹھ کی ان شاعرات کو پردہ گمنامی سے نکالنے اور ان کے کلام کو اردو کے قارئین تک پہنچانے کی اشد ضرورت ہے تاکہ ان کے کلام کو ضائع ہونے سے بچایا جا سکے۔

☆☆☆

کتابیات

1. صدارتی خطبہ۔ بیسویں صدی میں خواتین اردو ادب، مرتبہ۔ عتیق اللہ 2002، ص۔ 26
2. نظم جدید کی تثلیث۔ شاداب علیم، 2005 ص۔ 71
3. تذکرہ شاعرات اردو۔ محمد جمیل احمد 1944، ص۔ 338
4. تذکرہ شاعرات اردو۔ محمد جمیل احمد 1944، ص۔ 339
5. تذکرہ شاعرات اردو۔ محمد جمیل احمد 1944، ص۔ 353
6. تذکرہ شاعرات اردو۔ محمد جمیل احمد 1944، ص۔ 352
7. تذکرہ شاعرات اردو۔ محمد جمیل احمد 1944، ص۔ 344
8. تذکرہ شاعرات اردو۔ محمد جمیل احمد 1944، ص۔ 279
9. تذکرہ شاعرات اردو۔ محمد جمیل احمد 1944، ص۔ 755

سراج انور محمد میراں
ناندیڑ

۱۹۵۰ء کے بعد دبستانِ میرٹھ

رام پور، اکبرآباد، عظیم آباد امروہہ کی طرح میرٹھ بھی شروع ہی سے گہوارۂ شعروادب رہا ہے، یہاں کی ادبی سرگرمیوں کا بہ نظر عمیق مطالعہ کرنے پر یہ بات واضح طور پر نمایاں ہوتی ہے کہ میرٹھ ایک ''دبستان'' سے کم نہیں، بھلے ہی ہمارے ناقدین کرام کی بے اعتنائی و بے توجہی کے باعث اسے تسلیم نہ کیا گیا ہو، یہاں صف اول کے شعراء ہر دم اور ہر دور میں موجود رہے ہیں، غالبؔ کو غالب بنانے والی تین عدیم المثال ہستیوں میں دو کا تعلق اسی شہر نگاراں سے رہا ہے، صہبائی اور شیفتہ جن کا خمیر اسی خطۂ ارض سے وابستہ ہے، ان کا ذہنی ارتقا اسی ارضِ یا ہنر کا ساختہ پر داختہ رہا ہے، غالب ۱۸۵۹ء اور پھر کئی مرتبہ اس سرزمین کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے سرفراز کر چکے ہیں اور ان کے شاگردوں کی ایک اچھی تعداد اسی سرزمین سے وابستہ رہی ہے، جنھوں نے شعروسخن کے میدان میں قلم کے جوہر دکھا کر نہ صرف یہ کہ شاعری کے گیسوؤں کو سنوارا بلکہ اپنی عظمت کا اعتراف کراتے ہوئے اپنے فکروفن سے اردو شعروادب کو مالا مال کیا، میرٹھ میں ملک کے تین نامور تذکرہ نگاروں غلام محی الدین عشق و مبتلا ''طبقات سخن''، نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ ''گلشن بے خار'' اور حکیم فصیح الدین رنج نے ''بہارستان ناز'' تذکرے لکھ کر شعراء کو حیات جاودانی بخشی، غالب کے خطوط کا پہلا مجموعہ ''عود ہندی'' ان کی وفات سے چار ماہ قبل مجتبائی پریس میرٹھ سے ۲۷ اکتوبر ۱۸۶۸ء کو شائع ہوا، جس نے اردو کو ایک نئی اور سلیس روش دے کر سنگ میل کی حیثیت حاصل کی، صہبائی سے استفادہ کرنے والے مرزا رحیم بیگ میرٹھ جیسی شخصیت نے غالب کی علمی وادبی مخالفت میں ''قاطع برہان'' کے جواب میں ''ساطع برہان'' تصنیف کرکے اپنے علمی جوہروں کو آشکارا کیا، اس کے ردعمل میں لکھے گئے جواب کو ''نامہ غالب'' کا نام دیا گیا، کلام غالب

کے اولین شارح شوکت میرٹھی نے غالب کے بعض اشعار کے سات سات معانی بیان کر کے اپنی علمی وادبی فوقیت کا پرچم لہرایا، انہوں نے اپنی علمی فتوحات کے علاوہ ایک ایسے ذی علم، باصلاحیت، پروقار صاحب فرزند کو اپنے فیضان نظر سے سیراب کیا جو ندرت میرٹھی کے نام سے افق ادب پر چھا گیا، اسی وطن کے شوکت سبزواری نے اپنی غیر معمولی نگارشات سے اردو کائنات کے نظام شمشی کو اپنی کششِ تحریر سے سمت سفر بدلنے پر مجبور کر دیا، اسی شہر کے رام بابوسکسینہ کی ''تاریخ ادب اردو'' تنہا کی ''سیرالمصنفین'' ''ڈاکٹر شاہین کی ''اردو اسالیب نثر'' اردو ادب کی حسین شاہکار ثابت ہوئیں، میرٹھ ہی میں شاہ نصیر کو یہاں کے شعراء کے بالمقابل اپنے کو اظہار فخر کرنے کے بیان پر نظر ثانی کرنے پر مجبور ہونا پڑا، ۱۸۹۶ء میں سرسید تعلیمی کانفرنس کے سلسلہ میں میرٹھ میں جلوہ گر ہوئے اور میرٹھ کے خود دار شاعر بیاں ویزدانی کی خودداری کے آگے سر تسلیم خم کرتے ہوئے انھیں مدعو نہ کئے جانے پر اظہار ندامت کی، حالی، اسماعیل میرٹھی سے بسلسلہ ملاقات میرٹھ تشریف لائے، انجمن پنجاب اور حالی کی جدید شاعری پر سب سے پہلے لبیک کہنے والوں میں میرٹھ کے اسماعیل، بیاں قلق، رنج، افسر کے نام نامی اُردو ادب کا ایک حصہ بن چکے ہیں، بیاں ایسے باکمال شاعر وادیب صحافی وانشاء پرداز ہیں جو ہر فن میں یکتا ہیں، مراثی، غزل، رباعی، نظم مثنوی نگاری میں بھی ان کی قادرالکلامی عیاں ہے، انہوں نے حالی کے مسدس کا جواب بھی لکھا اور غالب کے مجموعہ عود ہندی کی طرح تیغ ہندی' کے نام سے مکاتیب کا مجموعہ شائع کیا، بچوں کے ادب کے سب سے بڑے شاعر اسماعیل میرٹھی کو اسی خطے کی صنفی آب و ہوا نے بلندی فکر اور نئی بصیرت عطا کی، غالب کے شاگرد مولانا عبدالسمیع بیدل اسی خطہ میں جلوہ گر رہ کر ادبی وروحانی فیضان سے سیراب کرتے رہے، اُردو کے ارتقائی دور میں شاعر و تذکرہ نگار عشق و مبتلا نے اُردو شاعری کو ادبی حیثیت سے روشناس کرایا، غالب اور حالی نے جس سخنور کی ناقدانہ صلاحیتوں کا اعتراف کیا وہ شیفتہ نامی فکر وفن کا امام اسی میرٹھ سے منسوب کیا جاتا ہے، جن سے ملنے غالب میرٹھ آئے اور جس کا ذکر غالب نے تفتہ اور میر مہدی مجروح کے نام اپنے مکتوب میں کیا ہے، آج بھی میرٹھ میں ان کے آثار قدیمہ ان کی عظمت و شخصیت کے گواہ ہیں، مومن کے شاگرد قلق جن کے سر سب سے پہلے انگریزی نظموں کے تراجم کا سہرا ہے اس خمیر کے پروردہ ہیں، اردو شاعرات کے اولین تذکرہ نگار حکیم فصیح الدین رنج اسی شہر نگاراں سے وابستہ ہیں، اسی شہر میں سید احمد حسن فرقانی وشا کی جیسا قادرالکلام شاعر گزرا جس کے لئے مرزا دبیر نے کہا" فرقانی کا کلام مثل فرقان

کے لاجواب ہے، غالب نے ان کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے فرمایا" غالب زندہ سید احمد حسین میں اسد اللہ خاں غالب مردہ اور فرمایا کہ سب کو ان سے استفادہ کرنا چاہئے، میرے پاس آنے کی ضرورت نہیں۔ انھوں نے میر مہدی مجروح، داغ کے ساتھ بیشتر مشاعرے پڑھے ہیں۔ مولوی عبدالحق اور مولوی چراغ علی جیسی اُردو کی قدآور شخصیتیں اسی شہر میرٹھ کی مرہون منت ہیں۔

شہنشاہ غزل میر تقی میر، مرزا مظہر جان جاناں اور شاہ نصیر کا میرٹھ آنا ثابت ہے، غلام محی الدین عشق و مبتلا کو میزبانی کا شرف حاصل ہوا، میرٹھ میں ذوق کے شاگردوں میں منشی احسان اللہ مخبرؔ، عبدالصمد فوق اور غالب کے شاگردوں میں حکیم فصیح الدین رنجؔ، محمد صادق سوزان و مداح محمد جان فوق، غلام بسم اللہ' مولانا عبدالسمیع بیدل، مولانا اسماعیل میرٹھی، فیض الحسن فیضی، نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ، حکیم محبّ علی نیر کے نام خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں، علاوہ ازیں مومن کے شاگرد قلق، صہبائی کے شاگرد رحیم بیگ، میر یار خاں شاد، فوق وغیرہ شامل ہیں۔ ڈاکٹر امیر اللہ خاں شاہین کے مطابق ''اُردو ادب میں اب تک کی تحقیق کے مطابق شمالی ہندوستان میں حضرت امیر خسرو پہلے شاعر ہیں جن کے کلام میں برج بھاشا اور کھڑی بولی کے ملے جلے اور الگ الگ دونوں نمونے ملتے ہیں، خسرو کے بعد جس شاعر کا نام آتا ہے وہ میرٹھ کے رہنے والے محمد افضل جھنجھانوی ہیں، افضل کے بارہ ماسہ میں ہمیں وہی زبان ملتی ہے جو اس وقت میرٹھ اور آس پاس بولی جاتی تھی'۔

ڈاکٹر شاہین کے اس انکشاف سے کہ اُردو کی ابتدا میں میرٹھ کے شعرا کا اہم رول رہا ہے بڑی اہمیت کا حامل ہے، محمد افضل کے بعد میر جعفر زٹلی کا نام آتا ہے، جنھیں لالہ شری رام نے کرنال ضلع میرٹھ کا لکھا ہے، ان کی تاریخ پیدائش ۱۶۵۹ء ہے، یہ ولی دکنی کے ہم عصر کہے جاتے ہیں۔

پروفیسر محمود شیرانی کے مطابق ''زبان اُردو کا ایک بڑا ذخیرہ ان کے کلیات میں موجود ہے ان کے بعد منور خاں دلمیر میرٹھی نے ''گنواری زبان'' میں شعر کہہ کر بہادر شاہ کے حضور میں پیش کیے' ڈاکٹر شاہین نے کلیات دلمیر بڑی عرق ریزی سے شائع کی ہے۔

کسی ادب کی نشو ونما میں ادبی نشستوں، مشاعروں کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ ان نشستوں کے ذریعے شعرا کو شعر کہنے اور سننے والے دونوں حضرات کے نہ صرف تسکین کا سامان مہیا ہوتا ہے بلکہ ان کے ذوق کی تربیت بھی ہوتی ہے، دراصل مشاعرے ایک نوع کی تہذیبی درسگاہیں ہیں جہاں سے سامعین کچھ اکتساب فیض کرکے اٹھتے ہیں، موجودہ دور کے مقابلہ

میں ماضی میں تفریحی پہلو سے زیادہ مشاعروں کی ادبی حیثیت نمایاں تھی، مشاعرے طرحی ہوتے تھے اوران کا انعقاد شاعر کی فکر کا امتحان ہوتا تھا۔

میرٹھ چونکہ دہلی سے زیادہ دور نہیں صرف ۶۵ کلومیٹر دوری پر قائم ہے، اس لئے راجدھانی میں ہونے والی ادبی سرگرمیوں کا اثر میرٹھ پر پڑنا لازمی تھا، دہلی میں شاہ نصیر، میر تقی میر، ذوق، مرزا مظہر جان جاناں، مرزا علی لطف، غالب، مومن کا دور دورہ تھا، مگر اردو شاعری کے ارتقائی دور میں دہلی میں شاہ نصیر کا طوطی بول رہا تھا اور وہاں شعر وادب کے سوتے پھوٹ رہے تھے، بقول مولانا عبدالحئیٰ انھیں استاذ الاساتذہ کا درجہ حاصل تھا، شاہ نصیر کے دوست میرٹھ میں غلام محی الدین عشق و مبتلا تھے جنھیں شاہ نصیر کی صحبت بافیض سے کچھ نہ کچھ ضرور ملا ہوگا، ادبی نشستوں میں دہلی کو مرکزیت حاصل تھی، یہاں کی گونج دور دور تک سنائی دیتی تھی اور دور دراز سے اہل ذوق آکر اپنی تشنگی بجھاتے تھے، دہلی کی قربت سے میرٹھ میں مشاعروں کا رواج ہوا اور اس طرح اُردو ایک باقاعدہ ادبی حیثیت کی طرف پروان چڑھتے گئی، ڈاکٹر حنیف نقوی کے مطابق ''فکر شعر سے دلچسپی کا یہ ماحول اور مشاعروں کی گرم بازاری صرف پایہ تخت تک محدود نہ تھی، اس کے اثرات مضافات میں دور دور تک پہنچ گئے تھے، شیفتہ کے فیضان سخن اور یمن صحبت کا سلسلہ میرٹھ اور دوسرے قریبی قصبات تک وسیع تھا''۔

اس طرح اردو شعر وشاعری نے میرٹھ میں اپنے قدم جما کر ادبی حیثیت اختیار کر لی اور ادبی سرگرمیوں کا مرکز میرٹھ میں غلام محی الدین عشق ومبتلا کا مکان بن گیا، یہاں مستقل طور پر طرحی نشستیں منعقد ہوتی تھیں، اس زمانہ میں دار الخلافہ دہلی میں شاہ نصیر کا رنگ عام ہو چکا تھا۔ چونکہ ان کا حلقہ وسیع تھا اس لئے ان کی ہر غزل کے حریفوں کی آزمائش وقار کا مسئلہ بن جاتی تھی۔

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کہتے ہیں ''شاہ نصیر اپنے یہاں مہینے کی پندرہویں اور انتیسویں تاریخ کو طرحی مشاعرے ترتیب دیتے اور اس کے لئے خصوصیت سے سنگلاخ زمین اختراع کرتے تھے''۔

آب حیات میں مذکور ہے کہ ایک مشاعرے میں شعرائے لکھنؤ کی فرمائش پر کہی ہوئی دوغزلیں ''قفس کی تیلیاں اور دہن پتھر کے کفن پتھر کے سنائیں' جن کی بے پناہ مقبولیت کے حریفوں کے لئے باعث رشک ثابت ہوئیں اور اس کے لئے عرصے تک جوابی غزلوں کا سلسلہ جاری رہا۔

شاہ نصیر کا میرٹھ آنا جانا تھا جہاں وہ غلام محی الدین عشق و مبتلا کے یہاں قیام پذیر ہوتے، یہاں وہ میر صدر جہاں کی درگاہ کا زرسالانہ وصول کرنے کے لئے آیا کرتے تھے، تذکرہ بے جگر کی روایت ہے کہ انہوں نے اپنی جانب سے ان (یعنی عشق و مبتلا) کے یہاں دو مشاعرے منعقد کئے تھے جن میں اچھے خاصے ادبی معرکوں جیسی کیفیت پیدا ہوگئی تھی۔اس کی تفصیل یہ ہے کہ شاہ نصیر مبتلا کے مہمان تھے اور انہوں نے مبتلا کے مکان پر مشاعرہ منعقد کیا تھا، جب مبتلا نے جن کا شمار اساتذہ میں ہوتا تھا اپنا قصیدہ پڑھا تو شاہ نصیر خاموش رہے اور کسی شعر پر داد نہیں دی بلکہ شعرائے میرٹھ کی آزمائش کے لئے اپنی طرف سے ایک طرحی مصرع دیا

کردے چمن میں تو ذرا بند قبا کو وا کہ یوں

اتفاق سے اس پر شعرائے میرٹھ میں سے کسی نے توجہ نہیں دی، جب شاہ نصیر کو یہ معلوم ہوا تو وہ از راہ فخر و غرور ہر ایک سے اس کا ذکر کرتے اور کہتے کہ میرٹھ میں ایک شاعر بھی ایسا نہیں جو میرے دیئے ہوئے مصرع پر طبع آزمائی کرتا، اس وقت میرٹھ میں ایک درویش صفت شاعر شاہ روشن بھی موجود تھے، انہوں نے شاہ نصیر کے غرور کو توڑنے کے لئے ان کی خدمت میں ایک دو غزل کہہ کر بھیج دیا، اس کا ایک مطلع یہ ہے ؎

ہوتی ہے کس طرح سحر، بولے نقاب اٹھا کے یوں
شام کے حق میں کچھ کہو، منھ کو چھپا کہا کہ یوں

اس کے بعد شاہ نصیر کو پھر کبھی میرٹھ میں اظہار فخر کی نوبت نہیں آئی۔

اس طرح میرٹھ میں شعر و سخن کے ارتقا میں نشستوں نے اہم کردار ادا کیا ہے، ان نشستوں کی بنا پر اردو اس قابل ہوئی جس کی بنیاد پر ادبی عمارت قائم کی جاسکے اور پھر غلام محی الدین عشق و مبتلا کی شکل میں ایسا باشعور شاعر ہمارے سامنے آیا جس نے شاعری کو دلکشی، حسن، تازگی و توانائی عطا کر کے غزل کے لب و لہجہ میں نکھار اور بانکپن پیدا کیا اس لئے عشق و مبتلا کو میرٹھ میں اردو ادبی شاعری کا باوا آدم کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔جن کی شاعرانہ خدمات کا اعتراف نہ کرنا حقایق سے چشم پوشی کرنا ہوگا، آج بھی شعراء کی اچھی تعداد اردو شعر و ادب کی خدمت میں سرگرداں ہے۔میرٹھ ایک مکمل دبستان ہے اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔اسی دبستان میرٹھ کے چند شعراء اکرام اور ان کی خدمات کا ذکر یہاں کیا جارہا ہے:

(۱) حفیظ میرٹھی

حفیظ میرٹھی دبستان میرٹھ کے ان ممتاز شاعروں میں ہیں جنہوں نے نصف صدی سے زائد تک اپنے کلام سے ایک پوری نسل کو متاثر کیا ہے اور اپنے فکر وفن سے شاعری میں گرانقدر اضافہ کیا ہے، میر، غالب، جوش کے بعد حفیظ کو بھی کو ایک خوددار اور شاعر انقلاب کی حیثیت سے ہمیشہ یاد کیا جائے گا۔

آپ کا اسم گرامی حفیظ الرحمٰن اور تخلص حفیظ میرٹھی تھا، پیدائش ۱۰ جنوری ۱۹۲۲ء میں میرٹھ میں ہوئی، آپ کے والد کا نام حکیم محمد ابراہیم تھا جو کرت پور ضلع بجنور کے باشندہ تھے اور بقول عزیز بگھروی ایک پختہ شاعر تھے، ابتدائی تعلیم وتربیت مقامی اداروں میں ہوئی بعد ازاں انٹرمیڈیٹ تک باقاعدہ تعلیم حاصل کی، کافی عرصہ کے بعد وہ راقم السطور کے ساتھ میرٹھ کالج ایم اے اُردو کی کلاس میں ساتھی بھی رہے۔ آپ کی پرورش نانا سید خادم حسین کے زیر سایہ ہوئی، فکر معاش لاحق ہونے پر کلکٹریٹ اور پھر فیض عام کالج میں ہیڈ کلرک رہے اور ۱۰ جنوری ۱۹۷۲ء کو سبکدوش ہوئے۔

۱۹۵۰ء کی دہائی میں معروف ادبی رسالے ''معیار'' کی ادارت کرتے رہے اور تاحیات ادارۂ ادب اسلامی ہند سے وابستہ اور اس کے ذمہ دارانہ منصبوں پر فائز رہے، ۱۹۵۷ء میں ڈی، آئی آر اور ۱۹۶۷ء میں میسا کے تحت گرفتار کئے گئے۔ ۳۱ مارچ ۱۹۸۲ء کو آپ کی اہلیہ کے قتل کا سانحہ جانگاہ پیش آیا، ۷/ جنوری ۲۰۰۲ء کو اس تاجدار شعر وسخن نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا اور عید کے روز ہزاروں سوگواروں کی موجودگی میں سپرد خاک کئے گئے، پسماندگان میں دختر حسین غزالہ فلاحی شامل ہیں۔

حفیظ میرٹھی کی ادبی تخلیقات میں ''شعر وشعور'' (مئی ۱۹۷۰ء)، متاع آخر شب (دسمبر ۱۹۸۶ء) شائع ہو کر مقبول خاص و عام ہوئیں، علاوہ ازیں ان کی شاعرانہ عظمت کے اعتراف میں ۱۹۹۳ء میں حفیظ میرٹھی فن اور شخصیت اور ۱۹۹۴ء میں مجلّہ ''اعتراف'' اور ''کلیات حفیظ میرٹھی'' مسعود اختر کی کاوشوں سے منظر عام پر آئیں۔ حفیظ میرٹھی نے پاکستان، برطانیہ، امریکہ، قطر، سعودی عرب اور دیگر عرب ممالک کے مشاعروں میں شرکت کی جہاں بہت پذیرائی ہوئی، ۱۹۹۱ء میں ادارۂ ادب اسلامی ہند نے ان کا جشن منایا۔ ۲۴/ دسمبر ۱۹۹۴ء میں میرٹھ میں شاندار جشن حفیظ منایا گیا، جس میں ایک لاکھ روپیہ عوام کی جانب سے حفیظ میرٹھی کو ان کی شاعرانہ خدمات کے اعتراف میں ہدیہ عقیدت کے طور پر پیش کیا گیا، یہ حقیقت ہے کہ میرٹھ کی تاریخ میں

اتنا بڑا عوامی استقبالیہ آج تک کسی شاعر کو نصیب نہ ہوا، مقامی جیم خانہ میدان میں منعقد اس تاریخی مشاعرہ کی خصوصیت یہ تھی کہ نامور شعراء کرام کے ساتھ اردو عالموں، ہندی کویوں، معززین شہر، حکام اور عوام کی بڑی تعداد نے شرکت کی۔

حفیظ میرٹھی نے جس ماحول میں آنکھ کھولی اور بعد ازاں شاعری کا آغاز کیا اس وقت میں میرٹھ کی فضا شعر و ادب کی کیفیتوں سے معمور تھی، جگہ جگہ شاعری کے تذکرے اور مشاعرے بھی کثرت سے ہوتے تھے، بڑے بڑے شعراء میرٹھ کے مشاعروں میں شرکت کر کے اپنے کلام سے سامعین کو نوازتے تھے اور اہل ذوق کے لئے ان کا کلام تسکین ذوق کا سامان فراہم کرتا، جنگ آزادی کی تحریک پورے شباب پر تھی، فرقہ وارانہ فسادات اور پھر اس کے تلخ نتائج ہر ذی ہوش کو جھنجھوڑ کر اس کے ذہن و دماغ پر اثر انداز ہور ہے تھے، اُردو شاعری میں مختلف الخیال نظریے شاعروں کے پیش نظر تھے، ایک گروہ روایتی شاعری کا دلدادہ تھا اور اس سے انحراف کرنے کے بجائے اسے برقرار رکھنا ہی اپنی شاعری کی بقا کے لئے باعث رحمت و برکت سمجھتا تھا، جب کہ دوسرا نظریہ شاعری میں جدید رجحانات کی عکاسی کا خواہاں تھا، نیز تیسرا گروہ ترقی پسندانہ خیالات کے ساتھ ساتھ کمیونزم میں اعتماد و یقین ہی انسانی نجات و اس کی رہبری کا باعث سمجھتا تھا، سرخ انقلاب نے شاعری پر واضح اثرات مرتب کئے تھے۔ ایسے دور میں بھی حفیظ نے خود راہ متعین کی۔

(۲) روش صدیقی

اسماعیل میرٹھی، افسر میرٹھی، ساغر نظامی کے بعد روش ایک ایسے شاعر ہیں جنہوں نے حب الوطنی اور ہندوستان کی روایات پر نظم گوئی کر کے دبستان میرٹھ کی قدر و قیمت میں اضافہ کیا، روش صدیقی کو میدان غزل گوئی کے ساتھ ساتھ نظم گوئی میں بھی ید طولیٰ حاصل ہے، اردو شاعری میں ان کا مقام بہت بلند ہے اور وہ ایک منفرد حیثیت کے حامل ہیں۔

ان کا نام شاہد عزیز اور تخلص روش تھا، آپ کی پیدائش جوالا پور سہارنپور میں ۱۰ر جولائی ۱۹۰۹ء کو ہوئی، والد کا نام مولوی طفیل احمد تھا، ابتدائی تعلیم فارسی میں ہوئی، گھر کا ماحول مذہبیت کے رنگ میں رنگا ہوا تھا، بعد ازاں انگریزی سنسکرت پر بھی استعداد کاملہ حاصل کی۔

روش کی سیرت کا اک خاص پہلو یہ بھی تھا کہ وہ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے انسان بھی تھے وہ بڑے پاک طینت تھے، جیسا ظاہر ویسا ہی باطن رکھتے تھے۔

ان کی تصانیف میں ''محراب غزال'' (۱۹۵۹ء) اور کارواں (مئی ۱۹۵۰ء) کو خصوصیت

حاصل ہے، نثری کارناموں میں متفرق مضامین شامل ہیں، ان کی وفات کے بعد ''روش'' کے نام سے ایک اور مجموعہ غزل شائع ہوا ہے، یوپی اردو اکادمی لکھنؤ نے انعام سے سرفراز کیا ہے۔ ن۔م۔ راشد نے روش صدیقی سے اصلاح لی ہے۔

شاعر کی حیثیت سے روش کا ایک خاص مقام تھا جس میں اس عہد کا کوئی شاعر ان کے بالمقابل نہ تھا، ان کی شاعری کا خمیر میر درد، غالب اور حسرت کے محاسن شعری سے تیار ہوا تھا، فارسی کی دلآویز ترکیبیں اور کلاسیکی رچاؤ، شروع سے آخر تک ایک ہی رنگ کی غزلیں مرصع، شگفتہ، پاکیزہ اور فنی اعتبار سے بھی ان کا مرتبہ شاعری بہت بلند تھا۔

(۳) سید احمد سید

سید احمد سید میرٹھی کا شمار دبستان میرٹھ کے ایسے شاعروں میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنے فکر وفن دونوں ہی اعتبار سے اردو شاعری میں گراں قدر اضافہ کیا ہے۔

ان کی پیدائش ۱۹۰۰ء میں دیوان خانہ ویلی بازار میرٹھ میں ہوئی، ان کے والد کا نام مختار احمد تھا۔ مورخہ ۵ مارچ ۱۹۷۵ء کراچی میں انتقال کیا اور وہیں مدفون ہوئے، انہوں نے کسی سے استفادہ نہیں کیا بلکہ ان کا ذوق اور مطالعہ ہی ان کے مشق سخن کا باعث بنا۔

سید میرٹھی ایم ایل سی اور اسپیشل مجسٹریٹ بھی رہے ان کا ادبی ذوق بہت پاکیزہ تھا، غزل، رباعی، مراثی، قصائد صرف ونحو پر قدرت رکھتے تھے، مکالمہ نگاری میں تو ید طولی حاصل تھا، عیش میرٹھی کی نشستوں میں برابر شریک ہوتے تھے، ان کا دیوان خانہ ادبی سرگرمیوں کا محور تھا، قریب ہی ویلی بازار میں بھی مختلف شعراء کی دکانوں پر اکثر و بیشتر شاعری کے چرچے ہوتے رہتے، تحت اللفظ پڑھتے تھے۔

سید میرٹھی کے دیوان خانہ میں شعری نشستوں کا اکثر انعقاد ہوتا تھا، ان کا مجموعہ مراثی 'و قار منیر' کے نام سے پاکستان میں ڈاکٹر سید سند حسین نے چھپوانے کی ذمہ داری لی تھی تادم تحریر اس کے بارے میں پتہ نہیں چل سکا۔

(۴) قیام الد بن مضطر

نامور استاد، کہنہ مشق شاعر قیام الدین مضطر نگینوی دبستان میرٹھ میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں،، آپ روایتی شاعری کے علم بردار ہیں، آپ کا نام قیام الدین اور تخلص مضطر ہے، آپ کی پیدائش ۲۳/دسمبر ۱۹۲۳ء کو نگینہ ضلع بجنور میں ہوئی، ابتدائی تعلیم وتربیت مقامی طور پر فارسی،

عربی دینی مدارس میں ہی حاصل کی ۔ بعدازاں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے انٹر کیا، اس کے بعد تعلیم اور ملازمت کے سلسلہ میں عمر کا بیشتر حصہ میرٹھ میں گذارا اور میرٹھ کو اپنا وطن ثانی بنایا، آپ نے کسی سے تلمذ حاصل نہیں کیا بلکہ ذوق مطالعہ اور خداداد صلاحیتوں سے شعر گوئی پر عبور حاصل کیا، کافی عرصہ تک ملازمت کی۔

آپ نے ماضی کے ادبی ورثے اور کلاسیکی روایات سے انحراف کرنے کے بجائے ان سے خاطر خواہ استفادہ کیا، آپ کے یہاں تغزل اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر ہے، حسن و عشق کے لطیف جذبات و احساسات میں پیش کیا ہے، ماہر فن عروض ہونے کے سبب آپ کی غزلوں میں فنی صداقتوں کا پورا احترام ملتا ہے، آپ کا انداز بیان فن کارانہ ہے، آپ نے اپنے فکر و فن سے اپنے تجربات و مشاہدات اس قدر بچے تلے انداز سے پیش کیا کہ اس میں سنجیدگی کے ساتھ لطف پیدا ہو جاتا ہے، آپ کی شاعری فکری وفنی خوبیوں کی ترجمان ہے۔

افسوس کی بات ہے کہ جس نے زندگی کا بڑا حصّہ شعر و شاعری کو پروان چڑھانے اور فروغ دینے میں صرف کیا ہو اس کا کلام منظر شہود پر نہ آئے، مضطر صاحب بہت جلد اپنا انتخاب مجموعہ کلام چھپوانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

مضطر صاحب نے راقم سے بتایا کہ پہلے میرٹھ میں دائرہ ادبی' نامی ایک فعال ادبی تنظیم تھی جس کے تحت ہر اتوار کو فیض عام کالج میں ادبی نشستیں انعقاد پذیر ہوتی تھیں، جس میں خصوصیت کے ساتھ حقی حزیں، مضطر، حفیظ سلیم بشر، امید، شکیل بدایونی شرکت کرتے تھے، ماہر القادری نے بھی کئی مرتبہ ان نشستوں میں شرکت کی ہے، دراصل ان نشستوں کا ایک مثبت پہلو تنقیدی سلسلہ تھا، یعنی شاعر کے پڑھنے کے بعد تنقید ہوتی تھی، ایک مرتبہ یہ مصرع دیا گیا ؎

تار نظر سے تڑ میں کچھ اس طرح بجلیاں

مضطر صاحب میرٹھ کے بزرگ شعراء میں سے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ غزل اردو شاعری کی ایسی صنف ہے جو اُردو کو آج پرفتن دور میں سنبھالے ہوئے ہے، مثال کے طور پر امراؤ جان''پاکیزہ''، فلم کو غزل نے ہی اٹھایا اور اس طرح اُردو عوام کے ذہن و دل پہ چھا گئی جو فلم کی کامیابی کی ضمانت بنی۔

مضطر صاحب نے ایک لطیفہ سنایا جس کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا، فرماتے ہیں''ایک مرتبہ لکھنؤ میں شعور بریلوی، استاد الشعرا، عالم معنوی اور مضطر بیٹھے ہوئے تھے، دریں اثنا عاصم نے

کہا کہ میرا دیوان تو چھپ جائے گا آج ہی ۲۲ ؍روپیہ کا رم لے کر پریس میں دے کر آیا ہوں۔ در اصل بیدارُ دوداں کی ہے کسی کی طرف اشارہ تھا نمونہ کلام ؎

سمجھ لیجئے جناب شیخ ہوں گے — کوئی فتنہ اٹھے جب انجمن سے
؎ سلام تک بھی نہیں پرسش مزاج تو کیا — یہی تو ہونا تھا گہرے تعلقات کے بعد
بچھڑ کے تجھ سے وہ نعمت جسے سکوں جیئے — نہ دن کے بعد میسر ہوئی نہ رات کے بعد

(۵) مبصرا مروہی

مبصر امروہی دبستان میرٹھ کے ایسے شاعر ہیں، جنہیں زبان و بیان پر یکساں قدرت حاصل ہے، انہوں نے جس صنف سخن میں بھی قلم کے جوہر دکھائے اس میں اپنی قادر الکلامی کا ثبوت دیا ہے۔ آپ کی پیدائش ۱۴؍جنوری ۱۹۳۴ء کو امروہہ سادات میں ہوئی، آپ کے والد کا نام مولوی حافظ محمد عباسی تھا، آپ کا نام مسعود احمد اور تخلص مبصرا مروہی تھا، ابتدائی تعلیم وتربیت دارالعلوم امروہہ میں حاصل کی، بعدازاں حفظ قرآن، تجوید اور علوم شرقیہ میں عبور حاصل کیا، اس کے ساتھ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے گریجویشن کیا، پھر لکھنؤ سے پانچ سالہ طبی کورس کر کے فاضل طب کا امتحان پاس کیا، اس کے بعد میرٹھ میونسپل کارپوریشن کی طبی ڈسپنسری میں میڈیکل آفیسر مقرر ہوئے، حج بیت اللہ کر نے تشریف لے گئے وہیں انتقال ہوا اور تدفین ہوئی، آپ کے پسماندگان میں تین لڑکے ہیں جن میں محمد طارق خلف اکبر ہیں۔

آپ شاعری میں تلمیذ الرحمٰن ہیں، کسی سے تلمذ حاصل نہیں کیا، ابتداء میں نثر نگاری کی طرف رجوع ہوئے سچ اس میں اتنی نفسگی آئی کہ دنیائے شاعری میں مبصر امروہی کہلائے۔

مبصر صاحب منفرد لب ولہجہ کے شاعر ہیں، آپ نے غزل، نظم، قطعہ، رباعی غرض کہ ہر صنف سخن پر طبع آزمائی کی ہے اور اپنی قادر الکلامی کا ثبوت دیا ہے، مبصر امروہی اپنی شاعری کے سلسلہ میں خود کہتے ہیں:

مبصر امروہی غزل کے شاعر ہیں، آپ نے روایتی شاعری کے عناصر کو اپنی غزلوں کا نگینہ بنایا ہے مگر دیگر اصناف سخن سے بھی گریز نہ کرتے ہوئے قلم آزمائی کی اور اسے باغ و بہار بنا دیا ہے۔

(۶) حیران کاشمیری

حیران کاشمیری دبستان میرٹھ میں ایک انقلابی شاعر کی حیثیت سے جانے و پہچانے جاتے ہیں، وہ شاعر اور ایک صحافی بھی تھے، ایک عرصہ تک شعروسخن کے نغمے گنگناتے رہے اور کئی اخبارات سے وابستہ رہے۔

ان کا نام عبد الخالق تخلص حیراں کاشمیری تھا، یکم مارچ ۱۹۲۵ء کو میرٹھ میں پیدا ہوئے، کشمیر سے چونکہ ان کے آباء واجداد نے ترک سکونت اختیار کر کے میرٹھ میں بود و باش اختیار کی، اس لئے کشمیر سے اپنی نسبت کے سبب اپنے نام کے ساتھ کشمیری کا اضافہ کرتے تھے، ۱۴ ؍ جون ۱۹۹۵ء کو راہی ملک بقا ہوئے اور قبرستان مائی کا تکیہ میں سپرد خاک ہوئے۔

ان کے دو شعری مجموعے ''نگار آتشیں'' اور ''آتش سیال'' ان کی حیات میں ہی شائع ہوگئے تھے۔ ان کے والد عبد المالک اختر اور چچا عبد الواحد فیض اور نانا مولوی سراج الدین سراج بھی شاعر تھے، اس لئے شاعری ان کو ورثہ میں ملی تھی مگر انقلابی شاعر کوثر قریشی نے ان کے ذوق شعری کو جلا بخشی، دوران تعلیم حقی حزیں ان کے استاد رہے ہیں، ان کے لڑکے اختر نواز اختر بھی شاعر تھے، اچھا شعر کہتے تھے۔

حیراں نے صحافت کے سنگلاخ میدان میں بھی قدم رکھا اور ہفت روزہ ہماری آواز (استاد عبد الرشید رشدی) میں کام کیا، صحافی اور بند نافت روزہ ''سندیش'' کے اڈیٹر ستیش چند شرما نے بھی ان دنوں ہماری آواز سے اپنی صحافی زندگی کا آغاز کیا تھا۔

حیراں کی صحافتی حق گوئی پر ۱۹۴۲ء میں کئی مقدمات چلے، انہوں نے اپنا اخبار ''ناہید'' نکالا جو آخر تک جاری رہا، حیراں کو اپنی انقلابی اور شعلہ بیانی کے سبب ۱۹۶۴ء میں ڈی آئی آر کی خلاف ورزی کرنے میں قید و بند کی مشقتیں برداشت کرنی پڑیں مگر حیراں اپنے خطیبانہ انداز اور منفرد انقلابی نقطۂ نظر کے سبب شعری سفر میں رواں دواں رہے۔

حیراں نے ترانۂ کشمیر، عنوان سے جو نظم لکھی وہ بہت مقبول ہوئی، مذکورہ نظم حب الوطنی کے جذبات سے لبریز ہے، اس کے کچھ شعر یہ ہیں ؎

ہم گلستاں کی حسیں تصویر دے سکتے نہیں　　غیر کو اجداد کی جاگیر دے سکتے نہیں
یہ ہمارا فیصلہ ہے یہ ہماری آن ہے　　جان دے سکتے ہیں ہم کشمیر دے سکتے نہیں

۱۹۶۸ء اور پھر ۱۹۷۵ء ایمرجنسی میں جیل گئے، اس طرح ان کی زندگی انقلاب کی نذر

ہوگئی۔ حیراں کے کلام میں انقلابانہ لہجہ کی کثرت ہے تاہم کلاسیکی شاعری وعصری آگہی کی آمیزش بھی کم نہیں، حیراں کے دور میں روایتی شاعری کے کافی چرچے تھے مگرانہوں نے جس انقلابی لہجہ کو اپنایا پھراس سے پیچھے نہ رہے، اپنی انفرادیت کو قائم رکھا۔ حالانکہ ان کی شاعری کے ابتدائی دور میں میرٹھ شعروسخن کا مرکز بنا ہوا تھا اور شہنشاہ غزل ندرت، بوم، سید، کوثر تسکین، اکبر، نشتر، ہشیار، حزیں، کامل، ساغر نظامی جیسے نامور شعرائے کرام میدان ادب پر چھائے ہوئے تھے۔

(۷) خوشتر میرٹھی

دبستان میرٹھ کی مزاحیہ شاعری کی جب بھی تاریخ لکھی جائے گی تو خوشتر کا نام لئے بغیر نامکمل رہے گی، بوم میرٹھی کے بعد مزاح نگاری میں سب سے بلند مرتبہ خوشتر کا ہے، موجودہ دور میں اعجاز پاپولر اس صنف میں شہرت کے حامل ہیں۔

خوشتر میرٹھی میرٹھ ہی میں پیدا ہوئے اور یہیں وفات پائی مگر تلاش بسیار کے باوجود تاریخ پیدائش و وفات دستیاب نہ ہوسکی، راقم السطور نے بچپن میں انہیں بارہا مشاعروں میں سنا ہے، پوری نشست کو زعفران زار بنادیا کرتے تھے، نعتیہ کلام میں بھی ان کی انفرادیت تھی، کسی کسی لفظ سے بڑا لطف پیدا کر دیتے تھے، ان کی شہر میں ٹیلرنگ کی دوکان تھی بعیش میرٹھی ہر سال عید میلادالنبی کے روح پرور موقعہ پر میرٹھ میں طرحی نعتیہ مشاعرہ کا انعقاد کرتے تھے، مدرسہ اسلامی عربی اندرکوٹ میں منعقد طرحی مشاعرہ کی روداد بہ شکل گلدستہ شائع ہوا کرتی تھی، جس میں شاعر واس کی نعت دی جایا کرتی تھی، خوشتر میرٹھی اس میں بڑی پابندی سے شرکت کرتے، راقم السطور کو ۱۹۷۱ء تک کا گلدستہ دیکھنے سے معلوم ہوا کہ اس سال تک انہوں نے شرکت کی ہے جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ اس وقت وہ حیات تھے، نمونہ کلام ملاحظہ ہو ؎

عشق تھا مجھ کو جو اس زلف گرہ گیر کے ساتھ   باندھ کر حشر میں لائے مجھے زنجیر کے ساتھ
عشق میں اس بت کے خوشہ بن گئے تصویر تم   محو نظارہ ہے اک عالم تماشا کیوں نہ ہو

(۸) بھیا رشید الدین رشید میرٹھی

دبستان میرٹھ میں ایسے شعرا کا فقدان نہیں ہے جنہوں نے اپنے فکروفن اور جولانی طبع سے مختلف شعری اصناف میں قلم کے جوہر دکھا کر اپنے کمال فن کا اعتراف کرایا۔ بھیا رشید الدین رشید میرٹھی کو بھی دیگر اصناف سخن کے ساتھ ساتھ تاریخ گوئی میں یدطولیٰ حاصل تھا، وہ مجاہد آزادی

بھی تھے۔

بھیا رشید الدین نام تخلص رشید میرٹھی تھا، ان کی پیدائش ۱۸۸۸ء مطابق ۱۳۰۴ھ عیدالاضحیٰ کے روز ہوئی تاریخی اعتبار سے ان کا نام خورشید صبح عید قرار دیا گیا والد کا نام خان بہادر بھیا حاجی حافظ شیخ وحید الدین صاحب کی آئی ای رئیس اعظم لال کرتی میرٹھ تھا، جو میرٹھ کی تاریخی حیثیت کے حامل تھے ۲۵/اگست ۱۹۵۲ء کو انہوں نے داعیِ اجل کو لبیک کہا اور قبرستان حضرت مخدوم شاہ ولایت میرٹھ میں اپنے استاد ووالد کے جوار میں مدفون ہوئے۔ ان کے انتقال پر صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرشاد، پنڈت جواہر لال نہرو، سروجنی نائیڈو، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسین احمد مدنی نے ملک وملت کے تئیں ان کی خدمات پر خراج عقیدت پیش کیا ان کے انتقال کی خبر آل انڈیا ریڈیو اور ریڈیو پاکستان سے بھی نشر ہوئی۔

پس ماندگان میں برادر اکبر بھیا شیخ نورالدین صابری اور اور بھیا شیخ کریم الدین التمش تھے وہ بھی اللہ کو پیارے ہو گئے، اب بھیا شیخ غلام غوث محی الدین صابری اور راقم السطور عارف الدین صابری آپ کے بغیر گان و جانشین ہیں، عارف الدین صابری کے دو فرزند شیخ شجاع الدین صابری، شیخ اظہر الدین صابری گلشن رشید کے جاں فزا چھوٹوں میں ہیں۔

غالب کے شاگرد کے شاگرد حضرت مولانا عبدالسمیع بیدلؔ قدس مرد نے آپ کی بسم اللہ شروع کرائی اور ان ہی کے زیر سایہ آپ نے زانوئے ادب طے کیا۔ علاوہ ازیں حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کے والد بزرگوار حضرت مولانا عبدالحق سہارن پوری، حضرت مولانا محمد الحکیم صدیقی، حضرت حکیم میاں محمد سے استفادہ کیا اور اپنی غیر معمولی ذہانت سے انگریزی کے علاوہ عربی، فارسی اور اُردو میں استعداد کاملہ حاصل کی، بعدازاں میرٹھ ڈویژنل کالج میں اعلیٰ تعلیم کے مدارج طے کئے۔ زمانہ طالب علمی سے ہی آپ کو شعر وسخن کا ذوق ہو گیا تھا۔ اس لئے ایک زمانہ میں آپ کو قافیہ پردازی کا شوق بھی رہا ہے ''تاریخ الشیوخ''، ''تذکرۃ القریش'' اور دیگر کتابوں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کلاسیکل شاعری کے علم بردار رہے ہیں، آپ اتر پردیش میں M.L.C. بھی رہے، اس سے قبل تحصیل دار اور آنریری مجسٹریٹ رہے۔

(۹) کوثر قریشی

حسرت، اقبال، جوش، روش اور ساغر وعلامہ انور صابری کی طرح کوثر قریشی کو بھی

بہت کم عمر میں شہرت دوام حاصل ہوئی۔ان کا نام عبدالقیوم تخلص کوثر تھا۔

کوثر کی تعلیم وتربیت حکیم احمد رشید زیبا کے زیر سایہ ہوئی۔ یہ استاذ کا ہی فیضان تھا کہ ان کی حب الوطنی سے بھر پور نظموں کو بہت جلد شہرت وعزت نصیب ہوئی۔کوثر کانگریس، جمعیۃ علمائے ہند، آل انڈیا جمیعۃ القریش اور مجلس اداروں کے جلسوں، کانفرنسوں اور اجتماعات میں اکثر نظمیں پڑھا کرتے تھے۔ جسے لوگ ذوق وشوق سے سنتے اور سراہتے تھے۔

''آنسو'' نام سے جو کتابچہ انہوں نے شائع کیا وہ بہت مقبول ہوا۔بخشی غلام محمد کی فرمائش پر انہوں نے وادی کشمیر نام سے ایک شاہ کار نظم لکھی جو وہاں کا قومی ترانہ بن گئی تھی اور ہر روز ریڈیو کشمیر سے نشر ہوتی تھی۔

کوثر علامہ اقبال سے بے حد متاثر تھے۔وہی ان کے آئیڈیل تھے۔انہوں نے رام، کرشن، مہاویر، گرونانک کے پیغام کو بھی اپنی شاعری میں سمویا۔'تعمیر انقلاب' ان کی قومی شاعری کی نظموں کا مجموعہ ہے۔مہاتما گاندھی کی شہادت پر کوثر نے اے شمیر ہے کہ وادی کشمیر مری دادی تو پیکیر جنت جنت تری تصویر کوثر قریشی نے قومی اور انقلابی نظموں کے علاوہ جو غزلیں کہیں انہیں مشاعروں میں مقبولیت، داد تحسین ضرور حاصل ہوئی لیکن ان میں دو کیفیت، جوش وخروش اور جذبہ جمال پیدا نہ ہوسکا جوان کی نظموں میں تھا۔بہت کم عمر میں کوثر قریشی نے داعی اجل کو لبیک کہا۔

(۱۰) عیش میرٹھی

اردو کی اعلی روایتی اقدار کے امین بھیا شیخ منظور محی الدین عیش میری دبستان میرٹھ کے ایک بلند پایہ قادرالکلام اور استاد شاعر ہیں جو نصف صدی سے بھی زائد کارزار شعر جن میں جلوہ گر رہ کر اپنے تجربات ومشاہدات شاعرانی فضل وکمال اور فکر وفن کے ایاز وال نقوش اردو شعر و ادب پر ثبت کر رہے ہیں۔

عیش صاحب کی پیدائش مورخہ ۲۹/اپریل ۱۹۱۶ء کو ۵۵/کوٹھی خان بہادر صاحب لال کرتی میرٹھ میں ہوئی، پورا نام منظور محی الدین تخلص عیش میرٹھ ہے شاعری ان کا جدی ورثہ ہے والد کا نام شیخ غوث محی الدین ہے وہ بھی شعر وسخن کے دل دادہ تھے، جد امجد بھی شعر وشاعری سے شغف رکھتے تھے۔علاوہ ازیں خاندان کے ایک اور بزرگ تسخیر میرٹھی کو حضرت بیدل ورشک انوری وخاقانی بیاں ویزدانی سے شرف تلمذ تھا، انہیں خود بھی شعر وفن پر کامل دست گاتھی۔ان کی

صحبت بافیض نے بھی ان کے شوق شاعری کو پروان چڑھانے میں مدد کی انہوں نے ابتدائی تعلیم و تربیت فیض عام کالج میرٹھ کالج بعدازاں سینٹ جونس کالج آگرہ سے حاصل کی آگرہ کی مطروحہ نشستیں ومشاعرے جومولانا حامد حسن قادری جیسی ذی علم شخصیت کی زیرنگرانی منعقد ہوتے تھے ان کے ذوق سخن کی تسکین کا سامان ہے، مذکورہ نشستیں یونیورسٹی سطح کے طلبا کی منعقد ہوتی تھی اور اس میں طلبا کو اپنی صلاحیتوں کے مظاہرہ کا بھرپور موقع ملتا تھا ان کے ذوق شعری کو جلا بخشنے میں یہ نشستیں بھی مددگار و معاون ثابت ہوئیں انہوں نے کسی کو استاد نہیں بنایا اور تلمیذ الرحمان رہے مگر ذوق مطالعہ اور مشق سخن سے شاعری پر عبور حاصل کیا، پس ماندگان میں ایک لڑکی میں جو بمبئی میں سینہ فصیح الدین سے منسوب ہیں۔

انہیں جملہ اصناف سخن پر قدرت حاصل ہے، غزل، نعت، قصیدہ، مرثیہ و دیگر موضوعات پر ان کا کلام، ان کی شاعرانہ عظمت کا برملا اظہار ہے عیش میرٹھی کے کلام میں میر کے اشعار کی گھلاوٹ، درد کی دردمندانہ تہ داری حسرت کی تہذیب رسم عاشقی اور شاہ نیاز بریلوی کی عارفانہ شاعری کی جھلک نمایاں طور پر دیکھی جاسکتی ہے۔ ان کا کلام فکری وفنی خوبیوں کی بنا پر اردو شاعری کا قیمتی سرمایہ ہے ان کے یہاں دہلی اور لکھنؤ دونوں اسکولوں کے صحت مند عناصر کا حسین امتزاج نظر آتا ہے۔ ان کی غزلوں میں زبان و بیان کی صحت، ضابطوں کی پابندی سحر کاری اور پرکاری بھی ملتی ہے۔ آپ کے کلام کی نشوز واحدی، ڈاکٹر مغیث الدین فریدی اور کئی شخصیتوں نے تعریف کی ہے۔

عیش میرٹھی کی غزلوں کا مطالعہ کرنے سے محسوس ہوتا ہے کہ اسمیں حسن وعشق، ان کا مثالی محبوب فصل گل میں عاشق کی بے قراری، جنون و دیوانگی کے ساتھ گریباں کا چاک ہونا، ہجر محبت کا انتظار، آہ وفغاں، بے قراری و بے چینی، ضبط کا دامن چھوٹ جانے پر بھی ترک عشق کی دعا نہ کرنا محبوب کے رو بہ رو عاشق پر ظلم اور بے اعتنائی، شباب، خرام ناز، سراپائے محبوب انجام عشق، خمریات، لقوف ووحدۃ الوجود آزادہ روی جلوہ گر ہے، کہیں کہیں سیاسی وسماجی معاملات پر بھی چوٹ کی ہے مگر ان کی تعداد بہت کم ہے، اس طرح غزل کے جملہ عناصر ان کے یہاں نمایاں ہیں۔

حسن وعشق روایتی شاعری کا اہم موضوع ہے ان سے متعلق تمام واردات و کیفیات کا

منبع جذبہ عشق ہے عشق ایک فطری جذبہ ہوتا ہے جو دوسرے تمام جذبات پر حاوی ہوتا ہے، اس کی تڑپ اور جوش کا مقابلہ کسی دوسرے جذبہ سے نہیں کیا جا سکتا۔

عیش میرٹھی کے یہاں جذبۂ عشق کی فراوانی حسن کی رعنائی جلوہ گر ہے، ان کا عشق التفات یار کا خواہاں ہے۔

☆☆☆

کتابیات

۱۔ آبِ حیات	محمد حسین آزاد
۲۔ دبستانِ میرٹھی	ڈاکٹر راحت آبرار
۳۔ شعورِ فن	ڈاکٹر فخر السلام و ڈاکٹر الیاس الاعظمی
۴۔ حفیظ میرٹھی	عزیز بگھروی
۵۔ رنج میرٹھی	ڈاکٹر مقصود حسین

عالمی یوم خواندگی کے موقع پر کلچرل کاؤنسل، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ کی جانب سے منعقدہ پروگرام مقابلہ تقریر میں شعبے کی طالبہ لائبہ تقریر کرتے ہوئے ۔اسٹیج پر موجود ہیں بائیں سے ڈاکٹر الکا وششٹھ، پروفیسر نیلو جین گپتا، پروفیسر اسلم جمشید پوری، ڈاکٹر آصف علی، ڈاکٹر شاداب علیم، ڈاکٹر ارشاد علی۔

پروفیسر ریشما پروین
لکھنؤ

دکھیارے: تہذیب اودھ کا نوحہ گر

آل احمد سرور نے کہا تھا کہ کسی ملک کے رہنے والوں کے تخیل کی پرواز کا اندازہ وہاں کی شاعری میں ہوتا ہے مگر اس کی تہذیب کی روح اس کے ناولوں میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ ہمارے ملک کی تہذیب کی روح کو بھی ان ناولوں کی مدد سے بہتر طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔ ان سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ہمارا سماج کس طرح بدل رہا ہے؟ طبقے کس طرح بدلے ہیں؟ عقائد کس طرح شکست کھا رہے ہیں؟ پیشے یا سماج کا جبر انسانوں کو کس طرح بانٹ رہا ہے؟ سائنس، کمپیوٹر اور گلوبلائیزیشن نے ہماری تہذیب پر کس طرح اثر ڈالا ہے؟ گویا ایک ذہنی تاریخ ان ناولوں میں محفوظ ہوگئی ہے۔ یہ ناول صرف وقت گزارنے کی چیز نہیں ہیں، ان میں ہم صدیوں سے جوجھتے، جدوجہد کرتے انسانوں کی پوری تاریخ دیکھ سکتے ہیں۔[1]

ادب زندگی کا آئینہ ہے کسی بھی عہد میں لکھی گئی تحریر سے اس عہد کے آداب و معاشرت کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے خصوصاً افسانوی نثر میں ناول کی صنف ہمارے تہذیبی و معاشرتی سروکار سے کبھی غافل نہیں رہی۔ اصلاحی ناول نگاروں سے لے کر ترقی پسند ناول نگاروں تک ایک طویل سلسلہ ہے جنھوں نے اپنی تخلیقات میں تہذیب و معاشرت کی عکاسی کی ہے۔ نذیر احمد، رتن ناتھ سرشار، عبدالحلیم شرر، مرزا محمد ہادی رسوا مولانا راشد الخیری، پریم چند، عصمت چغتائی، عظیم بیگ چغتائی سے لے کر عہد حاضر تک کے ناول نگاروں نے اردو ناول کو تہذیبی و سماجی تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی ہر ممکن سعی کی ہے۔ جدیدیت کے عروج کے زمانے میں جب ہر قسم کی وابستگی (کمٹمنٹ) سے انکار پر اصرار کیا جا رہا تھا نیز فرد کا تشخص اور انفرادیت ہی تخلیق کاروں کا محور و مرکز تھا۔ اس زمانے میں بھی ناول نے تہذیبی و سماجی سروکار سے اپنا رشتہ برقرار رکھا۔ جدیدیت کے نمائندہ ناول نگار بھی خود کو اس سے مستثنیٰ نہیں رکھ پائے۔ اس سلسلے میں شمس

الرحمٰن فاروقی کے ’کئی چاند تھے سرِ آسماں‘ کے بعد پروفیسر انیس اشفاق کا ناولٹ ’’دکھیارے‘‘ خصوصاً قابل ذکر ہے جس کا موضوع زوال پذیر ’لکھنوی تہذیب‘ ہے۔ ناولٹ کا بلیغ عنوان قاری کو تجسس و تفحص کی دنیاؤں میں لے جاتا ہے اور وہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ آخر اس کا عنوان ’دکھیارے‘ کیوں رکھا گیا؟ مگر عنوان کی پہیلی ناول کے آغاز میں فراست رضوی کے شعر سے کسی حد تک سلجھنے لگتی ہے۔

وہ زمانے جو ہوگئے کہیں گم
ان زمانوں کا نوحہ گرہوں میں

ناولٹ کا آغاز واحد متکلم ’میں‘ کے صیغے سے ہوتا ہے جو اس کا مرکزی کردار ہونے کے ساتھ راوی بھی ہے اور اودھ کی مسلم تہذیب کا ترجمان بھی۔ کہانی مرکزی کردار ذاکر اور اس کے اہل خانہ کے گرد گھومتی ہے ان کرداروں کے ذریعہ انیس اشفاق ’میری تمام سرگذشت کھوئے ہوؤں کی جستجو‘ کے مصداق لکھنوی تہذیب کے زوال کا نوحہ سناتے ہیں۔ ناولٹ کا مرکزی کردار یعنی راوی اپنی مرحوم والدہ اور بھائی کو یاد کرتے ہوئے قاری کو ماضی کے نگارخانے کی سیر کراتا ہے اور ماضی کی تمام جلوتوں اور اس کی باقیات کو اپنی یادوں میں سجائے شعور ولاشعور کے جھروکے سے نئی نسل کو وقتاً فوقتاً مٹتی ہوئی اقدار اور زندگی کی شکست وریخت سے دوچار کراتا ہے۔ انیس اشفاق کی خوبی یہ ہے کہ ایسی مغموم فضا میں بھی وہ قاری کو اپنے خوبصورت بیانیے کے ذریعہ کہانی میں الجھائے رکھتے ہیں اور کہیں اسے یہ احساس نہیں ہونے دیتے کہ ’بس اب اس کے آگے نہیں پڑھ سکتا‘۔ ان کا یہی بیانیہ ماضی کی روشن اقدار کو حال کی ناآسودگی کا مداوا بناتا ہے۔ ناولٹ کا مرکزی کردار ذاکر اور اس کے بڑے بھائی ناصر موجودہ مسائل سے پیدا شدہ احساسِ محرومی، دکھ اور کرب کے مداوے کے لیے اچھے دور کے پرسکون ماحول کو یاد کرتے ہیں۔ اپنی زندگی کی محرومیوں، تناؤ اور کشمکش سے بچنے کے لیے انسان ہمیشہ سے ماضی کی سنہری یادوں میں کھو جاتا ہے۔ یہ ماضی پرستی نہیں بلکہ سکون وشادمانی کی جستجو کا مثبت جذبہ ہے۔ قاضی جاوید نے اپنے ایک مضمون میں ناسٹلجیا کے پس منظر کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے۔

> ’’بہت سے دوسرے خیالات اور احساسات کی طرح ناسٹلجیا کا احساس بھی ہماری سماجی زندگی کو متاثر کرتا ہے۔ وہ ہمیں ماضی کے لمحوں اور مقامات میں سے ایسے اجزاء تلاش کرنے پر آمادہ کرتا ہے

جو ہماری موجودہ صورتِ حال کی ناگواری کا مداوا کر سکیں۔''۲

قدوس جاوید لکھتے ہیں:

''عالم انسانیت'' نوتاریخیت کے حصار میں ہے انسان تاریخ نہیں لکھ رہا ہے، تاریخ انسان کی تقدیر لکھ رہی ہے۔کل کس فرد یا ملک وقوم کا مقدر کیا ہوگا کچھ نہیں کہا جاسکتا اور یہی غیر یقینی صورت حال انسان کو بار بار اپنے ماضی میں جھانکنے اور پھر ماضی سے اپنے حال کے رشتوں کی بازیافت پر مجبور کرتی ہے۔دراصل ہم کتنے بھی ''مستقبل پرست'' یا حال زدہ کیوں نہ ہو جائیں حالات ثابت کر رہے ہیں کہ ملک وقوم کی فلاح کے سارے راستے ہمارے ماضی کے معاشرتی اور ثقافتی نظام میں موجود ہیں۔''۳

ماضی ہماری زندگی کا وہ حصہ ہے جس کا فراموش کرنا ناممکن ہے ہم اپنے حال میں بھی اسے خود سے الگ نہیں کر سکتے۔ماضی سایے کی طرح انسان کے ساتھ اس کے حواس پر غالب رہتا ہے اس کی گرفت ہمارے ذہن/تحت الشعور پر اس درجہ مضبوط ہوتی ہے کہ ہمیں کسی طرح اس سے مفر نہیں لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم آرزومندئ ماضی کی کیفیت کو اپنے اوپر حاوی نہ ہونے دیں۔بلکہ ماضی کی یادوں کو آج کے بہتر بنانے کے لیے استعمال میں لائیں۔''ذاکر'' (دکھیارے، کا مرکزی کردار) کے ذہنی مدرکات کو ماضی کے حوالے سے بخوبی سمجھا جاسکتا ہے۔اپنے بھائی ناصر کے ذریعہ وہ اودھ کی مٹتی ہوئی تہذیب کا بیان کرتا ہے لیکن کہیں بھی قنوطیت کا شکار نہیں۔ انتظار حسین نے لکھا ہے:

''مصنف کا ماضی سے ربط کسی ایک دور سے نہیں بلکہ پوری تاریخ سے ہوتا ہے اور اس رابطہ کا منشا یہ ہوتا ہے کہ نئے احساس میں پشتوں کا تجربہ اور زمانوں کا شعور بھی شامل ہو۔یعنی اگر ناول نگار سن ستاون، معرکۂ کربلا اور جنگ بدر سے اپنا رشتہ جوڑے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس قوم کا جو نیا احساس تعمیر ہو رہا ہے اس میں وہ ایک ہزار سالہ ہند اسلامی تہذیبی تجربہ کو اور پونے چودہ سو سالہ تاریخی شعور کو شامل کرنے کے لیے کوشاں ہے اور یہ وہ رشتہ ہے جہاں ماضی، حال اور

> مستقبل ایک مربوط برادری ہوتے ہیں تو بھی حال کوئی بیر بہوٹی قسم
> کی شے تو ہے نہیں جسے چٹکی سے پکڑ کر ہتھیلی پر رکھ لیا جائے وہ تو آگے
> پیچھے ماضی اور مستقبل کا جلوس لے کر ظاہر ہوتا ہے۔''۴

ذاکر اپنے افعال و محرکات کے ذریعہ قاری کو گذشتہ لکھنؤ کی عظمتوں سے روشناس کراتا ہے یادوں کا ریلا بار بار اسے ماضی میں لے جاتا ہے یہ یادیں اس کے بھائی اور والدہ کے ساتھ ساتھ اس پورے عہد کو اس کے شعور و لاشعور میں زندہ رکھتی ہیں۔ اس کا ذہن ایک Pendulam کی طرح ماضی اور حال کے درمیان متحرک اور رواں دواں رہتا ہے اور انھیں روشنی میں لاتا رہتا ہے۔ ناولٹ کے کردار ماضی، حال اور مستقبل کے تناظر میں ذہنی و نفسیاتی رویّوں کی ترجمانی کرتے ہیں جس کے سبب یہ ناولٹ ایک ایسے تہذیبی ساگا (Saga) کی شکل اختیار کر لیتا ہے جس میں فرد کے حوالے سے ایک پورا عہد نگاہوں میں گھوم جاتا ہے۔ ناولٹ کا راوی اپنے بھائی کی تلاش میں درگاہ جاتا ہے تو وہاں حاضریاں بانٹنے کا منظر یا پھر اس کی ماں کے ذریعہ محرم کی آمد پر عزا کا اہتمام۔

> ''محرم میں وہ پورے گھر میں چونا خود پوتی تھی اور ہمارے یہاں بقر
> عید کی انتیس کو علم کھڑے ہو جاتے تھے اور ماں رات بھر امام باڑہ
> سجاتی تھی اور بہت پہلے سے علَم پٹکے نکال کر رکھ لیتی تھی اور ایک ایک
> علم اور ایک ایک پٹکے کو دیکھتی اور کسی علم پر قلعی کی ضرورت ہوتی تو
> قلعی کراتی، اگر کسی پٹکے پر لچکا لگانا ہوتا تو دن دن بھر بیٹھ کر لچکا لگاتی
> اور پہلی محرم کو تعزیہ لا کر امام باڑے میں رکھ دیتی۔ اس محلے میں سب
> سے پہلے ہمارا امام باڑہ سجتا تھا۔''۵

جیسا کہ ذکر آ چکا ہے ذاکر لکھنؤ کے مختلف علاقوں اور امام باڑوں جیسے سعادت گنج، شیش محل، حسین آباد، سرائے معالی خان، دارالشفاء، پارچے والی گلی، فرنگی محل، تال کٹورہ، کشمیری محلّہ، نخاس، دریا والی مسجد، بڑا امام باڑہ، چھوٹا امام باڑہ، الماس کا امام باڑہ، دیانت الدولہ کی کربلا، کاظمین سے گزرتا ہے وہ تلاش تو اپنے بھائی کو کرتا ہے مگر اس کے ذریعہ انیس اشفاق ان گمشدہ اقدار کے متلاشی نظر آتے ہیں جن کی بازیافت اب ناممکن نہیں تو مشکل ضرور لگتی ہے وہ دور جب یہ مقامات اودھ کی تہذیب و معاشرت کے حقیقی آئینہ دار تھے مگر وقت کے سیلاب نے سب کچھ ختم

کر دیا اسے ہر کوچہ اجڑا ہوا اور ویران نظر آتا ہے جو پکار پکار کر اس سے کہتا ہے ''دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو، میں گئی رونقوں کا امانت دار ہوں بھائی کے انتقال کی مجلس کے بعد جب راوی ''شامہ'' (ناولٹ کا ایک ضمنی کردار) کی تلاش میں نکلتا ہے تو ان ویرانیوں کا احساس اور شدید ہو جاتا ہے۔

> ''میں بھائی کی مجلس کے دوسرے ہی دن سے شہر کے امام باڑوں اور کربلاؤں میں 'شامہ' اور اس کے گھر والوں کو ڈھونڈھنے نکل پڑا۔ شہر کی بہت سی کربلائیں اور امام باڑے اب بھی ویران پڑے تھے۔''[۶]

فن پارے کی مقبولیت کا انحصار اس کی ترسیل میں پوشیدہ ہے۔ لکھنے والا اگر قاری یا سامع کو ذہن مین رکھ کر اپنی بات نہیں کہے گا تو تخلیق صرف اس کی ذات تک سمٹ جائے گی۔ ادیب اپنے سماج کا نمائندہ ہے، اسے جدت پسند ہونا چاہیے مگر ابہام سے گریز ضروری ہے۔ انیس اشفاق نے 'دکھیارے' میں اس امر کا خصوصی خیال رکھا ہے۔ ناول لکھتے وقت تین اہم باتوں کا نظر انداز کرنا ممکن نہیں اول Pattern جسے معنی خیز فارم کی تلاش کہا جا سکتا ہے، یا کثیر العناصری کو وحدت میں ڈھالنا دوم Rythym اور تیسرے Point of view یا نقطۂ نظر۔ انیس اشفاق نے ان تینوں خصوصیات کا بخوبی استعمال کیا ہے۔ دکھیارے کا موضوع اودھ کی مٹتی ہوئی تہذیب ہے۔ انیس اشفاق نے اس تہذیب کے پس پردہ زندگی کے بحران خلفشار اور اختلال و انتشار کو پیش کیا ہے۔ اس کے باوجود کہیں بھی انتخاب اور ترتیب نو Reordering پر ضرب نہیں آئی ہے۔ اس میں کسی طرح کا اختلال یعنی Incoherence نہیں ملتا بلکہ ایک نوع کی اندرونی وحدت یا موزونیت موجود ہے۔ ناول اپنے موضوع میں ایک مخصوص آہنگ لیے ہوئے ہے۔ جس کا بیان کرنا مشکل ہے۔ ہم صرف اسے محسوس کر سکتے ہیں۔ جیسا کہ پہلے بھی ذکر آ چکا ہے۔ ناول انسانی زندگی کا آئینہ ہے۔ داستان کے زوال کے بعد دوسری اصناف کی بہ نسبت ناول کا کینوس وسیع ہے۔ اردو میں ناول نگاروں نے ناول کے کرداروں کو اکثر اپنے مقصد و نظریے کے لیے استعمال کیا ہے خواہ وہ اصلاحی ناول ہوں یا بعد میں لکھے گئے ناول مگر جدید نقطۂ نظر کے تحت لکھنے والے ناول نگاروں نے بیانیہ کے عمل میں راوی کے تفاعل پر بندش لگائی۔ اس کی وجہ غالباً عہدِ جدید میں ناول نگار کا عمیق مطالعہ اور مختلف زبانوں میں لکھے گئے ادب پر اس کی گرفت بھی ہے۔ مشہور امریکی ناول نگار ہنری جیمز نے اس سلسلے میں اپنی کتاب 'The Art of Novel' میں لکھا ہے کہ 'براہ راست اور بالواسطہ قصہ گوئی یا روایت کے درمیان فرق ایک بہت اہم مسئلہ ہے۔ ہمہ بیں اور ہمہ داں یعنی Omniscient قصہ گو کا جو مصنف خود ہی ہوا کرتا تھا کا تصور اب فرسودہ خیال کیا جانے لگا ہے اور تقریباً ترک کیا جا چکا ہے۔ اب مصنف کو پہلے جیسی

اہمیت حاصل نہیں کیونکہ متن بھی بہت کچھ کہتا ہے۔انیس اشفاق کے ناولٹ 'دکھیارے' میں مثال کے طور پر ذاکر کا کردار ایک نوع کی مرکزی ذہانت یعنی Central intelligence کا درجہ رکھتا ہے جس کے توسط سے ناول کے عمل کو مختلف زاویوں سے دیکھا جا سکتا ہے۔ اردو ناول کی تاریخ میں براہ راست بیان میں کرداروں کے برتاؤ اور عمل کی باگ ڈور کلیتاً ناول نگار کے ہاتھ میں محفوظ تھی ان کے محرکات ناول نگار کے مطابق ہوتے تھے کردار کی اپنی کوئی خواہش یا عمل نہیں تھا وہ منشائے مصنف کے تابع تھے۔لیکن آج ایسا نہیں ہے فن پارہ میں متن کی بڑھتی اہمیت نے مصنف کو حاشیے پر لا کھڑا کیا ہے اور عمل کے Vantage point میں تبدیلی آنے سے ہم ناول کو بھی مختلف زاویوں اور نقطہ ہائے نظر سے دیکھ اور پرکھ سکتے ہیں۔اسی وجہ سے ناول کی رفتار میں تعطل نہیں پیدا ہوسکتا اور نہ ہی ہم مصنف پر جانب دار ہونے کا الزام عائد کرسکتے ہیں نقطۂ نظر کی تبدیلی ناول کے عمل کے زیروبم کا ادراک اور احتساب کراتی ہے اور اسے ایک متغیر اکائی بناتی ہے۔بقول شافع قدوائی:

> ''بیانات (Narratology) کی نئی تقسیم کے مطابق ناول کے Dialogue اور Polyphonic ہوتے ہیں، Polyphonic ناولوں میں کرداروں، آوازوں اور نقطۂ نظر کی کثرت ہوتی ہے اور کرداروں کے عمل سے بیانیہ عرصہ تخلیق کیا جاتا ہے اور اکثر پورا ناول بیان کے بجائے Performance کی صورت میں سامنے آتا ہے۔''[7]

'دکھیارے' کا مرکزی کردار ذاکر اپنے جذبات و محرکات اور عمل کی وجہ سے ایک متغیر اکائی نظر آتا ہے۔انیس اشفاق کہیں بھی اس کی راہ متعین کرتے نظر نہیں آتے یہاں تک کہ اس کا نام بھی نہیں بتاتے ناول میں بہت کم مقامات پر اس کا نام آیا ہے منظر نامے، مکالمے اور جزئیات ذاکر کو فطری کردار بناتے ہیں۔ناول کے آخر میں یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> ''ایک دن مجھے بیٹھے بیٹھے یاد آیا کہ بھائی کے آخری ٹھکانے پر شمامہ کی صحنچی کے نئے رہنے والے نے مجھے اخبار میں لپٹی ہوئی کوئی چیز دی تھی جسے گھر لا کر میں کسی وجہ سے کھولنا بھول گیا تھا۔یہ بات یاد آتے ہی میں نے اخبار میں لپٹی ہوئی اس چیز کو نکالا تو دیکھا کہ یہ ایک خوبصورت کڑھا ہوا کرتا ہے یہ کرتا اسی کپڑے کا تھا جسے شمامہ کے لائے ہوئے تین ٹکڑوں میں سے میں نے پسند کیا تھا۔میں اس کرتے کو دیر تک دیکھتا رہا پھر اسے ایک ہینگر

میں لگا کر اپنے بستر کے سامنے والی دیوار پر ٹانگ دیا میرے کمرے میں جو
بھی آتا ہے اس کی نظر اس کرتے پر ضرور پڑتی ہے اور وہ اس کی عمدہ کڑھائی
کے بارے میں ضرور پوچھتا ہے مگر میں کسی کو نہیں بتاتا کہ چکن کا یہ خوبصورت
کام کس کی انگلیوں کا ہنر ہے۔'' ۸؎

ماضی اگر اپنے اندر خوبصورت یادوں کو سمیٹے ہے تو وہ ہمارے حال کو بھی حسین بنا دیتا ہے شامہ کی یاد ذاکر کے دل و دماغ کو فرحت و شادمانی بخشتی ہے۔ دراصل یہ علامت ہے اس شاندار ماضی کی جسے ہم فراموش کر بیٹھے ہیں اور صرف یہ سوچ کر بیٹھے ہیں کہ یادِ ماضی عذاب ہے یارب۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے ماضی میں ہماری تہذیبی اقدار ہمارا تمدن موجود ہے ماضی حال اور مستقبل ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں اگر ماضی کو یاد کر کے یاسیت کی بجائے اس سے اپنے حال میں چراغاں کریں تو یقیناً بہت کچھ تبدیل ہوگا سوال یہ ہے کہ انیس اشفاق نے اس ناول میں کیا صرف تہذیبی اقدار کی بازیافت کو اپنا نصب العین قرار دیا ہے؟ یا صرف نوحہ گری پر اکتفا کیا ہے؟ انیس اشفاق کے علاوہ اگر یہ ناولٹ کسی اور کے قلم سے نکلا ہوتا تو شاید یہ خیال آتا کہ یہ ناولٹ صرف اور صرف ہماری مٹتی ہوئی تہذیب کا نوحہ ہے لیکن انیس اشفاق بنیادی طور پر نقاد ہیں اور وہ بھی جدید نقاد۔ جدید تنقید جس طرح متن کی اہمیت پر زور دیتی ہے یہ ناولٹ بھی اسی طرف اشارہ کرتا ہے کہ مجھے پڑھو اور غور کرو یقیناً دکھیارے کے بین السطور میں نوحہ گری کے علاوہ بھی بہت کچھ پوشیدہ ہے۔ ضرورت اس کے بغور مطالعہ کی ہے۔

☆☆☆

۱۔ ہم عصر اردو ناول (صفحہ ۱۰۸)
۲۔ (ناسٹلجیا کے بارے میں چند باتیں ماہِ نو۔ اکتوبر ۱۹۸۶ء)
۳۔ تحریر نو، ص۔ ۲۵
۴۔ علامتوں کا زوال، انتظار حسین، ص۔ ۲۲۔
۵۔ دکھیارے، ص۔ ۲۹
۶۔ دکھیارے، ص۔ ۱۵۹۔
۷۔ روزنامہ صحافت (سنڈے صحافت ص۔ ۱۱۱) ۶ر فروری ۲۰۱۱ء بروز اتوار۔
۸۔ دکھیارے، ص۔ ۱۵۹۔

ڈاکٹر آصف علی

میرٹھ

قومی یکجہتی اور اردو شاعری

اردو شاعری میں قومی یکجہتی کے عناصر کی نشان دہی سے قبل میرے نزدیک یہ جان لینا بھی ضروری ہے کہ بالآخر قومی یکجہتی سے مراد کیا ہے تو اس سلسلے میں عرض ہے کہ قوم سے مراد ڈاکٹر سید عابد حسین کے بقول وہ انسانی جماعت یا لوگ ہیں جو:

''ایک ایسے علاقے میں رہتے ہیں جسے قدرتی حدود نے دوسرے علاقوں سے الگ کر کے ایک مستقل جغرافیائی واحدہ یا ملک بنا دیا ہے اور جن کی عام تہذیب میں کم و بیش اشتراک پایا جاتا ہے۔''

[قومی تہذیب کا مسئلہ، سید عابد حسین، ص 12]

جب کہ فرہنگ اور لغت نویسوں نے یکجہتی کے معنی اتحاد، اتفاق، یگانگت، دوستی اور ہمدردی وغیرہ تحریر کیے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ باہمی اتحاد و اتفاق، احترام و یگانگت، رواداری، وسیع النظری، میل جول و آپسی بھائی چارے کے جذبات کو جن عوامل سے فروغ ملتا ہو وہ سب کے سب قومی یکجہتی کے زمرے میں شامل ہیں۔ ظاہر ہے کہ زبان و ادب، رنگ و نسل، ذات و برادری، مذہب و عقائد، تاریخ و اساطیر، علوم و فنون، معیشت و معاشرت، تہذیب و ثقافت، رہن سہن، کھان پان کے طور طریقوں اور سماجی رسموں رواجوں میں جتنا زیادہ اشتراک ہوگا قومی یکجہتی کی بنیاد اتنی ہی مضبوط ہوگی۔ یہ مضبوط قومی یکجہتی عموماً ہر خطہ ارض اور خصوصاً ہندوستان کی اولین ضرورت ہے اور اس اولین ضرورت کی تکمیل میں دوسرے عوامل کے ساتھ اردو شاعری نے بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔ ڈاکٹر سید حسین طلعت نقوی لکھتے ہیں:

''قدیم زمانے سے ہندوستان مختلف مذہبوں اور تہذیبوں کا گہوارہ رہا ہے۔ دوسرے ملکوں کے لوگ مختلف اغراض و مقاصد کے تحت یہاں آتے رہے ہیں اور یوروپی اقوام کے سوا عموماً باقی سبھی یہیں کے ہو رہے۔ یہ لوگ مختلف مذاہب کے ماننے والے تھے، مختلف زبانیں بولتے تھے اور

ان کے رسم و رواج بھی ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں کے رسم و رواج، طریق بود و باش، تقریبوں، تہواروں، فنون لطیفہ، مذہب اور زبان وغیرہ کا فرق ہندوستان میں جگہ جگہ پر ملتا ہے۔ اس لیے جب تک ان سب میں اختلافی امور کے باوجود بحیثیت ایک قوم اتحاد و یگانگت نہ ہو ملک میں استحکام پیدا نہیں ہوسکتا۔ ملک میں اتحاد اور بھائی چارگی کا جذبہ بیدار کرنے کے لیے جہاں اور بہت سے طریقے عمل میں لائے گئے وہاں اردو شاعری نے بھی ایک اہم رول ادا کیا ہے۔''

[نظیرا کبرآبادی کی نظم نگاری، ڈاکٹر سید طلعت حسین نقوی، ص 64]

بلکہ اگر یوں کہا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا کہ اردو تو پیداوار ہی اس مشترکہ کلچر کی ہے جس نے باہمی رواداری و یگانگت، عزت و احترام، وسیع القلبی اور مشترکہ نقطۂ نظر کے اصولوں کو راہنما بنا کر ہندوستان میں آباد مختلف قوموں کو ایک رشتے میں جوڑنے کا فریضہ انجام دیا تھا۔ سید مجاور حسین اردو زبان کے اس وصف کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اردو کی بنیاد ہی مشترکہ کلچر پر پڑی تھی۔ اس کا وجود ہی اس لیے ہوا کہ مختلف مذاہب کے ماننے والے، مختلف علاقوں کے رہنے والے، مختلف پیشے کے افراد ایک دوسرے کو سمجھنے اور ایک مرکز پر آنے کی تمنا رکھتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان کے سارے مذاہب کے معتقدات و تصوارات ہندوستان کے تمام علاقوں کے افراد کی کاوشیں، شمال سے جنوب تک اور مشرق سے مغرب تک بولے جانے والے ہر زبان کے الفاظ اردو میں شامل ہو گئے۔ اس طرح بذات خود اردو کا وجود قومی یکجہتی کی علامت اور ہندوستانیت کے شعور کا مظہر بن گیا۔''

[اردو شاعری میں قومی یکجہتی کے عناصر، سید مجاور حسین، ص 456]

اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ اردو نے اپنے دور تشکیل سے لے کر عصر حاضر تک مغلوں کا عروج، ان کی تباہی، انگریزوں کی Divide and Rule پالیسی، تحریک آزادی، مذہبی احیاء پرستی کے علاوہ 1962، 1965، 1971 اور 1999ء کی ہندو پاک کی جنگیں وغیرہ متعدد ایسے انقلابات دیکھے ہیں جن میں کشت و خون، قتل و غارتگری، ظلم و استحصال اور جبر و بربریت کی ایسی شرمناک ہولیاں کھیلی گئیں کہ ان کے نتیجے میں باہمی رواداری، آپسی احترام، وسیع القلبی، انسان

دوستی اور کثرت میں وحدت کے عقائد ونظریات متزلزل ہوئے اور مشترکہ تہذیب کونا قابل تلافی نقصان پہنچاحتی کہ بعض جوشیلے رہنما تو کثرت میں وحدت کے فلسفے ہی سے منحرف ہوکر مذہب و معتقدات کی بنیاد پر یک رنگی خواب بننے لگے۔لیکن اردو شاعری نے ہندوستانی تاریخ کے ان مشکل ادوار میں بھی نہ صرف سماج میں رنگارنگی اور یک جہتی پیدا کرنے والے تمام عوامل کا ساتھ دیا بلکہ ؎

حافظ گر وصل خواہی صلح کن با خاص و عام
با مسلماں اللہ اللہ، با برہمن رام رام

کی اپنی بنیادی پالیسی پر مضبوطی سے قائم رہ کر تمام تفریق پسندانہ رجحانات پر کاری ضرب لگائی۔رنگ ونسل، ذات و برادری اور تاریخ و اساطیر کی حقیقتوں،علوم وفنون،معیشت و معاشرت اور تہذیب وثقافت کے فلسفوں نیز رہن سہن اور کھان پان کے طور طریقوں اور سماجی رسوم و روایات کی جذباتی وابستگیوں کے رخ کو آئینہ کرنے کے ساتھ ساتھ تاریخ کی تمام غیر متنازعہ بالخصوص مذہبی شخصیات کوقومی یکجہتی اور مشترکہ تہذیب کی علامت بنا کر بحیثیت ہیرو پیش کر کے عملی طور پر یہ ثابت کردیا کہ ہندوستان کی قومی یکجہتی اور تہذیبی ہم آہنگی کسی خاص مذہب، کسی خاص علاقے، کسی خاص فرقے، کسی خاص برادری، کسی خاص نسل یا کسی خاص زبان کا نظریہ نہیں ہے بلکہ ایک مربوط ہندوستانی فلسفہ ہے جسے جوشیلے مذہبی احیاء پرستوں اور مفاد پرست عوامی رہنماؤں کے خواب کبھی ملیامیٹ نہیں کرسکتے۔

مفاد پرستوں کو یوں تو تاریخ کے ہراس واقعے اور خیال، بودوباش، رہن سہن اور کھان پان کے ہراس طریقے اور رواج جس سے ان کے نظریۂ یک رنگی کو تقویت ملتی ہو کواپنا لینے سے گریز نہیں ہے تاہم مخصوص طور مذہب اور مذہبی روایات ان کے لیے لقمۂ تر کی حیثیت رکھتی ہیں۔کیونکہ مذہبی عقیدت اور مذہبی روایات سے گہری جذباتی وابستگی ہندوستانی اقوام کی فطرت ثانیہ ہے۔چنانچہ اردو شاعروں نے منجملہ دوسرے اشتراکانہ عوامل کے اس حساس موضوع پر بھی اتنا سرمایہ جمع کردیا ہے کہ اس کی قرأت وتفہیم کے لیے زندگیاں درکار ہیں۔مہاتما گاندھی نے مذہب کے بنیادی وصف کی وضاحت کرتے ہوئے کہا تھا:

''تمام مذاہب کی روح ایک ہے لیکن مختلف مظاہر میں جلوہ گر ہے۔یہ مختلف مظاہر تا ابد قائم رہیں گے۔دانش منداس ظاہری پیکر کونظر انداز کرتے ہیں اور مختلف پیکر میں ایک ہی روح دیکھتے ہیں۔''

[اردو شاعری میں قومی یکجہتی کے عناصر، سید مجاور حسین، 460]

اردو شاعروں نے ہمیشہ مذہب کی اسی روح کو مختلف زاویوں اور متعدد عنوانات سے پیش کیا ہے۔ مثال کے طور پر نظیر اکبرآبادی کہتے ہیں کہ جب کل کائنات کا خالق ایک ہے اور وہی تمام انسانوں کو مقصود بالذات بھی ہے تو پھر ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی کی تفریق بالکل بے معنی اور بے کار محض ہے۔ وہ کہتے ہیں ؎

جھگڑا نہ کرے مذہب و ملت کا کوئی یاں جس راہ میں جو آن پڑے خوش رہے ہر آں
زنار گلے یا کہ بغل بیچ ہو قرآں عاشق تو قلندر ہے نہ ہندو نہ مسلماں
کافر نہ کوئی صاحب اسلام رہے گا
آخر وہی اللہ کا اک نام رہے گا

جب ہمارا مقصود بالذات بعد از مرگ ہمارا فیصلہ ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی ناموں کی بجائے ہمارے عملوں کی بنیاد پر صادر فرمائے گا تو پھر ہمیں مذہب و ملت کے تعصب، حسب و نسب کے تفاخر اور مقام و علاقے کی تمام تر سیاست سے پرے ہٹ کر محض نیت کے اخلاص اور عمل کی صداقت پر توجہ مرکوز رکھنی چاہئے۔ چنانچہ نظیر ناموں کی ان تفریقات کو وجہ مخاصمت نہ بنانے کی تلقین کرنے کے لیے منطقی طرز استدلال کا طریقہ اپناتے ہوئے حمد جیسی مبارک صنف کے ایک بند میں یہ ثابت کرتے ہیں کہ باری تعالیٰ کی ذات محض ایک ہے مگر وہ اپنے مختلف ناموں سے مشہور ہے جنہیں مختلف عقیدوں اور رازموں کے بانیان نے اپنی تہذیبی روایات اور سماجی اقدار کی مناسبت سے اپنے لیے منتخب کر لیا ہے۔ کہتے ہیں ؎

کوئی خالق، باری، رب، مولا، رحمٰن، رحیم، اللہ، تنگری کوئی الکھ روپ کرتار کہے، نرکال، نرنجن نردھاری
کوئی رام رام کہہ کر سمرے کوئی بولے شیو شیو ہری ہری کوئی دانو، دینت، دیوائل، کوئی راچھس، دیوت
کل عالم تیری یاد کرے تو صاحب سب کا سچا ہے

مذہبی منافرت کو روکنے اور بے تعصبی کی فضا ہموار کرنے میں پیر، فقیروں، پیغمبروں، اوتاروں اور صوفی سنتوں کا کردار انتہائی اہم ہوسکتا ہے۔ چنانچہ اردو شاعروں نے تمام غیر متنازعہ مذہبی رہنماؤں کو اپنا موضوع بنایا ہے اور پوری عقیدت و احترام کے ساتھ ان کی خدمات کا اعتراف کیا ہے اور خاص بات یہ ہے کہ جہاں مسلمان شاعروں نے دیوی دیوتاؤں اور گرو و اوتاروں کی مدح سرائی کی ہے تو وہاں ہندو شعرا نے بھی حمد، نعت، منقبت اور مرثیہ جیسی مبارک اور مذہبی خاص اصناف میں بھی اپنی عقیدت کے وہ گل کھلائے ہیں کہ جن کی نظیر ممکن نہیں ہے۔ مثال کے لیے رام چندر جی، گرو نانک، گوتم بدھ، شری کرشن،

مہادیو، درگا جی، عبدالقادر جیلانی، معین الدین چشتی، بابا فرید، امام حسین اور محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم مگر سبھی رہنماؤں کی مدح میں تحریر شدہ تخلیقات سے نمونے پیش کرنا اس وقت ممکن نہیں ہے۔ اس لیے نظیر کی نظم ''ہر کی تعریف'' سے یہ بند ملاحظہ کر لیجئے ۔

میں کیا کیا اوصاف لکھوں یارو اس شیام برن اوتاری کے مسی کشن، کنھیا مرلی دھرن موہن، کنج بہاری کے
گوپال، منوہر، سانولیا، گھنشیام، اٹل بنواری کے نند لال، دلارے، سندر، چھپ، ہرج چند مکٹ چھلکا ری کے
کر دھو لٹیا دودھ ماکھن، رنچھور، نول گردھاری کے بن کنج پھریا، راس رچن، سکھ دائی کانہہ مراری کے
ہر آن دکھائے روپ نئے، ہر لیلا بناری بناری کے پت، لاج رکھیا، دکھ بھنجن، ہر بھگتی بھگت ادھاری کے
نت ہر بھج ہر بھج، رے بابا، جو، ہر سے دھیان لگاتے ہیں
جو، ہر کی آسا رکھتے ہیں، ہر، ان کی آس بچاتے ہیں

خود غور کیجئے کہ نظیر نے اس مختصر بند میں شری کرشن کے جتنے نام اور اوصاف بیان کردیے ہیں وہ شاید شری کرشن کے بہت سے نام نہاد بھگتوں کو بھی بمشکل یاد ہوں گے۔ یا پھر اقبال کی نظم ''رام'' کے یہ دو شعر ملاحظہ کیجئے اور اقبال جیسے راسخ العقیدہ مسلم فلسفی کی ذوق عقیدت کی داد دیجئے وہ کہتے ہیں ۔

ہے رام کے وجود پہ ہندوستان کو ناز
اہل نظر سمجھتے ہیں اس کو امام ہند
اعجاز اس چراغِ ہدایت کا ہے یہی
روشن تر از سحر ہے زمانے میں شام ہند

مخالف مذہب وعقیدہ راہنماؤں کی مدح سرائی اور عقیدت و وارفتگی میں امکان کے یہ تمام دریا عبور کر لینے میں غیر مسلم شعرا بھی کسی طرح مسلم شعرا سے پیچھے نہیں رہے ہیں اور انہوں نے بھی قومی یکجہتی کے معاملے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔ ذرا یہ اشعار ملاحظہ کیجئے ۔

محبوبِ الٰہی کیسے تھے تاریخِ عرب دہراؤ تو
چُپ کیوں ہو مدینے کی گلیو! منہ کھول کے کچھ بتلاؤ تو
ہر ظلم سہا تذلیل سہی اغیار نے ڈھائے لاکھ ستم
اس پر بھی دعائیں دیتے رہے یہ ظرف کہیں دکھلاؤ تو
الحاد کی کالی چادر میں لپٹی ہوئی دنیا سوتی تھی
جو شمسِ عرب نے نور دیا وہ کس نے دیا بتلاؤ تو

سچ یہ ہے محمدؐ سچے ہیں اور دین بھی ان کا سچا ہے
پرواز یقیناً بخشش ہے ایمان اگر لے آؤ تو

یہ نعت کے اشعار ہیں جو خالص مذہبی صنف ہے اور اس پر مستزاد آج کے پر آشوب دور کے شاعر کے ہیں مگر اس کے باوجود جیند رسنگھ پرواز کا ذوق عقیدت قابل دید ہے۔

شعرا کا یہ ذوق عقیدت محض مذہبی راہنماؤں کی حمد تک محدود نہیں ہے بلکہ انہوں نے سماج کی ہر روایت اور معاشرت کے ہر پہلو میں اخوت و یگانگت کے رنگ تلاش کر، کلچر کو مشترک بنانے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔ مثال کے بطور محسن کاکوروی کے نعتیہ قصیدے کی تشبیب کے یہ اشعار ملاحظہ کیجئے ۔

ڈوبنے جاتے ہیں گنگا میں بنارس والے
نوجوانوں کا سنیچر ہے یہ بڑھوا منگل
تہہ و بالا کیے دیتے ہیں ہوا کے جھونکے
بیڑے بھادوں کے نکلتے ہیں بھرے گنگا جل
جوگیا بھیس کئے چرخ لگائے ہے بھبھوت
یا کہ بیراگی ہے پربت پہ بچھائے کمّل

یہاں اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ قومی یکجہتی کے فروغ کی ایسی مثالیں بعض دانشور یا اصلاح پسند اردو شاعروں کا ہی خاصہ نہیں ہیں بلکہ اردو کے ہر چھوٹے بڑے شاعر کے یہاں ایسی مثالیں بکثرت موجود ہیں لیکن ان کے پیش کرنے کی یہاں بہر حال گنجائش نہیں ہے۔

مختصر یہ کہ اردو شاعری اور قومی یکجہتی یا مشترکہ کلچر کا فروغ لازم وملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں اور اسی لیے ادبیات عالم میں ایسی مثالیں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہوں گی کہ جہاں اردو شاعری کی طرح کھلے بندوں یہ وکالت کی جاتی ہو کہ ۔

وفاداری بشرط استواری اصل ایمان ہے
مرے بت خانے میں تو کعبہ میں گاڑھو برہمن کو

☆☆☆

ڈاکٹر شاداب علیم

میرٹھ

سہرے کی ادبی معنویت

زمانہ قدیم سے سہرا ہماری ادبی روایات اور تہذیب کا حصہ رہا ہے اور آج بھی ہے۔ شادی کے مبارک موقع پر نکاح کے بعد پڑھی جانے والی تہنیتی نظم سہرا کہلاتی ہے۔اس نظم میں دولہا دلہن کو مبارک باد اور دعائیں دی جاتی ہیں۔اس کے علاوہ ان کی ازدواجی زندگی کے لیے نیک خواہشات کا اظہار بھی کیا جاتا ہے۔دولہا دلہن کے والدین، متعلقین اور رشتہ داروں کی خوشیوں کی ترجمانی بھی اس نظم میں ہوتی ہے۔

دراصل یہ ایک فرمائشی نظم ہوتی ہے۔لغوی اعتبار سے دیکھا جائے تو سہرا پھولوں، موتیوں کی ان لڑیوں کو کہتے ہیں جو دولہا دلہن کے منہ پر لٹکائی جاتی ہیں۔یہ وہ نظم ہوتی ہے جو شادی بیاہ کے موقع پر شعرا دولہا اور اس کے اعزہ کو خوش کرنے کی غرض سے لکھتے ہیں۔نظم کی اس صنف کی کوئی طے شدہ زمین نہیں ہوتی۔شاعر جس ہیئت میں چاہے اسے لکھ سکتا ہے۔مثنوی، غزل، مثلث، مربع، مخمس، مسدس ہر طرح کی زمین اس کے لیے سازگار ہے۔

فنی اعتبار سے سہرا ایک مدحیہ نظم ہے جو صاحب شخصیت کی تعریف و توصیف کے لیے ایسے موقع کا انتخاب کرتی ہے جب کہ شخصیت خود خوش حالی سے ہم کنار ہونے والی ہوتی ہے۔

ان تمام ادبی مباحث سے قطع نظر اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ سہرا نگاری اردو ادب کی شعری روایت کا حصہ ہے اور اردو شاعری کی ایک خوبصورت صنف ہے جس میں ادب کی چاشنی، جذبات کی فراوانی، بندش کی چستی، تخیل کی بلند پروازی اور دلچسپ و دل نشیں قافیہ بندی پوری طرح موجود ہے۔اس لیے اس کی ادبی حیثیت مسلم ہے۔

سہرا نگاری کی روایت قدیم ہے۔اس کو قصیدے کی ایک شاخ بھی کہہ سکتے ہیں۔عربی فارسی اور اردو میں قصیدے کی ایک مستحکم حیثیت ہے۔فرق صرف یہ ہے کہ قصیدے کچھ اہم

شخصیات کے لیے مخصوص ہیں لیکن سہرا ہر اس شخص کا لکھا جا سکتا ہے جو شادی کر رہا ہے۔ ہندوستان کے تقریباً تمام علاقوں اور شہروں میں سہرا لکھنے اور پڑھنے کا سلسلہ پایا جاتا ہے۔ کیونکہ شادی خوشی اور کامیابی کی اطلاع پا کر ہدیہ تبریک و تہنیت نذر کرنا فطری جذبہ ہے اور شاید روز آفرینش سے ہی یہ رسم زندگی کے آداب میں شامل ہے۔

شادی کی تقریبات کے موقع پر تہنیتی نظموں اور سہروں کی روایت اردو تہذیب کا حصہ رہی ہے۔ اردو کے بیشتر مراکز میں سہرا نویسی کا چلن رہا ہے۔ حالانکہ سہرے یا تقریبات کے موقع پر کہی گئی نظمیں بیشتر لحاتی یا وقتی نوعیت کی ہوتی ہیں۔ لیکن شعرا اپنے تخلیقی اظہار سے بعض اوقات انہیں آفاقی حیثیت عطا کر دیتے ہیں۔ فن کاروں کا ایسا ہی تخلیقی رویہ ایسی نظم کو ادبی معنویت کا حامل بنا دیتا ہے۔

سہرے کی ابتدا عربی میں ہوئی۔ عرب میں شادی بیاہ کے موقع پر قبیلے کے لوگ نہ صرف دولہا دلہن کی تعریف بیان کرتے تھے بلکہ ان کے خاندانی وجاہت اور بہادری کو بھی پیش کرتے تھے۔ فارسی میں بھی اس کے نقوش ملتے ہیں۔ عہد غالبؔ سے قبل دکن میں سہرے کی روایت پائی جاتی ہے۔

اردو میں سہرا نویسی کو فروغ مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر کے دور میں حاصل ہوا۔ اس سلسلے میں پہلا باقاعدہ سہرا غالبؔ کا ملتا ہے جو انہوں نے بہادر شاہ ظفر کے صاحب زادے مرزا جواں بخت کی شادی کے موقع پر لکھا تھا۔ اس سہرے میں مقطع میں جو طنز تحریر تھا اس کا جواب شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ نے شہزادے کا سہرا لکھ کر دیا تھا۔ اس طرح غالبؔ و ذوقؔ کے سہرے اردو روایت کا حصہ بنے۔

غالبؔ، ذوقؔ، ظفرؔ کے علاوہ شیخ امام بخش، ریاض حیدر آبادی، آل احمد سرور، ابراہیم ہوش، فضا ابن فیضی، فیض احمد فیضؔ، مظفر حنفی، احمد فراز، مظہر امام، نثار احمد فاروقی، شہپر رسول، پروفیسر شاہدی، سالک لکھنوی، منظر شہاب، رئیس امروہوی، اعجاز صدیقی، علقمہ شبلی، عشرت رحمانی، محبوب راہی، اسلم بدر، شاہد جمیل اور ارشد مینا نگری جیسی ادبی شخصیات نے اس صنف کو وقار بخشا اور اردو ادب کے سرمائے میں گراں قدر اضافہ کیا ہے۔

سرزمین میرٹھ ادب کے حوالے سے ہمیشہ سرخ رو رہی ہے۔ یہاں کے شعرا و ادبا نے بین الاقوامی سطح پر اپنی موجودگی کا احساس کرایا ہے۔ کیونکہ یہاں کے شعرا و ادبا کے علمی ادبی

کارنامے کسی طرح بھی کسی دبستان سے کم نہیں رہے ہنوز یہ سلسلہ آج بھی جاری وساری ہے۔ آج بھی دبستان میرٹھ کے شعرا دیگر شعری اصناف کے ساتھ ساتھ سہرا نگاری کی روایت کو زندہ کیے ہوئے ہیں اور میری گفتگو کو تقویت بخشتے ہیں۔ وہ تمام شعری تخلیقات جو سید احمد ضیاء کی شادی کے موقع پر یہاں کے شعرا نے محبت وعقیدت کے پھول صنف سہرا میں پیش کر کے میرٹھ میں سحرا نگاری کی روایت کو مزید استحکام بخشا ہے۔ میں ان تمام شعرا حضرات کا صمیم قلب کے ساتھ شکریہ ادا کرتی ہوں۔

یہاں میری گفتگو کا مقصد میرٹھ کے شعری و ادبی ماحول میں سہرا نگاری کے مقام و مرتبے کو پیش کرنا اور یہ بتانا مقصود ہے کہ یہاں کے شعرا کے سہروں میں طرزِ بیان کی جو کارفرمائی نظر آتی ہے وہ دیگر شعرا کے یہاں خال خال ہی نظر آتی ہے۔

اس لیے ضروری معلوم ہوا کہ ان تمام سہروں کے نمونوں کو ایک گلدستے کی شکل میں پیش کر دیا جائے جس سے سہرا نگاری میں ان کی فکر اور شعری پرواز کا صحیح اندازہ ہو سکے اور اردو میں سہرے کے ادبی مقام ومرتبے کا تعین ہو سکے۔

امید کرتی ہوں کہ قارئین کی جانب سے اس گلدستے کو پذیرائی حاصل ہوگی اور اصحاب نظر بھی فن سحرا نگاری پر توجہ مبذول فرمائیں گے۔

☆☆☆

محفل سہرا خوانی پروگرام میں معروف شاعر شاداں پھلاؤدی سہرا پڑھتے ہوئے۔ اسٹیج پر موجود ہیں دائیں سے محترم سید معراج الدین، سید عاصم، ڈاکٹر معراج الدین، پروفیسر اسلم جمشید پوری محترم ذیشان خان وغیرہ۔

ڈاکٹر ارشاد سیانوی

آنکھ جو سوچتی ہے، پر ایک نظر

تقسیم ہند، ہجرت ، ملک کے بٹوارے کا غم ، سیاسی سماجی حالات ، اودھ کی تہذیبی معاشی روایات کی گرتی صورت حال ، متوسط گھرانوں کے مسائل ، نوجوانوں کی ذہنی نفسیاتی کشمکش ، غریبوں ، مزدوروں اور محنت کشوں کی پے چیدگی ، سماجی اقتصادی تعلیمی مسائل ، سماجی محرکات و رجحانات میں الجھتا انسان ، جدید نظریات سے پیدا ہونے والے مسائل ، عصری ماحول و معاشرے میں جڑ پکڑتی خرابیاں ، فرقہ پرستی کے درمیان ہندو مسلمان ، ہم عصر عہد کی بے راہ روی ، سماج میں چاروں سمت خوف و دہشت کا ماحول ، سیاسی انتشار ، مشترکہ تہذیب کا بکھرتا شیرازہ ، تہذیب و تمدن کا خاتمہ ، رقص و موسیقی اتحاد کی صورت حال وغیرہ ایسے موضوعات ہیں جن کو بہت سے ناول نگاروں نے اپنے ناولوں میں منفرد انداز میں پیش کیا ہے ۔ شموئل احمد ، غضنفر ، مشرف عالم ذوقی ، سرور غزالی ، مناظر عاشق ہرگانوی ، پیغام آفاقی ، الیاس احمد گدی ، عبدالصمد ، سید محمد اشرف ، شمس الرحمٰن فاروقی ، احمد سہیل ، عصمت چغتائی ، قرۃ العین حیدر ، ساجدہ زیدی ، صادقہ نواب سحر ، ترنم ریاض ، شائستہ فاخری ، ثروت خان ، قمر جمالی ، رحمٰن عباس ، حسین الحق ، شوکت خلیل ، شاہد اختر ، اختر آزاد ، نورالحسنین ، احمد صغیر ، خالد جاوید اور کوثر مظہری وغیرہ کی ایک طویل فہرست ہے جنھوں نے اپنے ناولوں کے ذریعہ مندرجہ بالا مسائل کو فنکارانہ انداز میں پیش کر کے نوجوانون ، قارئین اور عام انسانوں کو تفکراتی سوچ میں ڈالنے کا کام کیا ہے ۔ ان ناول نگاروں میں پروفیسر کوثر مظہری کا ناول ’’ آنکھ جو سوچتی ہے ‘‘ پہلا ہی ناول ہے جس میں ان تمام مسائل کو فنی چابکدستی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے ۔

ناول ’’ آنکھ جو سوچتی ہے ‘‘ کا خمیر ریاست بہار کے ضلع سیتامڑھی میں برپا فساد سے بنا

ہے۔جس میں مرکزی کردار رضوان صوم وصلاۃ کا پابند ہے۔شاعر ہے۔ پڑھا لکھا ہے۔مگر بے روزگاری سے جوجھتا رہتا ہے۔دردمند انسان کی تمام صفات کا مالک ہے۔نماز،قرآن اور خدا پر یقین کرنے والا کردار ہے۔اس ناول میں فرقہ واریت اور تشدد پر بھر پور روشنی ڈالی گئی ہے۔عصر حاضر میں پڑھے لکھے نوجوان کی ایک بڑی تعداد اعلیٰ تعلیم کے زیور سے آراستہ ہے مگر بے روزگاری ان کا مقدر بن گئی ہے۔ایسے ہی نوجوانوں میں اس ناول کا مرکزی کردار رضوان سماجی مسائل سے جوجھتا رہتا ہے۔اوران کا مقابلہ کرتا رہتا ہے۔ہر مصیبت ومسائل کا سامنا کرتے ہوئے ان کے خاتمے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔کیونکہ وہ بخوبی جانتا ہے کہ یہ سماج مفاد پرست لوگوں سے بھرا ہوا ہے۔مفاد کی خاطر انسان ہی انسان کا قتل کر دیتا ہے۔دھوکا دینا اپنی انا کی خاطر دیگر افراد کو نیچا دکھانا اب عام ہو چکا ہے۔سماجی،سیاسی اور مذہبی رہنما اپنی پرفریب باتوں سے،مذہبی مثالوں سے اور سیاسی داؤ پیچ سے سماج کے بھولے بھالے نوجوانوں اور عام انسان کے درمیان تعصب اور نفرت کی چنگاری کو ہوا دے رہے ہیں۔ناول کا یہ اقتباس ملاحظہ کیجئے:

”جب تک اس ملک میں سید اسلام الدین پی۔ایل مٹکانی،گھوش منگل، پریما بھارتی،سیف اللہ اعظمی امام سعد اللہ ہزاری، جیسے لوگ رہیں گے ہمیشہ یہاں اُتھل پتھل ہوتی رہے گی۔حالانکہ یہ سب کے سب مذہب کی آڑ میں سیاسی سطح پر کرسیاں ہتھیانے کی دھن میں لگے رہتے ہیں۔مذہب اسلام یا ہندو مذہب سے انہیں دور دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا۔“

(ناول آنکھ جو سوچتی ہے: کوثر مظہری)

اس حقیقت سے کون انکار کرسکتا ہے کہ دنیا میں کوئی بھی مذہب نفرت، جنگ، قتل و غارت،لڑائی جھگڑا،فساد وغیرہ کی تعلیم نہیں دیتا۔اور یہ بھی سچ ہے کہ سماج میں بہت سے ہندو یا مسلم رہنما ایسے گزرے ہیں جنہوں نے انسانیت کے درس کو عام کیا ہے۔ پیار محبت خلوص اور ہمدردی کو اپنی زندگی کا مشن بنایا ہے۔سماج میں ایک دوسرے سے الفت عزت اور بھائی چارے کو قائم کرنے کے لئے جدوجہد کی ہے۔ناول کا کردار رضوان بھی سماج سے فرقہ واریت کو ختم کرنا چاہتا ہے۔رضوان پڑھا لکھا شریف لڑکا ہے،اپنی اخلاقی قدروں اور تعلیم وتربیت سے لوگوں کی مدد کرتا ہے۔ان کی خدمت کرتا ہے اوران سے ہمدردی بھی کرتا ہے۔سماج میں سب کے ساتھ میل جول رکھتا ہے۔رضوان کی نظر میں لڑائی جھگڑا فساد اور مار پیٹ سب بے کار چیزیں ہیں۔

بُرے کام ہیں۔ مگر افسوس دنیا میں چاروں جانب اسی طرح کا ماحول چھایا ہوا ہے۔ یہ فساد والا ماحول رضوان کو پریشان کرتا ہے۔ ایسے ماحول میں ہندو مسلم مشترکہ تہذیب کمزور ہو جاتی ہے۔ خود ناول نگار کہتا ہے کہ ''مسجد اُجاڑی جائے یا مندر توڑا جائے ایک عبادت گاہ ہی تباہ ہوتی ہے۔ کاش اس دیش کے لوگوں کو اپنے اپنے دھرم سے محبت ہوتی'' ناول نگار کے اس رجحان سے پتہ چلتا ہے کہ سماج میں ہر سمت ایک دوسرے کے لئے خطرہ بنا ہوا ہے۔

ممتاز ناقد پروفیسر خالد جاوید کا یہ اقتباس ملاحظہ کیجئے:

> ''رضوان اخلاقی طور پر یہی کر رہا ہے۔ ایک غریب بے روزگار، مگر تعلیم یافتہ نوجوان جس کے پاس اپنی اخلاقی اقدار کی دولت کے سوا اور کچھ نہیں۔ فسادات بے معنی ہیں۔ وہ ہمیشہ سے ہی بے معنی اور Absurd رہے ہیں، مگر دنیا ایسی ہی بے معنی چیزوں سے بھری ہوئی ہے۔ رضوان کو یہ معلوم ہے، مگر وہ اس لایعنیت اور اس Absurd کے آگے شکست تسلیم نہیں کرتا۔ وہ اپنے وجود کی روشنی میں ان بے رحم اندھیروں سے ٹکراتا رہتا ہے۔ ان بے رحم اندھیروں نے اس کی روح کو زخمی کر دیا ہے۔ مگر یہ اندھیرے اس کی روح کے اُجالوں کو نہیں نگل سکتے۔''

(نیا ناول نیا تناظر، ص 413 کوثر مظہری/امتیاز احمد علیمی)

ناول نگار کے اس رجحان سے پتہ چلتا ہے کہ سماج میں لوگ ایک دوسرے سے نفرت کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کے دھرم مذہب اور عقائد پر الزام رکھتے ہیں۔ حق تو یہ ہے کہ اپنے ہی دھرم مذہب اور عقائد پر چلتے ہوئے دوسرے دھرم مذہب کا احترام کریں۔ اپنے مذہب کی تعلیم کو عام کریں اور دوسرے بزرگوں اور دوسرے مذہب کو بُرا نہ کہیں۔ تو سماج میں کبھی جھگڑا فساد نہ ہوگا۔ کیونکہ ہر مذہب پیار محبت، چین سکون اور مل جل کر رہنے کی تعلیم دیتا ہے نہ کہ نفرت کی۔ کوئی مذہب دوسروں سے نفرت کرنا نہیں سکھاتا۔ سماج میں چاروں سمت پھیلی برائیوں، ظلم وستم، تکلیف، غصہ، بدچلنی، نفرت، جھوٹ کی غلاظت، انتشار اور فریب کا اندھیرا گمنامی، مایوسی اخلاقی قدریں وغیرہ جب ناول نگار کی آنکھوں کے سامنے آتی ہیں تو ناول میں کوثر مظہری یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ:

''زیبا تم آسمان پر چمکتے ان ستاروں کو دیکھ رہی ہو؟''

''ہاں میں دیکھ رہی ہوں مگر کیوں؟''

''کتنی خوبصورت ہے ان ستاروں کی دنیا اور کتنی بدصورت ہے ہماری دنیا کاش ہم بھی ستارے ہوتے؟''

''دراصل تم ابھی کسی طرح کے جاب سے نہیں لگے ہو اس لئے ذہن میں ایسی باتیں پیدا ہوتی رہتی ہیں۔''

انکل! سیتا مڑھی میں کل فساد ہو گیا ہے۔ مسلمانوں کے بہت سے گھر جلائے گئے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ ان کا کوئی پرسان حال نہیں۔

تب پروفیسر صابر علی جن کے چہرے پر سنجیدگی اور تجربات کی لکیریں جھریوں کی شکل میں نمایاں تھیں، نے بڑی متانت سے فرمایا۔

''بیٹے یہ فساد تو ہندوستان کا مقدر بن گیا ہے۔ انسانوں کا خون دیکھ دیکھ کر طبیعت اکتا گئی ہے۔۔۔۔''

پروفیسر کوثر مظہری کا ناول ''آنکھ جو سوچتی ہے'' کے مطالعہ سے عیاں ہوتا ہے کہ ناول نگار اس سماج کے ہر گوشے میں پھیلے مسائل و میلات پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ آنکھ سے دیکھتے بھی ہیں اور سوچتے بھی ہیں۔ ان کی سوچتی اور دیکھتی آنکھوں کے سامنے سماج کے تمام مسائل ابھر کر سامنے آتے ہیں اور کردار کے ذریعہ وہ قارئین کو سوچنے پر مجبور کرتے ہیں مگر افسوس ہم آج جاگتی آنکھوں سے نہیں بلکہ بند آنکھوں میں آئے خوابوں میں کھوئے رہتے ہیں۔ جن میں حقیقت کے عناصر دور دور تک نظر نہیں آتے۔

ایک وقت ایسا بھی تھا جب ہندو مسلم اس ملک میں پیار محبت اور مل جل کر اپنی زندگی بسر کرتے تھے۔ ایک دوسرے کے ساتھ زندگی گزارنا، کھانا پینا، دکھ سکھ میں شامل ہونا ان کا مقصد حیات تھا۔ ہندو مسلم لڑکے لڑکیوں کا ایک دوسرے کے گھر خاندان میں بے خوف آنا جانا، شادیوں اور پروگراموں میں شریک ہونا عام تھا۔ اسی لئے سرسید احمد خاں نے ہندو مسلم کو ہندوستان کی خوبصورت دلہن سے تشبیہ دی ہے۔ مگر افسوس آج ہم اپنے بزرگوں کی روایت کو بھلا بیٹھے ہیں۔ ان کی تعلیمات کو ہم نے نظر انداز کر دیا ہے۔ اسی لئے ہماری پہچان بھی گم ہوتی جا رہی ہے ایک شاعر نے کیا خوب کہا ہے ۔

جس شخص کو بزرگوں کی روایت نہ رہے یاد

اس شخص کی لوگوں کوئی پہچان نہیں ہے

آج نہ ہندو بھائی کو مسلم کی فکر ہے اور نہ مسلم بھائی کو ہندو کی فکر ہے بلکہ ہندو مسلم مشترکہ تہذیب دن بہ دن کمزور ہوتی جا رہی ہے۔ گائے کے نام پر انسانوں کا قتل، مندر کے نام پر مسلمانوں پر ظلم، مندر، مسجد اور مذہبی کشیدگی کی آڑ میں ہندو مسلمانوں کے بیچ نفرت کو عام کیا جا رہا ہے۔ ہندو لڑکیاں مسلم علاقوں میں جانے سے گھبراتی ہیں۔ مسلمانوں کے خوف سے ہندو بھائیوں کے درمیان خوف کا ماحول بنا ہوا ہے۔ ایسے حالات میں کوثر مظہری نے اس ناول کے ذریعہ مذہبی کشیدگی اور مشترکہ تہذیب کو منتشر ہوتے ہوئے محسوس کیا اور اس پے چیدہ کیفیت کو اپنی تخلیق ''آنکھ جو سوچتی ہے'' میں منفرد اسلوب کے ساتھ پیش کیا۔ ناول نگار کا کردار رضوان سماج میں پھیلے ان تمام مسائل اور منظر نامہ کو اپنی اخلاقی قدروں کے ذریعہ تبدیل کرنا چاہتا ہے۔ بقول پروفیسر خالد جاوید ''رضوان اپنے آس پاس پھیلی ہوئی اس تشدد آمیز کائنات سے اوپر اُٹھنا چاہتا ہے مگر راہ فرار اختیار نہیں کرتا۔ وہ اس منظر نامہ کو اپنی اخلاقی جدوجہد کے ذریعہ بدلنا چاہتا ہے۔ اور اس طرح وہ مسلسل اُبھرتے ہوئے وجود کا ایک امکان ہے۔ یہ یقین ہی اس کے آزاد وجود کا اثبات ہے اور یوں اگر دیکھیں تو یہ وجود ہی خدا کے وجود سے بھی ہم آہنگ ہے۔'' ناول ''آنکھ جو سوچتی ہے'' کا کردار درگا ہی جی جب ہندو مسلم جھگڑے فساد سے گھبرا کر مسلم بستی میں پناہ لیتا ہے تو اس کے ساتھ ایک عجیب وغریب اور حیرت انگیز حادثہ پیش آتا ہے۔ ایک مسلم علاقے میں صرف مسلمان ہی رہتے ہیں۔ درگا ہی جی اپنی جان بچانے اور اپنی جوان بیٹی کی آبرو کی حفاظت کرنے کی غرض سے مسلم علاقے میں پناہ لیتا ہے۔ اور مسلمانوں کے درمیان وہ اپنی بیٹی اور خود کو محفوظ سمجھتا ہے مگر افسوس جب درگا ہی جی اپنے روزگار پر بازار جاتا ہے اور اپنی روزی روٹی کمانے کے لئے پوری رات گھر سے باہر بازار میں رہتا ہے تو اس کی غیر موجودگی میں کچھ لوگ اس کے گھر میں گھس آتے ہیں اور اس کی گونگی بیٹی کی عزت کو تار تار کر دیتے ہیں۔ اس خطرناک حادثہ سے درگا ہی جی کے دل میں مسلمانوں کے خلاف کتنا غصہ اور ستم کی لہریں اٹھی ہونگی اس سے ناول نگار بخوبی واقف ہے اور اس غم ظلم وستم کو ناول نگار نے اس طرح پیش کیا ہے:

> ''رات ہمارے گھر میں دو تین آدمی گھس کر بیٹی (گونگی بیٹی) کے ساتھ
> غلط کام کیا۔۔۔۔ ہم تو باجار پارٹی میں دس بیس روپیہ کمانے چلے گئے
> تھے۔ آج سویرے آئے ہیں۔۔۔۔ سن کے تن بدن میں آگ لگ گیا

ہے۔۔۔۔آپ ہی لوگ کہئے مسلمان گاؤں میں آ کر ہم کو کا پھل ملا۔''

ناول ''آنکھ جو سوچتی ہے'' میں ناول نگار نے فرقہ واریت کی تشہیر میں ملک کے فرقہ وارانہ رویوں کو منفرد انداز میں پیش کیا ہے۔ پڑھے لکھے نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد بڑی بڑی تعلیمی ڈگریاں لینے کے باوجود در در کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور ہے۔ بے روزگاری کی مار جھیل رہے لوگ مسائل کے دل دل میں گھستے چلے جا رہے ہیں۔غریبی کا یہ حال کہ گھروں میں ٹپکتا چھپر، پھٹے حال چھوٹے چھوٹے بچے اور طبقاتی کشمکش کا پھیلتا اندھیرا لوگوں کے دلوں کو مسوستا رہتا ہے۔ بھوک پیاس اور غربت نے گھروں کی ایسی حالت کی ہے کہ برسات کے موسم میں چھت سے ٹپکتا پانی بھی بارش کے مانند گھر میں آتا ہے اور چھت کے نیچے زندگی بسر کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔ بقول ناول نگار ''رضوان کے گھر میں چار طرح کی پریشانیاں تھیں۔روشنی کا فقدان، ہوا کا نہ آنا، چوہوں کی بہتات اور برسات کے موسم میں چھت کا برسنے کی طرح ٹپکنا۔'' سماج میں پڑھے لکھے نوجوانوں کا استحصال عام ہوتا جا رہا ہے۔ پڑھے لکھے نوجوان حکمرانوں کے ماتحت غلامی کی زندگی جینے کو مجبور ہیں اور حکمراں بھی پڑھے لکھے لوگوں کا استحصال کرنا اپنا حق سمجھ رہے ہیں نہ نہیں دنیا کی فکر نہ آخرت کا خوف۔ آج یہ دائرہ اپنی حدوں کو توڑتا نظر آ رہا ہے۔صرف ہندو مسلم فرقہ وارانہ فسادات ہی منظر عام پر نہیں آ رہے ہیں بلکہ دنیا میں ہر فرد، شخص، مذہب اور طبقہ فرقہ وارانہ فسادات میں مبتلا ہے۔ یہ سچ ہے کہ طبقاتی کشمکش میں صبر کا پیمانہ لبریز ہونے پر استحصال زدہ طبقہ احتجاج کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔اور یہ بھی حقیقت ہے کہ کچھ مذہبی رہنما ڈھونگی بن کر عوام کو گمراہ کرتے ہیں۔انہیں لوگوں کے مسائل سے کوئی مطلب نہیں ہوتا۔ پنڈت جواہر لال نہرو لکھتے ہیں:

> ''اونچے طبقے کے لوگوں کے گروہ مذہبی اقلیتوں اور اکثریتوں کے فرقہ وارانہ معاملات پیش کرنے کا ڈھونگ رچا کر خود اپنے طبقاتی مفادات کا تحفظ کرتے ہیں۔ ہندوؤں مسلمانوں کی جانب سے پیش کئے جانے والے فرقہ وارانہ مطالبات کے تنقیدی جائزہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں عوام الناس سے کوئی سروکار نہیں۔ زیادہ سے زیادہ چند بے روزگار ذی عقل افراد کے لئے روزگار فراہمی کا مطالبہ کرتے ہیں یہ فرقہ پرست لوگ عوام الناس کو قابل توجہ بھی نہیں سمجھتے۔''

(فرقہ واریت اور سیکولرزم، جواہر لال نہرو، جامعہ ملیہ اسلامیہ)

کوثر مظہری کا یہ ناول عصر حاضر کے مسائل کو پیش کرنے کے ساتھ ساتھ فرقہ وارانہ مسائل اوراس سے جوجھتے لوگوں کے دکھ درد کی داستان کومنفرد انداز میں پیش کرتا ہے۔ناول میں اعلیٰ طبقات کے زیر سایہ مظلوم پر ہونے والے ظلم واستحصال، عام انسانوں کی بے داری اورطبقاتی کشمکش کی کہانی بیان کی گئی ہے۔سماج میں مظلوم اپنی آواز بلند نہیں کرتے بلکہ معصومیت کے ساتھ ظالم حکمرانوں کے حکم کو بجالانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔اسی طرح ناول کا مرکزی کردارادب اوراحترام کے ساتھ سب کی پرواہ کرتا ہے۔سب کواحترام کی نظر سے دیکھتا ہے۔اس ناول میں دومخالف طبقوں کی باہمی کشمکش میں ایک خاص قسم کی شدت ہے۔ ہرسمت اکتا دینے والا ماحول طاری ہے۔فرقہ واریت کے نتیجے میں پڑھے لکھے نوجوانوں کوستایا جارہا ہے۔ناول کے ذریعہ سماج کے سیاسی سماجی صورت حال کا آئینہ ہمارے سامنے آتا ہے۔کوثر مظہری کی اسی انفرادیت کی بدولت یہ کہنے میں کوئی عارنہیں کہ کوثر مظہری نے اپنے فکروفن سے اردوناول نگاری میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے۔اعلیٰ طبقات کاظلم وستم ناانصافی، دبے کچلے لوگوں کے مسائل، سماجی رسم و رواج وغیرہ نہ جانے کتنے مکڑ جال میں پھنسے انسانوں کی پردرد داستان کوناول نگار نے اس ناول میں پرت در پرت کھولا ہے۔ناول نگار نے اپنی فنی مہارت اور چابکدستی سے کرداروں کوفنکاری سے پیش کیا ہے۔جوظلم برداشت کرتے ہیں اورآواز بھی مدھم رکھتے ہیں۔

دراصل سماج میں طبقاتی کشمکش کا ڈھانچا ابتداء سے ہی نظر آتا ہے۔ذات پات،قوم، نسل،طبقہ،فرقہ، مذہب، زبان وغیرہ کی بنیاد پر بہت سے طبقے سماج میں پیدا ہوتے رہے ہیں اور ان طبقات نے کبھی نوجوانوں کومتاثر کیا تو کبھی عام انسان کو۔نوجوانوں کو جہاد کے نام پر پھنسایا جا رہا ہے۔پڑھے لکھے نوجوانوں پرمندرمسجد، گائے فرقہ واریت،لوجہادوغیرہ کے الزام لگا کر جیلوں میں ڈالا جارہا ہے۔ بے روزگاری اور معاشی تشنگی کے باوجود پڑھا لکھا رضوان اپنے بزرگوں دوستوں عالموں کی عزت کرتا ہے۔ان کوادب واحترام کی نظر سے دیکھتا ہے مگران کی مانند بے عملی کی زندگی سے دوررہنا چاہتا ہے۔وہ عمل والی زندگی جینا چاہتا ہے۔اسے یقین بھی ہے کہ حالات کیسے بھی ہو، یعنی رات کتنی ہی اندھیری کیوں نہ ہوسویرا ضرور ہوتا ہے۔رضوان کوبھی یقین ہے کہ خدااس کی مدد ضرور کرے گا۔اور یہ ہی وجہ ہے کہ سیتامڑھی کے فسادکی خبراس کے لئے ایک قیامت برپا کردیتی ہے۔وہ بے چین ہوجاتا ہے مگر وہ نماز روزہ اورقرآن کی تلاوت کرتا ہے۔خداپریقین رکھتا ہے۔اوراچھے دنوں کا انتظار کرتا ہے وہ اچھے دن نہیں کہ لوگ بے روزگار ہوجائیں۔ پڑھے

لکھے لوگوں کو پکوڑا پکوڑی بیچنے کا مشورہ دیا جائے۔ مذہب کے نام پر قتل عام کیا جائے مگر رضوان کو یقین ہے کہ اچھے اعمال سے انسان کی پریشانیاں دور ہو جاتی ہیں۔ اور اچھے دن بھی آتے ہیں۔

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی

کوثر مظہری سماج و معاشرے پر گہری نظرے رکھتے ہیں ناول نگار کو یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ انسان اب ایک دوسرے کی فکر نہیں کرتا بلکہ اپنی عزت آبرو بچانے کی فکر میں لگا رہتا ہے۔ ہم آہنگی بھائی چارگی، تعصب، فرقہ وارانہ تشدد کی عمدہ تصاویر اس ناول میں جا بجا نظر آتی ہیں۔ ناول نگار نے تمام مسائل کو اس طور پیش کیا کہ جیسے یہ تمام مسائل ان کے ارد گرد ہی پھیلے ہوئے ہیں۔ کتاب ''اردو ناول کا تنقیدی جائزہ'' میں ابوالکلام عارفی ناول ''آنکھ جو سوچتی ہے'' کے تعلق سے لکھتے ہیں:

> ''آنکھ جو سوچتی ہے'' دو قوموں کے درمیان فرقہ وارانہ ہم آہنگی، یکجہتی، بھائی چارہ اور امن و آشتی کا چراغ جلانے، تعصب فرقہ وارانہ تشدد اور نسلی برتری کو بھلانے اور اپنے انسانی کردار کو بحال کر کے انسانیت کی راہ ہموار کرنے کے ضمن میں ایک اہم اور کامیاب ناول ہے۔ اس ناول کو پڑھ کر جو پہلا تاثر اُبھرتا ہے وہ جگہ جگہ کوثر مظہری کی موجودگی کا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے انہوں نے ذاتی تجربات، ذاتی زندگی کے اتار چڑھاؤ، مسرتیں، دکھ درد اور اپنے اوپر گزرنے والی کیفیات کے اظہار کے لئے اس ناول کو وسیلہ بنایا ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اکثر واقعات کے وہ چشم دید گواہ رہے ہوں۔''

ناول ''آنکھ جو سوچتی ہے'' کے پس منظر میں جب جھانکتے ہیں تو شہر سیتامڑھی کے فساد میں خون میں لت پت لاشیں، ماں باپ سے بچھڑتے چلاتے بچے، جان بچا کر چھپتے بے گناہ نوجوان، ہاتھ پیر گنوا چکے لوگ، دہشت گرد ماحول میں رچا بسا چندن باڑہ، امام کا قتل ہونا، خواتین کی لاشوں کی بے حرمتی، اور اسی ماحول میں بے شمار لوگ ایسے لاپتہ ہوئے جن کا کہیں کوئی پتہ نہیں چلا۔ ایسا ماحول جہاں نہ کسی کی موت کا صدمہ اور نہ کسی معصوم بچے کی کلکاری پر ترس۔ نہ امام کی قدر نہ بزرگوں کا احترام، نہ خواتین کی عزت آبرو کا پتہ، ایسے پر آشیب ماحول میں موت بھی موت سے گھبرانے لگتی ہے۔ شمیم قاسمی کا یہ اقتباس ملاحظہ کیجئے:

''شہر سیتا مڑھی۔۔۔۔گنیش پور۔۔۔۔سرکٹی لاشیں۔۔۔۔روتے بلکتے شیر خوار بچے۔۔۔۔ بے پناہی کے عالم میں بھاگتے ہوئے نہتے لوگ۔۔۔۔خون میں لت پت چنڈ یہا۔۔۔۔پنچھو، ہتیا، خوف و ہراس کے ماحول میں سانس لیتا ہوا چندن باڑہ۔۔۔۔ظلم و بربریت کا ننگا رقص، لہو روتی آنکھیں، مسجد کے امام کا بہیمانہ قتل۔۔۔۔ بے یارو مددگار نوازی۔۔۔۔معصوم انگوری کی لاش۔۔۔۔ چہار جانب فساد کے شعلوں میں گھرے خاکستر ہوتے ہوئے اقلیتی فرقے کے لوگ۔۔۔۔نہ عصمت عورتوں کی چیخیں اور مال و اسباب اور تمام مظاہر و مناظر۔۔۔۔گویا موت کے عفریت کا یہ گھناؤنا کھیل، سب نے دیکھا، محسوس کیا لیکن حد درجہ حساس دل کا مالک رضوان دس بیس کٹر مسلم نوجوانوں کے ساتھ جسمانی طور پر تو شوگل مل کے علاقے میں رہ کر فلاحی ٹیم کے ساتھ اپنے ملی فرض کی ادائیگی میں لگا ہوا تھا لیکن ذہنی اور روحانی طور پر وہ فساد کے انہیں شعلوں میں جھلس رہا ہے جس کی زد میں آ کر اس کے بے شمار مسلم بھائی بہن اپنے مالک حقیقی سے جا ملے تھے۔اور جب دور کہیں گنے کے کھیتوں میں جے شری رام کا ملک شگاف نعرہ گونج رہا تھا تو ٹھیک اسی لمحہ ایک مورخ نے اپنی نامکمل تحریر میں ایک جملے کا اضافہ کیا۔ An After frerquent blood shed, The golden age come into existence ا ے

(سہہ ماہی دربھنگہ ٹائمس ،ص،148،ڈاکٹر منصور خوشتر، پٹنہ، اپریل تا جون، 2016ء)

اس حقیقت سے انکار کرنا ذرا مشکل ہے کہ روز اول سے ہی سماج میں قتل و غارت گری کا سلسلہ مسلسل چلا آ رہا ہے اور ملک ہندوستان میں کسی نہ کسی موضوع اور مسئلہ پر فسادات کو ہوا دی گئی۔چاہے بدلتے سیاسی حالات ہوں یا کسی کو موت کے گھاٹ اتارنے کا ختم نہ ہونے والا مسئلہ، یہ تمام مسائل ناول نگار نے ناول میں موضوع بنا کر پیش کئے ہیں۔ممتاز ناول نگار عبدالصمد کے ناول ''دوگز زمین'' میں ہجرت کا کرب، بے گناہوں پر ڈھائے گئے ظلم و ستم اور دردناک واقعات نے قارئین کو چونکانے کا کام کیا ہے۔عبدالصمد نے اپنے ناول دھمک، بکھرے اوراق اور شکست

کی آواز جیسے ناولوں کے ذریعہ سیاسی پے چیدگی، عام انسان کا استحصال، ہجرت کا درد و کرب وغیرہ کو منفرد انداز میں پیش کیا ہے۔ عبدالصمد کے ناول ''دوگز زمین'' میں بہار کے مسلمانوں کی جدوجہد کی کہانی کو خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ ناول نگار فنکارانہ شعور سے ان مسائل کو ہر خاندان کی کہانی محسوس کرتا ہے۔ پیغام آفاقی کا تعلق بھی ریاست بہار سے ہے۔ ان کا ناول ''مکان'' اور ''پلیتہ'' بہت مقبول ہوئے۔ جن کے موضوعات بدعنوانی، سماجی برائی اور سیاسی اتھل پتھل ہے۔ کوثر مظہری کا ناول ''آنکھ جو سوچتی ہے'' کا کسی دیگر ناول نگار کے ناول سے تقابل کرنا میرا مقصد نہیں ہے بلکہ کوثر مظہری کا تعلق بھی بہار سے ہی ہے جہاں سے بے شمار ناول نگار ایسے منظر عام پر آئے جنہوں نے انسانی مسائل اور سماج میں پھیلے تمام موضوعات کو اپنے ناولوں کا مرکز بنایا۔

کوثر مظہری کے ناول میں ہندو مسلم فساد کی کوئی خاص تصویر ہی سامنے نہیں آتی بلکہ آپ نے دونوں طبقات کے درمیان پھیلی کشیدگی کو منظر عام پر لانے کی کوشش کی ہے۔ ان کے ناول کے کردار ہندو بھی ہیں اور مسلمان بھی۔ رضوان، زیبا، پروفیسر صابر علی، خالد امام، نسیم، عظیم، کلیم وغیرہ اہم کردار ہیں۔ رضوان اس ناول کا مرکزی کردار ہے۔ مرکزی کردار رضوان ناول میں آخر تک چھایا رہتا ہے۔ جبکہ دیگر کرداروں کی صرف پرچھائیاں ہی نظر آتی ہیں۔ اور ظفر ایسا کردار ہے جو رضوان کے ساتھ ساتھ نظر آتا ہے۔ زیبا صرف تھوڑی دیر کے لئے ہی ناول میں نظر آتی ہے۔ بعد میں اس کو غائب کر دیا جاتا ہے۔ راجیش، درگاہی، نوازی، سہیل وغیرہ کردار آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ ان کرداروں کا کوئی خاص رول نہیں ہے۔ زیبا کے کردار کو صرف تھوڑی دیر کے لئے اس لئے دکھایا گیا ہے کہ یہ محبت کی علامت ہے۔ یعنی ہلکی پھلکی رومان کی چاشنی بھی قارئین کو محسوس ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے ناول میں تھوڑا سا جھول بھی آ گیا ہے۔ اس کے علاوہ ناول میں رضوان کے ذریعہ مذہبی افکار کا سہارا زیادہ لیا گیا ہے جس سے مذہبی شدت پسندی کا احساس ہوتا ہے۔ ناول نگار کہیں کہیں مذہبی تخیلات میں ڈوب کر تخلیقی رفتار کو دھیما کر دیتے ہیں۔ پروفیسر خالد جاوید کا یہ اقتباس ملاحظہ کیجئے:

> ''رضوان کے علاوہ ناول میں جتنے بھی کردار ہیں وہ آتے جاتے رہتے ہیں۔ پرچھائیوں کی مانند۔ صرف ظفر کا کردار ہی ہے جو رضوان کے ساتھ ساتھ ٹھہرتا ہے۔ انہیں پرچھائیوں میں زیبا کی روشن پرچھائیں بھی ہے۔ جو بہت جلد ایک تاریک سایہ بن کر غائب ہو جاتی ہے۔ ناول نگار

کے کمال فن کی داد دینا چاہیے کہ اس نے زیبا کے کردار کو طول نہ دے کر بس جیسے سیاہ کینوس پر ایک رنگین اسٹروک کی طرح پیش کیا ہے۔ زندگی ایسی ہی ہے۔ اس میں اول تو محبت ملتی ہی نہیں اور اگر کبھی مل بھی جائے تو پروان چڑھنے سے پہلے ہی دنیا اور انسانوں کے اس میلے میں ہمیشہ کے لئے گم ہو جاتی ہے۔ ناول نگار نے زیبا کے کردار کے ذریعے سے ناول میں بہت ہلکی سی رومان کی چاشنی پیدا کی اور اس چاشنی کو زندگی کی کڑواہٹ میں ڈبو دیا۔ یہی تو ہوتا آیا ہے۔ اگر چہ ہم اسے قبول کرنے میں ہمیشہ جھجکتے ہیں۔''

(نیا ناول نیا تناظر، کوثر مظہری/امتیاز احمد علیمی، ص، 416)

ناول نگار نے فرقہ واریت کے مسائل اور ظلم و جبر کے ماحول کو قریب سے دیکھا اور محسوس کیا۔ اس لئے کہیں کہیں حقیقت کم اور تخیل زیادہ نظر آتا ہے۔ پڑھا لکھا باشعور رضوان مسائل اور حادثات کا مقابلہ بہادری سے کرتا ہے۔ گفتگو کا انداز بھی عالمانہ ہے مگر وہ ناول میں کچھ کمزور نظر آتا ہے۔ ناول کے آخری حصہ میں رضوان کا انتقال ہونا رضوان کی کمزوری کو ظاہر کرتا ہے۔ مگر ناول نگار کی فنکارانہ صلاحیت کا احساس ہوتا ہے۔ رضوان کے قتل سے کردار کی کمزوری کا احساس تو ہوتا ہے مگر ناول کے فن میں کمی نہیں آتی قرۃ العین حیدر جیسی بڑی ناول نگار بھی اپنے ناول ''چاندنی بیگم'' میں مرکزی کردار کو ناول کی ابتداء میں مار دیتی ہیں اور ناول کے فن میں کوئی کمی نہیں آتی بلکہ تسلسل بنا رہتا ہے۔ اسی طرح کوثر مظہری نے رضوان کی شکل میں ایسے کردار کی تخلیق کی ہے جو سماج و معاشرہ میں پھیلے مسائل کو ہنرمندی سے قاری تک پہنچاتا ہے۔ جس سے ملک کی سیاسی صورت حال اُجاگر ہو جاتی ہے۔

عصر حاضر میں عام انسان طرح طرح کی سیاسی سماجی معاشی اور اقتصادی پریشانیوں سے دوچار ہے۔ جگہ جگہ ہڑتال، دھرنے اور نعرے بازی نے ہندوستان کی تاریخ اور تہذیب کو متاثر کیا ہے۔ ہندوستانی معاشرت طبقاتی کشمکش میں مبتلا ہے۔ نچلے طبقات پر ظلم، ان کے گھروں کو جلانا، لڑکیوں کے ساتھ غیر اخلاقی حرکتیں، خواتین کو اپنی ہوس کا شکار بنانا، لڑکیوں کو جلا کر مار دینا، ذات پات میں الجھ کر خون خرابہ کرنا وغیرہ آج کے اخبارات کی سرخیاں بن گئی ہیں۔ ان تمام موضوعات پر دیگر ناول نگاروں نے بھی طبع آزمائی کی ہے اور اس سچائی سے بھی منھ نہیں موڑا جاسکتا

کہ عصر حاضر میں ہمارے معاشرے میں پھیلے ادباء، شعراء اور ناول نگار معاشرہ میں پھیلے مسائل کے خلاف لکھنے سے جھجکتے ہیں۔سب کچھ سمجھنے کے باوجود بھی مسائل سے آنکھیں موند لیتے ہیں۔ ادنیٰ طبقات کے مسائل کے خلاف اس لئے خاموش ہو جاتے ہیں کہ کہیں ان کی پہچان اور ترقی میں کوئی روڑا نہ اٹک جائے۔طبقاتی کشمکش ، بے روزگاری کے پے چیدہ مسائل، مزدوروں کی حالت زار پڑھے لکھے نوجوانوں کا بے روزگار یا کم تنخواہیں جیسے مسائل کو نظر انداز کیا جارہا ہے۔اور یہ محسوس ہونے لگا ہے کہ ادیب اپنا عہدہ بڑھانے کی خاطر تحریروں کے ذریعہ آواز بلند کرنے سے کترا رہا ہے۔مگر دوسری جانب ایسے ناول نگار بھی اردو زبان وادب کے میدان میں کھڑے نظر آتے ہیں جو حق کے سامنے کسی طرح کا سمجھوتا نہیں کرتے بلکہ ذات پات کی کشمکش، روایت پرستی، مذہبی تفریق ،مکروفریب کا جال، طبقاتی نابرابری، معاشی حالت کی سچی تصاویر اپنی تخلیقات میں ایمانداری سے پیش کرتے ہیں۔ایسے ناول نگاروں میں کوثر مظہری کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے جنہوں نے اپنے پہلے ہی ناول میں عورتوں کے استحصال، اعلیٰ طبقہ کے ذریعہ ادنیٰ طبقہ کی عورتوں کا جنسی استحصال، طبقاتی جنگ میں انسانیت کا شرمسار ہونا، ذات پات کی زنجیر میں جکڑا سماج، بے روزگاری کے مسائل وغیرہ کی سچی تصاویر پیش کی ہیں۔

مجموعی اعتبار سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ کوثر مظہری اس ناول کے ذریعہ زندگی کے نشیب و فراز انسانی رشتوں کی پاسداری عام انسان کا استحصال وغیرہ کو فنکارانہ انداز میں پیش کرنے کا ہنر جانتے ہیں اس ناول کے ذریعہ ناول نگار نے انسانوں کے ساتھ ہونے والے سیاسی سماجی جبر و استحصال اخلاقی بحران اور سماجی ظلم کے خلاف اعتراضات کی لہروں کو ناول میں سمیٹنے کی منفرد کوشش کی ہے۔ ہندو مسلم معاشرے کے تہذیبی وجود کی گھٹتی قدروں کا ماتم دیکھنے کے لئے اس ناول کا مطالعہ ضروری ہے۔

☆☆☆

ڈاکٹر فہیمہ الیاس
رانچی

غیاث احمد گدی کے افسانے

پرندہ پکڑنے والی گاڑی، معروف افسانہ نگار غیاث احمد گدی کے دوسرے افسانوی مجموعے کا نام ہے، اس مجموعہ میں درج ذیل سولہ افسانے شامل ہیں۔ا۔ پرندہ پکڑنے والی گاڑی ۲۔ تج دو، تج دو۳۔ ڈوب جانے والا سورج ۴۔ ایک خوں آشام صبح ۵۔ قیدی ۶ – نار دمنی ۷۔ خانے تہ خانے ۸۔ اندھے پرندے کا سفر ۹۔ افعی ۱۰۔ کالے شاہ، ۱۱۔ ایک جھوٹی کہانی ۱۲۔ پرکا شو۱۳۔ پاگل خانہ۱۴۔ دیمک، ۱۵۔ کیمیا گراور ۱۶۔ ہم دونوں کے بیچ۔

ان افسانوں میں غیاث احمد گدی کا رویہ انسانی عظمت اور انسانی ہمدردی کے تئیں مخلصانہ اور منصفانہ ہے، افسانہ نگار اپنی دنیا، اپنے ماحول سے انسیت رکھتا ہے اور اس کی خیر وفلاح کا متمنی ہے، افسانہ نگار چونکہ محرومی و مجبوری سے عملی طور پر آشنا ہے، لہذا اس کے افسانوں میں محروم و مجبور انسان اور محکوم طبقات کے مسائل و مزاج کو روشنی میں لانے کی اچھی کوشش کی گئی ہے، نیز فرد کے حوالے سے سماج و کائنات کے متعلقہ پہلوؤں پر بھی نگاہ ڈالنے کا سلیقہ انسانوں میں ملتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جبر وتشدد اور بدامنی و بے اطمینانی کے ماحول والے افسانوں میں بھی انسانی ہمدردی کا جذبہ اپنی موجودگی کا احساس دلاتا ہے۔ انسانی ہمدردی کا یہی وہ فطری اور توانا جذبہ ہے جس کے زیر اثر انسانی نظام کے ہاتھوں انسان کے استحصال پر سنجیدہ احتجاج کے اشارے ان افسانوں میں ملتے ہیں اور یہ افسانہ نگار کا پسندیدہ موضوع قرار پاتا ہے، ہر چند کہ یہ موضوعات پرانے اور فرسودہ ہیں لیکن غیاث احمد گدی نے ان موضوعات کو متنوع اور دل نشیں انداز کے پیکر میں پیش کیا ہے۔ موضوع و مسائل کی پیشکش کا یہی وہ انداز ہے جو گدی کو افسانہ نگاروں کی صفوں میں الگ پہچان دیتا ہے۔ فنی سطح پر تخیلات کی چاشنی، غیر ضروری تصنع سے پرہیز، سہل اور دلچسپ اظہار بیان، نیز فکری سطح پر انسانی ہمدردی سے آشنائی اور انسانی اقدار و معیار کا احترام گدی کی افسانہ نگاری کی

سمت ورفتار طے کرکے فنکار کی ذات کے غم کو غم جہان کا نمائندہ بنا دیتے ہیں۔

گدی اپنے افسانوں میں نہ تو کسی کے نقش قدم پر چلتے ہیں اور نہ کسی کو اپنا آئڈیل بناتے ہیں، یا ان کی پیروی کرتے ہیں۔ وہ اپنا راستہ خود بناتے، اسے سجاتے اور اس پر اپنی مخصوص رفتار سے چلتے ہیں۔ وہ زندگی کی مثبت قدروں پر نہ صرف یقین رکھتے ہیں۔ بلکہ اس کی معنویت اجاگر کرنے کے اپنے فرائض سے آگاہ رہنے کا ثبوت بھی فراہم کرتے ہیں۔ وہ الفاظ کے حقیقی استعمال کا ہنر جانتے ہیں اور یہ بھی بہت اہم بات ہے جو افسانہ نگار کی فنکارانہ عظمت کے جواز میں اضافہ کرتی ہے۔

'پرندہ پکڑنے والی گاڑی' زیرنظر مجموعہ کا پہلا افسانہ ہے اور گدی کے مزاج وافکار کی نمائندگی کرتا ہے۔ واقعاتی طور پر افسانہ کا لب لباب یہ ہے کہ شہر میں ایک گاڑی آتی ہے جو بانس اور لسدار رطوبت کی مدد سے پرندوں کو پکڑ کرلے جاتی ہے۔ پرندوں کے اس طرح شہر سے غائب ہوتے رہنے کی وجہ سے شہر کی خوبصورتی متاثر ہوتی ہے، لیکن اس کی فکر شہر کے لوگوں کو نہیں ہوتی، مستقل خاموشی کا عالم رہتا ہے۔ احتجاج ومزاحمت کے تقاضے شدید ہیں، لیکن ان تقاضوں کی تکمیل کے لیے کوئی آمادہ نظر نہیں آتا۔ خودغرض اور مفاد پرست حلوائی کا حال یہ ہے کہ وہ مٹھائیوں پر سے بھنکتی ہوئی مکھیوں کو نہیں اڑاتا کہ یہ مٹھائیاں اسے نہیں کھانی ہیں۔ منی بائی ایک ایسے طوطے کو چند سکوں کے لیے بیچنے پر آمادہ ہے جو اس کے رزق کے لئے مصروف دعا رہتا ہے۔ خودغرضی اور بے حسی کے اس تاریک ماحول میں اس وقت امکان کی روشنی دکھائی پڑتی ہے۔ جب ایک چھوٹے سے بچے کے ذریعہ لقا کبوتر کے تحفظ کے لیے پرندہ پکڑنے والی گاڑی سے الجھنے کا حوصلہ سامنے آتا ہے۔ اس بچہ کا سکے کی طرف دھیان نہ دینا اور حصول مقصد کے لیے خود کو خطرے میں ڈالنے سے گریز نہ کرنا اس بات کی علامت ہے کہ بے حسی ومفاد پرستی کے ماحول میں بھی وہ بچہ اس خوشگوار امکان کی نوید ہے، جس پر مستقبل کا دارومدار ہے۔

واقعات اور کردار علامتی ہونے کے باوجود قاری کے لیے یہ سمجھنا مشکل نہیں کہ یہ افسانہ ہمارے حالات اور معاشرے کا عکاس ہے۔ گاڑی کا پرندوں کو پکڑنا دراصل جبر وزیادتی کے دام میں عام، معصوم اور محکوم افراد وطبقہ کا گرفتار ہونا ہے۔ شہر کے لوگوں کا خاموش رہنا ہماری اس مصلحت کی طرف اشارہ ہے، جس کے سبب ہم احتجاج کی ضرورت محسوس نہیں کرتے اور خاموش تماشائی بننے میں ہی اپنی عافیت سمجھنے کی نادانی کرتے ہیں۔ ہماری یہی وہ مصلحت ہے،

یہی وہ مجرمانہ کمزوری ہے جو جبر وتشدد پر یقین رکھنے والوں کوتوانائی بخشنے کا کام کرتی ہے، ہمارے سماج اور ہماری دنیا کی یہی وہ صورت حال ہے جو پرندہ پکڑنے والی گاڑی میں اپنی تمام تر کراہیتوں کے ساتھ اجاگر ہوئی ہے۔مکمل طور پر علامتی واستعاراتی ہونے کے باوجود شگفتہ انداز بیان اور دل نشیں اسلوب کے سبب افسانہ عام قاری کو بھی متاثر ومتوجہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ دراصل یہی وہ فنکارانہ چابک دستی ہے، جس کے سبب غیاث احمد گدی کی افسانہ نگاری اپنی پہچان رکھتی ہے اور منفرد مقام کی حامل دکھائی دیتی ہے۔ تجزیہ نگاروں کے لیے اس افسانہ میں غور و فکر کے کئی پہلو معانی ومفاہیم کے طالب ہیں۔ گاڑی کا چاروں طرف سے رنگین شیشوں سے بند ہونا، گھنٹیوں کی آواز کا سحر زدہ ہونا، لمبے خمیدہ کمر اور زرد آدمی ہی کا گاڑی کو کھینچنا، گاڑی کا ہمیشہ پچھلے دروازہ سے ہی آنا، سکے اچھالنا، لوگوں کا سکے چننے لگنا، زخمی پرندے کا حملہ کرنا، لوگوں کے معمولات میں فرق نہ آنا اور پتھر کا پرندہ وغیرہ اپنے عواقب میں وسیع دنیا آباد کیے ہوئے ہیں اور اس دنیا کا تجزیاتی مطالعہ قاری کو بہت سے تلخ حقائق اور روداد حیات کے روبرو کرا سکتا ہے۔

مجموعہ کا دوسرا افسانہ 'تج دو، تج دو' گہرا علامتی رنگ لیے ہوئے ہے۔ یہ استعاراتی کہانی قدرے پیچیدہ اور مبہم معلوم ہوتی ہے۔ بظاہر نہ سمجھ میں آنے والی یہ کہانی اپنے جلو میں قارئین کی توجہ کا وافر سامان رکھتی ہے۔ زندگی کی ضرورتیں اور زندگی کے تقاضے ہر معاشرے میں اور ہر جگہ ہمارے ساتھ ہوتے ہیں اور ہمارے افعال واعمال کو نہ صرف متاثر کرتے ہیں، بلکہ ان کا تعین بھی کرتے ہیں۔ ہماری خواہشیں کچھ ہوں، ہم لاکھ چاہیں پھر بھی ہماری ضرورتیں اور دنیا کے تقاضے ہمیں اپنی گرفت میں رکھ کر اپنی اہمیت کا احساس دلاتے رہتے ہیں 'تج دو تج دو' کے ذریعہ افسانہ نگار نے نہ صرف دنیا کے تقاضوں کی فعالیت کا احساس اجاگر کیا ہے، بلکہ انسانی اقدار و ہمدردی کے رجحانات کو بھی مستحکم ومتعین صورتوں میں پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ افسانہ کا بنیادی کردار ایک ایسا شخص ہے، جو مستقل سوچوں میں گرفتار رہتا ہے، اپنی الجھنوں کا شکار رہتا ہے خود کو سب سے کٹا ہوا اور اکیلا محسوس کرتا ہے لیکن وہ اپنی سوچوں اور الجھنوں کی ترسیل میں ناکام ہے وہ ناکام اس لیے بھی ہے کہ دوسروں کے مقابلے میں وہ کہیں زیادہ حساس ہے۔ وہ روزمرہ کے معمولات کو بھی نظر انداز نہیں کر پاتا۔ ماحول اور معاشرہ کا ہر منظر اسے بے یقینی کی کیفیت میں مبتلا کر دیتا ہے اور وہ خوف وتشکیک کے عالم میں سوچنے اور مسلسل سوچنے پر خود کو مجبور پاتا ہے۔ ایک حساس انسان کے ٹوٹنے بکھرنے کے عمل کو کردار کے ذریعہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس کہانی میں تین کردار تین علامتوں کی صورت میں پیش کیے گئے ہیں۔ایک دم کٹا کتا ہے جسے ہر وقت پیچھے لگے رہنے کی عادت ہے۔دوسرا املی کے پیڑ پر بیٹھا ہو بدہیئت پرندہ ہے جو تالیوں کے ساتھ ساتھ ’قیں، قیں‘ اور ’تج دو تج دو‘ کی صدائیں لگا تار ہتا ہے۔تیسرا کردار خود افسانہ نگار کا ہے، جس کا ذہن امواج وافکار پر بہتا رہتا ہے۔کیا دم کٹا کتا زندگی کے ان تقاضوں کی صورت ہے جو انسان کے ساتھ ہمیشہ لگے رہتے ہیں؟ جس طرح دروازہ بند کرنے کے باوجود زندگی کے تقاضے باہر نہیں رہ جاتے بلکہ ہمارے ساتھ ساتھ ہوتے ہیں، کیا اسی طرح دروازہ بند کر لینے کے باوجود کتا دور ہونے کے بجائے ہم سے قریب بہت قریب ہو جاتا ہے؟ یا پھر دم کٹا کتا اس امید موہوم کا استعارہ ہے جو ناموافق حالات میں بھی انسان کے ساتھ رہتی ہے اور کبھی پیچھا نہیں چھوڑتی؟ یادم کٹا کتا ہماری اس مفاد پرستی یا خود غرضی کی علامت ہے جو آج ہم سے اس طرح چھٹی جارہی ہے کہ ہماری ذات اور ہمارے وجود کا حصہ بننے کے درپے ہے؟ کیا املی کے پیڑ پر بیٹھنے والا بدہیئت مکروہ پرندہ موجودہ ریا کارانہ نظام سے بیزاری کا اظہار کرتا ہے اور ’تج دو، تج دو‘ کی صدا لگا کر ہمیں متنبہ کرتا ہے۔مادی ضرورتیں ہوں یا امید موہوم یا پھر ہماری مفاد پرستی، یہ سب دنیاوی تقاضوں کی پروردہ ہیں اور دم کٹا کتا اسی کی نمائندگی کرتا ہے جب کہ معاشرہ کے کریہہ اور جبری رویوں پر آواز لگا کر ہمیں متارکرنے والا پرندہ ہمارے ضمیر کی نمائندگی کرتا ہے۔اس پرندہ کا بدہیئت نظر آنا غالباً ہماری نظر کا وہ فتور ہے۔جس کی وجہ سے ہمیں برے کاموں پر ٹوکنے والا عملی طور پر پسند نہیں آتا۔

اس کہانی میں حساس انسان ہمہ وقت کرب کا شکار نظر آتا ہے۔خیر وشر کی کشمکش نئی بات نہیں ہے۔یہ کشمکش ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی۔خیر وشر کی یہی کشمکش یا کشاکش ہے جو کئی پیچیدگیوں کو جنم دینے کا بھی سبب بنتی ہے اور یہی پیچیدگیاں اس کہانی میں بھی در آئی ہیں۔خیر وشر اور اثبات ونفی کے ان افعال واعمال اور ان کے نمائندہ کرداروں کے درمیان افسانہ نگار کی الجھنیں ہماری آپ کی الجھنیں ہیں جو ظلم وجبر پر مبنی معاشرہ یا ماحول نے ہمیں دے رکھی ہیں۔ایک عام انسان اور بوجھل ماحول کی یہ کہانی زندگی کے فلسفیانہ نکات کی آئینہ دار ہے اور اسی لیے کئی مفاہیم کے در وا کرتی ہے۔’پرندہ پکڑنے والی گاڑی‘ کی طرح اس افسانہ کا شمار بھی گدی کے اہم اور نمائندہ افسانوں میں کیا جانا چاہئے۔خود افسانہ نگار غیاث احمد گدی اس افسانہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

"۔۔۔۔میرے اب تک کے تمام افسانوں میں اس لیے بھی پسند ہے کہ سچائی اور نیک نیتی کے اظہار کے سلسلہ میں کہیں افسانوی غلو سے کام نہیں لیا گیا ہے۔ علامتی اظہار کی اس جاں سوز کہانی میں آئندہ نسل انسانی کی تباہی کی جو تصویر افسانے کا مرکزی کردار دیکھتا یا محسوس کرتا ہے، اس کے لیے جس درد کا وہ شکار ہے وہ بے حد قابل غور ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ زندگی کی فطری شرافت کا اتنا خوب صورت افسانہ اردو میں بہت کم لکھا گیا ہے۔" (میں اور میرے افسانے۔ مشمولہ 'غیاث احمد گدی کے افسانے' مرتب: جمشید قمر)

افسانہ 'ڈوب جانے والا سورج' خود افسانہ نگار غیاث احمد گدی کی سوانح حیات سے مستعار ہے اور ایک نا تمام ناولٹ سے ماخوذ ہے۔ سوانح حیات سے قطع نظر 'ڈوب جانے والا سورج' بطور افسانہ بھی کامیاب ہے اور افسانہ نگار کی ابتدائی زندگی کے نقوش فنکارانہ طرز میں ڈھل کر لافانی صورت اختیار کر گئے ہیں۔ رفعت یا رفو کو، جو غیاث احمد گدی کا افسانوی ہمزاد ہے، اپنی نوعمری میں ماحول کی جس سفاکیت و جبریت کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اس کی پیش کش کا بلیغ انداز اس افسانہ میں ملتا ہے۔ مادرانہ و پدرانہ شفقت ومحبت سے محروم اس لڑکے کا المیہ بے پناہ تاثیر کا حامل ہے۔ اس دردناک ماحول اور اذیت ناک لمحوں کا اندازہ وہی کر سکتا ہے جو اس صورت حال سے دو چار رہا ہو یا اس کا مشاہدہ کیا ہو۔ 'خوں خوار باپ' اور 'سخت گیر سوتیلی ماں' جیسے الفاظ ہی ساری داستان کہہ ڈالتے ہیں۔ اس نوعمر کا کام بھینسوں کو سانی لگانا، دودھ دوہنا، گاہکوں کو دودھ پہنچانا، گوبر پھینکنا، بالٹی دھونا اور بھینسوں کو تالاب میں نہلانا ہے، یعنی کھیلنے کھانے کی عمر میں اس کی زندگی بھینسوں کے تنگ وتاریک طبیلے تک محدود ومقید ہے۔

چھچھوندر کے صرف چھو جانے پر لہو کا کنپٹیوں میں جم جانا اور زبیدہ کی ترغیب وتحریک کے باوجود پٹری پر چلنے سے احتراز کرنا اس لڑکے کی معصومیت اور خوف زدگی کی نفسیات کے غماز ہیں۔ اس نفسیات کے حامل نوعمر لڑکے کا رسی پر چلنے جیسے خطرناک کام کے لیے تیار ہو جانا، جہاں اس کی انتہائی مجبوری و بے بسی کا مظہر ہے، وہیں ایک سفاکانہ ماحول سے فرار حاصل کرنے کے لیے دوسرے سفاکانہ ماحول میں داخل ہونے کا غیر شعوری یا نادانی کا قدم بھی ہے۔ کہانی میں ایک جگہ پانچ بے رحم افراد سے فجو سمجھ کر اپنے تماشا کے لیے اس کو استعمال کرتے ہیں؟ آخر رفو کو فجو

کیوں سمجھ لیا جاتا ہے؟ کیا صرف اس لیے کہ محکوم اور مفلوک افراد چاہے وہ رفو ہو یا فجو ایک جیسے ہوتے ہیں؟ ان کی نہ تو اپنی کوئی شناخت ہوتی ہے اور نہ کوئی سماجی معنویت، لہذا جیسے چاہو ان کا استعمال کرو؟

افسانہ میں زبیدہ جیسا کردار رفو کی تحریک ثابت ہوتا ہے۔ قدم قدم پر رفو کو زوبیدہ اور اس سے منسوب یادیں نہ صرف راستہ دکھاتی ہیں بلکہ جینے کا حوصلہ بھی دیتی ہیں۔ افسانہ نگار کی اپنی کہانی ہونے کے باوجود 'ڈوب جانے والا سورج' وسیع تناظر رکھتا ہے اور اس کا ہر منظر معنی خیز تنوع کا حامل ہے۔ افسانہ نگار نے اپنی نوعمری کے کرب کو فنکارانہ انداز میں اجاگر کیا ہے؟ یہ انداز اہل دردقاری کو ایسی خلش دیتا ہے جو زندگی کا حصہ ہی نہیں خود زندگی معلوم ہوتی ہے۔

'ایک خون آشام صبح' نفسیاتی کہانی ہے۔ عورت کے ہاتھ سے وہ کبوتر اڑ جاتا ہے جسے اس کا بیٹا سوشی بہت چاہتا تھا وہ عورت غمگین ہو جاتی ہے اور اسے ہر طرف خونی مناظر کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔ اس کے لیے ہر واقعات عجوبے کی صورت میں سامنے آتے ہیں اور وہ غیر معمولی طور پر اضطرابی کیفیت کا شکار رہتی ہے۔ اسی اثناء میں اس کا بیٹا سوشی آجاتا ہے اور یہ خبر دیتا ہے کہ کئی لوگوں کے کبوتر اڑ گئے ہیں۔ اس خبر کو سن کر وہ عورت اپنے بیٹے سوشی کو اس کے کبوتر کے اڑ جانے کی خبر دیتی ہے۔ سوشی یہ سن کر غمزدہ ضرور ہو جاتا ہے لیکن اس کا غم اس لیے شدت اختیار نہیں کرتا کہ اس کے سامنے بہت سے لوگوں کے کبوتروں کے اڑ جانے کے واقعات ہوتے ہیں۔ کبوتر کے کھونے کا غم البتہ اس لیے بڑھ جاتا ہے کہ اس کا اڑنا بدشگونی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ دوسری صبح سوشی کو وہ کبوتر فرش پر لہولہان پڑا ہوا تڑپتا ہوا ملتا ہے۔ کسی پیاری چیز کے بچھڑنے کا جو احساس ہوتا ہے، اس سے زیادہ کربناک اور دردآگیں احساس وہ ہوتا ہے جو اس پیاری چیز کو لہولہان ہو کر تڑپتے ہوئے دیکھنے سے پیدا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ 'اوپر آسمان اتنا لال، اتنا خوں آشام ہو گیا تھا کہ دل کی دھڑکنیں تک سہم کر تھم گئی تھیں'۔

افسانہ میں جو سوالات سوشی کی ماں کو الجھن سے دوچار کیے ہوئے ہیں، وہ سوالات ہمارے آپ کے لیے بھی الجھن کا سبب بنتے ہیں اور پورے افسانے کے تناظر میں دیکھیں تو ان سوالوں کے جواب میں ہی افسانہ کی کلیدی تفہیم چھپی معلوم ہوتی ہے۔ آخر کبوتر اس کے ہاتھ کی دسوں انگلیوں کے قفس سے نکل کر کیسے اڑ گیا، آسمان کا ایک ہی کنارہ سرخ کیوں ہے اور کبوتر اس کنارے کی طرف مائل پرواز کیوں ہوا؟ کیا آسمان کی لالی اور کبوتر کی سرخ آنکھوں میں کوئی رشتہ،

کوئی تعلق ہے؟ یہ ہیں وہ سوالات جو سوشی کی ماں کو پریشان کرتے ہیں۔ بے یقینی اور خوف کی تاریکیوں میں ماں اور بچے کی نفسیات موثر اور فطری انداز میں روشنی کی طرح تابناک پہلو رکھتی ہے۔

'قیدی' کا مرکزی کردار عارفہ ہے جسے حالات کے جبر کی قیدی بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ افسانہ میں عارفہ کی شخصیت پر یوں روشنی ڈالی گئی ہے۔

''پتہ نہیں مجھے ایسا کیوں محسوس ہو رہا تھا کہ رات کی کھوئی
ہوئی افسردہ اور اداس آنکھوں والی عارفہ اور اس بے باک
قہقہہ لگانے والی عارفہ میں ضرور کوئی فرق ہے''۔

ظاہر ہے عارفہ کے اطوار، عارفہ کی اضطراری کیفیت، ناآسودہ زندگی اور غیر مطمئن صورت حال کے عکاس ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ افسانہ نگار کے ساتھ خوش اخلاقی سے پیش آتی ہے، لیکن دوسرے ہی لمحہ وہ ایسا سچویشن پیدا کر دیتی ہے کہ افسانہ نگار اپنی اس خوش فہمی سے آزاد ہو جاتا ہے کہ وہ انسانی نفسیات کے پیچ وخم سے اتنی اچھی طرح واقف اور باخبر ہے کہ لوگوں کی آنکھیں اس سے باتیں کرتی ہیں۔ ایسی باتیں جو زبان پر نہیں لائی جاتیں۔

قیدی کی کہانی ایک عام اور مختصر واقعہ پر مبنی ہے۔ سرد موسم، تیز بارش، ویران اسٹیشن اور اندھیری رات سے دوچار ہو کر کوئی بھی مسافر کسی مخلص اور ہمدرد انسان کی ضرورت محسوس کرتا ہے اور اس کہانی میں بھی ایسا ہی ہوا ہے۔ مذکورہ ماحول میں دو اجنبی (عارفہ اور اس کا شوہر) گھر جاتے ہیں۔ افسانہ نگار از راہ ہمدردی انہیں اپنے گھر لے جاتا ہے، اس کی خاطر تواضع کرتا ہے، یہاں تک کہ وہ اپنی ضرورتوں کو پس انداز کر کے ان کی مالی مدد بھی کرتا ہے۔ یہاں تک تو سب کچھ ٹھیک نظر آتا ہے، لیکن کہانی میں غیر متوقع مگر اصل موڑ اس وقت پیدا ہوتا ہے، جب عارفہ افسانہ نگار کے لیے نازک اور خطرناک حالات پیدا کر دیتی ہے۔ حالات کا جبر آدمی سے کیا کچھ نہیں کراتا، عارفہ کے اس عمل کو بھی اسی پس منظر میں لیا جانا چاہئے۔ بہر کیف کہانی کا یہی وہ موڑ ہے جو حالات سے جبر کی قیدی عورت کی ذہنی صورت حال کی سچائیاں اجاگر کر کہانی کو خوبصورتی عطا کرتا ہے۔

افسانہ 'نارد منی' روحانی افلاس اور اخلاقی انحطاط سے متعلق پہلوؤں کی بازگشت ہے۔ افسانہ جس واقعہ پر مبنی ہے وہ گدی کے دیگر افسانوں کی طرح عام نوعیت کا ہے۔ نارد منی اور مصنف دونوں معمول سے کچھ زیادہ پی لیتے ہیں اور نارد منی گپتا نشہ کی ترنگ میں جو اول فول بکتا ہے اسے

محض اول فول کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی یہ بکواس دراصل معاشرے کی ایک اہم نفسانی نکتہ کی جانب توجہ مبذول کرانے کی شعوری کوشش ہے۔ زمین کا نظر نہ آنا، کار کا ڈھول اڑا کر نکل جانا، بھگوان سے بات چیت اور اپنے بھٹکنے کا اعتراف وغیرہ نفسیاتی عوامل کے طور پر پیش کیے گئے ہیں اور اسی سبب یہ ہماری توجہ اپنی جانب مبذول کر لیتے ہیں۔ گدی کی فنی عظمت کا راز اس حقیقت میں مضمر ہے کہ وہ اپنے منفرد اور سادہ طرز و اسلوب سے معمولی واقعہ کو بھی غیر معمولی، اہم اور دلچسپ بنا دیتے ہیں۔

'خانے تہ خانے' بھی 'ڈوب جانے والا سورج' کی طرح ایک نا تمام ناولٹ سے مستعار افسانہ ہے۔ رومانی ماحول کی عکاس یہ کہانی اثبات حیات کی قدروں سے استفادہ کرنے کی ترغیب دیتی ہے۔ افسانہ میں کلا ایک ایسا نسوانی کردار ہے جو عورت کے نظام باطن سے منسوب احساسات و جذبات کی موثر نمائندگی کرتا ہے۔ کلا کے کردار کو فطری رنگ و آہنگ سے مزین کیا گیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے افسانہ نگار کو 'کلا' کے شعور سے لاشعور تک رسائی حاصل ہو گئی ہے۔ اس افسانہ میں گدی نے انسانی صورت حال یا نفسیات کو نرم رو لہجے میں پیش کرنے کی ادا کا مظاہرہ کیا ہے۔

'اندھے پرندے کا سفر' کا جمالیاتی بیان متاثر کن ہے۔ اس کی کہانی روی، شانتا، چمپا اور افسانہ نگار کے درمیان گھومتی ہے۔ افسانہ کا ہر کردار متضاد سمتوں میں مائل پرواز ہے۔ یہ ایک دوسرے سے متعلق ہوتے ہوئے بھی لاتعلقی کی فضا میں سانس لیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

چمپا اور اپنے دوست افسانہ نگار سے روی بے حد محبت کرتا ہے۔ اسے اپنی محبت پر اس قدر اعتماد ہے کہ ایک دوسرے سے کسی کے الگ ہونے کا کوئی تصور وہ اپنے پاس نہیں رکھتا۔ یہی وجہ ہے کہ جب اس کے اعتماد کو ٹھیس لگتی ہے اور چمپا جو اس کی بیوی ہے، اس کی بن کر نہیں رہ پاتی تو وہ محبت اور وفاداری سے مایوس ہو کر خودکشی کر لیتا ہے۔ اس کے خیال میں سنگ دل اور بے مروت دنیا میں زندہ رہنا ضروری نہیں ہے۔ دوسری طرف شانتا ہے جو چمپا کے ذریعہ بہت کچھ جانتے ہوئے بھی روی کی شریف النفسی کی قائل ہے اور وہ روی سے بے پناہ محبت کا اظہار کرتی ہے۔ روی کے انتقال ہونے پر شانتا کا یہ انکشاف کہ روی نے صرف میرے لیے دنیا کو تیاگ دیا ہے، واقعہ کو ایک نئی سمت کی خبر سے جوڑ دیتا ہے۔ ہر چند کہ افسانہ کا مرکزی کردار روی ہے، شانتا کا

کردار اپنی پر اسراریت اور روی و افسانہ نگار کے ساتھ بے تکلفانہ رویے اور گفتگو کے سبب روی سے زیادہ توجہ طلب ہو گیا ہے۔ اس افسانہ کے ذریعہ بھی ماحول کے جبر اور اس کے شکار انسان کے نفسیاتی تجربے کا عمل فنکارانہ خصوصیت کے ساتھ سامنے آتا ہے۔

'افعیٰ' کلاسیکی طرز کا افسانہ ہے اور گدی کی تخلیقی ندرت کا مظہر بھی۔ ممکن ہے، اخلاقی حدود و آداب پر جنسی خواہشات کی برتری اور ایک مقدس رشتہ کی پامالی کے سبب اس افسانہ کو اعلیٰ انسانی اقدار کی نفی کے طور پر پیش کر کے اسے گدی کے کمزور لمحوں کی پیداوار گردانا جائے یا پھر جنسی ناآسودگی یا محرومی کے فطری عمل سے تعبیر کیا جائے۔ اس افسانہ میں زہرہ اور مشتاق دو کردار مرکزی نوعیت کے حامل ہیں۔ زہرہ میں مشتاق کا دلچسپی لینا اور زہرہ کا عجیب وغریب ردعمل ان حالات کی دین ہیں جن سے ان کا سامنا رہا ہے، زہرہ ایک بے حد خوبصورت لیکن پست کردار عورت ہے، جو شوہر کے ہوتے ہوئے دوسرے مردوں میں دلچسپی لیتی ہے اور بے حیائی کی انتہا یہ کہ ایک تانگہ والے کو زبردستی پکڑ کر گھر لانا چاہتی ہے۔ اس کے آگے کی انتہا یہ کہ وہ اپنے دربان کے ساتھ اکثر رات گزارنے کا ذکر فخریہ طور پر کرتی ہے۔ اس کے باوجود حیرت یہ ہے کہ وہ مشتاق کو ایک حد سے زیادہ بڑھنے نہیں دیتی اور ایسی کسی کوشش پر وہ برانگیختہ ہو جاتی ہے، مشتاق کو تمانچے جڑ کر الگ ہو جاتی ہے۔ زہرہ دراصل ایک قسم کی نفسیاتی مریضہ ہے۔ وہ اپنے چھوٹے بھائی انور کو بہت چاہتی ہے لیکن وہی انور بڑا ہو کر جب اس کے ساتھ جبراً ریپ کرتا ہے تو وہ ٹوٹ جاتی ہے۔ انور جب احساس کی دنیا میں لوٹتا ہے اور خودکشی کر لیتا ہے تو وہ بری طرح زہرہ کے دل اور دماغ پر قبضہ کر لیتا ہے اور وہ انور کے لیے سب کچھ لٹا دینے کی بات کرنے لگتی ہے۔ یہی خود سپردگی اس پر اس قدر حاوی رہتی ہے کہ اس کا متضاد رویہ اور اس کی عجیب وغریب حرکت سامنے آتی ہے جو مشتاق کی سمجھ سے باہر ہے۔

اس افسانہ میں بھی اگرچہ رومانی فضا پائی جاتی ہے لیکن مرد کے اندر کا حیوان جو اپنے ہونے کا احساس بھی دلاتا رہتا ہے، اس فضا کو گرد آلود بنا دیتا ہے۔ زہرہ جیسا کردار جہاں نسوانی حیا کی شناخت کو مجروح کرتا ہے، وہیں انور کا کردار رشتہ کے تقدس کی دھجیاں بکھیر دیتا ہے۔ خود مشتاق کا کردار اتنا غیر جانبدارانہ یا مخلصانہ نہیں، جتنا نظر آتا ہے۔ زہرہ سے اس کی ہمدری یا قربت کے حوالے اپنی غرض و غایت پوشیدہ رکھنے میں ناکام ہیں۔ ہر چند کہ یہ افسانہ اخلاقی انحطاط اور

سطحی روابط پر مبنی ماحول کی نمائندگی کرتا ہے، معلوم نہیں کیوں اس افسانے میں گدی مقصدیت کے پہلو کی کوئی جھلک نہیں دکھا پاتے اور ایک ہی رو میں بہت دور تک بہتے چلے جاتے ہیں۔

افسانہ' کالے شاہ' معصوم اور شریف النفس شخصیت کے حامل مجو بھائی جیسے لافانی اور قابل رحم کردار کے باعث ہمیشہ یاد کیا جائے گا۔ الفاظ کے تخلیقی استعمال اور انسانی ہمدردی کے جذبات سے پر یہ کہانی حقیقت سے غیر معمولی قربت رکھتی ہے۔ مجو بھائی ایک بے روزگار آدمی ہے اور ملازمت کے لیے انتھک دوڑ دھوپ کرنے کے باوجود ناکامی کے سبب بالکل بکھر چکا ہے گھر کے لوگوں کی لعنت وملامت کا سلسلہ مجو بھائی کو پے در پے ذہنی جھٹکوں اور دلی صدموں سے دوچار کرتے ہیں اور یوں وہ ایک نفسیاتی مریض بن چکا ہے۔ بے روزگاری کا آسیب ہی کیا کم تھا کہ مجو بھائی کو کالے شاہ نے نت نئی پریشانیوں میں ڈال دیا۔ مجو بھائی کی ماں، بہن اور بھابھی وہ بھیا کے کردار ہمارے عام گھروں کے کردار ہیں اور ان کی نفسیات کا مشاہدہ مشکل نہیں۔ آج ہمارے سماج کے تقریباً ہر متوسط طبقہ کے گھروں میں مجو بھائی اور اس کے متعلقین نظر آتے ہیں۔ مجو بھائی کی طرح ماں کو خوشی دینے کا جذبہ رکھنے والا ہر بے روزگار نوجوان روزگار پانے کا خواب دیکھتا ہے اور ماں کو اپنے خواب سے یوں روشناس کراتا ہے۔

''گھر بنواؤں گا، چھوٹا سا صاف ستھرا اچھا پلنگ خریدوں گا،
تمہیں بیٹھا کر تمہاری بہو سے کہوں گا کہ اماں کی دن رات
خدمت کیا کر خوب اچھی اچھی چیزیں پکا کر کھلا۔''

مگر بے روزگاری کا یہ آسیب نہ صرف ان خوابوں کو نگل لیتا ہے، بلکہ خواب دیکھنے والے مجو بھائی کو بھی۔ اپنے وقت کے ایک مسئلہ پر لکھا گیا یہ افسانہ مجو بھائی کے کردار اور حزنیہ و بیانیہ لہجے کے سبب تاثیر وتحرک کی ایک دنیا آباد کیے ہوئے ہے۔ مجو بھائی کے لیے قاری انسانی ہمدردی کا بے پناہ جذبہ اپنے اندر پاتا ہے، چونکہ قاری اپنے سماج اور اپنے گھر میں بھی کسی نہ کسی مجو بھائی کو بے روزگاری کے آسیب کی قید میں تڑپتا ہوا دیکھ چکا ہے یا دیکھ رہا ہے۔ لہذا اس کے اندر انسانی ہمدردی کا پیدا ہونا فطری ہے۔ انسانی ہمدردی کا جذبہ پیدا کرنا گدی کے افسانوں کا خاصہ ہے اور اس باب میں کالے شاہ خاص طور پر توجہ کا مستحق ہے۔

'ایک جھوٹی کہانی' ایک ایسے کہانی کار کی کہانی ہے جس کو سچی کہانی لکھنے کے جرم میں جسمانی اذیت پہنچائی جاتی ہے اور پتھر مار مار کر ندی پار بھگا دیا جاتا ہے۔ چوٹ، درد اور بھوک سے

نڈھال ہوکر وہ کہانی کار ندی پار تنہائی کے عالم میں ایک عورت کو دیکھ کر خوش ہوجاتا ہے اور پیٹ کی بھوک پر جنسی خواہش غلبہ پانے لگتی ہے۔ چند لمحوں بعد معلوم ہوتا ہے کہ وہ عورت دراصل ہجڑا ہے۔ ہجڑے سے ملاقات کے بعد گفتگو کا سلسلہ چلتا ہے اور وہ ہجڑا اپنی روداد کہانی کار کو سنا کر کہانی کار سے اس کی روداد پوچھتا ہے۔ کہانی کار اپنی روداد میں ایک گوالن کا تذکرہ کرتا ہے اور اس سے منسوب واقعات پیش کرتا ہے۔ یہاں گوالن اور اس سے منسوب واقعات ہمیں افسانہ نگار کے دودھ دوہنے والے ماحول میں لے جاتے ہیں۔ اس روداد کے مطابق گوالن کو وہ کہانی کار بتاتا ہے کہ گائے کا دودھ اس کے تھنوں میں سوکھنے لگے تو سمجھو راجہ کی نیت میں کھوٹ آ گیا۔ افسانہ نگار نے بڑی خوبصورتی سے راجہ کی نیت میں کھوٹ آنے کی تشریح و وضاحت کی ہے۔ دراصل افسانہ نگار اس تشریح کے بہانے راجا اور عوام، حاکم و محکوم کے بدلتے پیمانوں پر اپنا تبصرہ پیش کرنا چاہتا ہے۔ یہ 'تبصرہ' نہ صرف دلچسپ ہے بلکہ تلخ حقیقت اور بصیرت افروز طنز سے بھرپور بھی۔

کہانی کار کو راجہ نے جھوٹ کی حفاظت کے لیے رکھا تھا تاکہ وہ ایسی کہانیاں لکھے کہ سچ پر پردہ پڑا رہے۔ لیکن روز روز کے جھوٹ سے کہانی کار عاجز آ گیا اور اس نے سچی کہانی لکھ دی۔ گدی اس افسانہ میں زندگی کی کڑوی کسیلی سچائیوں کو آئینہ بناتے نظر آتے ہیں۔ اس آئینہ کو اگر ہم عصری چہرے کے سامنے لے جائیں تو صورت وہی بنتی ہے جو راجا کے یہاں ہے۔ آج بھی اقتدار کا کچھ خاص عامل طبقہ اپنے مصاحبین سے اپنے فنکار قلم کار سے کم و بیش وہی سب چاہتا ہے جو ایک جھوٹی کہانی کار اجا چاہتا ہے۔ مذکورہ افسانہ کا کردار کہانی کار کم از کم اتنی جرات تو کر لیتا ہے کہ ایک دن بھی کہانی لکھ دیتا ہے لیکن ان قلم کار سے ضمیر و غیرت کے بارے میں کیا کہیں گے جو اپنی آنکھوں سے راجا کی بربریت، ناانصافی اور عیاری کا مشاہدہ کرنے کے باوجود اپنے حقیر، سطحی اور ذاتی مفادات پورے ہونے کی وہم میں جھوٹی کہانی لکھتے چلے جا رہے ہیں اور ان کہانیوں میں ان کو رحم دل، عادل اور مخلص جیسے القابات سے نواز کر آسودگی محسوس کر رہے ہیں، نیز راجا کی اخلاقی پستیاں تہذیبی روایات کا حسن اور ان کی بدکرداری کا تسلسل دانشورانہ منصب کے تقاضے بن کر ان کی تحریروں میں حرف و لفظ کو شرمندہ کر رہے ہیں۔ یہاں ممتاز دانشور ایڈورڈ سعید کے خیالات گوارہ کریں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے مذکورہ افسانے کے مرکزی کردار نے ان خیالات سے روبرو ہونے کے بعد سچی کہانی لکھنے کا تہیہ کیا ہو۔ یہ خیالات ہیں۔

ہمیں اپنے رہنماؤں کی غلطیوں کو نہیں بھولنا ہے۔ ہمیں اپنے لیڈروں کی غلطیوں کے اظہار کے معاملے میں ایماندار ہونے کی ضرورت ہے، ٹھیک ہے اگر ہم کوئی ایسی بات کہتے ہیں جو ان کے لیے زیادہ شرمندگی کا باعث ہو تو پھر وہ ہمیں روزگار نہیں دیں گے، ہم کوئی اہم افسر نہیں بن پائیں گے، یا ہمیں کوئی اعزازی ڈگری نہیں مل سکے گی۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ ہم ان باتوں کا ذکر کریں، جنہیں اقتدار نے کچل کر رکھ دیا ہے۔ یہ پروا کیے بغیر کہ ہمیں اس کی کیا قیمت چکانی پڑے گی اور یہ بجائے خود ہمارے لیے نہ صرف یہ کہ فخر کا باعث ہوگا بلکہ انسانی بھائی چارے کا بھی۔'' (ایڈورڈ سعید کی جنگ-قمر صدیقی مشمولہ اردو چینل ممبئی)

اظہار کے معاملے میں ایماندار ہونے کی یہ ضرورت ہی مذکورہ افسانہ کے مرکزی کردار کے یہاں جھوٹی کہانی لکھنے پر تاسف کا احساس پیدا کرتی ہے اور سچی کہانی لکھنے کے حوصلے نوازتی ہے، ہر چند کہ کہانی کار کردار کو اس کی قیمت مار کھا کر، لہولہان ہو کر چکانی پڑتی ہے۔ مختصر عرض کیا جائے تو یہ افسانہ فنکار کی اپنی شخصیت کے پہلو بہ پہلو سیاسی و معاشرتی نظام کی کج رویوں کو صاحب قلم اور صاحب اقتدار کے حوالے سے پیش کرتا ہے، اسلوب کی ندرت اور چست و موثر مکالماتی انداز بیان افسانہ کی خوبی کہے جا سکتے ہیں۔

'پرکاشو' آسان اور سیدھی سادی کہانی ہے، پرکاشو ایک خودسر لڑکی ہے جسے راہ راست پر لانے کی ذمہ داری استاد کے سپرد کی جاتی ہے۔ استاد غور و فکر کے مختلف مراحل سے گزرتا ہے اور پرکاشو کو قدیم رسم و رواج کی دیواروں کو ڈھانے سے روکنا چاہتا ہے لیکن پرکاشو کی باغیانہ نفرت استاد کی کوششوں کو کامیاب نہیں ہونے دیتی اور آخر تک استاد (جو خود افسانہ نگار معلوم ہوتا ہے) امید و بیم کی کیفیت میں گرفتار رہتا ہے۔ انسان کی ذہنی کشمکش کا احاطہ کرنے والا یہ افسانہ انسانی زندگی کی کئی نفسیاتی سطحوں سے متعارف کراتا ہے اور یہ سطحیں عام زندگی کا حصہ نہ ہوتے ہوئے بھی فطری اور آشنا معلوم ہوتی ہیں۔

اگلا افسانہ 'پاگل خانہ' کی کہانی رضیہ نام کی ایک ایسی لڑکی کی کہانی ہے جو آخر آخر تک سمجھ میں نہیں آتی۔ رضیہ احمد کو بے انتہا چاہتی ہے، یہاں تک کہ شوہر کو چھوڑ دینا چاہتی ہے، دوسری

طرف اس کا شوہر اس کے بغیر نہیں رہ سکتا اور رضیہ بھی شوہر کے دیر سے گھر پہنچنے پر اس سے لپٹ کر رونے لگتی ہے۔ احمد کی شادی کی بات پر رضیہ کی خودکشی کا اندیشہ غالب ہو جاتا ہے لہذا احمد کے متعلقین، جو رضیہ کے بھی خیر خواہ ہیں، رضیہ کو سمجھانے کی کوششیں کرتے ہیں، آخر میں معلوم ہوتا ہے کہ وہ شوہر کے ساتھ شہر چھوڑ کر کہیں اور چلی گئی ہے۔

یہ افسانہ نفسیاتی فضابندی سے مستعار ہے۔ رضیہ کی حرکت اور احمد کے بھیا کے اطوار کئی مقامات پر نہ صرف عجیب وغریب ہیں بلکہ نفسیاتی مرض تک کی غمازی کرتے ہیں خصوصاً رضیہ کے معاملے میں۔ زندگی کی ناہمواریاں اور محرومیاں آدمی کو کس طرح کی کیفیات سے دوچار کر دیتی ہیں، اس کا علامتی جواب اس افسانہ میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔ افسانہ کا ہر کردار ایک عجیب ذہنی کشمکش کی زد میں ہے۔ غالباً اسی ماحول کے پیش نظر افسانہ کا عنوان 'پاگل خانہ' رکھا گیا ہے، غیر متوقع واقعہ پر مبنی یہ کہانی اس تاثر یا جواز کے اشارے واضح نہیں کرتی جس کی توقع ہمیں رہتی ہے۔

افسانہ 'دیمک' کالے شاہ کی طرح ہی متوسط طبقہ کے ایک مفلس خاندان کی تصویر پیش کرتا ہے۔ زندگی کی ضرورتوں کو پورا نہ کر پانے کی مجبوری اور کربناک حالات کی موجودگی انسانی رشتہ کی پاک دامنی پر کس طرح عدم اعتمادی کا داغ لگا دیتی ہے۔ اس کا فطری اظہار اس کہانی میں ملتا ہے۔ انسان کی شرافت غربت کے شکنجے میں کس طرح چیختی اور تڑپتی ہے اس کا مختصر مگر ان سوز اشارہ دیمک کی میاں بیوی کی صورت حال میں ملتا ہے۔ تھوڑے سے فرق کے ساتھ سعیدہ کا شوہر اور خود سعیدہ کالے شاہ کے مجو بھائی کے قریب دکھائی دیتے ہیں اور کہانی مفلسی سو بہار کھوتی ہے، کی تفسیر بن جاتی ہے۔ زندگی کی تلخیوں کی نقاب کشائی اور افلاس زدہ معاشرے کی نمائندگی کے لئے جس سنجیدگی اور حقیقت پسندی کی ضرورت ہوتی ہے وہ اس کہانی میں موجود ہے۔

'کیمیا گر' کی کہانی بھی معاشی بدحالی کی آئینہ دار ہے۔ یہ ایک ایسے کیمیا گر کی کہانی ہے جو سونا بنانے کے چکر میں اپنی زندگی کے بہترین سال برباد کر چکا ہے، اس کے باوجود وہ خوشگوار مستقبل کے سارے حسین خوابوں کی بنیاد اپنی سعی رائیگاں کو بنائے ہوئے ہے۔ ماجد کا کردار اس افسانہ میں زندگی کی بامعنی علامت کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ اس کردار کے ذریعہ افسانہ نگار اپنے اس مقصد کے اظہار میں کامیاب و بامراد نظر آتا ہے کہ سونا بنانے کا اصل نسخہ یعنی حال و مستقبل کو افلاس زدگی سے بچانے کا نسخہ کیمیا گر کی تجربہ گاہ نہیں بلکہ صرف اور صرف محنت شاقہ ہے اور ایک

ہی دن میں دنیا کی دولت پا لینے کے خواب میں اپنی زندگی کو لا حاصل تجربے کی نذر کر دینا حماقت و نادانی ہے۔خالہ وخالو کے درمیان ماجد کے متعلق بات چیت حقیقت پسندانہ نقطہ نظر کی سطح پر آنے کا ابتدائی عمل ہے۔ کلاسیکی طرز کا یہ افسانہ فنی التزامات اور پختہ تکنیک کے سبب متاثر کرتا ہے۔ مقصدیت کا اتنا روشن پہلو اس فنی ندرت کے ساتھ بہت کم دیکھنے کو ملتا ہے۔

آخری افسانہ 'ہم دونوں کے بیچ' ہے، اس افسانہ میں عورت کی تہہ داریت اور مرد کی محرومیاں نفسیاتی طور پر اپنے احوال سناتی نظر آتی ہیں۔اخبار کی رپورٹر وندنا کی زندگی کے اوراق کھلتے وقت اس کے بعد کے لمحے رومانوی ماحول کے باوجود سنجیدہ فضا پیدا کرتے ہیں۔اور یہی سنجیدگی دراصل وندنا اور فوٹو گرافر کی نفسیاتی الجھنوں کا انکشاف کرتی ہے۔کہانی اگرچہ بہت مختصر ہے اور عمومی مزاج کا حامل بھی لیکن افسانہ نگار کی تخلیقی استعداد نے اسے عمومیت سے اوپر اٹھا دیا ہے۔

افسانوی مجموعہ 'پرندہ پکڑنے والی گاڑی' کے اس مطالعہ کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ گدی کے افسانوں میں انسانی ہمدردی کے جذبات شدت سے سامنے آتے ہیں جو خاص طور پر پسماندہ و محروم طبقات نیز عورتوں کی نفسیات سے قریب تر اور ہم آہنگ ہیں۔

> ''گدی کے افسانوں کا موضوع یا اس کی تخلیقی و افسانوی فضا محروم و نا آسودہ انسان یا معاشرہ سے مستعار و آشنا ہیں جو گدی کی حساسیت اور انسانی ہمدردی کے جذبے کو ثابت کرتے ہیں۔ زندگی کی بے لباس سچائیاں یعنی مشاہدات و تجربات سے کشید کردہ کرب اور تلخیاں، حقیقت پسندانہ ذوق و مزاج اور تخلیقی اسلوب کا اشتراک گدی کے افسانے کی خصوصیات ہیں''۔

(پرندہ پکڑنے والی گاڑی کے افسانے)

☆☆☆

ڈاکٹر شبستاں آس محمد

ماہنامہ ’’آجکل‘‘ کی ادبی خدمات: ایک جائزہ

ادبی صحافت کے فروغ میں بیسویں صدی اہم مانی جاتی ہے۔ کیونکہ اس دور میں جتنے بھی بڑے علماء وادباء، شعراء، محققین وناقدین اردو میں پیدا ہوئے ان میں سے کوئی بھی ایسا نہ ہوگا جس نے رسائل کے لیے کچھ نہ کچھ تحریر نہ کیا ہوگا اور ان ہی ادبی رسائل نے بہت سوں کو شہرت دوام عطا کی۔

رسائل میں جملہ موضوعات پر مضامین تحریر کیے جاتے رہے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ جو مواد دیگر جگہوں پر مشکل سے حاصل ہو پاتا ہے وہی مواد رسائل وجرائد میں بہ آسانی دستیاب ہو جاتا ہے۔ ادبی صحافت میں جن رسائل نے اپنی شناخت قائم کی ان میں سے کچھ اہم رسائل یہ ہیں۔

’’تہذیب الاخلاق‘‘ (سرسید احمد خاں)، ’’الہلال‘‘ (مولانا ابوالکلام آزاد)، ’’ادبی دنیا‘‘ (مولانا صلاح الدین)، ’’کتاب نما‘‘ (مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، نئی دہلی)، ’’روح ادب‘‘ (بنگال اردو اکادمی، کولکاتا)، ’’عصری ادب‘‘ (محمد حسن)، ’’ایوان اردو‘‘ (دہلی اردو اکادمی)، ’’شب خون‘‘ (شمس الرحمٰن فاروقی)، ’’نقوش‘‘ (محمد طفیل)، ’’اردو دنیا‘‘ (قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی)۔

ماہنامہ ’’آجکل‘‘ بھی اسی طرح کا ایک ادبی اور معیاری رسالہ ہے جس نے ادبی حلقوں میں اپنی مستحکم شناخت قائم کر لی ہے۔ رسالہ ’’آجکل‘‘ ابتدا میں ’’نن پرون‘‘ کے نام سے پشتو زبان میں شائع ہوتا تھا۔ اس کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے اردوداں طبقہ اس کا ایڈیشن اردو میں بھی جاری کرانے کا خواہش مند تھا۔ جلد ہی ان کی آرزو پوری ہوئی اور 10/جون 1942ء کو اپنی پوری شان وشوکت کے ساتھ اردو کا پہلا ایڈیشن جاری ہوا اور اس کا نام تبدیل کرتے ہوئے ’’آجکل‘‘ رکھا گیا۔ شروع میں پندرہ روزہ اور پھر اس نے ماہنامے کی شکل اختیار کر لی۔

یوں تو اردو ادب میں طویل عرصے سے کثیر تعداد میں رسائل وجرائد شائع ہوتے رہے ہیں لیکن رسالہ ’’آجکل‘‘ نے جلد ہی اپنے انفراد کی وجہ سے ادبی دنیا میں جو مقام ومرتبہ حاصل کیا

اور وہ بھی مختصر سی مدت میں یہ واقعی لائق ستائش ہے۔

شخصیات پر بھی متعدد مضامین آجکل میں شائع ہوئے۔ ہر طرح کی شخصیات چاہے وہ سماجی، سیاسی، ادبی اور مذہبی کیوں نہ تھے ان سب پر مضامین لکھے گئے۔ جن میں اہم نام ہیں سر نواس شاستری، شاہ محمد سلیمان، سر عبدالقادر، خواجہ حسن نظامی، جوش ملسیانی، یگانہ چنگیزی، نوح ناروی، رام بابو سکسینہ، محمود شیرانی، نیاز فتح پوری، خواجہ میر درد، حفیظ جونپوری، حسرت موہانی، پنڈت برج نارائن چکبست، جوش ملیح آبادی، جگر مرادآبادی، پریم چند، راجندر سنگھ بیدی، علامہ اقبال، اختر حسین رائے پوری، آغا حشر کاشمیری، آرزو لکھنوی کے علاوہ اور بھی ایسے بہت سارے نام ہیں جن پر لکھے گئے مضامین اور اس کے ساتھ ساتھ ان کی تصاویر بھی شائع ہوئی ہے۔

آزادی ہند سے پہلے رسالہ آجکل میں ہر صنف کے مضامین شائع ہوتے رہے ہیں اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ تنقیدی اور تعارفی مضامین بھی شروع سے ہی رسالہ آجکل میں شائع ہوتے رہے۔ اس رسالے میں مختلف موضوعات پر جو مضامین شائع ہوئے ان سے ان مضامین کے تنوع کا پوری طرح اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ رسالہ میں شائع ہونے والے تنقیدی اور تعارفی مضامین کا معیار شروع سے ہی بہتر رہا ہے۔ جو اس رسالے کے ادبی اور معیاری ہونے کا ثبوت ہے۔ رشید احمد صدیقی نے ڈاکٹر ذاکر حسین کی تعلیمی خدمات پر روشنی ڈالی، ظہور حسین ڈار نے اختر حسین رائے پوری پر مقالہ لکھا۔ فیض کا مضمون ''شاعر انقلاب'' کی حیثیت سے اپنی نوعیت کا پہلا مضمون تھا۔ مسعود حسین خان نے عظمت اللہ خاں پر ایک مضمون ''ادب کا ایک باغی'' کے عنوان سے لکھا۔ ڈاکٹر عابد حسین کا ''ہندوستان کی مشترکہ تہذیب''، مضمون شائع ہوا۔ خواجہ غلام السیدین کا مضمون ''معلّمی کا پیشہ''، عشرت رحمانی کا مقالہ ''حشر کا ڈرامہ'' کاظم علی خاں کا مضمون'' آتش کے بعض غیر معروف شاگرد''، عرش ملسیانی کا مضمون ''آجکل کے اٹھائیس برس''، شمیم حنفی کا مضمون ''اردو ادب آزادی کے بعد (ہند) میں'' خواجہ احمد فاروقی کا مضمون ''تاریخ ادب اردو کی تدوین کا مسئلہ'' اطہر دہلوی کا لکھا مضمون'' فورٹ ولیم کالج اور اردو ادب''، رفعت سروش کا مضمون ''مشاعرے جب اور اب''، عبدالماجد دریا آبادی کا مضمون ''ہندو شاعروں کی کہانی'' وغیرہ کے علاوہ اثر لکھنوی، حامد حسین، عابد سہیل، صالحہ عابد حسین، شکیل الرحمٰن، فراق گورکھپوری، سردار جعفری، اکبر مرادآبادی، نیاز فتح پوری، وغیرہ کے مضامین بھی وقتاً فوقتاً رسالہ آجکل میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان کے علاوہ آجکل میں شروع سے ہی اردو کی دیگر اصناف پر بھی مضامین شائع ہوتے رہے۔ مثلاً اردو نظم، غزل، مرثیہ، مثنوی، رباعی، افسانوی ادب، ناول نگاری، داستان وغیرہ کے علاوہ تاریخی، جغرافیائی اور سائنسی موضوعات پر بھی لاتعداد مضامین شائع ہوتے رہے۔

تقسیم ہند سے پہلے کے آجکل کا جو خاکہ ہمارے سامنے موجود ہے اور جن کے بارے

میں ہم لکھ چکے ہیں کہ ایسی کوئی صنف نہیں ہے جس کے اوپر آجکل نے مضامین شائع نہ کیے ہوں۔ بہر حال مجموعی اعتبار سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ تقسیم ہند سے پہلے آجکل کی ادبی حیثیت کسی بھی معیاری، ادبی رسالے سے کسی بھی طرح کم نہ تھی بلکہ اس کا جو ادبی معیار تھا وہ اس دور کے بعض ادبی رسالوں سے قدرے بہتر تھا۔ چونکہ کچھ ایسے ادیب بھی تھے جو صرف آجکل کے لیے ہی لکھ رہے تھے اور یہ آجکل کے لیے فخر کی بات تھی۔

''آجکل'' کی سب سے بڑی خوبی جو میری نظر میں ہے وہ یہ ہے کہ یہ رسالہ سب سے بڑی لعنت یعنی ''ادبی گروہ بندی'' کا کبھی شکار نہ ہوا اور نہ اس نے یک طرفہ کسی ایک نظریے کی تشہیر کی بلکہ اس نے نہایت دانش مندی اور خوبصورتی کے ساتھ ہر طبقے اور ہر نظریے کے لوگوں کی نمائندگی کی ہے۔ ترقی پسند ادیب ہوں یا غیر ترقی پسند، جدیدیت کے حامی ہوں یا مخالف، مابعد جدیدیت کے پرستار ہوں یا پھر ہر نظریے یا تحریک سے بے زار، ہمیشہ ہی ''آجکل'' نے سب کو اپنا پلیٹ فارم مہیا کرایا اور ان ہی ادیبوں کے ذریعے ترقی کی معراج طے کرتا رہا اور معاصر رسالوں میں اپنا ایک منفرد و ممتاز مقام بناتا رہا۔

رسالہ ''آجکل'' نے شاید ہی اردو ادب کی کوئی صنف ایسی ہو جس سے اجتناب برتا ہو بلکہ مختلف اصناف و موضوعات پر قلم کے جادوگروں اور شہسواروں سے سیر حاصل، مدلل اور تشفی بخش بحثیں کرا کر قارئین کے منتشر ذہنوں، بے قرار دلوں اور تشنگیِ سوالات کو قرار دلایا ہے۔ ''آجکل'' کی ایک بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ اس نے ہمیشہ نئے لکھنے والوں کو نہ صرف مواقع فراہم کیے بلکہ ان کے سنہرے مستقبل کی راہ ہموار کی۔ کیونکہ اس رسالے نے نئے لکھنے والے شعراء و ادبا کو قارئین سے متعارف کرایا اور دیکھتے ہی دیکھتے جوش ملیح آبادی، مرزا ثاقب لکھنوی، یگانہ چنگیزی، عبدالمجید سالک، بے خود لکھنوی، جگر مرادآبادی، سیماب اکبرآبادی، ساغر نظامی، اختر شیرانی، رضا علی وحشت، جمیل مانک پوری، امجد حیدرآبادی، صفی لکھنوی، نیاز فتح پوری، شور علیگ، زور اکبرآبادی، آرزو سہارنپوری، آرزو لکھنوی، آباد لکھنوی، آصف نیازی، آفاق دہلوی، آفاق حسین، اثر رام پوری، محمد علی خان، جعفر علی خان، احسان دانش، اختر عادل، اختر ہوشیار پوری، ادا بدایونی، ادیب سہارنپوری، ادیب مالیگانوی، اسد ملتانی، اشعر ملیح آبادی، احمد ندیم قاسمی وغیرہ جیسے ماہ و نجوم سے ادب آسمان پرنور ہو گیا۔ ان سب لکھنے والوں کی ابتدائی تخلیقات ''آجکل'' کی ہی زینت بنی اور ہر دن ان پُرنور ستاروں کی روشنی بڑھتی چلی گئی۔

اسی دور کے ایک اور شاعر، ساحر لدھیانوی کی شہرت کا باعث بھی یہی رسالہ ہے۔ اسی نے ساحر کو شہرت کے آسمان تک پہنچایا۔ ان کی ایک مشہور نظم ''تاج محل'' اس رسالے میں دوبار شائع ہو چکی ہے۔ اس رسالے نے کئی اور شعرا کو بھی آسمان کی بلندیوں پر پہنچایا جن کا نام اس سے

پہلے کہیں نہیں آتا تھا۔

''آجکل'' نے نہ صرف شعراء کی تخلیقات کو اپنا مرکز بنایا بلکہ اس نے افسانوی ادب کو بھی اپنے بیش قیمتی صفحات پر جگہ دی اور افسانوی تخلیقات بھی خوب شائع کیں۔ یہی سبب ہے کہ ''آجکل'' میں افسانوی ادب کا ایک بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ کیونکہ اس زمانے میں جتنے بھی معروف ومشہور فکشن نگار تھے، مثلاً سلطان حیدر جوش، راجندر سنگھ بیدی، علی عباس حسینی، قدرت اللہ شہاب، خواجہ احمد عباس، سلام بن رزاق، یوسف،، اقبال مجید، عصمت چغتائی، حیات اللہ انصاری وغیرہ کے افسانے ''آجکل'' میں شائع ہوتے رہے ہیں۔

جہاں ''آجکل'' میں بے شمار افسانے شائع ہوئے وہیں اس میں مختلف ادبی، سیاسی اور سماجی شخصیات پر خاکے اور ان کے انٹرویو بھی شائع کیے جس سے رسالے کا معیار بلند سے بلند تر ہوتا چلا گیا اسی کے ساتھ ساتھ رسالے میں شمس الرحمٰن فاروقی، انیس قدوائی، گوپال متل، فراق گورکھپوری اور عصمت چغتائی وغیرہ کی خودنوشت سوانح عمری بھی شائع ہوئی۔ اس رسالے نے ابتدا سے ہی قارئین کو پوری دنیا کے ادب سے روشناس کرایا۔ دوسرے ملکوں کے تجربات، زبان وادب سے لوگوں کو متعارف کروایا۔ ایسے موضوعات سے ہمارے ادب کا دامن بھی وسیع ہوا۔

''آجکل'' میں ادبی وسماجی جلسوں کی خبروں کے ساتھ ساتھ بہت سے سفر نامے بھی شائع کیے۔ ان میں اہم رپورٹیں، اردو مدیران کی کل ہند کانفرنس، اردو کتابوں کی قومی نمائش، اردو کے ترقی پسند ادیبوں کی کل ہند کانفرنس وغیرہ شامل ہیں۔

رسالہ'' آجکل'' کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا جس میں نہ صرف ادبی موضوعات قلم بند ہوتے رہے بلکہ سیاسی، سماجی اور مذہبی شخصیات پر مضامین کے ساتھ ہی فلمی دنیا کو بھی اچھا خاصا اسپیس ملا۔ جس نے اگر ڈراما، داستان وغیرہ پر عمدہ مضامین شائع کیے ہیں تو وہیں اردو شاعری کی تمام اقسام جدید شاعری، قدیم شاعری، اردو غزل، اردو نظم، مثنوی، مراثی، قصائد، لوک گیت اور قوالی وغیرہ پر بھی بہت سے اچھے اور معیاری مضامین شائع کیے۔

اگر مخصوص گوشوں یا نمبرات کی بات کی جائے تو اس میں بھی رسالہ'' آجکل'' پہلی صف میں نظر آتا ہے۔ جمہوریت نمبر، آزادی نمبرم اور جنگ آزادی نمبر کے علاوہ افسانہ نمبر، خطوط نمبر، ڈراما نمبر، شعروشاعری نمبر، صحافت نمبر، طنزومزاح نمبر، اردو نمبر، جدید ہندوستانی شاعری نمبر اور فلمی نمبر وغیرہ شامل ہیں اور یہ تمام نمبرات ایک دستاویزی حیثیت رکھتے ہیں۔ رسالہ'' آجکل'' کے ان تمام کارناموں کو دیکھنے کے بعد بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے کہ یہ رسالہ کس معیار کا ہے۔

رسالہ'' آجکل'' کو ایک ادبی رسالہ بنانے میں اس کے مدیران نے بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔ آغا محمد یعقوب'' آجکل'' کے سب سے پہلے مدیر ہیں۔ 1943ء میں انہیں اس عہدے پر

فائز کیا گیا تھا اور 1946ء تک وہ اس رسالے کی خدمات انجام دیتے رہے۔ ان کے بعد سید وقار عظیم اور جوش ملیح آبادی نے 1955ء تک اپنی خدمات انجام دیں۔ ان کی سبکدوشی سے اب تک آجکل کی ادارت یکے بعد دیگرے لوگوں کے ہاتھوں میں رہی جن میں عرش ملسیانی، مہدی عباس حسینی، راج نرائن راز، محبوب الرحمٰن فاروقی، عابد کرہانی، خورشید اکرام اور ڈاکٹر ابرار رحمانی وغیرہ نے آجکل کے ادبی سفر کو بہتر سے بہتر بنانے کی سعی کی اور کامیاب بھی ہوئے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر جمیل اختر رقم طراز ہیں:

> ''انہوں نے ہندوستان کے تمام اچھے ادیبوں وشاعروں کو لکھنے پر اامادہ کیا۔ بہت سے نئے سلسلے شروع کیے جس سے رسالے کی ادبی حیثیت اور مستحکم ہوئی۔ اس رسالے میں ''داستان نجات'' کے عنوان سے اینتھل وانس کی مشہور کتاب ''اسکیپ'' کا آزاد ترجمہ پیش کیا گیا۔ نقد ونظر کے عنوان سے نئی کتاں پر تبصرے ہونے لگے۔ ضمیمہ آجکل کے تحت فارسی زبان سکھانے کا سلسلہ بھی شروع ہوا۔ پشتو رسم الخط، جدید شاعری، ترقی پسند ادب، آزاد نظم، اردو زبان کے مسائل اور ایسے ہی لاتعداد موضوعات پر مشہور اہل قلم حضرات کو مقالے لکھنے کی دعوت دی گئی۔ ''نقدالانتقاد'' کے عنوان کے تحت ادباء وشعراء کی تخلیقات کو نقد کے معیار پر جانچنے کا کام بھی کیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی آجکل میں مشہور ادبی و سیاسی شخصیات پر مضامین بھی شائع ہوتے تھے۔ گویا رسم الخط اردو زبان کے بنیادی مسائل سے لے کر ادب وفلسفہ تک مختلف موضوعات پر بے شمار مضامین شائع ہوئے جس نے آجکل کی ادبی اہمیت میں کافی اضافہ کیا۔''

[اشاریہ آجکل، ڈاکٹر جمیل اختر، ص82، 2002ء انٹرنیشنل اردو فاؤنڈیشن]

رسالہ ''آجکل'' نے 1943ء سے لے کر اب تک اردو ادب میں جو نمایاں کارنامہ انجام دیا ہے وہ اردو رسائل کے لیے باعث فخر ہے۔ کیونکہ اس رسالے کے شروعاتی دور سے ہی اس میں بہترین شخصیات کے مقالے، مضامین، وغیرہ وہ تمام چیزیں جو ادب کے شائقین، قارئین اور طالب علموں کے لیے معاون ثابت ہوئے ہیں۔ رسالہ ''آجکل'' بین الاقوامی حیثیت رکھتا ہے اور یہ ایک سرکاری رسالہ ہے۔ اس کو ہمیشہ ہی عزت کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے ان تمام باتوں کے مد نظر یہی کہا جاسکتا ہے کہ جس طرح رسالہ ''آجکل'' کا شاندار ماضی، پُر وقار حال ہے ایسے ہی اس کے تابناک مستقبل کی بھی امید کی جاسکتی ہے۔

☆☆☆

راحت علی صدیقی قاسمی

عابد سہیل کی خاکہ نگاری

عابد سہیل اردو صحافت اور اردو افسانہ کی روایت کا معتبر و مستند نام ہے، انہوں نے اپنے افسانوں اور صحافتی خدمات کی بنیاد پر اردو ادب کی تاریخ میں نمایاں مقام حاصل کیا ہے، انہوں نے اپنے منتشر اوراق زندگی کو بھی تفصیلی طور پر سپرد تحریر کیا ہے، اور ''جو یاد رہا'' کے نام سے خودنوشت سوانح تصنیف کی، جس کا مطالعہ ان کی زندگی کے نشیب و فراز مصائب و مسائل کا اندازہ لگانے کے لئے کافی ہے، عابد سہیل کے مختلف حوالے ہیں، جن پر گفتگو کی جاسکتی ہے، اور کی گئی ہے، ان کی شخصیت ان کا فن سیاسی و سماجی کوششیں مزاج و مزاق اور تحریروں کی خوبیاں زیر بحث لائی جاسکتی ہیں، عابد سہیل ہمہ جہت فن کار کا نام ہے، انہوں نے مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے، جن میں افسانہ، خودنوشت سوانح، فکشن تنقید، ترجمہ نگاری اور خاکہ نگاری شامل ہیں، اس مضمون میں ان کی خاکہ نگاری پر گفتگو مقصود ہے۔ عابد سہیل کے خاکوں پر مشتمل دو مجموعہ شائع ہو چکے ہیں، جن میں سے پہلا مجموعے کھلی کتاب شائع ہوا، اور دوسرا مجموعہ پورے آدھے ادھورے منظرِ عام پر آیا، ان دونوں مجموعوں کا مطالعہ عابد سہیل کی خاکہ نگاری کی خوبیاں خصائص اور انفرادیت سے واقف کراتا ہے، عابد سہیل کے ذہن میں یادوں کی ایک خوبصورت اور دلکش کہکشاں ہیں، جسے وہ نقوش کی شکل میں سپرد قرطاس کردیتے ہیں، یہی کہکشاں ان کے خاکوں کا حسن ہے، جس میں واقعات کو تفصیلی طور پر پیش کیا گیا ہے اور شخصیات کے اوصاف و کمالات کا بخوبی تذکرہ کیا گیا ہے، واقعات کی روشنی میں شخصیت کے مزاج و مزاق اور عادت و اطوار سے بخوبی واقف کرایا گیا ہے، ملاقاتوں کی روداد دلکش پیرائے میں بیان کی گئی ہے، تعلقات کی کیفیت واضح کی گئی ہے، شخصی اور فنی کمالات کی ترجمانی کی گئی ہے، اصول و ضوابط اور زندگی کے ڈھب سے واقف کرایا گیا ہے، خوبیاں پیش کرنے میں بخل سے کام نہیں لیا گیا ہے، البتہ خامیاں پیش کرنے

میں ضرور احتیاط برتی گئی ہے، جس کی جانب وہ ''کھلی کتاب'' کے پیش لفظ میں ان الفاظ کے ذریعے اشارہ کر چکے ہیں:

''خاکہ میں کسی شخصیت کے بارے میں ظاہر کی جانے والی یا منعکس ہونے والی رائے کو عام رائے سے سراسر متغائر ہونے سے بچانے کے ساتھ معروضیت کا دامن تھامے رہنا بھی ایک مشکل مرحلہ ہوتا ہے، اور یہ بھی کہ جو ہیں، سے تھے، ہو چکے ہیں، ان کی زندگی کے کمزور پہلوؤں پر سے پردہ اٹھانا کچھ ایسا کارِنیک نہیں، اخلاقی قدریں بھی جگہ جگہ دامن پکڑتی ہیں۔''
(کھلی کتاب صفحہ 9)

خامیاں بیان کرنا ان کا محبوب مشغلہ نہیں ہے، البتہ شخصیات کے رنگ مختلف ہیں، کہیں ظرافت غالب ہے، کہیں محبت نے نمایاں مقام حاصل کیا ہے، کہیں شرافت ونجابت بلند اخلاقی و نفاست نے شخصیت کے وقار میں اضافہ کیا ہے، کوئی محفل کو زعفران زار بناتے ہیں، کوئی تنہائی کے رفیق مایوس اور غم زدہ کوئی تندمزاج اور غصیل، شخصیات کے مختلف رنگ خاکوں میں بڑے دلکش اور جاذب قلب پیرائے میں پیش کئے گئے ہیں، جو خاکہ نگار کی کامیابی پر دلالت کرتے ہیں۔

کھلی کتاب انیس میں شخصیات کے خاکے شامل ہیں، جن میں اردو اخبار قومی آواز اور انگریزی اخبار نیشنل ہیرالڈ سے متعلق شخصیات پر خاکے لکھے گئے ہیں، ادبی دوستوں اور متعلقین و احباب کے خاکے بھی شامل کتاب کئے گئے ہیں، جن کی زندگی عابد سہیل نے قریب سے دیکھی، وہ ان کے معاملات و معاشرت طرز زندگی، کام کرنے کا طریقہ افکار ونظریات مزاج ومزاق، کردار عادت واطوار سے بخوبی واقف تھے، ان کے ساتھ کام کیا، ان کی زندگی کا نظم وضبط اور فنی کمالات کو دیکھا برتا اور استفادہ کیا، ان تمام چیزوں کو انہوں نے بڑے دلکش انداز میں سپرد قرطاس کر دیا ہے، ان شخصیات میں ایم چلپت راؤ، حیات اللہ انصاری، عشرت علی صدیقی کے خاکے اہمیت کے حامل ہیں، جن کا تعلق صحافت سے ہے، ایم چلپت راؤ کا خاکہ اہم اور تفصیلی ہے، وہ نیشنل ہیرالڈ کے ایڈیٹر تھے، سابق وزیر اعظم جواہر لال نہرو بھی ان کی صلاحیتوں کے قدردان اور ان کی شخصیت سے متاثر تھے، ان کی صحافتی صلاحیتوں کا خاص طور سے تذکرہ کیا ہے، انگریزی زبان پر ان کی گرفت اور اصلاح کے طریقے مثالوں کے ساتھ پیش کئے ہیں، کام کرنے اور چھوٹوں سے کام لینے کی صلاحیت پر بھی روشن ڈالی گئی ہے، جس سے ان کی شخصیت کی وجاہت ظاہر ہوتی ہے، ان کی شخصیت کا رعب بھی ذکر کیا گیا ہے، سیاسی نظریات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے، حق گوئی اور بیباکی

کو بھی واقعات کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے، حیات اللہ انصاری، اور عشرت علی صدیقی قومی آواز سے سے منسلک تھے ان کے خاکے بھی اہم ہیں، جن کا مطالعہ ان شخصیات کے کمالات نظم ونسق اور صحافتی خدمات سے واقف کراتا ہے، ان خاکوں میں لکھنؤ کی صحافتی صورت حال بھی واضح ہوتی ہے، اور صحافت کا معیار و وقار بھی عیاں ہوتا ہے، اخباروں کے دفاتر اور ملازمین کی صورت حال اور مالی تنگی و تنگ دستی کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے، اصول واقدار کی عظمت و بلندی کی مثالیں بھی پیش کی گئی ہیں، ایم چلپت راؤ نیشنل ہیرالڈ کے ایڈیٹر ہیں، اخبار کانگریس کا گردانا جاتا ہے، اور کانگریس کی مخالفت میں اداریے بھی لکھے جاتے ہیں، مخالفین کی خبریں مرکزی مقام پاتی ہیں، حتی کہ ایک موقع پر کانگریس کا تیس ہزار روپے کا اشتہار بھی شائع نہیں کیا جاتا ہے، صحافتی اقدار کی بلندی اور کیا ہوسکتی ہے، جس کا مشاہدہ ان خاکوں میں بخوبی ہوتا ہے، وہ لوگ اپنے اصولوں کو ہر شی پر مقدم اور عزیز رکھتے تھے، خاکے لکھنوی تہذیب ادبی وصحافتی معیار اور طرز زندگی کے عکاس ہیں، واقعات اور ان کی پیشکش خاکوں کی انفرادیت اور وقعت کا سبب ہے، البتہ کچھ واقعات مکرر آ گئے ہیں، جو شخصیت کی خصوصیات کو پیش کرنے کے لئے ضروری تھے، دوبارہ واقعہ کو پیش کرتے ہوئے، کچھ معلومات میں اضافہ ضرور کیا گیا ہے، واقعات اور گفتگو اس طرح پیش کی گئی ہے کہ ان کو پڑھتے ہوئے افسانے کا گمان ہوتا ہے، اس افسانوی رنگ نے خاکوں کے تاثر کو مزید گہرا اور پراثر کر دیا اور شخصیت کے مختلف ومتضاد رنگ مزید نکھر کر سامنے آ گئے ہیں۔

دوستوں کے خاکوں میں بے تکلفی اور مزاح کا پہلو بھی نظر آتا ہے، زمانہ طالب علمی کی شرارتیں بھی ذکر کی گئی ہیں، اس سلسلے میں احمد جمال پاشا کا خاکہ اہمیت کا حامل ہے، احمد جمال پاشا کی مزاح نگاری کیسے شروع ہوئی اس پر بھی گفتگو کی گئی ہے، ان کے ذاتی حسن و جمال مزاج اور ملنساری کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے، سیاسی نظریات پر روشنی ڈالی گئی ہے، عارف نقوی عابد سہیل اور احمد جمال پاشا کی بے تکلفی اور زمانہ طالب علمی کی مستیوں کا تزکرہ کیا گیا ہے، احمد جمال پاشا کا لکھنؤ چھوڑنا اور دوستوں سے جدائی کا غم بھی آشکار کیا گیا ہے۔

متعلقین ومحبین میں منظر سلیم کا خاکہ دلکش ہے، منظر سلیم کے شخصی اور فنی کمالات بیان کئے گئے ہیں، غربت وافلاس تنگی و تنگ دستی کے باوجود انہوں نے ادبی دنیا میں وقار واعتبار حاصل کیا، نام ونمود شہرت و بلندی کی پرواہ نہیں کی، اپنے فن کو بلند کرنا ہی ان کا مقصد اولیں تھا، عابد سہیل نے ان کے فن اور شخصیت کا خاکہ دلکش اور وقیع انداز میں پیش کیا ہے، آل احمد سرور، ڈاکٹر

عبدالعلیم کے خاکے بھی دلکش اور جاذب نظر ہیں۔

اولڈ انڈیا کافی ہاؤس کا خاکہ انفرادیت کا حامل ہے، جو کسی شخصیت نہیں بلکہ ایک مقام کے حسن دلکشی تہذیب اور جاذبیت کو آشکار کرتا ہے، اس کے ماحول کا عکاس ہے، اس کی علمی و پر کیف فضا کو پیش کرتا ہے، وہاں بیٹھنے والی شخصیات اوران کے کارناموں سے واقف کراتا ہے، جو تحریکیں ونظریات اس کی گود میں پروان چڑھیں، ان کی روداد بیان کرتا ہے، اس خاکے میں لکھنوی تہذیب کے دلکش نقوش بخوبی نظر آتے ہیں، ادباء کے آپسی تعلقات کی کیفیت بھی واضح ہوتی ہے، اس ایک خاکے میں کئی شخصیات کا تزکرہ کیا گیا ہے، مجاز، سلام، سجیلا ، سدا سرن مسرا کا تذکرہ اس خاکے میں شامل ہیں۔

عابد سہیل کا دوسرا مجموعہ پورے آدھے ادھورے ہے، جس میں پچیس خاکے شامل ہیں، جن میں مشہور ومعروف شعراء وادباء اور اساتذہ، متعلقین اور احباب کے خاکے شامل ہیں، کھلی کتاب کے خاکوں کے بنسبت زبان وبیان کی سادگی و برجستگی پورے آدھے ادھورے میں زیادہ نظر آتی ہے، پورے آدھے ادھورے کھلی کتاب سے گیارہ سال بعد شائع ہوا اس دوران عابد سہیل کی خاکہ نگاری ارتقائی منازل طے کرتی رہی، ان کے اسلوب کی پختگی شخصیات سے متعلق معلومات کو پیش کرنے کا طریقہ اس دعوے کی بین دلیل ہیں، وہ شخصیت اور اس کے کمالات ،خدمات اور علمی فتوحات سے واقف ہونے کا شوق قاری کے قلب پیدا کر دیتے ہیں، خاکے کے اختتام پر شخصیت سے متعلق گہرا تاثر قاری کے ذہن وفکر پر قائم ہوتا ہے، اور عابد سہیل کی کامیابی و کمال یہ ہے کہ وہ تاثر مثبت ہوتا ہے۔

پورے آدھے ادھورے میں شامل اساتذہ کے خاکوں میں احسن فاروقی اودھ کشور سرن رام مورتی لمبا سیوا رام شرما، نندکشور دیوراج کے خاکے شامل ہیں، جن میں اساتذہ کے طرز تدریس، طلبہ سے تعلقات طلبہ کی ہمدردی شفقت ومحبت کے واقعات بیان کئے گئے ہیں، ان کی علمی فتوحات اور صلاحیتوں کا نقشہ کھینچا گیا ہے، ان کے مزاج اور طرز حیات کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے، عابد سہیل نے شخصیت کو جیسا پایا ویسا ہی سپرد قرطاس کر دیا ہے، درس کی خصوصیات بیان کیں ،خامیاں ذکر کرنے سے بھی گریز نہیں کیا اور خوبیاں بیان کرنے میں بھی کوتاہی نہیں برتی، مثلاً احسن فاروقی کے خاکے میں ان کی شفقت کا تزکرہ کیا گیا ہے، وہ طلبہ پر کس درجہ مہربان تھے، ان کی کامیابی کے لئے محنت کرتے تھے، امتحان کے زمانے میں اپنے گھر کو مہمان خانہ کی شکل میں

تبدیل کردیتے تھے، طلبہ کی تیاریوں میں کوئی کمی نہیں آنے دیتے تھے، اوران کی ضیافت کرتے، احسن فاروقی کی علمی صلاحیتوں اور طلبہ سے ان کے حددرجہ لگاؤ اور شفقت کو بخوبی بیان کیا گیا ہے، رام مورتی لمبا کے خاکے میں واضح کیا گیا ہے کہ ان کا طرز تدریس اچھا نہیں تھا، کتاب پڑھ کر سنایا کرتے تھے، اساتذہ کے خاکوں میں خاص طور سے اساتذہ اور طلبہ کے تعلقات کو واقعات کی روشنی میں بیان کیا گیا ہے، جس کی روشنی میں اساتذہ اور طلبہ کے تعلق کی کیفیت بخوبی واضح ہوتی ہے، اساتذہ کا علمی معیار اوران کی شخصیت کے مختلف پہلو بھی خاکوں میں ابھارے گئے ہیں۔

متعلقین واحباب کے خاکوں میں سب سے اہم خاکہ سریندر کمار مہرا کا خاکہ ہے، جن سے عابد سہیل ذاتی طور پر واقف نہیں تھے، عابد سہیل نے سریندر کمار مہرا کو ان کی تحریروں اور خطوط کے ذریعے جانا، سریندر کمار مہرا ماہنامہ کتاب کے لئے اپنی تخلیقات بھیجتے اور خطوط کے ذریعے اپنی ذہنی کیفیت سے واقف کراتے، زندگی سے مایوس اور موت کے قریب کھڑے ہوئے شخص کی نفسیاتی کیفیت اس خاکے میں بخوبی محسوس کی جاسکتی ہیں، خاکہ کو خطوط کے ذریعے ترتیب دیا گیا ہے، عابد سہیل اور سریندر کمار مہرا کے درمیان خط وکتابت کا طویل سلسلہ رہا، خطوط میں عابد سہیل ان کی حوصلہ افزائی کرتے رہے، انہیں حیات کی کشمکش سے مقابلہ کرنے کی تلقین کرتے رہے، ان کی کوشش کامیاب ہوئی، اور سریندر کمار مہرا جینے کے لئے تیار ہوتے ہوئے محسوس ہونے لگے، پھر ماہنامہ کتاب اپنے اختتام کو پہنچا، عابد سہیل اور سریندر مہرا کی خط وکتابت کا سلسلہ منقطع ہوا، اور ایک عرصہ بعد سریندر کمار مہرا کے مرنے کی خبر اخبارات کے ذریعے موصول ہوئی، خاکہ بہت اہم اور متاثر کن ہے، جس میں جذبات واحساسات اور قلبی واردات کو دلکش پیرائے میں بیان کیا گیا ہے، زندگی کی تلخیوں کا نقشہ کھینچا گیا ہے، یہ خاکہ اس مجموعہ کے خاکوں میں اہم ترین ہے، جس میں شکستہ اور مایوس سریندر کمار مہرا کو عابد سہیل ہمت وحوصلہ عطا کرنے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں، خاکہ کا مطالعہ عابد سہیل کی ہمت نفسیاتی مسائل کو حل کرنے کی صلاحیت سے بخوبی واقف کراتا ہے، ان کی انسانیت نوازی وہمدردی کے پہلو کو بھی اجاگر کرتا ہے، ساتھ ہی قلم سے وابستگی انسان کو مسائل سے مقابلہ کرنے کی ہمت عطا کرتی ہے، اس حقیقت کو بھی باخبر کرتا ہے، خاکہ کے اختتامی جملے آنکھوں میں نمی چھوڑ جاتے ہیں۔

صباح الدین عمر کا خاکہ بھی اہم اور تفصیلی ہے، جس میں ان کی شخصیت کے مختلف رنگوں کو واقعات کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے، ان کی تخلیقی صلاحیتوں پر روشنی ڈالی گئی ہے، وہ کمال کی ہجو

کہتے تھے، ہجو کی مثالیں پیش کی گئی ہیں، جس کی روشنی میں ان کی تخلیقی صلاحیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

ماہنامہ کتاب کا خاکہ اس مجموعہ کا اہم ترین خاکہ ہے، جس میں رسالہ کو مستقل شائع کرنے میں پیش آمدہ مشکلات کا تذکرہ کیا گیا ہے، ایڈیٹر کی محنت پر روشنی ڈالی گئی ہے، تخلیقات کے انتخاب کی دشواریاں اور مالی حالت پر روشنی ڈالی گئی ہے، مختلف ادباء جو اس رسالہ میں اپنی تخلیقات بھیجتے تھے، ان کے حوالے سے مدیر کے تاثرات مذکور ہیں، رسالہ کن مراحل سے دوچار ہوتا ہے، اشتہارات کے لئے کیا کیا پریشانیاں پیش آتی ہیں، ان تمام کا بخوبی تذکرہ کیا گیا ہے، ماہنامہ کتاب کا خاکہ بھی اہم ترین ہے، رسائل و جرائد کی اشاعت اور ادارت سے شغف رکھنے والے اس خاکہ کے مطالعہ میں بہت سے حقائق کا مشاہدہ کریں گے۔

خاکوں کا مطالعہ کرتے ہوئے مختلف جذبات واحساسات قلب پر طاری ہوتے ہیں، کبھی لبوں پر مسکراہٹ ہوتی ہے، کبھی تدبر وتفکر ذہن کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے، اور کبھی قلب غم وتکلیف میں مبتلا ہوتا ہے، مختلف احساسات کی ترجمانی خاکوں میں بخوبی کی گئی ہے، مختلف مراحل میں ہم خود کو خاکہ نگار کے ساتھ محسوس کرتے ہیں، جو عابد سہیل کے خاکوں کی نمایاں خصوصیت ہے، خاکوں میں پیش کی گئی شخصیات کے فن پر بھی اجمالی گفتگو گئی ہے، شاعر ہیں تو چند جملوں میں ان کے شعری محاسن ذکر کر دیئے گئے، مزاح نگار ہیں، تو ان کی مزاح نگاری کو زیر بحث لائے ہیں، سیاسی رہنما ہیں، تو ان کی سماجی خدمات کو بیان کیا گیا ہے، اردو سے محبت اور اس کی ترقی کے لئے کی گئی جد و جہد کا تذکرہ کیا گیا ہے، تنقید نگار ہیں، تو ان کے فن نقد پر چند جملے تحریر کئے گئے، جس سے اِن شخصیات کے ادبی مقام اور فن کی جانب متوجہ ہونے کا خیال قلب میں مچلنے لگتا ہے، اور ان کی ادبی صلاحیتوں کا سراغ لگانے کی فکر ذہن پر سوار ہوجاتی ہے، احمد جمال پاشا وجاہت علی سندیلوی عابد پشاوری کے خاکوں میں اس طرح کی مثالیں بخوبی پائی جاتی ہیں۔

شخصیات کا مرقع اور حلیہ بڑے خوبصورت اور دلکش انداز میں کھینچتے ہیں، چہرا ناک آنکھ ڈاڑھی چلنے اور بولنے کا انداز ان تمام پہلوؤں کو خاکے میں بخوبی پیش کرتے ہیں، حالانکہ حلیہ پیش کرتے ہوئے اختصار سے کام لیتے ہیں، مختصر جملے استعمال کرتے ہیں، ضرورت کے بقدر تشبیہات وتمثیلات بھی پیش کرتے ہیں، جو عبارت کو بوجھل نہیں کرتی ہیں، بلکہ اس کے حسن میں اضافے کا سبب ہوتی ہیں اور شخصیت کی ایک تصویر ہماری نگاہوں میں ابھر آتی ہے، جس سے ہم اس کے ذاتی حسن و جاہت سے باخبر ہوجاتے ہیں، مثال کے طور پر چند جملے ملاحظہ کیجئے اور اس

حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کیجیے، عشرت علی صدیقی کے حوالے سے رقم طراز ہیں:

''گوراچٹا سا رنگ بوٹا سا قد کھدر کا کرتا پائجامہ اس پر کھدر ہی کی شیروانی اور سر پر سفید گاندھی ٹوپی بلکل ویسے ہی ہیں جیسے میں نے انہیں پچاس سال قبل دیکھا تھا، جب میں نے انہیں پہلے پہل دیکھا تھا۔''

(کھلی کتاب، صفحہ:105)

ڈاکٹر عبدالعلیم کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''کم وبیش پونے چھ فٹ کا قد کھلتا ہوا گندمی رنگ، دہرا بدن اور بڑی بڑی روشن آنکھیں، خوش پوش خوش گفتار اور حاضر جوابی اس پر مستزاد۔ جہاں بھی بیٹھیں شمع محفل بن جاتے ہیں۔''

خاکوں میں اس طرح کی اور بھی مثالیں موجود ہیں، جن سے عابد سہیل کی حلیہ بیان کرنے کی صلاحیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

خاکے زبان وبیان کے اعتبار سے بھی وقعت کے حامل ہیں، عبارت کی سادگی ان کا حسن ہے، ایسا لگتا ہے یادوں کو بے تکلف سپرد قرطاس کر دیا گیا ہے، جملے طویل بھی ہیں، اور مختصر بھی الفاظ آسان ہیں، مکالمے عام طور پر مختصر اور دلکش ہیں، واقعات افسانوی رنگ میں پیش کئے گئے ہیں، خاکہ نگار خود بھی ان میں بطور کردار شامل ہو گئے ہیں، محاورے اور کہاوتیں بھی بقدر ضرورت استعمال کی گئی ہیں، مصرعے اور اشعار کے برمحل استعمال نے عبارت کے حسن اور تاثر میں مزید اضافہ کر دیا ہے، متعلقہ شخصیات کے خطوط بھی خاکوں میں پیش کئے گئے ہیں، جس سے یادوں کی کہکشاں مزید دلکش ہوگئی ہے، عابد سہیل نے خاکہ نگاری کے میدان میں دو مجموعوں کے ساتھ اپنی صلاحیت اور فن کاری لوہا منوالیا ہے، خاکہ نگاری کی روایت ان کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہوگی، پورے آدھے ادھورے کے خاکے کھلی کتاب سے زیادہ مؤثر بے تکلف اور جاذب عبارت میں ہیں، جس سے واضح طور محسوس ہوتا ہے کہ عابد سہیل کا فن خاکہ نگاری ارتقائی مراحل طے کر رہا تھا، اور ان کا ہر دوسرا خاکہ پہلے کے مقابلہ میں مزید خوبیوں کا حامل ہے۔

☆☆☆

فرح ناز

ریسرچ اسکالر

مجتبیٰ حسین کی طنز ومزاح سے پر کچھ تحریریں

طنز ادب کی ایک ایسی صنف ہے جو انسانی سوسائٹی میں موجود خرابیوں ،خامیوں اور ناانصافیوں کے سبب پیدا ہوئی تلخی ،نفرت ،حقارت سے جنم لیتا ہے اور مزاح پوری ہمدردی کے ساتھ ان عیوب ونقائص کو شائستہ وشگوفتہ لوازمات کے ساتھ قابل قبول بنانے کا فن ہے۔حقیقتاً طنز ومزاح نگاری نہایت ہی مشکل اور نازک فن کا نام ہے۔طنز تنقید،احتجاج ،تبصرہ اور مزاح مبالغہ ،چٹکی اور پھل جھڑی جیسی خصوصیات کا حامل ہوتے ہوئے بھی ہر قسم کے عامیانہ پن، سطحی پن اور پھکڑ پن سے پاک ہوتا ہے۔دراصل طنزیہ ومزاحیہ ادب بھی سنجیدہ ادب کے مانند ہی تمام فنکارانہ خوبیوں کا حامل ہوتا ہے جس میں فن کار کا خلوص اس کی تخیل پرواز اور اس کے مزاج کی جدت پسندی کا عکس نمایاں ہوتا ہے۔ایک طنز ومزاح نگار کا شعور اتنا بالغ اور پختہ ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف گرردوپیش کے بے ہنگم باتوں کو موضوع فن بناتا اور مسکراتا ہے بلکہ اپنے اپر بھی دل کھول کر ہنسنے اور قہقہہ لگانے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے اور ایک دردمند اور مخلص طنز ومزاح نگار کا یہی ردعمل اس کو معیاری درجہ کا فن کار بناتا ہے۔

جناب مجتبیٰ حسین طنز ومزاح کے اس فن میں ایک ایسی زعفران زار شخصیت کے مالک ہیں جن کے نزدیک فن طنز ومزاح نگاری ایک مخصوص کیفیت کی پیداوار ہے جہاں پہنچ کر انسان خود اپنی ذات سے بھی بے نیاز ہو جاتا ہے اور ایسا بے خبر شخص خود غرض ہو ہی نہیں سکتا۔وہ لکھتے ہیں:

> ’’بعض لوگ مزاح کی کیفیت کو بہت معمولی کیفیت سمجھتے ہیں حالانکہ سچا مزاح وہی ہے جس کی حدیں سچے غم کے بعد شروع ہوتی ہیں۔زندگی کی ساری تلخیوں اور اس کی تیزابیت کو اپنے اندر جذب کر لینے کے بعد جو آدمی قہقہہ کی جانب جست لگاتا ہے وہی سچا اور باشعور قہقہہ لگا سکتا ہے۔

ہنسنے کے لیے جس قدر گہرے شعور اور ادراک کی ضرورت ہوتی ہے اتنے
گہرے شعور کی ضرورت شاید رونے کے لیے نہیں ہوتی۔''

(مجتبیٰ حسین بحیثیت طنزومزاح نگار، افسر کاظمی، موڈرن پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی، ۲۰۰۴، ص ۸۹)

یہی وجہ ہے کے مجتبیٰ حسین نے اپنے اندیشے و تر ددا ور دکھ درد کو ظرافت کا جو لبادہ پہنایا ہے وہ تلخ تجربوں اور محرومیوں کے بیچ بقائے حیات کا ایک وسیلہ معلوم ہوتا ہے۔

مجتبیٰ حسین نے اپنی طنزومزاح نگاری کا آغاز ۱۹۶۲ء میں حیدرآباد کے روزنامے ''سیاست'' میں ''میرا کالم'' نامی مزاحیہ کالم سے کیا جو اپنے ادبی حسن اور ادبی معیار کے سبب قارئین کے درمیان بہت مقبول ہوا۔ ۱۹۶۴ء میں انہوں نے اپنا پہلا مضمون ''ہم طرف دار ہیں غالب کے سخن فہم نہیں'' قلم بند کیا۔ جس میں ان کے فن کی بلندی اور قلم کی شوخی کے اعلا نمونے موجود ہیں ۔مثلاً

''ایک بار کا ذکر ہے کہ وہ اپنے گھر کے صحن میں بیٹھے تھے اور مالک مکان کی زیادتیوں کا دُکھڑا رو رہے تھے کہ یکبارگی انہوں نے مکان کے در و دیوار کی جانب نظر دوڑائی۔ ایک آہ سرد کھینچی اور نہایت ہی درد بھرے لہجے میں غالبؔ کا شعر یوں پڑھا ؎

اُگ رہا ہے در و دیوار پہ مرزا غالبؔ
ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

اس پر ہم نے کہا قبلہ! اب تو آپ کی جرأت اتنی بڑھ گئی کہ در و دیوار پر بھی مرزا غالبؔ کو اگانے لگے ہیں۔ خدا کے لئے شعر میں مرزا غالبؔ کی جگہ سبزہ غالب کہئے۔ بولے!'' آپ مجھے بہکانے کی کوشش نہ کیجئے۔ میں خود جانتا ہوں کہ غالب کا پورا نام سبزہ غالب نہیں مرزا غالب تھا۔''

(مجتبیٰ حسین، تکلف برطرف، نیشنل بک ڈپو، حیدرآباد، ۱۹۶۶، ص ۵۶)

ان کے فن کی حیرت انگیز خوبی یہ ہے کہ وہ ہر موضوع اور موضوع کے ہر پہلو سے مزاح کے دلکش شگوفے کھلانے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور ایسی شائستہ تحریریں تخلیق کرتے ہیں کہ جن میں ان کے تجربات اور مشاہدات کا تنوع بھی ہے اور ظرافت کی پرواز میں وسعت بھی۔ انہوں نے کینوس کو وسیع و عریض کرنے کے لئے زندگی کو نہ صرف بہت قریب سے دیکھا ہے بلکہ ایک عام

آدمی کی طرح برتا بھی ہے۔جس پر وہ کبھی دل کھول کر ہنستے ہیں تو کبھی سنجیدگی اور متانت سے طنز کے تیر چلاتے ہیں۔ان کے طنز ومزاح میں وہ قوت اور جادوئی صلاحیت ملتی ہے کہ قارئین متاثر ہوئے بنا نہیں رہتا۔ان کی تحریروں میں ہمیں بھانت بھانت کے تجربات کا چٹخارہ ملتا ہے:

''بھائی صاحب مجھے اندیشہ ہے کہ میں چشمہ لگائے بغیر سورج کی طرف دیکھوں تو کہیں میری آنکھوں میں بینائی نہ آجائے میرا ذریعہ معاش یہی اندھاپن ہے اگر یہ چلا گیا تو بھوکا مرجاؤں گا۔میں دنیا کو اپنی آنکھ سے نہیں پیٹ کی آنکھوں سے دیکھتا ہوں۔''

واقعیت آمیز تلخی،تیزی اور سچائی سے پُر ان کے فن کے یہ نمونے بھی دیکھئے:

(بالآخر،مجتبیٰ حسین،حسامی بکڈپو،حیدرآباد،ص۳۳،۱۹۸۲ء)

''دوستوں!ٹفن باکس اس کے منہ سے چھینو یہ میری عزت کا سوال ہے۔اگر کتے نے اس ٹفن باکس کو کھول لیا تو میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گا۔آج تک دفتر میں کسی کو یہ پتہ نہیں کہ میں سالن کے بغیر ہی ایک چپاتی ٹفن باکس میں ڈال کر لاتا ہوں پھر یہ اکلوتی چپاتی بھی اس قابل نہیں کہ اسے ڈائریکٹر صاحب کا کتا کھا سکے۔''

ایک دوسری جگہ مجتبیٰ حسین حقیقت پر مبنی تلخاہٹ کو واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

(بالآخر،مجتبیٰ حسین،حسامی بکڈپو،حیدرآباد،ص۴۹۔۴۸،۱۹۸۲ء)

ایک بار کسی نے رکشہ والے سے کرایہ پوچھا تو رکشہ والا نے آٹھ آنہ بتا دیا۔وہ صاحب کہنے لگے بس کا کرایہ تو صرف دس پیسے ہوتا ہے،اس پر رکشہ والا جواب دیتا ہے:

''جی!دس پیسے ہوتا ہے مگر آپ نے غور نہیں فرمایا کہ بس پٹرول سے چلتی ہے،رکشہ خون سے چلتا ہے،خون سے۔''

(مجتبیٰ حسین،قطع کلام،نیشنل بک ڈپو،حیدرآباد،ص،۳۸،۱۹۶۹ء)

مندرجہ بالا اقتباسات نہ صرف مجتبیٰ حسین کے مشاہدات وتجربات کی عمدہ مثالیں ہیں بلکہ یہ ایک حساس فنکار کے سینے میں موجود کرب واضطراب کو بھی بہترین طور پر پیش کرتے ہیں۔شخصی اور معاشرتی زندگی سے وابستہ ان کا طنز وظرافت انسانی دوستی کے جذبے کی ایسی پرخلوص پیداوار ہے جو عوامی زندگی کی نامکمل ضرورتوں اور سماجی خامیوں سے وجود میں آئی ہے۔سماج میں پنپ رہے چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے عیبوں ومسائل کو وہ نہ صرف ایک ماہر فن کار

کی طرح موضوع فن مانتے ہیں بلکہ ایک اعلیٰ ظرافت نگار کی مانند بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ بیان بھی کرتے ہیں:

''جس گھر می مہمان زیادہ آتے ہیں ،اس گھر میں کبھی کوئی چور نہیں آتا کیوں کہ چور کو معلوم رہتا ہے کہ جس گھر میں مہمان آتے ہوں، وہاں چوروں کے لئے باقی ہی کیا رہ جاتا ہے۔''

وہ دوسری جگہ لکھتے ہیں:

(مجتبیٰ حسین ،قصہ مختصر،حسامی بک ڈپو،حیدرآباد،ص،۴۷،۱۹۷۲ء)

''میں ایک ناظر سے واقف ہوں جو صرف موسم برسات میں بڑی پابندی سے لائبریری آتے ہیں۔ میں نے پورے ادب واحترام سے پوچھا! اجی حضرت یہ کیا بات ہے کہ آپ صرف برسات میں مطالعہ کی طرف راغب ہوتے ہیں۔اس پر وہ یخ بستہ آہ کھینچتے ہوئے بولے'' بھائی بات دراصل یہ ہے کہ اس موسم میں میرے مکان کی چھت بہت ٹپکتی ہے۔لائبریری کی چھت نہیں ٹپکتی ،اس لئے برسات میں مطالعے کی طرف راغب ہوجاتا ہوں۔''

(مجتبیٰ حسین ،تکلف برطرف،حسامی بک ڈپو،حیدرآباد،ص ۹۵،۱۹۷۸)

ہمارے معاشرے میں پنپ رہی برائیوں اور مضحکہ خیز پہلوؤں کو اپنے طنز ومزاح کا نشانہ بناتے ہوئے دلچسپ انداز میں لکھتے ہیں:

''فسادات برپا کرنا ہم ہندستانیوں کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ برسوں کے ریاض کے بعد اب ہم نے اس فن میں وہ مہارت حاصل کرلی ہے کہ کسی وجہ کے بغیر ہی فساد برپا کردیتے ہیں۔فساد کے لئے ایک ہندو اور ایک مسلمان کا ہونا ضروری ہے،ان دونوں کے اتحاد کے بغیر فسااد کا ہونا ممکن نہیں۔اگر ایک ہندو نے کسی مسلمان کی طرف گھور کر دیکھا تو یہ بات خود ایک ہنگامہ خیز فساد کے لئے بہت کافی ہے۔ ہندو اور مسلمان کی بات تو چھوڑ یئے اگر کسی مسلمان کے کتے نے کسی ہندو کے کتے پر بھونکنا شروع کیا تو سمجھ لیجئے کہ فساد کی بنیادیں تعمیر ہورہی ہیں۔''

(مجتبیٰ حسین ،قطع کلام ،نیشنل بک ڈپو،حیدرآباد،ص ۶۳،۱۹۶۹)

مجتبیٰ حسین کی تحریروں کا خاص وصف یہ ہے کہ ان میں طنز کا تیکھا پن ہونے کے باوجود مزاح کی مٹھاس کا عنصر غالب رہتا ہے۔جس میں کہیں بھی پستی ٔ ذوق کا شبہ نہیں گزرتا عہد حاصرہ کے طنز ومزاح نگاروں میں اسالیب تحریر کی شگوفتہ انفرادیت بے حد دلکش معیاری اور شفاف ہے جنہوں نے طنز ومزاح نگاری نیرنگی اور بلندی عطا کی ہے۔زبان وبیان پر ان کومہارت حاصل ہے اور بات میں سے بات پیدا کرنا وہ خوب جانتے ہیں جس سے ان کے فن میں زندہ دلی،تازگی اور انفرادیت کا احساس ہوتا ہے:

''پوچھا ''نہاری ہے........بیرا بولا ''نہیں ہے''۔مخدوم نے پوچھا ......کھانے کے لئے کچھ بیرا ا بولا ''نہیں ہے''۔اس پر مخدوم بولے ......''یہ ہوٹل ہے یا ہمارا گھر کہ یہاں کچھ بھی نہیں ہے۔''

(مجتبیٰ حسین،آدمی نامہ،حسامی بکڈپو،حیدرآباد،۱۹۸۱ء،ص۶۳)

ان کے طنز ومزاح نگاری کا یہ نمونہ بھی دیکھئے:

''اگرچہ یہ بات مشہور ہے کہ ہند کے شاعروں اور افسانہ نویسوں کے اعصاب پرعورت سوار ہے۔لیکن اس کے باوجود ان کی تخلیقات میں وہ بھر پورعورت نظر نہیں آتی جو ہمیں عام زندگی میں دکھائی دیتی ہے۔اس پر کسی نے کہا افسانہ نگار کے اعصاب پرعورت کا سوار ہونا ایک الگ بات ہے اور اس کا اعصاب سے اتر کر ادب میں چلے آنا بالکل دوسری بات ہے۔ہمارے افسانہ نگاروں کے اعصاب پر جس طرح کی عورت سوار ہے وہ وہیں بیٹھی رہے تو اچھا ہے۔ایسی عورت کا ادب میں کیا کام''۔

(مجتبیٰ حسین،ماہنامہ کتاب نما،ستمبر،مکتبہ جامعہ لمیٹڈ،ص،۵۱،۱۹۹۹ء)

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ مجتبیٰ حسین کا فن طنز آمیز ہوتے ہوئے بھی مزاح کی چاشنی سے سرشار نظر آتا ہے۔جس میں ایک خاص تہذیب اور وضع داری موجود ہے۔ان کا طنز سانچے میں ڈھلا ہوا اور مزاح نفیس وشائستہ ہے۔جس کے پس پردہ مجتبیٰ حسین کا انسان دوستی اور دردمندی کا جذبہ کارفرما نظر آتا ہے۔وہ نہ صرف قاری کو ہنساتے اور گدگداتے ہیں بلکہ شخصی کمزوریوں اور سماجی ناہمواریوں سے بھی بخوبی آگاہ کرتے ہیں اور ہمیں ایک گہری سوچ اور فکر کی دعوت دیتے ہیں۔

☆☆☆

سیدہ مریم الٰہی
ریسرچ اسکالر

مولانا عاشق الٰہی میرٹھی کی مذہبی شاعری

اردو کی نشونما اور فروغ میں میرٹھ شہر کو امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ یہاں کی کئی شخصیات اور خاندانوں نے ارتقاء اردو میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس شہر میں اعلیٰ درجے کے علماء اکرام اور مصنفین جو اردو کے میدان میں دینی مدارس سے بھی حصہ لے رہے تھے انہوں نے بھی اردو شاعری اور نثر میں قابل قدر اضافہ کیا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ ایک طرف اس مے خانے سے دین ومذہب اور کتاب وسنت کے خدام نکلے ہیں تو دوسری طرف ایسے ایسے ماہرین فن بھی تیار ہوئے ہیں جنہوں نے شعروادب کی چاشنی، شعر کی سحر انگیزی، غزل کی دل آویزی تک اردوادب میں اپنی مہارت کی داد وصول کر چکے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود جب آج کے روشن خیال لوگوں کی مجالس میں علماء اکرام یا مسند حدیث کو زینت بخشنے والے خانقاہی صوفیا کا تذکرہ ہوتا ہے تو اُن کے ذہن میں ایک ہی سوال اُبھرتا ہے کہ ان کا اردوادب سے کیا تعلق؟ شعروشاعری سے انکا کیا واسطہ یہ تو بس منطق وفلسفہ کی احادیث کی گتھیوں میں الجھے رہنے والے ہیں لیکن یہ نظریہ ان کا ہے میں اس پر کسی لب کشائی کے بغیر یہ کہنا چاہوں گی کہ اللہ نے علماء کو علوم اسلامیہ میں گہرائی کے ساتھ ساتھ ''شعرگوئی'' اور اردوادب کی بھرپور صلاحیت سے بھی نوازا۔ کیونکہ ادب سماج کا آئینہ ہے اور اس کا دائرہ بہت وسیع ہوتا ہے اور ادبی موضوعات کو اس تنگ دائرہ میں محدود نہیں کیا جا سکتا ہے اس میں مذہبی شاعری بھی عوام میں خوب داد وتحسین حاصل کرتی رہی ہے اور اس کی ایک مثال'' مولانا عاشق الٰہی میرٹھیؒ'' ہیں۔ جنہوں نے بہت مختصر مدت میں ادبی دنیا کو منور کیا۔

یہاں مولانا عاشق الٰہی میرٹھیؒ کی حیات زندگی کا مختصر تعارف پیش کرنا چاہوں گی کیونکہ کسی بھی فن کار یا فن پارے کو پڑھنے سے پہلے اس فن کار کا پس منظر جاننا بے حد ضروری ہو جاتا ہے۔ اس شہر میں مولانا عاشق الٰہی میرٹھیؒ کی ولادت ۱۲۹۸ ہجری مطابق ۳ جون ۱۸۸۱ یوم جمعہ کو ہوئی۔ مولانا

عاشق الٰہی کے دادا مولانا فضل الٰہی نے میرٹھ کے ہی کوٹلہ محلّہ میں اپنا گھر تعمیر کرایا اور یہیں سے مولانا کی پرورش اور تعلیم و تربیت بھی کی۔ اُس کے بعد ''پوروہ فیاّض علی'' محلّہ میں منتقل ہو گئے۔ پوروہ فیاض علی محلّہ جو مولانا عاشق الٰہی میرٹھیؒ کے بزرگ 'فیاّض علی خاں' کا بسایا ہوا محلّہ تھا۔ یہی سے مولانا عاشق الٰہی میرٹھی کا دینی، سماجی اور ادبی سفر شروع ہوا۔ مولانا میرٹھیؒ کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہی ہوئی۔ قرآن اور دینیات کی تعلیم گھر کے بزرگوں سے حاصل کی۔ چھ سال کی عمر میں ہی قرآن پاک ناظرہ اور کچھ اردو کی کتابیں ''مراۃ العروس'' اور ''بنات النعش'' و ''توبتہ النصوح'' ختم کر لی۔ جو فی الزمانہ ایم اے اردو وغیرہ کے نصاب میں شامل ہیں۔ آپ کی پڑھنے کی رفتار اس قدر تیز تھی کہ بچپن میں ہی بے پڑھے اخبارات فر فر پڑھ دیتے تھے۔ اسی مدت میں ریاضی بھی سیکھی اور اربعۃ وستہ کے سوال حل کرنے لگے۔

مولانا عاشق الٰہی میرٹھیؒ اپنے عہد کے ممتاز ترین اور اعلیٰ شخصیات میں سے تھے۔ آپ مصنف اور علماء دیو بند کے پہلے مترجم اور مفسر قرآن تھے۔ آپ کی بہت سی کتابیں دینی حیثیت سے بہت مقبول ہیں جن میں ''تفسیر میرٹھی''، تذکرۃ الرشید، تذکرۃ الخلیل، تاریخ اسلام، فیوض یزدانی، امدادا سلوک، الجواہر الزواہر، مکشوفات غوثیہ، داڑھی کی قدر و قیمت، تبریز، نبوت کی ضرورت، الذکر المیمون، بہترین جہیز، الصلاۃ، زیارۃ الحرمین وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ لیکن شاعری کا شوق بھی رکھتے تھے اسلئے شاعری میں بھی طبع آزمائی کی۔ جہاں کہیں بھی سفر پر جاتے تھے وہاں اپنا کلام لوگوں کو سنا کر داد و تحسین حاصل کرتے تھے۔ ان کے فکر و فن کی عظمتوں کا اعتراف کیا گیا ہے۔

مولانا عاشق الٰہی میرٹھیؒ شاعری کے اصولوں کے پابند تھے۔ اپنی ایک کتاب ''تذکرۃ الخلیل'' میں شاعری کے مطابق لکھتے ہیں؛

> ''شعر میں وزن و قافیہ ہی نہیں بلکہ یہ تمام رعایتیں ضروری ہیں کہ الفاظ مہذب ہوں، بندش دلربا ہو، مضمون سلیس ہو، مفہوم بے غبار اور آسان ہو، پھر اس میں مدعی کے دعوے کا نقص مدلل ہو''۔

(تذکرۃ الخلیل، ص319، مکتبہ خلیلیہ سہارنپور)

مولانا عاشق الٰہی میرٹھیؒ کی شاعری کے بہت کم نسخے دستیاب ہیں انہوں نے مختلف موضوعات پر شاعری کی جیسے کی تہواروں پر، شادی اور جہیز پر، مزہب کی روایات پر، روحانیت، ایمان، اخلاق اور عقیدہ جیسے موضوعات پر بڑے دلچسپ انداز میں شعر کہتے تھے۔ اسلامی

روایات کی پاسداری اور مذہبی اقدار کی حفاظت نے ان کی شاعری کو دوسرے شعرا سے ممتاز کر دیا۔

مولانا اتباع سنت کے عاشق تھے۔ایک مرتبہ ان کی بہنیں شب برات کے دن آئیں اور کہا کہ ''بھائی،ہمیں بھی شبراتی چاہیے۔''اس بات کو سن کر مولانا میرٹھی خاموش ہو گئے اور فرمایا کہ شام کے وقت آنا۔ہم شبراتی دیں گے۔مولانا عاشق الٰہی کیونکہ قلم کے سپاہی تھے آپ نے شام تک اپنے قلم سے کچھ لکھا اور اس کو چھپوا دیا۔کیونکہ چھاپہ خانہ گھر میں تھا اس لیے جو بھی لکھتے تھے فوراً طبع ہو جاتا تھا۔اس کو بھی طبع کرایا اور شام کو بلا کر وہ پرچے اپنی بہنوں کو دے دیے کہ یہ تمھاری شبراتی ہے۔اس پرچے کے الفاظ کچھ اس طرح تھے:

آئی شب برات چھوڑو گناہ کے دھندے
احمد کے اُمتی ہو رب عہد کے بندے
مومن کو کیا غرض ہے آتش سے یا لپٹ سے
انار اور پٹاخے سب کام ہیں یہ گندے
شب کو کرو عبادت اور دن کو رکھو روزہ
مانگو دعا الٰہی شر سے ہمیں امن دے

اس طرح بے حد سادہ اور سلیس اردو زبان میں مولانا کی شاعری عوام میں داد و تحسین حاصل کرتی رہی۔مولانا کی شاعری میں مذہبی عناصر کی وجہ دراصل ان کا خاندانی ورثہ اور دینی ماحول ہے اور آپ نے اس ماحول کو نہ صرف برقرار رکھا بلکہ بڑے سلیقے اور رکھ رکھاؤ سے اسے پیش بھی کیا۔

مولانا کی شاعری قدیم اور جدید کا حسین امتزاج ہے،خواتین کے لئے بیحد کشادہ ذہنیت کے حامل تھے۔خواتین کا بڑا مسلہ 'جہیز' جو آج ہمارے معاشرے میں کینسر کی طرح پھیل چکا ہے اس لعنت نے لاکھوں بہنوں اور بیٹیوں کی زندگی کو تو جہنم بنا دیا ہے ان کی معصوم آنکھوں میں بسنے والے رنگین خواب چھین لئے ہیں۔اُس وقت بھی مولانا بہن بیٹیوں کے لئے فکرمند رہتے تھے۔معاشرے میں جہیز جیسی لعنت کو ختم کرنے کے لئے والدین کو بھی سخت بننے کی تعلیم دیتے اور لوگوں کو بھی بتاتے کہ اپنی حیثیت سے بڑھ کر تحائف کے نام پر جہیز دینا اور جہیز کے مطالبات پورا کرنا اخلاقی جرم ہے۔جس وقت مولانا اشرف علی تھانوی صاحبؒ جو اپنے عہد کے اعلیٰ درجے کے عالم اور ممتاز ترین علماء میں سے ایک تھے خواتین کے مسائل پر''بہشتی زیور''کو ترتیب دے رہے تھے اُس وقت مولانا عاشق الٰہیؒ نے ایک کتاب''بہترین جہیز''ایک رات میں تحریر فرمائی اور چونکہ چھاپا خانہ اپنا تھا اس لئے اسے طبع کرادی اور عوام میں اس کتاب نے کافی مقبولیت حاصل

کرلی۔دراصل مولانا نے یہ کتاب اپنی دختر کی رُخصتی پرتحریر کی تھی اُس زمانے میں بھی آپ جہیز لینے اور دینے کے خلاف تھے۔اپنی اس کتاب کومولانا نے بطور جہیزاپنی بیٹی کو دی تھی اس کتاب میں ہی مولانا نے نصیحت نامہ تحریر فرمایا جواس طرح شاعری کی شکل میں ہمیں ملتا ہے؛؛

بیٹی ترے گلے میں نمازوں کے ہار ہوں
چمپاکلی کے دانے صیام انہار ہوں
جھومر ہوحسن خلق ، گلوبند حبّ حق
سہرہ کے پھول منزل قرآن کے ورق
کانوں کی بالی حلقہ بگوش خدا کی ہو
ہاتھوں کی چوڑی دست نگر مصطفےٰ کی ہو
بُندے ہوں بندگی کے تو پتّے خشوع کے
کنگن کڑے دوام قیام و رکوع کے
چھلّے ہوں عبدیت کے انگوٹھی یقین کی
پازیب پاؤں کا بنے پابندی دین کی
جوش وتوکل، آرسی اللہ پر نظر
خلخال ہو ثبات قدم راہ رُشد پر
توحید کا ہو سینہ پہ جگنو پڑاہوا
اعمال صالحہ کے نگوں سے جڑا ہوا
ہیکل رجاؤ خوف،،قلاوہ ذکر و فکر
اللہ کا رنگ رنگ ہو سُنّت کا عطرعطر
صبرو رضاء و زہدوحیا کا سنگھار ہو
ماتھے پہ ٹیکا سجدۂ پروردگا ر ہو
گر جان جائے جانے دوایمان پر نہ جائے
دامن نبی کا ہاتھ سے ہرگز نہ چھٹنے پائے
ہاں حرص ہوتو علم کی اور کار نیک کی
اصلاح دین مدّنظر ہو ہرایک کی
سن لو وصیّت آخری کہتا ہوں ایک بات
اسلام ہو لباس ، عبادات زیورات
دنیا دنی ہے سچ ہے سب یاں کا مال و زر
اللہ بس ہے باقی ہوس، قصّہ مختصر

یہ پورانصیحت نامہ بطور جہیز مولانا نے اپنی بیٹی کو دیا۔اپنی شاعری کے زریعے عوام میں پھیلی برائیوں کوبھی دور کرنا چاہتے تھے،اس پوری نظم میں مولانا نے ظاہری زیور کو باطنی زیور سے تشبیہ دی ہے شاعری میں مہذب اردو الفاظ کا استعمال کرتے تھے۔اس پورے نصیحت نامہ میں مضمون بے حد سلیس اور مفہوم واضع ہے۔الفاظ کا حسن انتخاب،علوفکر،قدرالکلامی اورعموما خشک سمجھے جانے والے موضوع کوآپ نے سحرآگیں اسلوب میں ڈھال کراس طرح سے پیش کیا ہے کہ قاری مسحور ہوکر رہ جائے،اس کے علاوہ پوری نظم میں انتہائی شستہ اور رواں لہجہ قاری کے دلوں میں ہولے ہولے دستک دیتا ہے۔

شاعرگزرے ہیں کچھ تو گمنامی کی زندگی گزار کراس دارفانی سے کوچ کر گئے اور کچھ آج بھی شاعری میں طبع آزمائی کر رہے ہیں لیکن منظرعام پرنہیں آئے۔مولانا کی نسلوں میں سے کچھ

شاعر گمنامی کی زندگی گزار کر ہی چلے گئے ان کے تحریری شکل میں کلام دستیاب نہیں ہو سکے جن میں محترم جمشید الٰہی مرحوم، محبوب علی زبیری مرحوم، محمد علی زبیری مرحوم، فضل الٰہی مرحوم وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

مولانا عاشق الٰہی خاندان کے آج ایک اور ابھرتے ہوئے شاعر 'عرفان الٰہی اعظمی' جو مولانا عاشق الٰہی میرٹھیؒ کے پوتے ہیں شاعری میں طبع آزمائی کر رہے ہیں۔محترم عرفان الٰہی صاحب آل انڈیا ریڈیو میں اُردو کے announcer ہیں، اور اردو شاعری میں بھی غزل، نظم، رباعیات، نعت رسول، وغیرہ لکھ کر اردو شاعری میں بھی اپنی جگہ بنانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ عرفان صاحب کے کلام کا مجموعہ ''کھارا پانی'' کے نام سے شائع ہو کر عوام میں داد و تحسین حاصل کر چکا ہے۔اس کے علاوہ نعتیہ کلام بھی پیش کیا۔غزل میں وہ اعلیٰ مقام رکھتے ہیں۔عرفان اعظمی صاحب نے مولانا عاشق الٰہیؒ کی شاعری کو محسوس کیا اور خود بھی اس راہ پر چل کر اردو شاعری میں قابل قدر اضافے کئے۔

ان کے علاوہ عاشقیہ خاندان کے ایک اور چشم و چراغ محترم 'تنویر زبیری' نے بھی اس صنف میں طبع آزمائی کی۔تنویر زبیری بھی میرٹھ سے تعلق رکھتے ہیں، کنوہر لال انٹر کالج کے صدر رہ چکے ہیں۔اور اردو شاعری میں بھی اپنی جگہ بنا رہے ہیں۔انہوں نے بھی مختلف موضوعات پر غزلیں کہی، منفرد اشعار سے اردو شاعری میں قابل قدر اضافے کیے اور عوام میں بھی ان کا کلام مقبولیت حاصل کر رہا ہے۔

اس طرح مولانا عاشق الٰہی کی ادبی خدمات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔اردو شعر و ادب میں مولانا عاشق الٰہی میرٹھیؒ نے اردو میں کتابیں تصنیف کر کے گراں قدر اضافے کیے۔حقیقت تو یہی ہے کہ مولانا نے مذہبی منظر نامے پر اپنے قلم کی جولائی طبع کو دکھاتے ہوئے یہ ثابت کر دیا کہ وہ اردو شاعری میں انتہائی کھرا سونا ہیں ادب میں مذہبی ذوق کو نہ صرف برقرار رکھا بلکہ اس کا اظہار کرنا بھی آپ کے دست ہنر کا کمال ہے۔ان کی شاعری میں جس روحانی سرشاری کا ذکر کیا ہے وہ عطیہ خداوندی ہے۔آج بھی بزرگ حضرات کو مولانا کی پرانی نظمیں تلاش کرتے ہوئے مختلف کتاب فروشوں کی دکان پر دیکھا جا سکتا ہے۔یہ سب مولانا کے آسان زبان میں لکھے گئے کلام کا بین ثبوت ہے۔اور اردو ادب میں بھی انکا ایک اہم مقام ہے۔

☆☆☆

عرفان عارفؔ
جموں

الفاظ کے نفسیاتی برتاؤ کا منفرد شاعر: احمد شناس

پیر پنجال کے معاصر اردو شاعروں میں احمد شناس اپنے منفرد لب ولہجہ کی وجہ سے ایک معتبر پہچان رکھتے ہیں۔''پسِ آشکار''(2010ء)اور''صلصال''(2014ء)کے بعد ابھی چند روز قبل منظر عام پر آنے والے ان کے تیسرے شعری مجموعے'' آب رنگ''(2023ء) کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ احمد شناس کی شاعری تخلیقی اظہار کے مسلسل عمل سے عبارت ہے ۔احمد شناس کی شاعری میں ان کی زندگی اور ذات کے علاوہ انسانی حیات وکائنات کے اِسرار و زموز کا بیان ان کی شاعری کی شناخت کے طور پر سامنے آتا ہے۔

''آب رنگ''میں غزل کی کلاسیکی روایات کا احترام بھی ہے،جدید لب و لہجے کا برتاؤ بھی اور مابعد جدید صورتِ حال کے تلخ وشریں حقائق بھی۔

کیا چیز ہے وہ جس کے، سہارے کھڑے ہیں ہم
نا اعتبارِ جسم ہے نا اعتبارِ جاں

وہ میرا وہم ہے یا پھر یقین ہے میرا
وہ کون ہے کہ جو میرے سوا ہے شیشے میں

آگ لگا کر اس دھرتی کے، ہرے بھرے دریاؤں میں
اب ہم چاند پہ ڈھونڈ رہے ہیں، پانی کے امکانی رنگ

بچے نکال لائے ہیں خبریں نئی نئی
بوڑھے فلک کی جیب سے چیزیں نئی نئی

گلاب کھل اٹھے، تتلی کے پر نکل آئے
سبھی کو نیند سے، بیدار کر گیا سورج

یہی اچھا ہے کہ بہتے رہیں دریا احمدؔ
روک لگ جائے تو سیلاب بنادیتے ہیں

اتنے پردے ہیں یہاں، دیدہ و دل کے احمدؔ
اپنے اندر ہی کہیں، رہ گئے دیوار میں ہم

یہی وجہ ہے کہ عام شعراء کے برعکس احمد شناس کی شاعری میں جمالیاتی سوز و گداز کے ساتھ ساتھ فکری تہہ داریاں بھی بہت ملتی ہیں۔ احمد شناس کے اشعار پہلی قرأت میں قاری کو لطف وانبساط سے ہم کنار کرتے ہیں۔ جو غزلیہ شاعری کی خصوصیت ہے۔ لیکن ان کے اشعار کی بازقرأت (Second Reading) پس آشکار، معنی اور مفہوم کے لامحدود امکانات کو بھی سامنے لاتی ہے۔

یہ کیسا خلا ہے مرے اطراف میں احمدؔ
میں اپنی گواہی کے لئے، چیخ رہا ہوں

مرا کمال یہ لکھے ہوئے حروف نہیں
مِرے خیال کی ہے انتہا، گلاب کا پھول

ذرا سی دھوپ نہیں یخ زدہ زمینوں میں
پڑی جو برف تو کیسے ٹھٹھر گیا سورج

احمد شناس کے یہاں عصر حاضر کے انسان کے ثقافتی اور معاشرتی انتشار اور بحران کی ترجمانی تو ہے ہی لیکن ان کے اشعار کے اندرون سے تخلیقِ کائنات اور وجودِ آدم سے متعلق کلامِ پاک کی توضیحات کی نشاندہی بھی ہوتی ہے۔

صبحِ وجود ہوں کہ شبِ انتظار ہوں

میں آشکار ہوں کہ پسِ آشکار ہوں
کیسے کھڑا ہوں کس کے سہارے کھڑا ہوں میں
اپنا یقین ہوں کہ ترا اعتبار ہوں

خدا کا جوہرِ وحدت ، ضمیرِ لا الہ دیکھا
وہ ہر موجِ نفس کے ساتھ، مصلوبِ انا دیکھا

ہر طرف بکھری ہوئی اس کی نشانی دیکھنا
نقشِ اول سے زیادہ نقشِ ثانی دیکھنا

پنچھی بنا رہے ہیں محبت کا گھونسلہ
سوکھا ہوا ہے پیڑ کنارا ہے نہر کا

تمہارا نام سَمندَر کی خامشی جیسا
تمہارے نام کے حسنِ بیاں سے آؤں میں

احمد شناس کی شاعری کا سفر 70 کی دہائی کے آس پاس شروع ہوا تھا۔اُس دور میں ان کا کلام’’الفاظ‘‘ اور’’اِنکار‘‘ (جو علی گڑھ سے،ابوالکلام قاسمی کی ادارت میں شائع ہوتے تھے) کے علاوہ ہندو پاک کے کئی معتبر رسائل میں شائع ہوتا رہا۔اسی کے آس پاس ریاست جموں و کشمیر میں فاروق مضطر صاحب نے’’ دھنک‘‘ جاری کر کے گویا جموں کشمیر میں جدید رجحانات کو ایک مثبت سمت عطا کیا۔بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ’’ دھنک‘‘ نے اردو میں خالص جدیدیت کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا۔1973ء کے جدید رنگ کے’’ دھنک‘‘ سے احمد شناس کی غزلوں کے یہ اشعار دیکھیے اور غور کیجیے کہ یہ اشعار فیشن پرست جدید شاعروں کی غزلیہ شاعری سے کس قدر مختلف ہیں اور جو نئی نئی ترکیبیں ایجاد کی ہیں وہ کس قدر دلکش ہیں۔جیسے’’فاصلہ شکن‘‘

وہ المیہ کہ کہیں فاصلہ شکن نہ ہوئے
یہ سانحہ کہ ملے اور یک بدن نہ ہوئے

ہم ایک معرکۂ کربلا میں مارے گئے
عجب کہ مرگ رسیدہ ہمارے تن نہ ہوئے
فصیلِ ذات میرے تیرے درمیان رہی
ہم ایک گھر میں رہے اور ہم وطن نہ ہوئے

......

میں مسافر اُفق تا اُفق دھوپ کے سنگ فصلِ زمستاں کا لمحہ لیے
اور میرے تعاقب میں ہے تیرگی، کوہساری ہمہ گیر سایہ لیے
میں محافظ تھا جس زندگی کا اسے، لمسِ آواز سے بھی بچانا پڑا
ریت میں خامشی کی جھلستا رہا بند ہونٹوں میں دریائے قصہ لیے

(دھنک، شمارہ:1، اشاعتِ جدید: م نومبر 2022ء)

اس مقام پر ''دھنک'' اور جدیدیت کے حوالے سے خود ''دھنک'' کے مدیر جناب فاروق مضطر کے اشعار بھی یاد کیے جاسکتے ہیں۔ مثلاً

دیکھو مری جبیں پہ میرے عہد کے نقوش
رکھو مجھے سنبھال کے اِک آئینہ ہوں میں
میں بولتا رہا تو کسی نے نہیں سنا
میں چپ ہوا تو سارا شہر گونجنے لگا
ایک دن ساری کتابوں کو لپک جائے گی آگ
اور پھر اس راکھ سے اک حرف لکھا جائے گا

جدیدیت کے رجحان کے تحت اردو شاعری میں تنہائی، اجنبیت، ادھوراپن، آنگن، گلاب، چمن، خواب، گھر، سفر، آئینہ، پتھر، مٹی، شب، جگنو، ڈر، مکان، آدمی، انسان، ہجر، وصال، دیوتا، در، دیوار، مہک، خوشبو، چہرہ، شاخ، پرندہ، دھوپ، چھاؤں، چانداور سورج کے ساتھ شور، خامشی اور حرف جیسے موضوعات کے برتاؤ کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا وہ احمد شناس کے یہاں بھی ان کی 70/80 کی دہائی کی شاعری سے لیکر اب تک نظر آتا ہے۔ ''پسِ آشکار'' اور ''صلصال'' میں ایسے اشعار ملتے ہیں۔ لیکن اپنے تیسرے مجموعے ''آب رنگ'' تک آکر احمد شناس کی شاعری ارتقاء کی نئی منزلوں کو چھوتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس ضمن میں پروفیسر قدوس جاوید نے ''آب رنگ'' کے

پیش لفظ میں لکھا ہے کہ:

''آب رنگ'' کی شاعری پر غور کریں تو اندازہ ہوگا کہ احمد شناس کی شاعری میں ''مٹی'' سے تشکیل پذیر، خالقِ کائنات کی اس شاہکار تخلیق 'انسانی وجود کے حوالے سے احمد شناس کے یہاں ایک غیر معمولی فکری تسلسل ملتا ہے۔ مثلاً اس طرح کے اشعار کے تخلیقی محرکات کو اور کن تناظرات میں دیکھا جانا چاہئے؟

ہے وہی کار وہی کارگہہ ہستی ہے
وہی طوفان ہے دریا میں وہی کشتی ہے

......

ہمیں اکیلے نہیں جو ہونے کی آرزو میں سُلگ رہے ہیں
ہر ایک پتھر چیخ رہا ہے، ہر ایک ذرہ ہے ذاتِ امکاں ص:19

اس کی تصدیق کسی نہ کسی پہلو سے احمد شناس کے معاصر شاعر پرتپال سنگھ بیتاب نے اس طرح کی ہے:

''آج کی مارا ماری اور پُرشور دُنیا میں احساس تنہائی کو احمد شناس نے کس خوبصورتی سے مندرجہ ذیل شعر میں بیان کیا ہے۔''

ہر ایک شخص یہاں بھیڑ میں اکیلا ہے
کسی کے ساتھ کوئی دوسرا نہیں ہوتا ص 31

اسی طرح جناب غنی غیور نے احمد شناس کی ''آب رنگ'' کی شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے ''احمد شناس کو عصر حاضر کا نمائندہ شاعر قرار دیا ہے۔'' انہوں نے بھی قدوس جاوید کی تصدیق کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

''احمد شناس کی شاعری کی اوپری سطح ساکن وایستادہ معلوم ہوتی ہے لیکن جونہی حساس قاری انکے اشعار کی گہرائی میں اترتا ہے تو اسکا سامنا ایک زبردست زیرِ موج undercurrent سے ہوتا ہے'' ص35/36

احمد شناس کی شاعری مذہبی شاعری نہیں ہے اور نہ ہی مشاعراتی اور میڈیائی لیکن ان

کے یہاں عصری حالات وحقائق کے تناظر میں مذہبی روشن خیالی کی ترقی یافتہ لہریں مظاہر فطرت کے حوالے سے مختلف صورتوں میں ضرور ملتی ہیں۔غرض یہ کہ ''آب رنگ'' کی شاعری صرف پڑھنے یا سننے کی نہیں بلکہ علامہ اقبال کی شاعری کی طرح مطالعہ کی شاعری بھی ہے۔

ایک مسجد دوسرا پتھر شوالہ بن گیا
اور دونوں کا کلس کوہ ہمالہ بن گیا
ان کے اندر وہ کتابوں کا محافظ ایک شخص
لفظ و معنی میں تصادم کا حوالہ بن گیا

ہر ایک چیز ہے احمؔد گماں کے پردے میں
ہمارا دیکھنا سننا بھی ہے اشارا ایک

احمد شناس کی شاعری کے سمندر میں طغیانی بہت ہے اسی لیے ان کے یہاں شاعرانہ اظہار کی کئی صورتیں نظر آتی ہیں۔''آب رنگ'' میں احمد شناس کی جدت یہ ہے کہ غزل کی روایت میں یہ جدّت پیدا کی ہے کہ پورے مجموعے میں اظہار و بیان کی یہ ترتیب رکھی ہے کہ ہر غزل سے پہلے دو دو شعر درج کیے ہیں۔مثال کے طور پر ''آب رنگ'' کی پہلی غزل جس کا مطلع ہے۔

تمام عمر کسی ایک کا نہیں ہوتا
وہ ہر جگہ ہے مگر ہر جگہ نہیں ہوتا

اس غزل سے پہلے انہوں نے دو شعر اس طرح کہیے ہیں۔

زہر پینا ہے تو پینا ہے شکایت کے بغیر
بات کرنی ہے تو کرنی ہے سیاست کے بغیر
صرف لکھنے سے کتابیں نہیں لکھی جاتیں
حرف کاغذ پہ اُترتا نہیں وحشت کے بغیر

غزل سے پہلے دو دو شعر لکھنے کا اہتمام ''آب رنگ'' میں شروع سے آخر تک ملتا ہے اور یقینی طور پر اس سے ''آب رنگ'' کی غزلیہ شاعری میں ایک نیا ذائقہ پیدا ہو گیا ہے۔خاص بات یہ ہے کہ جس طرح ''آب رنگ'' کی غزلوں کے معنیاتی اور لفظیاتی نظام میں ایک اچھوتا پن ہے اسی طرح ہر غزل سے پہلے آنے والے دو دو اشعار میں بھی ایک انفرادیت ملتی ہے۔

فکری کے علاوہ فنی اعتبار سے بھی ''آب رنگ'' کی شاعری میں احمد شناس کی شاعرانہ فنکاری اور تخلیقی اجتہاد کے نمونے بھرے ہوئے ہیں۔اول یہ کہ وہ نت نئی تشبیہات اور استعارات ایجاد کرتے ہیں۔ان کے یہاں تشبیہ اور استعارے کا استعمال غزل کا لازمہ ہے۔شاعر کے اندر جذبات و احساسات اور افکار و خیالات کا سمندر موجیں مارتا رہتا ہے۔غزل کی ہیئت اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ کسی بھی مضمون کو تفصیل اور وضاحت کے ساتھ بیان کیا جائے۔غزل میں تشبیہ اور استعارہ کے برتاؤ کا جواز یہی ہے۔اسی لیے علامہ اقبال تک کو یہ کہنا پڑا تھا کہ ؎

برہنہ حرف نگفتن کمالِ گویائیست
حدیثِ خلوتیاں جز بہ رمز و ایمانیست

احمد شناس کے یہاں حرف، لفظ، سورج، دریا، موج، پھول، تتلی، روشنی، دھوپ، برف، بارش، سمندر، جیسے الفاظ کا استعاراتی برتاؤ ''آب رنگ'' کی شاعری کو زیادہ سے زیادہ تہہ دار اور معنی خیز بناتا ہے۔لیکن احمد شناس بحیثیت شاعر اور شخص کیا ہیں اور کیا نہیں، اس کے بارے میں وہ خود کوئی دعویٰ نہیں کرتے لیکن ان کے یہ اشعار آج کے ہر انسان کی وجودی حقیقت کو بیان کرتے ہیں۔

ادھورا سا ہوں کچھ پورا نہیں ہوں
میں اس تصویر میں ہوں یا نہیں ہوں
خود اپنے آپ سا لگتا نہیں ہوں
جو شیشے میں ہے وہ چہرا نہیں ہوں
نہ جانے اور میں کیا کیا ہوں احمدؔ
نہ جانے اور میں کیا کیا نہیں ہوں

احمد شناس، شاعری کے بارے میں خود ایک واضح رائے رکھتے ہیں۔''آب رنگ'' کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں۔

> ''شاعر اپنے شعر کے لئے مواد زندگی سے لیتا ہے۔پیش آمدہ حالات اور واقعات، جذبات اور احساسات پر اثر انداز ہوکر اس کی فکر کو انگیخت کرتے ہیں جہاں سے ایک خوبصورت شعر جنم لیتا ہے۔یہ ایک فرد کی آواز ہوتی ہے مگر وہ سب کی آواز بن جاتی ہے اور اس میں ہر کوئی بول رہا ہوتا ہے۔مگر یہ آواز ہمیشہ ایک جیسی نہیں ہوتی بلکہ اس کے اندر تغیر پذیری

کا عمل جاری وساری رہتا ہے۔ کیونکہ یہ آواز خود زندگی کی آواز ہوتی ہے
اور زندگی کے بارے میں علامہ اقبال بجا طور پر کہتے ہیں کہ ؎

جاوداں پیہم رواں، ہر دم جواں ہے زندگی

علامہ اقبال زندگی کے شاعر ہیں اور زندگی نام ہے حرکت کا اور جمود اس کی موت ہے۔ جو لوگ ان کی شاعری میں تضادات ڈھونڈ تے ہیں وہ دراصل اقبال کو اپنے بنائے ہوئے فکری سانچے میں رکھ کر سمجھنا چاہتے ہیں جبکہ اقبال سانچے بنا بنا کر انہیں توڑتے رہنے کے مسلسل عمل کو اپنا کمالِ فن سمجھتے ہیں۔''

تراشیدم، پرستیدم، شکستم۔ص 52/53

اسی طرح اپنے شعری مجموعہ ''آب رنگ'' کے بارے میں خود احمد شناس نے لکھا ہے
''پسِ آشکار'' اور ''صلصال'' کے بعد میری زیرِ نظر کتاب ''آب رنگ'' کو دیکھتے ہوئے میں اُن قارئین اور تبصرہ نگاروں کے ساتھ ہوں جو یہ محسوس کر رہے ہوں گے کہ میرا یہ سفر ٹھہراؤ کا نہیں بلکہ بہاؤ کا سفر ہے اور بہاؤ میں نہ کوئی منزل ہوتی ہے اور نہ کوئی مقام۔''

اپنی آواز میں جل ترنگ جیسا ہے
میرے گیتوں میں وہ آب رنگ جیسا ہے

توڑتا رہتا ہے شکلوں کو بنا کر بچہ
جو بنانی ہے وہ تصویر نہیں بنتی ہے

تم میری تمنا ہو مرے دل کی صدا ہو
ہاتھوں سے نکل جاتے ہو تتلی کہ ہوا ہو
دیکھا ہے تمہیں پاس بہت پاس سے میں نے
جو کچھ مجھے معلوم ہے تم اس کے سوا ہو

احمد شناس اور احمد سوز کی شاعری کے بارے میں اردو کے معروف شاعر، پاکستانی ٹی وی سیریلوں کے لیے مشہور، Playwriter، Screenwriter, اور نغمہ نگار ستارہ امتیاز امجد

اسلام امجد نے ''چشم تماشا'' میں لکھا ہے:

''بہت دنوں سے میں جموں کشمیر کے شاعر احمد شناس اور ممبئی میں مقیم سینئر شاعر احمد سوز کے بارے میں کچھ لکھنا چاہ رہا تھا مگر دیگر موضوعات کے دباؤ کی وجہ سے موقع نہیں نکل رہا تھا سو آج اس جان پر رکھے ہوئے قرض کو چکانے کی کوشش کرتا ہوں ۔۔۔۔احمد شناس کی شاعری میں تصوف کے حوالے سے ''موجود'' کی عنایت اور ''مابعد'' کی ہیئت کے بارے میں بہت سادگی سے کئی فکر انگیز سوال اٹھائے گئے ہیں لیکن اس ''عالم گیر'' حیرت کے اظہار میں عام طور پر شعریت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا گیا کہیں کہیں ضرورت سے زیادہ سادگی یا موضوع کی رعایت سے استعاراتی پیچیدگی ضرور نظر آتی ہے مگر اس نواح میں ایسا اکثر ہو جاتا ہے کہ اس شہادت گہر الفت میں بڑے بڑوں کے قدم بھی شروع شروع میں ایسے ہی پڑتے دیکھے گئے ہیں ؎

صبح وجود ہوں کہ شب انتظار ہوں
میں آشکار ہوں کہ پس آشکار ہوں
کیسے کھڑا ہوں کس کے سہارے کھڑا ہوں میں
اپنا یقین ہوں کہ ترا اعتبار ہوں
زندہ انساں اسے آباد کیا کرتے ہیں
گھر کسی خواب سے معمور نہیں ہوسکتا

بزرگ قلم کار ڈاکٹر ستیہ پال آنند نے احمد شناس کی شاعری کی فنی جمالیاتی خوبیوں کی نشاندہی ان الفاظ میں کی ہے:

''''صلصال'' اور ''پس آشکار'' میں مشمولہ نظمیں احمد شناس کے فن کو ان کی غزلیہ شاعری میں موجود غنائت سے بھی الگ کرتی ہے اور علامت واستعارہ سازی کے عمل میں منہار کی دکان جیسی چمکیلی روایتی زبان سے بھی دور رکھتی ہے۔دوسری طرف ان کے ہاں تجریدی آرٹ کے وہ جدید فیچر نہیں ہیں، جن سے مثنیٰ یا مشابہت، سے آگے بڑھ کر کسی فوٹو گراف

کی Enlarged تصویر پیش کی جاتی ہے یا تصغیریہ کی سطح پر اسے
minimise کر دیا جاتا ہے ۔ وہ اگر آرٹسٹ ہوتے تو بھی شاید
Surrealism پر تکیہ کرنے کے بجائے Representational
Painting کرتے ۔ ان کی نظموں میں تسلسل ہے ، استحکام ہے ،
پائداری ہے، Organic Unity ہے۔ اگر بوقلمونی یا رنگا رنگی ہے تو وہ
بھی اس توافق کو مجروح نہیں کرتی ۔ اس لحاظ سے ان کے ہاں استعارے
کی سطح پر ''مشبہ بہ'' اور ''مشبہ'' میں One-to-one equation ہے
۔ اگر موضوعاتی سطح پر وہ ایک آگاہ شاعر ہیں تو اسلوبیاتی سطح پر بھی وہ
زبان و بیان کے رموز سے واقف، منجھے ہوئے استاد شاعر ہیں۔

بحیثیت مجموعی یہ کہا جا سکتا ہے کہ گذشتہ پچاس برسوں میں پیر پنجال ہی نہیں بلکہ ہندو پاک کی سطح پر جو شعری مجموعے منظر عام پر آئے ہیں'' آب رنگ'' ان میں ایک منفرد پہچان کا حامل ہے اور اس دورانئے میں پیر پنجال میں کئی معتبر شاعر سامنے آئے ہیں ان سے آپ واقف ہونگے لیکن کسی بھی فہرست میں احمد شناس کا نام شامل کرنا بہرحال ضروری ہوگا۔ چونکہ

احمد شناس کی انفرادیت کا انحصار ان کے تخلیقی رویے، شعری طریق کار اور الفاظ کے نفسیاتی برتاؤ پر ہے۔ جس میں سیاسی، سماجی، معاشی مسائل کی عکاسی کے ساتھ ساتھ ذاتی تاثرات کی کارفرمائی بھی شامل ہے۔ انہوں نے روایتی لفظیات میں مضامین کے نئے نئے معنی و مفہوم کے گل بوٹے کھلائے ہیں۔ خصوصاً غزلیہ شاعری میں جدید لفظیات اور لسانی توڑ پھوڑ کو ترجیح دی ہے۔ الفاظ میں وہ لفظوں کے مرکب بھی شامل ہیں جو کسی معنی کی صورت اختیار کر لیتے ہیں اور جن کو شناس صاحب نے اپنی شاعری میں برتا ہے۔ ان کی نفسیاتی جہات دوسرے شعرا سے اس لئے منفرد ہے کہ شناس صاحب کا اپنا لفظیاتی ڈکشن ہے اور اسے برتنے کا اپنا منفرد اسلوب۔

آپ سب جانتے ہیں کہ احمد شناس کے پہلے شعری مجموعے ''پسِ آشکار'' پر جموں یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں ایم فل کا مقالہ لکھا جا چکا ہے جبکہ دوسرے شعری مجموعہ ''صلصال'' کو یوپی اردو اکیڈمی اور بہار اردو اکیڈمی دونوں نے انعامات سے نوازا ہے۔ اب ان کا تیسرا شعری مجموعہ'' آب رنگ'' آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

☆☆☆

شاہِ زمن

ریسرچ اسکالر

تقابلی تنقید کی روایت اور موجودہ صورت حال

تقابلی تنقید:

تقابل دو چیزوں کے درمیان موازنہ کرنے کو کہا جاتا ہے اور تقابلی تنقید میں بھی یہی کام کیا جاتا ہے۔ تقابلی تنقید ادبی تنقید کا ایک انداز اور طریقۂ کار ہے، خصوصی نوعیت کا مستقل دبستان نہیں۔ دیگر دبستانِ فکر کی اچھی یا بری کچھ خصوصیات ہوتی ہیں اور ان کی ہی وجہ سے مخصوص دبستانِ فکر کی مدت مقبولیت میں کمی بیشی ہوتی ہے۔ حالانکہ تقابلی تنقید کا کام تخلیقات و نگارشات کے تقابل و موازنہ سے تعین مقام وقدر کی کوشش ہے۔

تنقیدی بحث طلب امور و نکات اور علمی اصطلاحات سے صرفِ نظر عام ذہنی سطح کا قاری بھی شعوری یا غیر شعوری انداز میں اپنے ادبی فیصلوں میں تقابلی تنقید کے طریقۂ کار سے کام لیتا ہے۔ بہت سے ادیبوں اور شاعروں میں سے کسی ایک کو خصوصی ترجیح یا ایک ہی موضوع وعنوان پر کئی ساری تخلیقات و تصانیف میں سے کسی ایک کی پسندیدگی، عام زندگی میں تقابلی تنقید کی مثالیں ہیں۔ میرا پسندیدہ شاعر، میرا محبوب مصنف اس کے اظہار کی آشنا صورتیں ہیں۔

تنقیدی ادب کے مطالعے کی تاریخ سے یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ بیشتر بہت اہم نقادوں نے تقابلی تنقید سے کام لیا ہے۔ مثال کے طور پر ڈرائیڈن اور جانسن سے لے کر میتھیو آرنالڈ اور ٹی ایس ایلیٹ تک ہر اندازِ فکر کے حامل نقاد نے کسی نہ کسی ڈھنگ اور زاویے سے تقابلی تنقید سے مدد لی ہے۔

اردو میں تقابلی تنقید کی روایت کی ابتدائی صورت کا تذکروں میں بغور مطالعہ کیا جا سکتا ہے اگر چہ تذکرہ نگاروں کی تنقید آج کی اصطلاح کے معنی و مفہوم میں تنقید نہ تھی تاہم بعض مقامات پر ایسے اشارات مل جاتے ہیں جنہیں تقابلی تنقید پر محمول کیا جا سکتا ہے۔ خاص کر اس وقت جب

کسی خوبصورت تشبیہ، خیال یا محاورے کے ضمن میں کئی اساتذہ کے اشعار لکھ دیے جاتے تھے۔ ’’آب حیات‘‘ 1880ء میں بھی مولانا محمد حسین آزاد نے بھی بعض اوقات تقابلی تنقید کے انداز و اسلوب سے تقابل کیا ہے۔

اردو شعر و ادب کی تاریخ میں ہر دور میں کوئی نہ کوئی ادیب و شاعر ایسا ضرور ملے گا جس میں عموماً معنوی حسن کو سامنے رکھ کر دو فن کاروں کا مقابلہ و موازنہ کسی دوسرے ادیب و شاعر سے کیا جاتا رہا ہے۔

یہ سلسلہ باضابطہ طور پر میر تقی میرؔ اور مرزا رفیع سوداؔ سے شروع ہوتا ہے۔ بعض لوگ آج بھی دونوں معاصرین کو ایک دوسرے پر برتری و ترجیح دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ مرزا رفیع سوداؔ اور میر تقی میرؔ کے بعد مومنؔ اور ذوقؔ کا مقابلہ و موازنہ کیا گیا ہے۔ مرزا غالبؔ کی بھی مومنؔ سے تو نہیں لیکن شیخ ابراہیم ذوقؔ سے ان کے شاہی اعزاز کی بدولت ہمیشہ چشمک رہتی تھی۔

انشاءؔ اور مصحفیؔ کے معرکے معاصرانہ چشمک و چپقلش اور تقابلی تنقید کے ابتدائی نقوش اور بہترین اشارے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ادبی مباحثے یا شاعرانہ چشمک فتنہ و فساد کی شکل اختیار کر لیتے تھے لیکن اس کا سبب بھی تو ایک دوسرے کو فوقیت و ترجیح دینا ہوتا تھا۔

اردو ادب میں سب سے اہم موازنہ انیس و دبیر کا ہے۔ خود ان کے زمانے میں ایک زمانے تک اردو داں طبقہ ’انیسئے‘ اور ’دبیریے‘ کے دو گروہوں میں تقسیم رہا ہے اور ہمیشہ ایک پر دوسرے کو ترجیح دیتا رہا ہے۔ اردو میں تقابلی تنقید کے انداز کی سب سے مشہور و معروف، شہرۂ آفاق قابل تقلید اور لائق صد آفرین و تحسین مثال ’’موازنہ انیس و دبیر‘‘ 1907ء ہے۔ اس میں شبلی نے انیس و دبیر کا تقابلی مطالعہ تقابلی تنقید کی مدد سے کیا ہے۔ موازنہ انیس و دبیر سے اردو میں تقابلی ادب و تقابلی تنقید کی باقاعدہ قابل تقلید ابتدا ہوئی ہے۔ موازنہ انیس و دبیر میں بلاغت کے جزئیات کے ضمن میں چودہ مثالیں دی گئی ہیں۔

اگرچہ تقابل اور موازنے کی روایت عربی و فارسی سے ماخوذ ہے اور ہمارے تذکروں میں بھی اس کی صورتیں ملتی ہیں۔ لیکن تقابل کی روایت کو امداد امام اثر نے بہت تقویت بخشی۔ ’’کاشف الحقائق‘‘ میں جا بجا اس طریقۂ کار کا اثر نے آزمایا ہے۔ لیکن شبلی کی اہمیت ان معنوں میں ہے کہ انہوں نے دو اہم ترین معاصر شعرا کے فکر و فن کا ہمہ جہتی مطالعہ باقاعدہ تقابلی تنقید کے انداز میں کیا ہے۔

انیس ودبیر یا موازنۂ انیس ودبیر سے قطع نظر آتش وناسخ، میر حسن ونسیم، داغ وامیر اور موجودہ دور اثر وفراق کا موازنہ کیا جاتا رہا ہے اور ان کی اچھائی اور برائی پر مضامین لکھے جارہے ہیں۔ معرکۂ چکبست وشرر موازنہ ہی کی ایک مثال ہے۔

دوشاعروں یا ادیبوں کا مقابلہ وموازنہ خواہ وہ ایک عہد کے ہوں یا دیگر زبانوں کے یہ کہاں تک اور کس حد تک درست ہے اور اس سے کچھ معنی خیز نتائج واثرات کی توقع کی جاسکتی ہے یا نہیں یہ ایک اپنی جگہ اہم سوال ہے۔ اور یہ بات بھی قابل غور ہے کہ تقابلی تنقید کو اسالیب تنقید میں شمار کیا جاسکتا ہے یا نہیں۔ محی الدین قادری زور نے تنقید کی تعریف میں رابرٹس اور گاڈکن کے اقوال نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> ''مسٹر رابرٹس (مقالات صفحہ۱) میں کہتے ہیں ''تنقید انسانی معلومات کے تمام شعبوں کے متعلق صرف مقابلہ کرنے یا خیالات کے ٹکرانے کے عمل کو کہتے ہیں اور گاڈکن (فورم ۴۵۱) میں رقم طراز ہیں کہ کسی کام کے کرنے کے دو طریقوں کے درمیان موازنہ کرنا اصلی تنقید ہے۔''

لیکن یہاں موازنہ سے اس کی مراد کام کرنے کے طریقے اور خیالات کے ٹکرانے سے پہلے دوشاعروں کا آپس میں موازنہ کرنا نہیں ہے۔ دو ادیبوں یا شاعروں کے باہمی مقابلہ وموازنہ کرنے میں یہ دشواری ہے کہ ہر فرد کے خیالات وتجربات اور احساسات مختلف ہوتے ہیں۔ ایک ہی عہد میں ہوتے ہوئے بھی ماحول، معاشرتی، ثقافتی یا جغرافیائی حالات، خانگی معاملات و حالات کے فرق سے بھی شاعری یا نثر پر اثر پڑتا ہے، معاشی آسودہ وخوش حالی اور بے اطمینانی بھی اثر انداز ہوتی ہے۔ اس لیے تقابلی مطالعہ، تقابلی تنقید کے انداز میں پوری غیر جانب داری کے ساتھ نہیں ہو پاتا۔ اس تقابلی مطالعے میں تقابلی تنقید صرف ایک چیز پر نگاہ رکھی جاسکتی ہے۔ محاسن شعری کے لحاظ سے کلام کیسا ہے۔ لیکن صرف روزمرہ، محاورہ اور صنعتوں کا استعمال وتصرف شاعر کی عظمت طے نہیں کرتا۔

اردو شعروادب میں تقابلی تنقید کی کئی مثالیں ملتی ہیں جن میں ''موازنۂ انیس ودبیر'' کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ اس موازنے کے جواب میں بھی بہت سے مضامین لکھے گئے ہیں لیکن وہ اس اہمیت کو نہ پہنچ سکے۔ موازنۂ انیس ودبیر کی خصوصیت یہ ہے کہ شبلی نے پہلے مرثیہ گوئی کی تاریخ لکھی ہے۔ اس کے بعد انیس کے کلام کی خصوصیت فصاحت، روزمرہ ومحاورہ، مضامین

کی نوعیت، ردیف وقافیہ کی موزونی، بلاغت اوراس کی جزئیات کا ذکر تفصیل سے کیا ہے پھراس کے بعد انیس و دبیر کے کلام سے مثالیں پیش کر کے انیس کی افضلیت و برتری ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

''موازنۂ انیس و دبیر'' اپنے تقابلی تنقید کے اندازِ نقد کی بدولت تنقید میں اہمیت رکھتا ہے۔اس لیے کہ اس میں بالعموم شعری محاسن ومعائب پر روشنی ڈالی گئی ہے اور انیس کی فضیلت ثابت کرنے کے لیے تقابل وموازنہ میں بھی ایک تقابلی تنقید کا انداز اختیار کیا گیا ہے۔مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی کے یہاں بھی تقابلی تنقید کا انداز ملتا ہے لیکن وہ شبلی سے مختلف ہے۔وہ غالبؔ ومیرؔ کے بعض ہم معنی اشعار کا مقابلہ وموازنہ کرتے ہیں،لیکن وہ موازنہ ومقابلہ تشریح وتجزیے کی حد میں قید ہے۔اثرؔ لکھنوی نے بعض دوسرے شاعروں پر بھی تنقید وتبصرہ کرتے ہوئے ان کا موازنہ ومقابلہ قدیم شعرا یا اسی عہد ووقت کے شاعروں میں سے کسی ایک سے کیا ہے۔اثرؔ لکھنوی دونوں شعرا کے اشعار کی تشریح کرتے ہیں اور معنوی خوبیوں کے اظہار پر تاثراتی رائے پیش کرتے ہیں۔''چھان بین'' اور اثر لکھنوی کے تنقیدی مضامین، دونوں میں تقابلی تنقید کا ڈھنگ اور تاثراتی رنگ نمایاں ہے۔

اردو میں المیزان اور موازنہ بھی تقابلی تنقید کی مثالیں ہیں۔تقابلی تنقید کے اسلوبِ نقد میں بھی بہت سی خامیاں ہیں۔ادبی تنقید کا جو مطمحِ نظر ہونا چاہئے اس کی اس سے تکمیل نہیں ہوتی۔ اول تو یہ کہ تقابل وموازنہ میں بعض نقاد ذاتیات اور غیر ادبی وغیرہ ضروری بحثوں میں الجھ جاتے ہیں۔ دوسری چیز یہ ہے کہ شاعر یا ادیب کے مقام کا صحیح تعین اور صحیح قدر و قیمت بھی واضح نہیں ہوتی۔ کلام کی کسی ایک خوبی کی وضاحت تو ہو جاتی لیکن کلی طور پر شاعر یا ادیب کس اہمیت و خصوصیت کا حامل ہے اپنے وقت اور اپنے عہد کی کس حد تک نمائندگی کرتا ہے پورے ادب میں اس کا کیا مقام ہے اس کا فیصلہ نہیں ہو پاتا۔

اردو کے تقریباً تمام قابل ذکر معتبر نقاد مختلف صورتوں میں تقابلی تنقید سے کام لیتے رہے ہیں جس کا معروف انداز غیر ملکی ادیبوں سے تقابل وموازنہ کی صورت میں دیکھا جا سکتا ہے۔ہمارے اکثر نقاد امریکی، فرانسیسی اور روسی ادیبوں سے تقابل وموازنہ کے بعد اپنے ادیبوں کی عظمت اور اہمیت ثابت کرتے رہے ہیں۔اس انداز کی مشہور مثال ڈاکٹر بجنوری کی ''محاسن کلام غالبؔ'' قرار دی جاسکتی ہے۔بجنوری نے پہلے تو ''دیوانِ غالبؔ'' کو ''ویدِ مقدس'' کا ہم رتبہ

قرار دے کر الہامی بنایا اس کے بعد ملارمے باولیر اور ورڈز ورتھ سے لے کر گوئٹے تک سے غالب کا موازنہ کیا۔

تقابلی تنقید یقیناً مفید ہوسکتی ہے مگر شرط یہ ہے کہ نقاد کا مقصد افہام وتفہیم کے ساتھ مقابلہ وموازنہ یا تقابل سے ادب پارے کے پوشیدہ گوشوں کو اجاگر کرنا ہو۔ عام طور پر دو تخلیق کاروں کے تقابلی موازنہ ہی کو تقابلی تنقید سمجھ لیا جاتا ہے حالانکہ گہری نظر سے تقابلی تنقید کا مطالعہ کرنے پر ادبی تخلیقات کی میزان بننے تک تقابلی تنقید ایک سے زائد صورتیں اختیار کرسکتی ہے۔

تقابلی تنقید کی سب سے معروف ومقبول اور روشن صورت تو وہی ہے جس کا ذکر مندرجہ بالا سطور میں کیا جاچکا ہے یعنی دو شعرا کے تقابلی مطالعے سے کسی ایک کو ترجیح دے کر دستارِ فضیلت کسی ایک کے سر باندھنا لیکن فضیلت کی اس دستار بندی کے لیے غیر جانب داری لازمی شرط ہے۔ کیونکہ نقاد اگر بد دیانتی سے کام لے گا تو اس کی تنقید، تنقید نہ رہے گی بلکہ ایک کے لیے اگر تعریف کا سبب بنے گی تو دوسرے کے لیے تنقیص کا ایک انداز اور اگر پہلے سے ہی ایک کے سر دستارِ فضیلت باندھنے کا تہیہ کرلیا گیا ہو تو پھر تقابلی تنقید توازن کی میزان نہ بن سکے گی۔

تقابلی تنقید کی آخری صورت یہ ہے کہ جس میں دو یا دو سے زیادہ زبانوں یا ممالک کے ادب یا کسی مخصوص صنف شعر وادب کے تقابلی مطالعے سے ادبیات یا کسی مخصوص فن پارہ یا فن کار و تخلیق کار کے مختلف گوشوں کو اجاگر کیا جاتا ہے۔ ایک ملک کا ادیب وشاعر یا پھر ادب دوسرے ملک کے ادیبوں کو شعوری یا غیر شعوری طور سے متاثر کرسکتا ہے اور کرتا رہتا ہے۔

موجودہ دور میں اس قسم کے تقابلی مطالعے کی اہمیت وافادیت یوں اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ نشر واشاعت اور ابلاغ وترسیل کی عالمگیر سہولتوں اور تراجم کی عام آسان دستیابی کے باعث اب جدید تجربات سے ادبی راہیں اور مخصوص رجحانات کی تعمیر وتشکیل میں معاون مددگار غیر ملکی ادبی شخصیات یا دیگر عصری تحریکوں کے بارے میں واقفیت حاصل کر کے ان سے تقابلی مطالعے کے بعد ان کی قدر وقیمت، اثرات اور انفرادیت وغیرہ کا بآسانی تجزیہ کیا جاسکتا ہے۔

☆☆☆

اطہر خان

ریسرچ اسکالر

ہمارے مدارس اور عصری تعلیم

سب سے پہلے ہم بات کرتے ہیں تعلیم کی اہمیت کی (کہ تعلیم قوموں کی شہ رگ ہے)، اسلام سے پہلے مختلف قوموں میں عورتوں کو میراث نہیں ملتی تھی، ان کا خیال تھا کہ جو لوگ دشمن سے پنجہ آزمائی کرتے ہیں اور قوم کی حفاظت و مدافعت کا فریضہ انجام دیتے ہیں میراث کا حق انہیں کو ہے، غرض جسمانی طاقت اور مقابلہ کی قوت کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ غلبہ اور اقتدار کا وسیلہ بھی اسی کو سمجھا جاتا تھا اور زمانہ کے حساب سے بڑی حد تک یہ بات درست بھی تھی لیکن اب حالات تبدیل ہو چکے ہیں اور اب قوموں کی تقدیر میدانِ جنگ کی للکار کی بجائے علم و تحقیق کے مراکز سے متعلق ہو گئی ہے، جو قوم علم و فن سے عاری و محروم ہو خواہ وہ تعداد میں کتنی ہی ہو لیکن اس کی حیثیت مٹی کے ڈھیر کی مانند ہے جس کو روندا جاتا ہے۔ اس کی کھلی مثال جاپان اور ہمارا ملک ہندوستا ہے۔

ہم لوگ آبادی کے اعتبار سے دنیا کی دوسری بڑی طاقت ہیں اور رقبہ میں بھی ہم کچھ کم نہیں ہیں۔ دوسری طرف جاپان ہے جو تعداد اور رقبہ دونوں میں ہم سے کم ہے لیکن آج ہمیں جاپان کے آگے دستِ سوال پھیلانا پڑتا ہے۔ یہ صورت حال محض علم و دانش کی طاقت کا ادنیٰ کرشمہ ہے۔ اسلام وہ مذہب ہے جس اپنی آمد کے اول دن سے علم پر زور دیا ہے۔ پیغمبر اسلام علیہ السلام جس دور میں پیدا ہوئے اور نبوت سے سرفراز ہوئے اس میں کیا کچھ برائیاں اور کوتائیاں نہیں تھیں جس سے بظاہر یہ خیال ہوتا ہے کہ پہلی وحی ظلم و جور کی مذمت اور عدل و انصاف کی بابت ہونی چاہئے تھی لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلی وحی میں ان چیزوں کا صراحۃً کوئی ذکر نہیں تھا بلکہ آپؐ سے کہا گیا کہ اپنے اس رب کے نام سے پڑھئے جو تمام کائنات کا خالق ہے یعنی سب

سے پہلی وحی تعلیم کے متعلق ہے کیونکہ علم ہی سے تمام بھلائیاں پھوٹتی ہیں اور برائیاں ختم ہوتی ہیں۔اب اس کے بعد درجہ آتا تعلیم کی تقسیم کا (دینی اور دنیاوی تعلیم)

جہاں علم کی اتنی اہمیت ہے وہیں آج ہم مسلمانوں میں بھی تعلیم کی نسبت سے دینی اور دنیاوی تعلیم کی اصطلاح قائم ہوگئی ہے۔قرآن وحدیث کی تعلیم کو دینی تعلیم اور عصری علوم کے سیکھنے،سکھانے کو دنیوی تعلیم کہا جاتا ہے۔حالانکہ اسلام میں علم کی ایسی کوئی تقسیم ہے ہی نہیں بلکہ علم کی محض دو قسمیں ہیں۔۱۔علم نافع ۔۲۔علم غیر نافع۔یعنی جو انسانیت کے لیے نافع اور ترقی کا ضامن ہو وہ نافع ہے اور ترقی کے بجائے تنزلی کا سبب بنے وہ غیر نافع ہے اور اللہ کے نبی علیہ السلام نے علم نافع کی دعا فرمائی ہے اور غیر نافع سے پناہ چاہی ہے۔اسلام کسی علم کا مخالف نہیں ہے پھر چاہے وہ میڈیکل کی تعلیم ہو،انجینئرنگ کا فن ہو یا پھر تکنیکی تعلیم کے دیگر شعبہ جات۔یہ سب کے سب انسانی خدمت اور انسانی فلاح و بہبود کے ذرائع ہیں اور یقیناً علم نافع کی فہرست میں آتے ہیں اور پھر قرآن مجید نے بھی کتنے ہی ایسے حقائق پر روشنی ڈالی ہے جن کا تعلق فلکیات سے ہے اور طبیعات،نباتات اور حیوانات کے علوم سے ہے۔بہر حال ان علوم کو حاصل کرنا جن سے کائنات کے اسرار و رموز کو جانا جا سکے قرآن مجید کا عین مطلوب ہے۔چنانچہ آپؐ نے دوسری قوموں سے جو جدید تکنیک حاصل ہوسکتی تھیں اس میں کسی بخل سے کام نہیں لیا اور اس کو کبھی تقاضائے دین کے منافی تصور نہیں فرمایا۔مدینہ لوگ زراعت پیشہ تھے اور اسلام سے پہلے کھجور کے نر اور مادہ درخت میں اختلاط (ملاکر) کی ایک خاص صورت اختیار کرتے تھے جس کو ''تابیر'' کہا جاتا تھا۔آپؐ نے ابتداً اسے بے فائدہ اور فضول عمل تصور کرتے ہوئے اس سے منع فرمادیا،لیکن جب اس سال پیداوار کم ہوئی اور لوگوں نے آپؐ سے اس کا ذکر کیا تو آپ نے اپنی رائے پر اصرار نہیں فرمایا اور آئندہ ایسا کرنے کی اجازت دیتے ہوئے کہا کہ تم اپنے دنیا کے امور میں زیادہ واقف ہو۔اسلامی عہد میں نہ صرف قدیم سائنسی علوم کو قبول کیا گیا بلکہ مزید ریسرچ کے لیے دار الخلافہ بغداد میں ''بیت الحکمت'' کا قیام عمل میں آیا۔یہی حال لغت اور زبان کا بھی ہے۔اسلام نے کبھی کسی زبان کی مخالفت نہیں کی۔آپؐ نے فرمایا کہ تمام زبانیں اللہ کی ہی پیدا کی ہوئی ہیں۔خود قرآن مجید نے ہمیں بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے ہر قوم میں انہیں کی زبان میں اپنا کلام نازل فرمایا۔اس لیے نہ معلوم کتنی زبانیں ہیں جنہیں اللہ کے کلام کے حامل ہونے کا شرف حاصل ہے۔اس لیے

کسی مسلمان کے لیے یہ بات ممکن نہیں کہ کسی بھی زبان کو بحیثیت زبان برا تصور کرے اور ان کے سیکھنے اور سکھانے کو بدگمانی اور گمراہی سمجھے اور یہ بہت بڑا مغالطہ ہے کہ علماء حضرات جدید علوم اور انگریزی زبان کے حاصل کرنے کو منع کرتے ہیں یا کسی زمانے میں منع کیا ہے۔ بلکہ مولانا قاسم نانوتویؒ نے جب دیوبند میں دار العلوم کی بنیاد رکھی تو سنسکرت زبان کو بھی داخل نصاب فرمایا۔ سنسکرت میں مشرکانہ محاورات زیادہ ہیں۔ یہ بات کیسے سوچی جاسکتی ہے کہ مولانا اس زبان کے مخالف نہ ہوں اور انگریزی زبان کے مخالف ہوں۔ دیوبند کے نصاب میں شروع ہی سے انگریزی، جیومٹری اور فلسفہ داخلِ نصاب رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ علماء نے کبھی بھی انگریزی زبان اور عصری علوم کی مخالفت نہیں کی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ہندوستان میں بعض ایسی شخصیتیں عصری تعلیم کا جھنڈا لے کر اٹھیں جو اگر چہ اسلام اور مسلمانوں کے تئیں مخلص تھیں مگر مغرب سے مرعوب ہو کر وہاں سے آنے والی ہر چیز پر لبیک کہنا شروع کر دیا۔ علماء کو اس انداز فکر سے اختلاف تھا نہ کہ عصری تعلیم سے۔ جہاں تک مدارس کی بات ہے جہاں خالص اسلامی علوم وفنون پڑھائے جاتے ہیں تو وہاں پوری طرح عصری علوم کو داخل نصاب کرنا طلبہ کو بیک وقت دونوں علوم سے محروم کرنے کے مترادف ہے۔ کیونکہ اسلام نے علم ومعرفت کے سلسلے میں جو احکامات دیئے اور اس کی وجہ سے پڑھنے پڑھانے کا جو رواج چل پڑا اور ہر جگہ کی ضرورت کے اعتبار سے ایجادات اور انکشافات کا اسلام بانی بنا ہے لیکن یہ وہ دور تھا جب علم شاخ در شاخ نہیں ہوا تھا اور ایک فرد کے لیے ممکن تھا کہ وہ جامع معقول ومنقول کی حیثیت سے سامنے آئے۔

اسلام ایک زندہ مذہب ہے اور اسلامی علوم وفنون کی کم از کم تعداد چودہ پندرہ تو ہے ہی، پھر ان میں سے ہر ایک کی متعدد شاخیں ہیں ان سب کا حق ادا کرتے ہوئے عصری علوم کو بھی تمامیت کے ساتھ شامل نصاب رکھنا ایک ناممکن امر ہے، اس لیے ان مدارس میں عصری علوم کا حصہ کم رکھا گیا ہے، لیکن اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ علماء اور دینی مدارس عصری تعلیم کے مخالف ہیں۔ اس وقت اس بات کی بڑی ضرورت ہے کہ مسلمان اعلیٰ فنی تعلیم حاصل کریں اور کوشش کریں کہ ہمارے سماج میں کوئی بچہ تعلیم سے محروم نہ رہے۔

بہر حال اس میں کوئی دو رائے نہیں ہے کہ آج بھی ہندوستان بھر میں لاکھوں مدارس ایسے ہیں جہاں دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ عصری تعلیم کا بھی معقول انتظام ہے اور نہ صرف لڑکوں

کے لیے بلکہ لڑکیوں کے لیے بھی دینی وعصری دونوں طرح کی تعلیم کا بہترین نظم ہے۔ گجرات، مہاراشٹر، کرناٹک، کیرالا، راجستھان وغیرہ ایسے صوبے ہیں جہاں ایسے مدارس کی بہتات ہے اور بڑی کامیابی وکامرانی سے اپنے فریضے کو انجام دے رہے ہیں۔ بہت سے چھوٹے مدارس میں انٹر تک اور بڑے مدارس میں بنیادی، ثانوی کے ساتھ ساتھ اعلیٰ تعلیم کا بھی عمدہ بندوبست ہے۔

جہاں بہت سے مدارس عصری نصابات کو اپنے یہاں مستقل بہترین اور ماہرین اساتذہ کے ذریعے مکمل کراتے ہیں وہیں بہت سے مدارس نے مختلف اسکول وکالجز کے سینٹر لیے ہوئے ہوتے ہیں جو پرائیویٹ طور پر اپنے طلبا کو اعلیٰ تعلیم سے سرفراز کرتے ہیں اور بہت سے مدارس اپنے طلبا کو مختلف بورڈ اور یونیورسٹیز سے فاصلاتی نظام کے تحت عصری نصابات سے جوڑتے ہیں اور ان کی رسائی اعلیٰ تعلیم تک کرادیتے ہیں۔ ان تمام باتوں کی روشنی میں یہ بات بہ بانگ دُہل کہی جاسکتی ہے کہ ہمارے مدارس نہ صرف دینی تعلیم کی خدمات انجام دے رہے ہیں بلکہ جدید اور عصری تعلیم کا فریضہ بھی کسی نہ کسی شکل میں انجام رے رہے ہیں۔

☆☆☆

''پریم چند کی عصری معنویت'' موضوع پر اظہار خیال کرتی ہوئیں پروفیسر پرگیا پاٹھک۔ اسٹیج پر موجود ہیں پروفیسر ارتضیٰ کریم، ایڈوکیٹ منیش تیاگی اور صدر شعبۂ اردو، پروفیسر اسلم جمشید پوری۔

لائبہ
ایم۔اے سال دوم

زبان کی ترقی میں ترجمہ کا کردار

ترجمہ ایک فن ہے، ایک ہنر ہے، اس فن میں ایک زبان کے متن کو دوسری زبان کے متن میں تبدیل کیا جاتا ہے۔ اسی لئے ترجمہ نگار کو دوزبانوں کا علم ہونا ضروری ہے۔ دوزبانوں سے واقفیت اور دونوں زبانوں پر ترجمہ نگار کو عبور حاصل ہونا چاہئے۔ بقول قمر رئیس:

> ''زبانوں کے درمیان فرق کو مٹانے میں ترجمہ نے جو اہم رول ادا کیا ہے، انسانی تہذیب کا ہر ورق اس کا گواہ ہے۔ انسانی علوم کو فروغ دینے میں جہاں اور بہت سے اسباب اور عوامل رہے ہیں وہاں ترجمہ بھی ایک محرک کا رول ادا کرتا رہا ہے۔''

دنیا میں جو علم بکھرا پڑا ہے، اس کو ایک زبان چاہ کر بھی اپنے دامن میں سمیٹ نہیں سکتی۔ اس عالمگیر نور اور سرور سے لطف وانبساط کے حصول کے لیے ایک زبان سے دوسری زبان میں تراجم ضروری ہیں۔ جب لوگ ایک دوسرے کے علم، مہارت اور تجربے کو کام میں لانے کی جستجو رکھیں گے تب تک ترجمے کا سہارا حاصل کرنا یقینی بات ہے۔ ترجمے کی ضرورت واہمیت نہایت مسلمہ ہے۔ زندگی کے ہر شعبے میں ترجمہ انسانیت کی خدمت کر رہا ہے۔ اگر دیکھا جائے تو دنیا کو گلوبل ولیج بنانے میں ترجمے کا کردار نہایت اہمیت کا حامل ہے۔

علم وآگہی، جذبے اور شعور، فکر واحساس، تکنیک اور سائنس کے علوم میں اشتراک کی آشامن میں رہے گی تب تک ذہن کے نہاں خانوں میں اور دل کے کسی گوشے میں یہ ضرورت جنم لے گی اور ترجمے کی اہمیت اور افادیت کا سوال ہوتا رہے گا۔

آج کے دور کو اگر ترجمے کا دور کہا جائے تو مبالغہ آرائی نہ ہوگی۔ آج ہمارے علم کی وسعت میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ہم کئی زبانوں کے لوگوں اور کمیونٹیز (Communities) کے

ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔ جس کی وجہ سے ہمیں گلوبلائزیشن (Globalization) کے احساس کو فروغ دینے میں مدد مل رہی ہے۔

ہر انسان اپنی مادری زبان سمجھتا اور بولتا ہے۔ مادری زبان سے ہی اسان کی فطرت کھلتی بھی ہے اور نکھرتی بھی ہے۔ اس لئے انسان کی ترقی کے لئے زبان کا فروغ بے حد ضروری ہے۔ آج جو انسان جتنی زیادہ زبانوں سے واقفیت رکھتا ہے اس کی ترقی کے امکان اتنے ہی زیادہ ہے۔

علم وسائنس کی ترقی کی وجہ سے آج دنیا سکڑتی اور چھوٹی ہوتی جا رہی ہے۔ جس کی وجہ سے مارشل میکلوہان نے دنیا کو گلوبل ولیج (Global Village) کہا۔

تراجم کا عمل انسانی مزاج، تاریخ وتمدن کی دریافت کا ایک اہم اور بھرپور ذریعہ ہے۔ انسان جو زبانوں، رنگوں اور جغرافیائی بندشوں اور سیاسی تفرقات کے ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے کی ذات کے لیے اجنبی ہوتے ہیں۔ ترجمے کے ذریعے ایک زبان کو جسے وہ جانتے نہیں ہیں اپنی زبان میں ڈھالتے ہیں اور اس چیز یا علم سے آشنائی حاصل کرتے ہیں۔ جیلانی کامران لکھتے ہیں کہ:

> ''ترجمہ جہاں الفاظ کے ذریعے انسانی علوم میں اضافہ کرتا ہے اور ذہن کی سرحدوں کو کشادہ کرنے میں مدد فراہم کرتا ہے تو اس میں ترجمہ کی تمدنی اور ثقافتی ضرورت بھی مضمر ہو جاتی ہے۔ وہاں ترجمہ کا عمل زبان کی ساخت کو بھی متاثر کترا ہے۔ خیالات وجذبات کو بیان کرنے کے نئے نئے اسلوب مل جاتے ہیں۔ نئے الفاظ وضع کرنے پڑتے ہیں۔ پرانے الفاظ کو دوبارہ استعمال کرنے سے ان میں وسعت پیدا ہو جاتی ہے۔ نئے محاورے اور نئے محاکات دستیاب ہوتے ہیں۔ نئے علوم سے آشنائی ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں نئی نئی اصناف کے ساتھ ذہن کا تعارف ہوتا ہے۔ اور فکر اور تحقیق کے نئے نئے سانچے اور نئے اسالیب مل جاتے ہیں۔''

زبانوں سے بھری اس دنیا میں کتنی ہی زبانیں اور بولیاں موجود ہیں اور ہر زبان و بولی میں فکر و احساس کا ایک تخلیقی ادب موجود ہے۔ اس خزانے سے لطف اندوز ہونے کے لئے ترجمے کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ ہر زبان اور بولی میں لوک گیت، سنگیت، کہاوتیں، داستانیں، قصے کہانیاں اور ہر پل بدلتے حالات کے عکس نظر آتے ہیں اور دنیا کے دوسرے ملک ان تک پہنچنے کے لئے کوشش

کرتے ہیں۔جس کی ایک کوشش ترجمہ ہے۔

آج جب دنیا کے مختلف حصوں سے لوگ ایک دوسرے کے قریب آ رہے ہیں تو زبانوں اور سیاست کی سرحدوں کو بھول کر ایک دوسرے کو سمجھنے اور جاننے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اصل میں ترجمہ دو تہذیبوں یا دو زبانوں کے درمیان ایک پل کا کام کرتا ہے۔جس کے ذریعے خیالات و جذبات ایک تہذیب سے دوسری تہذیب یا ایک ملک سے دوسرے ملک کی طرف جاتے ہیں۔

ترجمہ انسان کے علم میں اضافہ کرتا ہے۔ پرانے علوم وفنون اگر آج بھی زندہ ہے تو اس کی ایک وجہ ترجمہ ہی ہے۔ دنیا کے کسی بھی ملک کی زبان میں دستیاب علم، سائنس، ادب، صحیفے، موسیقی، فن وغیرہ کو دوسرے ملک کی زبان میں ترجمہ کر کے حاصل کیا گیا ہے۔جس سے ساری دنیا کے انسانوں کے بیچ بھائی چارہ بڑھا اور لوگ ایک دوسرے کے خیالات وافکار سے متاثر ہوئے اور یہ سرگرمیاں صرف ترجمہ کی ہی بدولت ہوئی۔

ہندوستان میں مختلف قسم کی زبانیں اور بولیاں موجود ہیں۔جن میں سے ۲۲ زبانوں کو آئینِ ہندوستان میں شمل کیا گیا ہے۔ یہاں مختلف قسم کی تہذیبیں اور روایات پائے جاتے ہیں جیسے کی بھارتیندو ہریش چندر نے کہا تھا:

چار کوس پر بدلے پانی، آٹھ کوس پر وانی
بیس کوس پر پگڑی بدلے، تیس کوس پر دھانی

اس بناء پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ دوسروں کی زبان اور بولی جاننے کے لئے ہمیں ترجمے کا سہارا لینا پڑتا ہے۔موجودہ دور میں اگر دیکھا جائے تو دنیا کے تمام ترقی یافتہ ملکوں میں علم وادب کا سب سے زیادہ فروغ ترجمہ کی وجہ سے ہوا۔ترجمہ کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے گوئٹے لکھتے ہیں:

''ان سبھی سرگرمیوں میں جن کی اہمیت اور قدر و قیمت سب سے زیادہ ہے
ان میں ترجمہ شامل ہے۔''

ترجمہ زبان وادب کی ترقی میں اہم کردار ادا کرتا ہے اور زبان وادب کے اظہار کا اہم ذریعہ ہے۔

ترجمہ کے ذریعہ ہی ہم دنیا کی تمام زبانیں جان سکتے ہیں۔ترجمہ آج کی انسانی زندگی کا ایک لازمی حصہ بن چکا ہے۔ اور زندگی کے دیگر شعبوں جیسے :ویب سائٹس، سوفٹ ویَر

انڈسٹری، میڈیکل انڈسٹری، قانون، سفرو سیاحت، فائنینس اور بینکنگ، تفریح، انفارمیشن ٹیکنالوجی ،صحافت وغیرہ میں اپنالوہا منوار ہاہے۔ذہانت اور علم کو بڑھانے کے لئے جذبات کے تبادلے کی ضرورت ہوتی ہے۔اور یہ تبادلہ صرف اور صرف ترجمہ کے ہی ذریعہ ممکن ہے۔

ترجمہ کی اہمیت قدیم زمانے سے لے کر دور حاضر تک قائم ہے۔ترجمہ کے ذریعہ ذہنی نشو ونما ہوتی ہے اور علمی آ گہی حاصل ہوتی ہے اور مختلف اقوام کی تہذیبوں سے بھی واقفیت حاصل ہوتی ہے۔

☆☆☆

نیک پیئر ٹیم شعبۂ اردو اور اس کے ریسرچ ورک کا معائنہ کرتے اور ڈاکٹر آصف علی سے معلومات کرتے ہوئے

معروف شاعر مظہر سیانوی کے تعزیتی جلسے میں ایڈوکیٹ سرتاج احمد اظہار خیال کرتے ہوئے۔

گوشۂ سرسید

پروفیسر صغیرافراہیم
علی گڑھ

سرسیداور پنجاب

سرسید نے اپنے تعلیمی واصلاحی مشن کی ترویج وترقی، نیز رؤساء، نوابین وعوام الناس کا مالی اور عملی تعاون حاصل کرنے کے لیے ہندوستان کے مختلف علاقوں کے دورے کیے۔ وہ کئی صوبوں میں گئے ۔انھوں نے کلکتہ کا دورہ کیا، وہ حیدرآباد دکن گئے، لیکن صوبۂ پنجاب کو یہ امتیاز حاصل رہا کہ سرسید نے اس صوبے کے پانچ سفر کیے۔ اور ایک مرتبہ تو ان کا قیام خاصا طویل تھا، جس کی تفصیل آئندہ سطور میں بیان کی جائے گی۔

دراصل سرسید کی نظر میں پنجاب کی بڑی اہمیت تھی، اس لیے کہ یہ صوبہ دیگر ہندوستانی صوبوں کے مقابلے میں زیادہ ترقی یافتہ اور خوش حال تھا۔ یہاں تعلیم کا دور دورہ تھا۔ یہاں سکھ ریاستوں کے علاوہ دو بڑی مسلم ریاستیں بھی تھیں، یعنی بھاول پور اور مالیر کوٹلہ۔ اب یہ الگ بات کہ مسلم ریاستوں کے علاوہ کئی سکھ ریاستوں نے بھی سرسید کے ساتھ بھرپور تعاون کیا۔ غالباً اسی لیے سرسید نے پنجاب کو بہت اہمیت دی، اور اہل پنجاب نے بھی ان کا کھلے دل اور کھلی باہوں سے زوردار خیر مقدم کیا۔

سرسید کو بخوبی احساس تھا کہ ''پنج آب'' کی سرسبز وشاداب سرزمین نہ صرف رِشیوں، مُنیوں ،صوفیوں اور گوروؤں کا مسکن کہلاتی ہے بلکہ یہ زبان وادب کا گہوارہ بھی رہی ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ جب ۱۸۵۰ء میں جب پنجاب ایسٹ انڈیا کمپنی کے زیرِ نگیں آ گیا تو لارڈ ڈلہوزی نے اس کو برطانوی حکومت میں شامل کرلیا تھا، باور ہو کہ اُس وقت بھی یہ برصغیر کا سب سے زرخیز اور مردم خیز علاقہ تھا۔ رقبۂ پنجاب شمال میں ہمالہ تک، مغرب میں صوبہ سرحد اور بلوچستان تک، جنوب میں سندھ اور مشرق میں صوبہ متحدہ اور راجپوتانہ تک پھیلا ہوا تھا۔ عہدِ سرسید میں مذکورہ صوبے میں ایک طرح ۳۴ ر چھوٹی بڑی دیسی ریاستیں تھیں۔ بہاول پور، روہتک، کپورتھلہ، پٹیالہ، نابھا، فرید

کوٹ، مالیر کوٹلہ وغیرہ کی علم وادب کے اعتبار سے بھی اپنی شناخت رہی ہے۔ مالیر کوٹلہ اِس لیے اہم ہے کہ جب یہاں کے نواب شیر محمد خاں نے آپسی بھائی چارہ، باہمی رواداری، اخوت و یگانگت کو برقرار رکھنے کے لیے شری گورو گوبند سنگھ جی کے صاحبزادوں کے لیے کلمہ تاسف ''ہا'' کا نعرہ بلند کیا تھا اُسی وقت سے صوبہ پنجاب کے تمام اضلاع نے بُرائیوں کے خلاف اپنی دیرینہ روایت کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایک نئی تاریخ رقم کی ہے۔ اِس سُنہری تاریخ کے تعلق سے کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ نے کہا ہے:

جس کی ہر وادی گلستاں جس کا ہر صحرا چمن
رشک فرماتی ہے جس پر وادیٔ گنگ وجمن
جس کو ورثہ میں ملی محنت، شجاعت، بانک پن

سرسید اس حقیقت سے بھی آگاہ تھے کہ صدیوں سے اِس سرزمین پر محبت ومروت اور قومی یک جہتی کے پھول کِھل رہے ہیں۔ اسی لیے سرسید کئی مرتبہ اپنے احباب کے ساتھ مشترکہ وراثت کے اِس دیار میں وارد ہوئے جس کا نام پنجاب ہے اور روایت کا پاس ولحاظ کرتے ہوئے اہل پنجاب نے دل کھول کر اُن کے ساتھ تعاون کیا، سرآنکھوں پر بٹھایا۔ اِس تعلقِ خاص کا ذکر الطاف حسین حالؔی نے ''حیاتِ جاوید'' میں اِس طرح کیا ہے:

''پنجاب والے سرسید کی منادی پر اِس طرح دوڑے جیسے پیاسا پانی پر دوڑتا ہے۔ انھوں نے صرف یہی نہیں کہ مدرسۃ العلوم کو مالی مدد پہنچائی بلکہ سچ یہ ہے کہ سرسید اور اُن کے کاموں کی کسی صوبہ نے عام طور پر ایسی قدر نہیں کی جیسی پنجاب والوں نے کی''۔ (ص: ۵۸۵)

اس دور کا پنجاب آج کے پنجاب سے کہیں زیادہ وسیع وعریض اور خاصا مختلف تھا۔ آج کا ہندوستانی، پاکستانی پنجاب اُس وقت ہماچل پردیش کے ہریانہ، حتیٰ کہ دہلی تک، علاقے پنجاب کا حصہ ہُوا کرتے تھے (واضح ہو کہ ۱۸۵۷ء کے واقعات کے بعد، برطانوی حکومت نے (انتقاماً) دہلی کو پنجاب کا ایک حصہ بنا دیا تھا اور کبھی کا دارالسلطنت دہلی کچھ عرصہ کے لیے محض پنجاب کا ایک ضلع بن کر رہ گیا تھا۔ اس لحاظ سے سرسید بھی پنجاب کے باشندے بن گئے تھے۔ یاد رہے کہ حیات جاوید کے مصنف حالؔی کا وطن پانی پت بھی پنجاب ہی کا ایک حصہ تھا۔ لہٰذا ہر وہ بزرگوں کے لیے پنجاب کے ساتھ ایک تعلق خاطر لازم تھا اور غالباً اہل پنجاب بھی سرسید کو اپنے ہی دیس کا باسی سمجھتے تھے۔ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس دور کے حالات میں یہ تمام عوامل کارفرما تھے۔

سرسید نے صوبہ پنجاب کا سفر کل پانچ مرتبہ کیا۔ پہلی مرتبہ ۲۹؍دسمبر ۱۸۷۳ء کو پنجاب تشریف لائے لیکن سب سے طویل اور سب سے اہم اُن کا وہ اٹھارہ روزہ سفر ہے جو سفرِ پنجاب کے نام سے معروف ہوگیا اور جس کا تفصیلی ذکر یہاں مقصود ہے۔ سرسید ۲۲؍جنوری ۱۸۸۴ء کو مولوی محمد اسماعیل خاں (رئیس دتاولی ضلع علی گڑھ)، مولوی سید اقبال علی (جج بارہ بنکی) اور سید محمد علی (برادر نسبتی سید حامد) کے ہمراہ علی گڑھ سے روانہ ہوئے، دہلی سے محمد اکرام اللہ خاں ان کے ساتھ ہولیے۔ ۲۳؍جنوری کو یہ قافلہ لدھیانہ پہنچا، نواب علی محمد خاں کی کوٹھی میں قیام ہوا۔ ''تہذیب الاخلاق'' اور کالج کے تعلق سے گفتگو ہوئی۔ ۲۴؍جنوری کو جالندھر میں کنور ہرنام سنگھ اہلو والیہ کے یہاں قیام پذیر ہوئے۔ مساوات اور یکجہتی پر گفتگو ہوئی۔ ۲۵؍اور ۲۶؍جنوری کو امرتسر میں قیام کیا۔ جہاں انھوں نے مغربی علوم وفنون پر روشنی ڈالی۔ اور اپنے میز بانوں کو کالج کی ضرورتوں سے واقف کرایا۔ ۲۷؍جنوری کو بٹالہ ہوتے ہوئے وہ گورداس پور پہنچے۔ وہاں انھوں نے جدید علوم پر عبور حاصل کرنے کی بات کہی۔ خصوصاً تعلیمِ نسواں کی جانب توجہ دلاتے ہوئے انھوں نے ۲۸؍جنوری کو خواتین پنجاب سے خطاب کیا۔ ۲۹؍جنوری کو دوبارہ امرتسر آئے اور ٹاون ہال میں لیکچر دیا جس کا مرکز ومحور اتحاد باہمی اور جدید تعلیم تھا۔ امرتسر سے لاہور پہنچے، تو وہاں ۲؍فروری کو ''اسلام'' کے عنوان سے خطبہ پیش کیا۔ ۴؍فروری کو رئیسِ جالندھر بکر ما سنگھ بہادر کی حویلی میں قیام پذیر ہوئے اور وہیں عوام سے خطاب کیا، ۵؍فروری کو پٹیالہ میں سائنس اور انگریزی تعلیم کے تعلق سے ریزولیوشن پاس کیے گئے۔ اِس اعتبار سے بھی یہ سفر تاریخی حیثیت کا حامل ہے کہ سرسید نے اہلِ پنجاب کو ''دلاورانِ پنجاب'' کے لقب سے سرفراز کیا۔ پروفیسر ثریا حسین نے اپنی کتاب ''سرسید احمد خاں اور اُن کا عہد'' میں اس سلسلے میں لکھا ہے:

> ''سرسید احمد خاں کا سفرنامۂ پنجاب قومی جدوجہد کی ایک مختصر روداد ہے جس کا بنیادی مقصد اپنے تعلیمی مشن کو فروغ دینا اور قوم کو جدید مغربی تعلیم کی ترویج پر متوجہ کرنا تھا۔ دلاورانِ پنجاب نے بھی (سر) سید کے قافلہ کی راہ میں آنکھیں بچھائیں اور دورانِ سفر انھوں نے بھی امیر، غریب، ہندو، مسلمان، اراکین آریہ سماج اور ہندو سبھا نیز اسکول و کالج کے لڑکوں سے ملاقاتیں کیں اور سب کا دل اپنی دردمندی اور حق گوئی سے جیتا اور اپنا پیغام علم وعمل دوسروں تک پہنچایا اور ان میں تحرک پیدا کیا''۔ (ص: ۲۸۲)

پروفیسر ہارون خاں شروانی جو 'سفرِ پنجاب' کے اہم رُکن نواب اسمٰعیل خاں (رئیس دتاولی)

کے بھتیجے تھے، وہ اپنے مضمون ’’سید احمد خاں اور ہندو مسلم اتحاد‘‘ میں لکھتے ہیں کہ:

’’مدرستہ العلوم مسلمانان‘‘ یعنی (M.A.O. College, Aligarh) کے قیام کے بعد سب سے پہلا ایڈریس جو اس کالج میں کسی والیِ ملک کو دیا گیا وہ ایک سکھ مہاراجہ یعنی مہاراجہ سر مہندر سنگھ بہادر فرماں روائے پٹیالہ کی خدمت میں تھا‘‘۔

اس ایڈریس میں سیّد والا گُہر نے کالج کے متعلق جس پالیسی کا اظہار کیا ہے وہ یہاں نقل کرنے کے قابل ہے۔ وہ کہتے ہیں:

’’اس مدرسہ کے جو قواعد تعلیم قرار پائے ہیں ان کے موافق ہندو اور مسلمان دونوں اس مدرسے میں تعلیم پائیں گے۔ اس کے بانیوں کا مقصد ہندوستان میں **علم و روشن ضمیری** پھیلانے کا ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کی دونوں قومیں یعنی ہندو اور مسلمان برابر ترقی کریں اور علم و ہنر سے فیض یاب ہوں۔‘‘

سر سید کے موثر خطاب کے تحت مہاراجہ پٹیالہ نے جو جواب دیا اس کا ایک حصہ ملاحظہ ہو:

’’اس سوسائٹی کا یہ مقصد ہے کہ اہل ہند خواہ وہ کسی ملّت و مشرب کے ہوں ان کو فائدہ پہنچے۔ اور مدرستہ العلوم کی تدبیر میں اس سے بھی عمدہ اصول کو ملحوظ رکھا گیا ہے کہ اس میں تعلیم علوم عقلیہ کی بلا اختلاف ملّت و مذہب یکساں ہو...میری دانست میں آپ بانیوں کی یہ دانش مندانہ تدبیر بالتخصیص نہایت عمدہ ہے۔‘‘ (تہذیب الاخلاق، جشنِ سر سید، ۲۰۱۷ء، خصوصی پیش کش-۱، ص:۷۸)

خلیفہ احمد حسن (وزیر اعظم مہاراجہ پٹیالہ)، خان بہادر برکت علی خاں (لاہور)، سر سکندر علی حیات، فتح علی خاں بہادر قزلباش، شیخ غلام حسین سوداگر (گجرات پنجاب)، غلام احمد قادیانی، پیر بخش (گورداس پور)، شمس الدین (لاہور)، غلام نبی (شاہ پور)، نور احمد (انبالہ)، عبدالغنی (سیالکوٹ)، نیاز محمد (جالندھر)، محمد شاہ دین (لاہور)، خوشی محمد (مالیر کوٹلہ)، مُراد علی (جالندھر) محمد افضال الدین (لاہور)، رحمت اللہ (گجرات، پنجاب) وغیرہ پنجاب کی وہ قابل قدر ہستیاں تھیں جنھوں نے علی گڑھ تحریک کو تقویت بخشی اور یہ تمام حضرات اس کے استحکام میں معاون ہوئے۔

سر سید نے دورانِ سفر اضلاع کے اعتبار سے پنجاب کے جن غیر مسلم حضرات کا انتہائی محبت

سے ذکر کیا ہے اُن میں لدھیانہ کے منشی چتر سنگھ، منشی رام رجپال، سردار رچھپال سنگھ، لالہ درگا دت، لالہ کشور لعل اور لالہ امراؤ سنگھ اہم ہیں۔ جالندھر کے بابو لچھمن داس، پنڈت شیو نرائن، بابو سلامت رائے، کنور ہرنام سنگھ اہلو والیہ، سردار بکرما سنگھ اور بھگت رام کے نام خصوصی طور پر شامل ہیں۔ اسی طرح امرتسر سے لالہ رام چندر، گوپی رام، نرائن داس، رام سنگھ، گنگا رام بخش اور لالہ بہاری کا سرسید نے بیحد شکریہ ادا کیا ہے۔ گورداس پور میں سردار شیر سنگھ، رائے رام داس، نرائن داس، منشی ٹیک چند، سردار پرتاپ سنگھ، رائے بوٹا مل، لالہ بشن داس، نرنجن لال، باوا گرم سنگھ، باوا پرتاپ سنگھ، باوا لچھمن سنگھ، بشمبھر ناتھ، نرائن سنگھ قابل ذکر ہیں۔ پٹیالہ کا ذکر کرتے ہوئے وہ سردار بسنتا سنگھ اور لالہ منسارام کے بے حد ممنون ومشکور نظر آتے ہیں۔

لاہور کے قیام کے بیان میں سرسید نے مہاراجہ کپورتھلہ کی کوٹھی کا تفصیلی ذکر کیا ہے جہاں انھوں نے نہ صرف قیام کیا، بلکہ مستقبل کے منصوبے بھی بنائے۔ لاہور میں جن غیر مسلموں کے وہ مشکور ہوئے ان میں سردار دیال سنگھ مجیٹھا، پنڈت ہرندر ناتھ، پنڈت امرناتھ، لالہ سنگم لال، لالہ رام کشن، ڈاکٹر برج لال گھوش، منشی گوپال داس، مسٹر بھوشن مُکھر جی، رام گوپال بوس اور پیارے لال وکیل اہم ہیں۔

سرسید اور رفقائے سرسید کی کائنات درکائنات کے تعلق سے دانش وران ادب متفق ہیں کہ مدرسۃ العلوم، یعنی محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کی تعلیمی اور تعمیری سرگرمیوں کے پیش نظر سرسید احمد خاں نے برصغیر کے تقریباً تمام بڑے صوبوں کا دورہ کیا۔ اُن کے ہمراہ بغیر کسی تخصیص وتمیز کے وہ لوگ شامل ہوئے تھے جنھیں علی گڑھ تحریک سے گہری دلچسپی تھی۔ ہندو مسلمان، سکھ، عیسائی سبھی مل کر تعلیمی مشن کو کامیاب بنانے کے جتن کرتے تھے اور چندہ دینے کی اپیل کرتے تھے۔ قابل ذکر ہے کہ اس سلسلہ میں انھیں سب سے زیادہ مدد صوبہ پنجاب سے ہی ملی۔ اِس دیار میں انھوں نے بیسیوں جلسوں سے خطاب کیا اور پیش کیے گئے سپاس ناموں کا جواب دیا۔ جن سے موصوف کی تعلیمی، تہذیبی اور فکری حکمت عملی ظاہر ہوتی ہے۔ ہارون خاں شروانی مذکورہ تحریروں اور تقریروں کے ضمن میں فرماتے ہیں:

> ''شاید ان میں سب سے نمایاں وہ ایڈریس تھے جو ہندو مسلمانوں کے ملے جلے اداروں یا خالص غیر اسلامی اداروں مثلاً آریہ سماج کی طرف سے تھے اور جو (بات) خاص طور پر قابل ذکر ہے وہ یہ کہ ان میں سے ہرادارہ سید صاحب کی بے تعصبی اور ملی جلی قومیت کے خیال کی داد دینے

میں (ایک) دوسرے پر سبقت لے جا رہا تھا۔ پھر سید صاحب نے ان سپاس ناموں کے جواب میں جو اصول پیش کیے وہ ایسے تھے کہ اگر انھیں آج کل کے زمانے میں بڑے سے بڑے قوم پرست بھی پیش کریں تو تعجب نہ ہوگا۔ چند مثالیں کافی ہوں گی:

''...جناب سید صاحب صرف ایک قوم یا ایک فرقے کے ہی مددگار نہیں بلکہ وہ جناب بابو کیشپ چندر سین اور شری سوامی دیانند سرسوتی کے پیروؤں کو بھی اسی نظر عنایت سے دیکھتے ہیں۔ وہ خاص مسلمانوں ہی کے معاون نہیں بلکہ وہ کل ملک کے مددگار، کل ہندوستان کے جان نثار ہیں''۔(ایڈریس طلبائے گورنمنٹ اسکول جالندھر)

''...ایک اور امر جس کی طرف آپ کا صلح کل خیال ہمیشہ مبذول رہا قابل شکر گزاری عامہ ہے: اور وہ اتحاد مابین ہر فرقہ بشر اور خصوصاً ہندو اور مسلمان گروہان عظیم ہند کا ہے۔(سپاسنامہ باشندگان گورداسپور)''

(سید احمد خاں اور ہندو مسلم اتحاد، ص:۸۰)

اس یادگار سفرِ پنجاب کے دوران مدرسۃ العلوم کے قیام کے سلسلے میں سرسید نے انجمن اسلامیہ لاہور میں ۲۹ ر دسمبر ۱۸۷۳ء کو قومی عزت اور غیرت نیز تعلیم و تربیت کے سلسلہ میں جو تقریر کی اُس میں انھوں نے اہل پنجاب کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا تھا:

''میں ایک مدت دراز سے آپ صاحبوں کی زیارت کا مشتاق تھا۔ اسی اشتیاق سے میں نے ایک لمبا سفر اختیار کیا اور آج میں اپنے تئیں نہایت معزز، خوش قسمت پاتا ہوں کہ آپ صاحبوں کی خدمت میں حاضر ہوں۔ آپ صاحبوں کی ملازمت (کذا) سے جو عزت مجھ کو حاصل ہوئی، میں اپنی تمام زندگی کی کسی ساعت کو اس سے زیادہ معزز نہیں سمجھتا''۔

فرحت و انبساط کے خوشگوار ماحول میں سرسید نے خلوصِ دل اور نیک نیتی کے ساتھ فرمایا:

''ملک پنجاب ایک مشہور و نام آور ملک ہے۔ اس کی شادابی اور سرسبزی، خوبی اور خوش نمائی تمام ہندوستان میں ضرب المثل ہے۔ یہ ملک صرف اپنی ملکی خوبیوں ہی کے سبب سے نام آور نہیں ہے بلکہ اس میں ایسے حالات گزرے ہیں جو ایک (کذا) نہایت دلچسپ اور عبرت انگیز تاریخی

واقعات کو بھی یاد دلاتے ہیں''۔

انھوں نے زمینی حقائق کی اہمیت اور افادیت کو محسوس کرتے ہوئے مزید فرمایا تھا:

''رئیسان و بزرگان و سرداران ملک پنجاب کی نیکی اور فیاضی اور عالی ہمتی اور ان کے خاندانوں کی نام آوری بھی دُور دُور ملکوں میں مشہور ہے۔ ملازمانان سرکاری بھی اس ملک کے بہ نسبت دوسرے ملکوں کے زیادہ تر نام آور معزز ہیں۔ یہ آپ ہی کے ملک کی خوش نصیبی ہے کہ آپ کا ملک ایسے سرکاری نوکروں سے جیسے کہ نجم الہند خان بہادر، محمد حیات خان صاحب سی.ایس.آئی. ہیں اور ایسے آفتاب پنجاب جیسے کہ خان بہادر محمد برکت علی خاں صاحب ہیں روشن و منور ہے جس کا نام نہ صرف ہندو پنجاب میں مشہور ہے بلکہ ان مسلمانی ملکوں میں بھی جو پنجاب کے ہم سرحد ہیں، ان کی نیکی و فیاضی اور بہادری اور اخلاق کی شہرت ہے۔ پس یہ تمام چیزیں انسان کے دل کو ضرور ایسے بزرگوں کی زیارت و ملازمت کے لیے کھینچتی ہوں گی مگر ان سب باتوں سے زیادہ جس چیز نے میرے دل پر اثر کیا ہے اور آپ صاحبوں کی ملازمت (کذا) کا مشتاق بنایا ہے وہ ایک ایسی چیز ہے جو ان سب باتوں سے بڑھ کر ہے۔ اور جو ہندوستان میں عنقا صفت ہو گئی ہے ــــ مگر خدا کا شکر ہے کہ میں پنجاب میں اس کا نشان پاتا ہوں۔ وہ چیز قومی ہمدردی ہے''۔(خصوصی پیش کش -۲، تہذیب الاخلاق، جشن سرسید ۲۰۱۷ء)

سرسید کی وفات سے بہت پہلے اُن کے انفرادی اور عوام سے مختلف نقطہ نظر کی وجہ سے مخالفت کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ لیکن ان کے سانحہ ارتحال نے اس پر بڑی حد تک قدغن لگا دیا۔ در اصل سیدوالا گُہر نے توہم پرستی کے خلاف جو مورچہ کھولا اور حقائق کو منطقی اور سائنسی زاویے سے دیکھنے کی کوشش کی اس پر زبردست واویلا مچا۔ اِس بابت منطقی اور استدلالی انداز میں انھوں نے فرمایا تھا:

''اے بزرگان پنجاب! میں آپ سے تمثیلاً ایک بات عرض کرتا ہوں۔ میں فرض کرتا ہوں کہ میں بدعقیدہ ہوں مگر میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ اگر ایک کافر، مرتد آپ کی قوم کی بھلائی پر کوشش کرے تو کیا آپ اس کو

اپنا خادم، اپنا خیر خواہ نہ سمجھیں گے''۔(سفر نامہ پنجاب)

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی قدیم دیواروں پر، کمروں میں اوراسٹریچی ہال میں جو کتبے نصب ہیں وہ اُن عطیات کے شاہد ہیں جنھوں نے ایم.اے.او. کالج کی بنیادوں کو مستحکم کیا ہے۔ ''تہذیب الاخلاق'' اور ''انسٹی ٹیوٹ گزٹ'' کے علاوہ ''سفر نامہ پنجاب'' کے روشن ابواب مادرِ درس گاہ کے استحکام کی کہانی کو واضح کرتے ہیں۔ اِس بابت سرسید فرماتے ہیں:

''اس شہر میں آپ صاحبوں نے جو صدر سب کمیٹی واسطے تحصیل چندہ مدرسۃ العلوم کے مقرر کی ہے اس کی شکرگزاری ہم مسلمانوں پر واجب ہے اور امید ہے کہ جو لوگ اس کے محرک ہوئے ہیں اس کی جزائے خیر خدائے کریم سے پاویں گے۔ اور اس میں بھی شک نہیں کہ جب تک مسلمانوں کی نسل ہندوستان میں ہے ان کا نام نامی ہمیشہ ہماری قوم میں یاد رہے گا۔ اب میں آپ صاحبوں کا دل وجان سے شکریہ ادا کرتا ہوں اور جس طرح کہ میں بزرگان پنجاب کا شکرگزار اور ممنون ہوں اسی طرح پنجاب کے نامی گرامی اخباروں اور ان کے ایڈیٹروں، بالتخصیص 'پنجابی اخبار' لاہور و' کوہ نور' اخبار اور انجمن پنجاب و پٹیالہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے مدرسۃ العلوم مسلمانان کی بڑی تائید کی اور جو حق قومی ہمدردی کا تھا وہ ادا کیا۔ خدا ہمارے کاموں کا مددگار ہو''۔(خصوصی پیش کش-۲، تہذیب الاخلاق، جشن سرسید ۲۰۱۷ء)

سرسید کی وہ تقریر جو انجمن اسلامیہ امرتسر کے ایڈریس کے جواب میں ۲۶؍جنوری ۱۸۸۴ء کو کی گئی، اُس کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''آج یہ دوسری عزت ہے جو امرتسر میں میری عزیز اور پیاری قوم نے مجھ کو دی ہے۔ گو میں اس عزت کا مستحق نہیں ہوں مگر جو ہمدردی اور مسافرنوازی میرے ہم وطن اور میری قوم کے بزرگوں نے امرتسر میں مجھ ناچیز کے ساتھ کی اس سے مجھے امید ہے کہ ہماری قوم میں اب یہ بات پیدا ہو چلی ہے کہ وہ جس شخص کو اپنے خیال میں ملک کی بھلائی یا قوم کی خیر خواہی کرنے والا سمجھتے ہیں اس کی قدر کرتے ہیں۔ میں قبول کرتا ہوں کہ یہ ایڈریس جو مجھے دی گئی ہیں (کذا) اس کا مستحق نہیں ہوں مگر اس جوش

سے جو اس وقت ظاہر کیا گیا ہے میں خدا سے امید رکھتا ہوں کہ (وہ) ہماری قوم میں ایسے لوگ پیدا کرے گا جو اس عزت کے مستحق ہوں گے''۔(خصوصی پیش کش-۲،تہذیب الاخلاق،جشن سرسید ۲۰۱۷ء)

رودادِ چمن کی چھوٹی چھوٹی باتوں اور اُن سے وابستہ قلبی لگاؤ کی زیریں لہروں کو سمجھنے کے لیے گورداس پور میں پیش کیا گیا سید والا گُہر کا جوابی ایڈریس ملاحظہ ہو:

''بزرگانِ من! آج اس پلیٹ فارم پر ایسے مقام میں جو پنجاب کے کونہ پر واقع ہے،اس ہمدردی سے جو میری عزت کی گئی ہے، ہمیشہ جب تک میں زندہ رہوں گا اس کو یاد رکھوں(گا)۔ سچ بات تو یہ ہے کہ جن چیزوں کا آپ نے براہ مہربانی مجھ کو مستحق تصور کیا ہے درحقیقت میں اس کا مستحق نہیں ہوں--- میں سمجھتا ہوں کہ ہر مسلمان پر بلکہ ہر رعایا پر جو عادل گورنمنٹ کی رعایا ہو ایسا ہی کرنا فرض ہے۔ مدرستہ العلوم جس کا آپ نے بہت تعریف کے ساتھ ذکر کیا ہے واقعی ہماری قوم کے لیے جس میں ہندو اور مسلمان سب شامل ہیں ایسا ہی ہوگا جیسا آپ نے اس کو خیال کیا--- اس کے بانی کا خطاب جو آپ نے مجھے دیا ہے اصل میں اس کا استحقاق انہی لوگوں کو حاصل ہے جنھوں نے روپیہ اور محنت سے اس میں مدد کی اور مدد دیتے جاتے ہیں''۔(سفرنامہ پنجاب)

سپاس نامے،اعزازات،خطابات اور خطبات کے علاوہ رئیس مالیر کوٹلہ نواب محمد علی خاں کے خط سے بعض اہم تفصیلات کے ساتھ چندہ بھیجنے اور ہوسٹل کے نظام کے سلسلے سے بھی اطلاع ملتی ہے-اس خط کا اک مختصر اقتباس ملاحظہ ہو:

''تہذیب الاخلاق میرے پاس برابر پہنچتا ہے اس کو میں خوب غور سے پڑھتا ہوں اور اس کے مضامین کی دل سے قدر کرتا ہوں خدا آپ کو قومی خدمت کے لیے بہت دنوں تک زندہ رکھے''۔(سفرنامہ پنجاب)

مالیر کوٹلہ کے ایک علی گیرین جناب خوشی محمد ناظر صاحب جو سرسید سے بڑی عقیدت رکھتے تھے۔ اپنے خط مؤرخہ ۱۵؍دسمبر ۱۸۹۴ء میں قلعہ رحمت گڑھ سے لکھتے ہیں:

''قبلہ وکعبہ جناب سرسید کالج میگزین سے معلوم ہوا کہ امسال کانفرنس کا اجلاس علی گڑھ میں ہوگا۔ فدوی کا ارادہ ہے کہ کانفرنس میں شریک ہوکر

ایک ریزولیوشن پیش کرے، جس کا لب لباب یہ ہو کہ حامیان قوم کو ایک
قلیل مگر مستقل سالانہ چندہ دینا چاہیے۔ کیوں کہ اگر ایک مستقل ذریعہ
آمدنی کا پیدا ہو جاوے تو متفرق اور منتشر چندوں سے بدرجہا بہتر ہے''۔

اہم بات یہ نہیں ہے کہ اہل پنجاب نے دل کھول کر چندہ دیا، سرسید کو سرآنکھوں پر بٹھایا بلکہ اہم بات یہ ہے کہ صوفی سنتوں اور گوروؤں کی اِس مقدس سرزمین نے سرسید اور رفقائے سرسید کو منظّم طریقے سے تعصب، تنگ نظری اور قتل وغارت گری کے خلاف مورچہ قائم کرنے کی ترغیب دی اور حصولِ علم ودانش کی راہیں ہموار کیں۔ ہمت وحوصلہ کے ساتھ ساتھ میسر آنے والی روحانی قوت کی بدولت انھوں نے نہ صرف انسانی عمل اور اس کی بامعنی زندگی پر زور دیا بلکہ انسانی رشتوں میں جدید علوم وفنون اور تہذیب وتمدن کی بھی نشاندہی کی۔ نتیجتاً علی گڑھ تحریک نے جبرواستبداد، خوف اور تناؤ کے ماحول میں بھی خلوص وصداقت، قوتِ عمل اور بے لوث جذبہ ہمدردی کی وکالت کی اور عالمی سطح پر منافرت، رقابت، کدورت اور رشک وحسد پر نشتر زنی کرتے ہوئے صلح جوئی، باہمی رفاقت، مساوات اور اتحاد کی نشاندہی کی جس کی ضرورت آج سب سے زیادہ اور کافی شدت سے محسوس کی جارہی ہے۔

تاریخ اِس کی بھی گواہ ہے کہ جب مصلح قوم کے آخری سفر پر روانگی کی خبر ملی تو یہ اطلاع سبھی کے لیے تکلیف دہ، لیکن اہلِ پنجاب کے لیے اندوہناک تھی کہ سرسید اُنھیں داغِ مفارقت دے گئے۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے اپنے مضمون ''سرسید کی وفات پر تعزیتی اجلاس'' میں لکھا ہے کہ سب سے زیادہ تعزیتی قرار دادیں پنجاب میں پاس ہوئیں۔ لدھیانہ میں منعقدہ اجلاس کی تعزیتی قرار داد، اسلوب بیان کا منفرد نمونہ ہے اس کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''صبح کا وقت تفریح کا ہوتا ہے مگر گزشتہ کل کی (یعنی ۲۷ر مارچ مگر یہ اطلاع پنجاب میں دو دن بعد عوام کو ملی تھی۔) کی صبح سے تو شام غریباں اچھی، خدا ایسی صبح پھر نہ دکھائے خود بخود دل امڈا آتا تھا۔ آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے، جی گھبراتا اور رونے کو جی چاہتا، طبیعت اوجھتی، حیات سے وحشت ہوتی۔ دل سے بے ساختہ پُر درد آہیں نکلتیں۔ عمارتیں کاٹ کھانے کو دوڑتیں، طیور کی نغمہ سرائیاں غم زدوں پر بانگ بوم کا اثر کرتیں۔ ہوا کے جھونکوں میں پریشانی پائی جاتی تھی اور دھوپ میں سرگردانی۔ اکثروں کا یہی حال تھا مگر ایک دوسرے سے چھپاتا کہ کہیں ہم کو کوئی پوچھ نہ بیٹھے تو سبب کیا بتاویں گے لوگ خواہ مخواہ مجنوں ووحشی

بنادیں گے۔ لیجیے ادھر تو یہ رنگ ہے کہ جناب خواجہ احد شاہ صاحب پروپرائٹر پنجاب آبزرور کے ذریعہ سے معلوم ہوا کہ سید محمود صاحب کے سر سے باپ کا سایہ اُٹھ گیا۔ ہماری قوم یتیم ہوگئی۔ کوئی والی اور سرپرست نہ رہا۔ علی گڑھ کالج کی عالی شان عمارت پر حسرت برسنے لگی نوجوان ہونہار مسلمانوں کی سب حسرتیں خاک میں مل گئیں۔ ہمارا ہمدرد وغم خوار بھی اور وہ غم گسار کہ جس کے سبب سے (ہم) قوموں کی نظروں میں عزیز تھے، جس نے اپنی ساری عمر ہماری بہبودیوں میں صرف کردی، اپنا آرام چھوڑ کر ہمیں راحت پہنچائی وہ کون کہ آنریبل ڈاکٹر سر سید احمد خاں کے.سی.ایس.آئی، ایل.ایل.ڈی. نے اس خرابات خاکی سے فردوس بریں کو نہضت فرمائی۔

بس سنتے ہی اس خبر وحشت کے جو قلق واضطراب مسلمانانِ شہر کو ہوا اس کا اندازہ کیوں کر ہوسکتا ہے۔ جتنا غم کریں تھوڑا ہے سچ تو یہ ہے کہ آج ان کے گھر ماتم سرا ہوگئے ہیں وفورِ غم سے ہر شخص اپنی جگہ صاحب عزا ہے علاوہ اس رسم تعزیت کے جو فرداً فرداً ادا کی گئی انجمن اسلام نے جملہ مسلمانانِ لدھیانہ کی جانب سے تعزیت (کے) ارجنٹ تین تار خدمات میں جناب سید محمود صاحب ونواب محسن الملک بہادر ومولوی عبداللہ جان صاحب وکیل وٹرسٹی کالج مضمون (کے) ذیل اسی دن ۱۲ بجے دوپہر کو دیئے''۔

میں اپنی بات پنجاب کے ایک معروف علی گیرین شاعر خوشی محمد خاں ناظر کی نظم ''مرثیہ سید مرحوم'' کے چند اشعار پر ختم کرتا ہوں جو سید والا گُہر کی وفات پر کہی گئی تھی ؎

سید مرحوم اُمت کا بھلا کرتا رہا　　ہم جفا کرتے رہے اور وہ وفا کرتا رہا
فکرِ قوم از ابتدا تا انتہا کرتا رہا　　سال وماہ و روز وشب صبح ومسا کرتا رہا
جو فلاحِ قوم کی آئی سمجھ میں اس کی بات　　برملا کہتا رہا اور ، برملا کرتا رہا
اپنے دل پر سینکڑوں سہتا رہا رنج والم　　دردِ دل کی قوم کے لیکن دوا کرتا رہا
کام جو شاہوں کا تھا سو یہ گدا کرتا رہا
ہم جفا کرتے رہے اور وہ وفا کرتا رہا

☆☆☆

پروفیسر اسلم جمشید پوری
میرٹھ

''سرسید مشن'' وقت کی اہم ضرورت

سرسید احمد خان کا تعلق یوں تو انیسویں صدی سے ہے لیکن انہوں نے جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں، ان کی بنا پر آنے والی ہر صدی کے لئے معتبر و مستند بن گئے ہیں۔ سرسید کے کارناموں کی ایک طویل فہرست ہے۔ وہ صحافی تھے، ادیب تھے، ماہرِ تعلیم، مفکر اور دانشور بھی تھے۔ اسلام کی تعلیمات سے نہ صرف واقف تھے بلکہ اسلام کے سچے پیرو کار بھی تھے۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ ہے کہ انہوں نے قوم کی تعلیم کی نہ صرف فکر کی بلکہ عملی جدوجہد بھی کی۔

قوم وملک کو بیدار کرنے کے لئے سرسید احمد خاں نے علی گڑھ تحریک کی منیاد رکھی۔ جس نے زندگی کے ہر شعبے میں ہماری رہنمائی کی۔ علی گڑھ تحریک سے وابستہ افراد خاص کر سرسید کے ساتھی اپنے آپ میں ایک ادارہ تھے۔ سب نے مل کر سرسید کا ساتھ دیا اور ان کی رہنمائی میں قوم کو قعرِ مذلت سے نکال کر تعلیم کی راہوں پر گامزن کیا۔

سرسید احمد خاں کی زندگی میں انگلستان کے سفر کی بڑی اہمیت ہے۔ وہاں جا کر آپ نے انگریز قوم کی ترقی اور خوشحالی دیکھی۔ پوری دنیا پر حکومت کرنے اور سب کو اپنا غلام بنانے کا راز پالیا تھا۔ دورانِ سفر انہوں نے سائنٹفک سوسائٹی کے سکریٹری کو ایک خط میں لکھا تھا۔

> ''اس تمام ترقی کا باعث انگلستان میں یہ ہے کہ تمام چیزیں، تمام علوم، تمام فن جو کچھ ہے اسی قوم کی زبان میں ہے جو عموماً یا قریب عموماً کے بولی جاتی ہے۔ انگریزی کو اسی انگلستان میں بعض مقاموں کی زبانیں ایسی گنواری ہیں جن پر انگریزی کا اطلاق کرنا مشکل ہے۔ مگر انگریزی زبان انگلستان میں ایسی ہے جیسی ہندوستان میں علی الخصوص شمال مغربی اضلاع

اورصوبہ بہار میں اردو ہے جس کو ہر کوئی سمجھ سکتا ہے۔پس جو لوگ حقیقت میں ہندوستان کی بھلائی اور ترقی چاہنے والے ہیں وہ یقین جان لیں کہ ہندوستان کی بھلائی صرف اسی پر منحصر ہے کہ تمام اعلیٰ علوم سے لے کر ادنیٰ تک ان ہی کی زبانوں میں دیے جاویں۔‘‘

[سرسید کا سفرنامہ مسافرانِ لندن،مرتب اصغرعباس،ص ۱۵۸]

وقت کی پابندی ،کام کو عبادت ماننا،انصاف ،صاف صفائی،تعلیم کی اہمیت،نصب العین،ڈسپلن اور ایمانداری وغیرہ ایسے راز ہائے زندگی تھے جن کی بدولت انگریز پوری دنیا پر قابض تھے۔اور دنیا کی سب سے بڑی طاقت تھے۔اس کے مقابلے ہم ہندوستانی ہر معاملے میں صفر تھے۔اور ہم ہارے ہوئے جواری کی مانند ہاتھ پر ہاتھ رکھے،تقدیر کے بھروسے بیٹھے تھے۔

انگلستان سے واپسی کے بعد سرسید اپنی قوم کا مستقبل سنوارنے میں لگ گئے۔انہوں نے تہذیب الاخلاق نامی رسالہ نکالا۔سائنٹفک سوسائٹی قایم کی۔محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس منعقد کی۔ایک جدید مدرسے ’’مدینۃ العلوم‘‘ کی بنیاد رکھی جو آگے چل کر اے ایم یو کی شکل میں ایک تناور درخت کی حیثیت اختیار کر گیا۔اور قوم و ملک کے لئے فیض کا ایک دریا ثابت ہوا۔ سرسید نے دورانِ سفر،یورپ کے اسکول،کالج،یونیورسٹی،بڑی بڑی عمارتیں،بازار،خوبصورت بسیں،ریل گاڑیاں،اپنے حقوق کے لئے بیدار شہری،تعلیم کے زیور سے آراستہ فیشن ایبل خواتین وغیرہ دیکھیں۔سرسید اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں۔:

’’اگر ہندوستان میں کوئی عورت بالکل برہنہ بازار میں پھرنے لگے تو ہمارے ہم وطنوں کو کیسا تعجب اور کس قدر حیرت ہوگی،بلا مبالغہ یہ مثال ہے کہ جب یہاں کی عورتیں یہ سنتی ہیں کہ ہندوستان کی عورتیں پڑھنا لکھنا نہیں جانتیں اور حلیہ تربیت اور زیور تعلیم سے بالکل برہنہ ہیں تو ان کو ایسا ہی تعجب ہوتا ہے اور کمال نفرت اور کمال حقارت ان کے خیال میں گزرتی ہے‘‘

[سرسید کا سفرنامہ مسافرانِ لندن،مرتب اصغرعباس،ص ۱۵۲]

سرسید کے خط کے اس اقتباس سے ظاہر ہے کہ سرسید کے دل میں تعلیم کی کیا اہمیت تھی۔خاص کر وہ عورتوں کی تعلیم کے لئے بھی فکرمند اور سنجیدہ تھے۔

سرسید نے وقت کی ضرورت اور مصلحت کو سمجھا تھا۔اس لئے انہوں نے وقتی طور پر انگریزوں کا ساتھ دیا۔ان پر ہمارے ملک کے بعض مورخ انگریزوں سے مصالحت ،کا الزام لگاتے ہیں۔سرسید اپنی قوم کواور انگریزوں کو بخوبی جانتے تھے۔ایک طرف پسپا اور دوسروں کے رحم وکرم پر قسمت کے سہارے ،کسی طرح وقت گذارنے والی قوم تھی۔دوسری طرف دنیا پر حکومت کرنے والی،سب سے طاقتور انگریز قوم تھی۔اس لئے انہوں نے مصلحت سے کام لیا اور ۱۸۵۷ کے بعد پسپا قوم کی ذہنیت رکھنے والے مسلمانوں کی تعلیمی اور معاشی بدحالی کو سمجھا۔دوسری طرف اپنے اور ملک کے سب سے بڑے دشمن انگریزوں کو سمجھنے اور جاننے کے لئے مصلحتاً قربت بنائی ۔قوم و ملک کو بیدار کیا اور ایسا تعلیمی ادارہ قائم کیا،جس کے فارغ طالب علموں اور اساتذہ نے تحریک آزادی میں حصہ لے کر نہ صرف انگریزوں کو ہمیشہ کے لئے ملک بدر کرنے ، بلکہ ہندوستان کو آزاد کرانے میں بھی اہم کردار ادا کیا۔سرسید اگر دبے کچلے اور ہارے ہوئے مسلمانوں کے ساتھ انگریزوں سے ٹکرا جاتے تو کیا ہوتا۔۔؟ قوم بدحال اور برباد ہو جاتی۔ایسی برباد کہ صدیوں تک سر نہ اٹھا پاتی۔دوسری طرف ہم ان تعلیمی اداروں سے بھی محروم ہو جاتے ، جو سرسید تحریک کی دین تھے۔نہ جانے ہمارا ملک انگریزوں کے چنگل سے کب آزاد ہوتا۔یہ بھی ممکنات میں ہے کہ سید کا شمار شہداء اور عظیم مجاہدین میں ہوتا۔لیکن سرسید جیسا مدبر اور مفکر،جس نے وقت کی ضرورت اور مصلحت کے مطابق کام کیا م،قوم کو نہ ملتا۔

سرسید اور ان کے بیشتر ساتھی ادب اور صحافت میں بھی انقلاب کی نوید ثابت ہوئے۔ ڈپٹی نذیر احمد نے ناول کی شروعات کی۔سرسید سے متنی تنقید کا آغاز ہوا۔مضمون نویسی،صحافت اور اردو نثر کا عام فہم ہونا بھی سرسید کا کارنامہ ہے۔حالی سے اردو تنقید کی شروعات ہوئی۔توشبلی نے تقابلی تنقید اور مشرقی تنقید کو بنیاد فراہم کی۔سرسید کے دوسرے ساتھیوں نے تعلیمی مشن کو تحریک کی شکل دی۔

سرسید،ان کے رفقاء اور ابتدائی دور کے فارغین نے اپنا کام تندہی اور خوش اسلوبی سے انجام دیا۔تعلیم کو عام کرنے اور قوم وملک کو بیدار کرنے کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیا۔علی گڑھ مسلم یونیورسٹی صرف ایک تعلیمی ادارہ نہ رہی بلکہ ایک رواں دواں دریا بن گئی،جس کے فیض سے لاکھوں کروڑوں لوگ سیراب ہوئے۔اور یہ ادارہ پوری دنیا میں قوم کی بیداری کا باعث بنا۔ملک

پر کیسے بھی سیاسی وسماجی حالات آئے، اے ایم یو کے طلبہ اوراساتذہ نے، نہ صرف آگے بڑھ کران کا مقابلہ کیا بلکہ ملک وقوم کی حفاظت بھی کی۔ پروفیسر افتخار عالم خاں نے سرسید کی قومی یکجہتی کے لئے کی گئی عملی کوششیں اور سرسید کے بیان کو پیش کیا ہے:

''ملک میں قومی یکجہتی اور مذہبی رواداری کی فضا کو برقرار رکھنے کے لئے سرسید، اپنے زمانے میں ہرممکن تدابیر اختیار کرنے کے حق میں تھے۔ دراصل یہ وہ زمانہ تھا جب انگریزوں کی نوآبادیاتی حکومت نے 'تقسیم کرو اور حکومت کرو' کے نظریے کے تحت فرقہ وارانہ فضا تیار کرنا شروع کردی تھی۔عہدِ وسطیٰ کے مذہبی رواداری کے حامل معاشرے کی بیخ کنی کی جارہی تھی۔اس زمانے میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان سب سے حساس معاملہ گائے کی قربانی کا تھا۔جس کو لےکر جگہ جگہ فسادات ہو رہے تھے۔سرسید کی مذہبی رواداری کے سلسلے کی مخلص نیت اور صالح فکر کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ اس زمانے میں انہوں نے اس مسئلہ پرنہایت واضح الفاظ میں اپنی مندرجہ ذیل رائے ظاہر کی تھی:

''ہماری مدت سے یہی رائے ہے کہ اگر گائے کی قربانی ترک کرنے سے آپس میں ہندو اور مسلمانوں کی دوستی قائم ہو تو گائے کی قربانی نہ کرنا، اسکے کرنے سے ہزار درجہ بہتر ہے۔''

[سرسید تحریک کا سیاسی وسماجی پس منظر، پروفیسر افتخار عالم خاں، ص نمبر ۲۸۹،]

سرسید نے قومی یکجہتی اوراور مذہب کے ساتھ سائنسی فروغ کی ذمہ داری بخوبی ادا کی۔ہم سب بہی خوانِ سرسید اور محبانِ سرسید کی ذمہ داری ہے کہ ہم سرسید کے خوابوں کو پورا کریں اور ان کے کارناموں کو عوام الناس تک پہنچائیں۔کچھ لوگ محبان سرسید کو دوخانوں میں تقسیم کرکے ان کی طاقت کو کم کرنا چاہتے ہیں۔علیگ اور نان علیگ جیسے دو خانے بنادیے گئے ہیں۔علیگ حضرات یہ سمجھتے ہیں کہ سرسید صرف ان کے ہیں۔سرسید کی ہر طرح کی وراثت پر صرف ان کا حق اوراجارہ ہے۔اور سرسید کے خوابوں کو تکمیل تک پہچانے کی ذمہ داری صرف ان کی ہے۔مانا کہ علیگ وہ لوگ کہلاتے ہیں،جنہوں نے علی گڑھ مسلم یونورسٹی کے احاطے میں رہتے ہوئے اقامتی زندگی

گذاری اور تعلیم حاصل کی۔ ہر سال ۱۷ اکتوبر کو علیگ حضرات سر سید ڈے مناتے ہیں۔سر سید ڈے پر اپنے ہاسٹل کی یادوں کو تازہ کرتے ہیں۔سر سید کے نام پر ''سر سید ڈنر'' کرتے ہیں۔جس میں پوری دنیا میں کروڑوں روپے کا صرفہ آتا ہے۔معاف کریں یہ سر سید کے نام پر ''علیگ ڈے'' ہوتا ہے۔آج قوم ایک عجیب دوراہے پر کھڑی ہے۔مسلمانوں کو سیاسی اور سماجی اعتبار سے بونا بنایا جارہا ہے۔مسلمانوں کی سیاسی حیثیت کو صفر کیا جارہا ہے۔مذہبی آزادی بھی سیاسی غلام بن چکی ہے اور قوم عدالت کے فیصلوں کو پر امید نظروں سے دیکھتی ہے۔ ہر طرف افرا تفری کا ماحول ہے۔ہمارے نوجوان بے روزگار ہیں۔تعلیم کا جو فی صد ہونا چاہئے تھا،اب تک ہم اسے حاصل نہیں کر پائے ہیں۔ہماری شناخت اور تشخص داؤ پر ہے۔ہمارے تعلیمی ادارے دشمن عناصر کی نظر میں ہیں۔ہمارے اداروں کی اقلیتی شناخت پر حملے ہو رہے ہیں۔یہ وہی حالات ہیں،جو علی گڑھ تحریک کے وقت تھے۔جس نے ہمیں سر سید جیسا جو جھارو،دور اندیش،مصلحت کوش اور سیاسی تدبر رکھنے والا قومی رہنما دیا۔سر سید نے قوم کے ساتھ ساتھ پورے ملک کو آگے بڑھانے کی فکر کے ساتھ عملی کوشش بھی کی۔

آج ہمارے درمیان کوئی سر سید ہے نہ ان کے قول وعمل پہ جاں نثار کرنے والے ان کے احباب۔آج ہمارے ناتواں شانوں پر قوم کی اصلاح کی ذمہ داری کا بوجھ ہے۔ایسے وقت میں ہم سب محبانِ سر سید جس میں علیگ اور نان علیگ کا کوئی امتیاز نہیں مل کر سر سید کے مشن کو ایک تحریک کی شکل میں عام کریں۔سر سید کی زندگی اور ان کے کارناموں کو قوم کے نونہالوں تک پہنچائیں۔تعلیمی ادارے قایم کریں۔قومی اتحاد کے بل پر ملک دشمن عناصر سے لوہا لیتے ہوئے قوم وملک کی صحیح رہنمائی کریں۔یہ موجودہ وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔اور پوری دنیا میں پھیلے محبانِ سر سید کے لئے ایک چیلینج بھی۔کہ سب مل کر قوم وملک کو موجودہ سیاسی اور سماجی بحران سے باہر نکالیں۔یہاں میں صغیر افراہیم کی کتاب کا ایک اقتباس نقل کرنا چاہوں گا،جس میں انہوں نے آج کے حالات کا عہد سر سید کے حالات سے موازنہ کیا ہے اور آج ہمیں کیا کرنا چاہئے،پر بھی اظہار خیال کیا ہے:

''سر سید احمد خاں کی رحلت کے بعد ان گنت دشواریوں کے ہوتے ہوئے،ہمارے بزرگوں نے اپنے اور مصلح قوم کے خوابوں کی تعبیر کیلئے

طرح طرح کے جتن کیے۔ وہ جن ناگزیر حالات سے نبرد آزما تھے۔ کم و بیش آج ہم بھی انہی حالات سے دوچار ہیں۔ ہمیں بھی اسی طرح کے چیلنجز کا سامنا ہے بلکہ ہم ان کے مقابل کمزور ہیں۔ کیوں کہ ہم صوبائی، علاقائی، لسانی، مسلکی اختلافات کا شکار ہیں۔ جب یہ مان لیا گیا کہ عصرِ حاضر میں مسائل و مصائب کی نوعیتیں بدلی ہوئی ہیں پھر ان کے تدارک کے لئے ہمیں سر جوڑ کر بیٹھنا ہوگا۔ اس نکتہ پر خاص توجہ دینی ہوگی کہ ۱۸۵۷ کی حشر سامانیوں، اندرونی خلفشار اور صدمے سے ابھرنے کے لئے رفقائے سرسید نے کئی منصوبے تیار کئے تھے۔ محض کاغذ یا ذہن پر نہیں، بلکہ یکسوئی سے ان نقوش پر دلجمعی سے کام کیا۔ اور کامیابی نے ان کے قدم چومے۔''

[عصر حاضر میں علی گڑھ تحریک کی اہمیت ومعنویت، پروفیسر صغیر افراہیم، ص ۳۰۴]

موجودہ وقت میں ہمیں باہمی اتحاد کا مظاہرہ کرنا ہوگا اور سرسید کی زندگی اور قوم و ملک کے لئے ان کی خدمات کا نہ صرف جائزہ لینا ہوگا بلکہ اس کو عام کرنے کے لئے عملی جدوجہد بھی کرنی ہوگی۔ آج ہماری قوم علی گڑھ کی طرف امید بھری نظروں سے دیکھ رہی ہے کہ وہاں سے پھر کوئی ابر کا ٹکڑا اٹھے گا اور قوم و ملک پر جم کے برسے گا۔ اے ایم یو کے طلبہ اور اساتذہ نے ہر مشکل وقت میں قوم و ملک کی صحیح رہنمائی کی ہے۔ آج پھر وہ وقت آ گیا ہے کہ ہم سب محبانِ سرسید کو قوم کی فکر کرنی ہوگی اور سرسید کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے اپنے تعلیمی ادارے قائم کرنے ہوں گے۔ جن سے ہمارے بچے مختلف شعبہء حیات، سول سروسز، عدالتی محکموں کے اعلیٰ عہدے، مینجمنٹ کے شعبے، ڈاکٹر۔ انجینیر، وکلا اور اساتذہ، عصری تعلیم یافتہ مدرس اور ریاستی اعلیٰ عہدوں پر جا سکیں۔ بچوں کو مختلف عہدوں کے لئے تیار کرنے کو مقابلہ جاتی ادارے بھی قائم کریں۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق شیخ الجامعہ، جناب ضمیر الدین اور کچھ سابق طلبہ نے ادارے قائم کرنے کی ایک تحریک چلائی ہے، جس کی تعریف کرنی چاہئے۔ مگر جس طرح سرسید تحریک سے متاثر ہو کر پورے ملک میں تعلیمی اداروں کا قیام عمل میں آیا تھا، آج اسی طرز کی مہم کی ضرورت ہے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ، جامعہ ہمدرد، زکوٰۃ فاؤنڈیشن آف انڈیا، جنوب کے تعلیمی ادارے، ملک

کے بڑے مدارس یا علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور پوری دنیا میں پھیلے سرسید کے چاہنے والے۔سب مل کر اگر قوم کی تعلیمی، معاشی اور سماجی پسماندگی کو دور کرنے کے لئے کام کریں، تو ضرور قوم کا بھلا ہوگا۔اور پوری قوم میں خاص کر نوجوانوں میں سماجی کے ساتھ سیاسی بیداری بھی آئے گی۔جس کے نتیجے کے طور پر آبادی کے تناظر میں ملک کی مختلف ریاستوں کی اسمبلیوں اور ملک کے ایوانِ بالا میں ہمارے ممبران کی ایک اچھی خاصی تعداد ہوگی۔جو اس ملک میں نہ صرف ہمارے ملی مفادات کا تحفظ کرے گی، بلکہ قوم و مذہب پر حملہ آور ہونے والی سیاسی طاقتوں کا ڈٹ کر مقابلہ کرے گی۔اگر ایسا ہوا تو سرسید کا مشن بھی کامیاب ہوگا اور تعلیمی اداروں کا مقصد بھی پورا ہوگا۔یہی سرسید اور ان کے مشن کو سچا اور عملی خراج ہوگا۔

☆☆☆

''اگر ہندوستان میں کوئی عورت بالکل برہنہ بازار میں پھرنے لگے تو ہمارے ہم وطنوں کو کیسا تعجب اور کس قدر حیرت ہوگی، بلا مبالغہ یہ مثال ہے کہ جب یہاں کی عورتیں یہ سنتی ہیں کہ ہندوستان کی عورتیں پڑھنا لکھنا نہیں جانتیں اور حلیہ تربیت اور زیور تعلیم سے بالکل برہنہ ہیں تو ان کو ایسا ہی تعجب ہوتا ہے اور کمال نفرت اور کمال حقارت ان کے خیال میں گزرتی ہے''

[سرسید کا سفرنامہ مسافرانِ لندن، مرتب اصغر عباس، ص ۱۵۲]

''دبستانِ میرٹھ'' کا اجراء کرتے ہوئے بائیں سے پروفیسر ایم کے گپتا، پروفیسر ارتضیٰ کریم، پروفیسر وائی وملا، پروفیسر اسلم جمشید پوری، ڈاکٹر ارشاد سیانوی، ڈاکٹر شاداب علیم اور ڈاکٹر آصف علی۔

ڈاکٹر ساجد علی

غازی آباد

سرسید تحریک اور اخبار 'الجمعیۃ'

ہمارے ملک کی فعال اور مختلف کارہائے نمایاں انجام دینے والی قومی و ملی تنظیموں میں سے ایک جمعیۃ علماء ہند ہے۔ جس کا ترجمان اخبار 'الجمعیۃ' 1925ء سے لے کر عہد حاضر تک تقریباً ایک صدی سے اپنی صحافتی خدمات انجام دے رہا ہے۔ 1857ء کی تحریک آزادی کی ناکامی کے بعد مسلمانان ہند کا شیرازہ بکھرا ہوا تھا۔ جس کو یکجا کرنے اور ان کے علمی معیار کو بلند کرنے کے لئے انفرادی و اجتماعی طور پر جو کوششیں کی گئیں اخبار 'الجمعیۃ' نے ایسی تمام کوششوں کو نہ صرف سراہا بلکہ حمایت کی اور اپنا بھر پور تعاون بھی دیا۔ انہیں کوششوں میں سے ایک تحریک سرسید احمد خاں کی علی گڑھ تحریک تھی۔ جس کو منظر عام پر لانے کے لئے الجمعیۃ میں متعدد اداریے و مضامین شائع ہوئے۔ اس تعلق سے ایک خصوصی شمارے میں پروفیسر اختر الواسع کا ایک مضمون 'علی گڑھ اور دیوبند' شائع ہوا۔ حالانکہ ان دونوں تحریکوں کا طریقۂ کار جداگانہ رہا مگر مقصد قریب قریب تھے کہ مسلمانانِ ہند کے سنہرے مستقبل کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کیا جائے۔ جس کی نشو و نما علی گڑھ میں مدرستہ العلوم اور کالج کے طور پر اور دیوبند میں دارالعلوم کے نام سے ہوئی۔ اپنے مضمون میں پروفیسر اختر الواسع تحریر کرتے ہیں:

> ''اگر ہم معروضی اندازِ فکر اور غیر جانب داری کے ساتھ دونوں تحریکوں اور اداروں کے مقاصد پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ سرسید اور مولانا قاسم نانوتوی دونوں ہی مسلمانوں کے واسطے ایک 'با عزت زندگی' کے لئے فکر مند ہیں۔ دونوں اس کیمیا کے متلاشی ہیں جس کے ذریعہ مسلمانوں کو ایک بار پھر آبرو اور وقار کے ساتھ سر بلند کر سکیں اور

عزت اور خودداری کے ساتھ نئے حالات میں نئی منزلوں کی طرف سفر کر سکیں۔ یہ خاص بات ہے کہ سرسید مذہبی اور مشرقی تعلیم کے حامی ہیں اور مولانا نانوتوی علوم جدیدہ کے حصول کے قائل۔''

(اختر الواسع، خصوصی دارالعلوم دیوبند نمبر 1980ء، ص 212)

اسی طرح ایک خصوصی شمارے 'جمعیۃ علماء ہند: خدمات ولائحہ عمل' 2012ء میں شائع ہوا۔ جس میں دہلی کی تاریخ پر سرسید احمد خاں کی تصنیف 'آثار الصنادید' کے تعلق سے خلیق انجم کا ایک پرمغز مضمون 'دلّی جو ایک شہر تھا عالم میں بے مثال' پیش کیا گیا۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ایک اقلیتی ادارے کے طور پر پہچانا جاتا ہے۔ حالانکہ اس کے اقلیتی کردار کو ختم کرنے کے لئے مسلسل کوششیں کی جاتی رہی ہیں۔ اس کے اقلیتی کردار کے تحفظ کے لئے جمعیۃ علماء ہند کی طرف سے جو کوششیں کی گئیں۔ ان کو اخبار الجمعیۃ نے اپنے ایک خصوصی شمارے 'جمعیۃ علماء نمبر' میں شائع کیا۔ جو 1995ء میں منظر عام پر آیا۔ جمعیۃ علماء ہند کے ناظم عمومی مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمان نے علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے اقلیتی کردار کے تحفظ کی مہم چلائی۔ جس میں مولانا ابوالکلام آزاد اور ڈاکٹر ذاکر حسین جیسے اشخاص نے تعاون کیا۔ اور ہر نقطۂ خیال اور ہر مکتب فکر کے لوگوں کو ساتھ لے کر احتجاج درج کروایا۔ اس کی وضاحت ایک مضمون 'مسلم یونی ورسٹی اور جمعیۃ' میں اس طرح تحریر کی گئی ہے:

''جب جمعیۃ علماء نے محسوس کیا کہ مسلم یونیورسٹی کے کردار کے تحفظ کے لئے عدالتی چارہ جوئی ضروری ہوگئی ہے تو ہزار مشکلوں اور مخالفتوں کا مقابلہ کر کے سپریم کورٹ میں رٹ داخل کی گئی۔ لیکن جب عزت مآب چیف جسٹس نے جو اس رٹ کی سماعت کر رہے تھے رٹ کو واپس لینے کا مشورہ دیا اور کہا کہ حکومت اعلان کر رہی ہے کہ وہ عنقریب باقاعدہ بل پیش کرے گی اور میں حکومت کو مشورہ دوں گا کہ وہ بل کی تیاری میں مسلم اقلیت کے جذبات کا خیال رکھے۔ جب ایسا بل آجائے اور آپ محسوس کریں کہ آپ کے حقوق کی خلاف ورزی ہوئی ہے اور ایسی رٹ ضروری ہے تو آپ دوبارہ رٹ داخل کر دیں۔ چیف جسٹس کے اس ریمارک کے بعد رٹ کو واپس لے لیا گیا۔ لیکن بعض ناعاقبت اندیش حضرات مذکورہ بالا

عناصر کے ہاتھ میں غیر شعوری طور پر کھیلتے رہے۔ان حضرات نے ان باتوں کی اہمیت کومحسوس نہ کیااور انہوں نے دوبارہ رٹ داخل کر دی۔ جس کورد کرتے ہوئے سپریم کورٹ نے یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کوتسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔اس طرح ان عناصر کے ہاتھ مضبوط ہو گئے جو یونیورسٹی کا کردار بدلنا چاہتے تھے۔''

(ماخوذ،مسلم یونیورسٹی اور جمیعتہ،خصوصی'جمیعتہ علماء نمبر'1995،ص308)

اس کے بعد جمیعتہ کے متعدد جلسوں میں ورکنگ کمیٹی نے اس مسئلہ پر غور وخوض جاری رکھا۔جب حکومت نے مسلم یونی ورسٹی ایکٹ پر عوام سے آراء طلب کیں تو جمیعتہ نے 1965-66 کے جلسوں میں اپنی قرارداد میں اس کے اقلیتی کردار کو برقرار رکھنے کا مطالبہ کیا۔اور اس تعلق سے ایکٹ پاس ہوجانے کے بعد مسلم یونی ورسٹی کا نظم اس ایکٹ کے ذریعے چلایا جانے لگا۔مگر کافی مدت گزر جانے پر پارلیمینٹ میں کوئی بل پیش نہیں ہوا تو جمیعتہ نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ حکومت اپنے کئے گئے وعدہ کے مطابق اس بل کو منظوری کے لئے پیش کرنے کی کارروائی کرے۔1970ء کے اجلاس میں منظور کردہ تجویز یہ تھی:

''جمیعتہ علماء ہند کی مجلس منتظمہ کا یہ اجلاس طے کرتا ہے کہ جمیعتہ علماء ہند اور شہر علیگڑھ کی جمیعتہ کے نمائندگان پر مشتمل ایک وفد کی تشکیل کی جائے جو حکومت کو مسلم یونیورسٹی سے متعلق عوام کی رائے سے باخبر کرے اور وزیر اعظم سے مل کر ان کے سامنے حالات پیش کرتے ہوئے مطالبہ کرے کہ مسلم یونیورسٹی بل کو جلد از جلد پارلیمنٹ میں پیش کرکے اسے منظور کرایا جائے۔''

(ماخوذ،مسلم یونیورسٹی اور جمیعتہ،خصوصی'جمیعتہ علماء نمبر'1995،ص309)

متعدد مواقع پر علی گڑھ تحریک کے مقاصد کو واضح کرنے کے لئے مضامین ومقالات شائع ہوئے۔ایک سہ روزہ شمارے میں مکمل صفحہ پر اس تعلق سے علی سردار جعفری (علیگ) کا ایک مضمون 'مسلم یونی ورسٹی: ہندوستانی طلباء کی تحریک کا ایک ورق' شائع ہوا۔اس مضمون میں کئی نکات کو ذیلی سرخیوں کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔جس میں 'یونیورسٹی یونین'، 'تصویر کا دوسرا رُخ'، 'شعور و بیداری کا آغاز'، 'ڈاکٹر ضیاء الدین کا انتخاب'، 'رجعت پسندی کے شواہد'، 'حکومت نوازی کا دور'، 'پروفیسر حلیم کا منتقمانہ رویہ' اور 'جدید انتخابات' جیسے نکات اہمیت کے حامل ہیں۔مسٹر

علی سردار جعفری نے علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کی عظمت کا اعتراف درج ذیل الفاظ میں کیا ہے:

''سیاسی اور اقتصادی کشمکش کے زمانے میں علی گڑھ کا عین وقت پر بیدار ہو جانا اس بات کا ثبوت ہے کہ اس ملک اور قوم کو دنیا میں سربلند ہو کر رہنے کا حق حاصل ہے۔ جس کے نوجوانوں کے خون میں حرارت اور دل میں آزادی کی تڑپ ہو اس پر علی گڑھ کے طلباء جتنا بھی فخر کریں، کم ہے کہ ہندوستان کی جنگ آزادی میں وہ بھی اپنی بساط کے مطابق حصہ لے رہے ہیں۔ بیشک ایک زمانہ وہ بھی تھا جبکہ علی گڑھ صرف ڈپٹی کلکٹر پیدا کرتا تھا۔ اس وقت حکومت وقت اس کی ہم آہنگ تھی۔ اب علی گڑھ ملک اور قوم پر جان دینے والے سپاہی پیدا کرنے کو تیار ہے اور اس کی ہمنوا زمانے کی چیرہ دستیاں اور وقت کی مشکلات ہیں۔''

(سہ روزہ 'الجمعیۃ' 24 نومبر 1937 ص 4)

ان تحریریوں کے آئینے میں ہم دیکھتے ہیں کہ کس طرح اخبار 'الجمعیۃ' نے سرسید احمد خاں کی تحریک کو ملک وقوم کے سامنے لانے کے لئے اپنا کردار ادا کیا۔

☆☆☆

جشن سرسید کے دوران مقابلۂ بیت بازی میں حصہ لیتے ہوئے مختلف کالجز کے طلبہ وطالبات۔

ڈاکٹر شبستاں آس محمد

سرسید احمد خاں اور رسالہ ''تہذیب الاخلاق''

1857ء کی جنگ آزادی جب ناکام ہوگئی تو ہندی مسلمانوں پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹ پڑے حالانکہ اس بغاوت میں برصغیر کی مختلف اقوام شریک تھیں لیکن مسلمان پیش پیش تھے۔ اسی بنا پر انگریزوں نے مسلمانوں کو ہی ظلم وستم کا نشانہ بنایا اور مسلمانوں کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا یا۔اس کے نتیجے میں مسلم طبقہ معاشی تنگ دستی، تعلیم سے دوری، بے راہ روی، بے بسی اور بے حسی کی نذر ہوگیا۔اس پر آشوب دور میں مصلح قوم، ماہر تعلیم، دانشور اور مسلمانوں کے مسیحا سر سید احمد خاں نے مسلمانوں کو ایک نئی فکر ہم آہنگ کرنے اور ان میں جدید شعور پیدا کرنے کے لیے صحافت کا سہارا لیا۔

یوں تو سر سید احمد خاں سے قبل ہی اردو صحافت کا آغاز ہو چکا تھا اور عہد سر سید تک اردو صحافت روایت کی شکل اختیار کر چکی تھی لیکن سر سید نے ایک عظیم مقصد کے تحت صحافت کے میدان میں بھی ایک انقلاب برپا کر دیا۔ان کا رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' ایک علمی، ادبی اور جدید فکری نظریات وخیالات کا علمبردار بن کر جب صحافت کے میدان میں آیا تو اردو صحافت نے ایک نئی راہ اختیار کر لی۔ ''تہذیب الاخلاق'' نہ صرف ایک پرچہ تھا بلکہ یہ ادبی حلقوں اور تعلیم یافتہ طبقوں کے لیے بھی حد درجہ اہمیت کا حامل بن چکا تھا۔ یہ پرچہ نہ صرف صحافت کے بلند اور اعلیٰ معیار کا ترجمان بنا بلکہ ایک مقصدی اور اصلاحی رسالہ ثابت ہوا اور اس رسالے نے مردہ اور خستہ حال قوم کو تقویت بخشتے ہوئے ان میں ایک نئی روح پھونک دی، جو قوم ہر طرف سے پست ہو چکی تھی اس نے ایک بار پھر جوش وخروش کے ساتھ تعلیم کا دامن تھامنا شروع کر دیا اور ان کے مزاج میں تعلیم کے تعلق سے سنجیدگی پیدا ہونے لگی۔

''تہذیب الاخلاق'' یوں تو بہت سی خوبیوں کا مالک تھا لیکن اس کی سب اہم خوبی گھسے پٹے، فرسودہ اخباری مواد کی بجائے مقصدی اور جدید مضامین شامل ہوتے۔ مضامین بھی ایسے جو سوئی ہوئی قوم کو جگانے میں معاون ثابت ہوں اور اس میں شامل مضامین نے ایسا کر بھی دکھایا کہ قوم میں انقلابی تبدیلی آنا شروع ہوگئی۔ جلد ہی مخالفت موافقت میں تبدیلی ہونے لگی اور مسلم سماج پر بہت جلد اس رسالے کے اثرات مرتب ہونے ہونے لگے۔ اس رسالے کا مقصد ہی قوم کی خدمت تھا۔ سرسید نے پورا خاکہ اپنے ذہن میں مرتب کر رکھا تھا کہ مسلمانوں کو کیسے تعلیم، سیاست اور دیگر شعبوں میں جہاں صرف انگریز یا پھر دیگر اقوام کا دبدبہ تھا، اپنی قوم کو بڑھایا جائے۔ اسی بنا پر سرسید نے منظّم طریقے سے اس رسالے کی شروعات کی اور یہی رسالہ ہندوستانی اردو صحافت کے لیے میل کا پتھر ثابت ہوا اور اردو صحافت کو بام عروج بخشا۔

سرسید احمد خاں نے جب لندن کا سفر کیا تو ان کا اہم مقصد یہ تھا کہ لندن کے طریقۂ تعلیم کو نزدیک سے دیکھا جائے۔ کتب خانوں میں تلاش وجستجو کے بعد انہیں دو رسالے ''ٹیٹلر'' اور ''اسپیکٹیٹر'' ملے۔ یہ رسالے 1709ء سے 1713ء تک جاری رہے اور ان کے بارے میں یہ مشہور تھا کہ ان کی تحریروں سے انگریزوں کے اخلاق وعادات، رسم ورواج اور دیگر شعبوں میں انقلاب برپا ہوگیا تھا۔ ان رسالوں کی اشاعت سے قبل برطانیہ کی معاشی حالت ہند کے مسلمانوں جیسی ہی خستہ تھی۔ سرسید نے خوب غور وخوض کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ ایسا ہی ایک رسالہ جو خاص طور سے ہندی مسلمانوں کے لیے ہو، جاری کیا جائے جس میں قوم کے متعلق مضامین شائع کیے جائیں۔ یہ اخبار نہ ہو کر رسالہ ہوگا جس میں خبریں نہیں ہوں گی بلکہ تجزیاتی، انکشافاتی اور ترقیاتی خیالات شائع کیے جائیں گے جو ہندوستانی قوم کے لیے مفید ثابت ہوں گے۔

سرسید ان رسالوں سے کافی متاثر ہوئے اور اسی وقت ان کے دل میں ایسے ہی ایک رسالہ کا خیال آیا۔ سرسید کے سامنے تین اہم کام تھے۔ مذہب کو عقل انسانی اور جدید فکر سے جوڑنا اور 1400ء سال پہلے کے اسلام کو آج کی عقل اور سائنس کے نظام سے ثابت کرنا۔ دوسرا مقصد قوم کی سماجی اور معاشی اصلاح اور تیسرا مسلمانوں کو جدید علوم سے ہم آہنگ کرنا تھا۔ اپنے ان مقاصد کی تکمیل کے لیے سب سے پہلے مسلمانوں کو ان تبدیلیوں کے لیے تیار کرنا تھا اور یہ تب ہی ہو سکتا تھا جب قوم تک ان کا پیغام، ان کی بات پہنچے۔ اس کام کے لیے ایک رسالے سے بہتر اور کوئی ذریعہ نہیں ہوسکتا تھا۔ ایک ایسا رسالہ جو وطن کے لوگوں میں ایک تحریک پیدا کرے، ان میں جوش

بھر دے جیسا کہ برطانیہ کے رسائل نے کر دکھایا تھا۔قوم کی اصلاح اوران کی بقا سر سید کا پہلا مقصد تھا۔ پہلے انہوں نے رسالہ ''اسباب بغاوت ہند'' لکھ کر انگریزوں کو جنگ آزادی کی وجوہات بتائیں اور مسلمانوں کو انگریزوں کے وحشیانہ انتقام سے بچانے کی کوشش کی۔ پھر مسلمانوں کی اصلاح کے لیے صحافت کے میدان میں داخل ہونے کا فیصلہ کیا۔ پہلے انہوں نے مسلمانوں میں جدید علوم حاصل کرنے کی ضرورت کا شعور پیدا کرنے کے لیے اخبار ''سائنٹفک سوسائٹی'' شروع کیا۔ اس میں خبریں بھی ہوتی تھیں اور دیگر مضامین بھی۔ اس کے برعکس ''تہذیب الاخلاق'' کا مقصد معاشرے کی اصلاح تھا اور یہ رسالہ خاص طور سے صرف مسلم طبقے کے لیے تھا۔ ہندوستان آنے سے قبل ہی یکم شوال 1870ء کو محسن الملک کو لکھے خط میں تحریر کرتے ہیں:

> ''ایک خاص اخبار خاص مسلمانوں کے فائدے کے لیے جاری کرنا تجویز کرلیا ہے اور تہذیب الاخلاق اس کا نام فارسی میں اور انگریزی میں محمڈن سوشل ریفارمر رکھ لیا ہے۔ اس کا منظر نامہ بہت خوبصورت یہاں کھدوالیا۔ کاغذ بھی ایک برس کے لائق یہاں خرید لیا ہے۔''
>
> [سر سید احمد خاں، سفرنامہ مسافران لندن، شیخ اسماعیل پانی پتی]

12 را کتوبر 1870ء کو سر سید ہندوستان واپس پہنچے اور 24 ردسمبر 1870ء کو انہوں نے ''تہذیب الاخلاق'' کا پہلا شمارہ شائع کر دیا۔ تہذیب الاخلاق کو انہوں نے اسلامی مہینوں کے مطابق نکالا۔ یکم شوال 1287ء کو تہذیب الاخلاق کا پہلا شمارہ منظر عام پر آیا۔ پہلے ورق پر انگریزی میں The Mohammadan Social Reformer چھپا ہوتا تھا اور پھر اردو میں تہذیب الاخلاق چھپا ہوتا تھا۔ پہلا شمارہ عید الفطر کے مبارک دن شروع کیا گیا۔ تہذیب الاخلاق کا پہلا پرچہ 8 صفحوں پر مشتمل تھا اور اس میں سارے مضامین سر سید کے لکھے ہوئے تھے۔ یہ پرچہ منشی محمد مشتاق حسین کے باہتمام شائع ہوا تھا۔ مشتاق حسین 1388ء تک مہتمم رہے۔ اس کے بعد حافظ عبدالرزاق نے اس کی ذمہ داری سنبھالی۔ تیسرے دور میں ممتاز الدین کے زیر اہتمام مطبع علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ سے چھپا۔

''تہذیب الاخلاق'' کے پہلے ہی شمارے میں سر سید نے تہذیب الاخلاق جاری کرنے کی وجوہات بیان کی ہیں اور بعد میں بھی وقتاً فوقتاً باتوں کو دہرایا ہے:

> ''اس پرچہ کے اجزا سے مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو کامل

درجے کی سولیزیشن یعنی تہذیب اختیار کرنے پر راغب کیا جاوے........
یہی ہمارا مطلب اپنے ہندوستان کے مسلمان بھائیوں سے ہے اور اسی مقصد کے لیے یہ پرچہ جاری کرتے ہیں تا کہ یہ ذریعہ اس پرچے کے جہاں تک ہم سے ہو سکے ان کے دین دنیا کی بھلائی میں کوشش کریں اور جو نقصان ہم میں ہیں گر ہم کو نہ دکھائی دیتے ہوں مگر غیر قومیں ان کو بخوبی دیکھتی ہیں ان سے ان کو مطلع کریں اور جو عمدہ باتیں ان میں ہیں ان میں ترقی کرنے کی ان کو رغبت دلاویں۔''

[اردو صحافت اور سرسید احمد خاں، عبدالحئی، 2008ء، ایجوکیشنل بک ہاؤس]

اپنی اس بات کو سرسید احمد خاں نے آخری پرچے تک نبھایا اور صرف ایسے ہی مضامین شامل اشاعت رہے جو کسی نہ کسی تعلق سے قوم کی بھلائی، قوم کے مفاد سے متعلق تھے۔ تہذیب الاخلاق کے فرائض کے عنوان سے مولوی عبدالحق کا مضمون یکم رجب 1312ھ مطابق 20 دسمبر 1894ء کو شائع ہوا تھا۔ اس مضمون میں عبدالحق نے تہذیب الاخلاق کے مقاصد کو بڑے ہی اچھے ڈھنگ سے بیان کیا ہے۔

تہذیب الاخلاق کے دوسرے دور کی میعاد دو سال تین ماہ ہوتی ہے جب کہ عبدالسلام خورشید نے دو سال پانچ مہینے لکھا ہے اور عبداللہ خاں سوا دو سال لکھتے ہیں۔ دوسرے دور کے کل مضامین کی تعداد 67 ہے جس میں سرسید کے 23 مضامین ہیں۔ حالی کا مسدس ''مد و جزر اسلام'' بھی تہذیب الاخلاق کے دوسرے دور میں شائع ہوا تھا۔ دوسرے دور میں اخبار ''اودھ پنچ'' سے منتخب شدہ مضمون ''خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا'' بھی شامل ہے۔ تہذیب الاخلاق کے دوسرے دور کے خاتمے کے بارہ سال بعد دسمبر 1893ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے آٹھویں اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے مولوی نذیر احمد نے پھر سے اس پرچے کو شروع کرنے پر کافی زور دیا جس کا ذکر کرتے ہوئے سرسید نے تیسرے دور کے پہلے تہذیب الاخلاق میں ذکر کیا ہے:

''دوست کہتے ہیں کہ پھر تہذیب الاخلاق جاری کرو، ویسا ہی جیسا پہلے تھا۔ تیسرے دور کے پہلے پرچے میں نذیر احمد کا مضمون ''تہذیب الاخلاق'' کے عنوان سے شامل ہے۔

تہذیب الاخلاق کا تیسرا دور تین سال پر مشتمل ہے۔ تیسرے دور کی شروعات یکم شوال 1311ھ مطابق 7/اپریل 1894ء سے ہوتی ہے اور آخری پرچہ یکم رمضان 1314ھ

مطابق 2 ؍فروری 1897ء کو شائع ہوا۔ اس طرح تیسرے دور کی میعاد تقریباً تین سال ہوتی ہے۔ آخری پرچے کے بعد تہذیب الاخلاق کا اپنا علیحدہ وجود نہیں رہا اور اسے انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں شامل کر لیا گیا اور انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے نام میں تہذیب الاخلاق کا اضافہ ہو گیا۔ تہذیب الاخلاق کے تیسرے دور کے مضامین کی کل تعداد 145 ہے اور تین جلدوں میں چھتیس شمارے شائع ہوئے۔ تیسرے دور کے تہذیب الاخلاق میں 73 مضامین سرسید کے لکھے ہوئے تھے۔

بات اگر اس پرچے کی قیمت کی، کی جائے تو تہذیب الاخلاق رسالے کی سالانہ قیمت دور اول میں چار روپیہ، دوسرے دور میں ساڑھے چار روپے اور تیسرے دور میں چھ روپے تھی اور جو کوئی 60 روپے سالانہ پیشگی دے دیتا تھا ایسے ممبران کو یہ پرچہ بغیر قیمت کے دیا جاتا تھا ساتھ ہی ممبران کو یہ بھی اختیار تھا کہ وہ جس کو چاہیں پرچہ دے سکتے تھے۔ پرچہ پورے طور پر سرسید کی زیر نگرانی تھا۔ خط و کتابت اور پرچے میں شائع شدہ مضامین کی تمام تر ذمہ داری سرسید کی ہی تھی۔ یہ بھی واضح ہو کہ جب سرسید نے یہ رسالہ جاری کیا تھا تو ہرگز یہ نہیں سوچا تھا کہ رسالے میں مذہبی بحثیں ہوں گی۔ ان کے سامنے برطانیہ کے پرچے تھے جن میں اس طرح کی کوئی بحث نہیں ہوتی تھی لیکن ہند کے ماحول اور یہاں کے مسلمانوں کی خستہ حالت نے انہیں ایسی بحثیں کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔

اس میں کوئی دورائے نہیں کہ تہذیب الاخلاق نے جہاں زندگی کے ہر شعبے کو متاثر کیا تھا وہیں اردو صحافت بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکی۔ تہذیب الاخلاق کی شہرت اس کے مضامین سے ہی ہوئی اور اس رسالے کے مضامین نے معاشرے میں پھیلی بے جا رسوم اور فرسودہ روایت کے خلاف تحریک کا کام کیا۔ ان مضامین میں زندگی کے چھوٹے چھوٹے معاملات بھی نظر آتے ہیں۔ اس میں سیاست کے نقارے بھی دکھائی دیتے ہیں اور عام زندگی کی آہیں اور سسکیاں بھی۔ تہذیب الاخلاق میں مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کا رونا بھی ہے اور انگریزی حکومت کے ترانے بھی غرض کہ زندگی کا شاید ہی کوئی شعبہ بچا ہو جس پر مضامین نہ لکھے گئے ہوں اور اس میں شائع نہ کیے گئے ہوں۔ اس میں بین الاقوامی سطح پر اپنے آپ کو منوانے کی کوشش بھی نظر آتی ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر مشتاق احمد رقم طراز ہیں:

> ''سرسید نے تہذیب الاخلاق میں ایسے شش جہت مضامین سموئے کہ یہ ہماری تمام جدید علمی، ادبی اور سماجی ترقیوں کا محور اور نثری ترقیوں کا مخزن بن گیا۔ مذہبی، قومی، اخلاقی، اسلامی ہر قسم کے مضامین میں ندرت و

جدت، دلکشی و رنگا رنگی، فکر وتخیل، منطق و فلسفہ، جوش و خروش، متانت و جزالت اور شوخی و ظرافت کا حسب موقع جلوہ نظر نواز ہوتا ہے۔‘‘

[سرسید کی نثری خدمات، ڈاکٹر مشتاق احمد، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ]

ڈاکٹر مشتاق احمد کی یہ بات صدفی صد درست ہے۔ تہذیب الاخلاق کے شمارے اس کے گواہ ہیں کہ ان کے اوراق میں مسلمانوں کی مفلوک الحالی اور بے منزل زندگی اور ان سے باہر نکلنے کی تجاویز ہیں۔ سرسید نے مذہبی و اسلامی، تہذیبی و سیاسی، تعلیمی و اصلاحی، معاشی اور ادبی مضامین لکھے۔ تہذیب الاخلاق میں شائع سب سے پہلا مضمون ’’تمہید‘‘ کے عنوان سے ہے۔ اس مضمون میں تہذیب الاخلاق کی غرض و غایت بیان کی گئی ہے۔ یہ مضمون سرسید کے اہم مضامین میں شمار کیا جاتا ہے۔

مختصر یہ کہ تہذیب الاخلاق کے ذریعے سرسید کا تعلیمی مشن نہ صرف کامیاب ہوا بلکہ اردو صحافت کے ارتقا میں بھی اس رسالے نے نمایاں کردار ادا کیا ساتھ ہی اردو زبان و ادب کے فروغ میں بھی نہایت معاون و مددگار ثابت ہوا۔ تہذیب الاخلاق کبھی بند کبھی جاری رہنے کے سلسلے کے ساتھ پھر سے نئے رنگ وروپ میں معروف اسکالر و ناقد پروفیسر صغیر افراہیم کی ادارت میں نکل رہا ہے اور مجھے یقین ہے کہ یہ شاہکار رسالہ اپنے شاندار اور یادگار ماضی کی طرح نئی نسل کے لیے مستقبل میں بھی اردو کے خزانے میں بیش بہا اضافہ کرتا رہے گا۔

ایجوکیشنل ٹور کے دوران شعبۂ اردو کے طالب علم اور اساتذہ رضا لائبریری، رام پور میں نادر مخطوطات دیکھتے ہوئے

☆☆☆

عظمیٰ سحر

ریسرچ اسکالر

سرسید کا نظریۂ تعلیم

ہزار و سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

سرسید احمد خان کا شمار انیسویں صدی کی قدآور اور انقلابی شخصیات میں ہوتا ہے۔ یہ صدی ہندوستانیوں خصوصاً ہندوستانی مسلمانوں کے زوال کی صدی تھی۔ 1857ء کی جنگ آزادی جسے انگریزوں نے غدر کا نام دیا تھا اور جس کے لیے وہ مسلمانوں کو ہی ذمہ دار سمجھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ انگریزوں کے ظلم وستم مسلمانوں پر سب سے زیادہ ہوئے انہیں اذیت ناک سزائیں دی گئی۔ سرکاری ملازمتوں کے دروازے ان کے لیے بند کر دیے گئے۔ پنشن یافتہ مسلمانوں کی پنشن بند کر دی گئی۔ غرض یہ کہ انگریزوں نے مسلمانوں کو تباہی کی آخری منزل پر پہنچا دیا۔ ان حالات کا تقاضہ تھا کہ کوئی مرد مجاہد اٹھے اور قوم کی ڈوبتی کشتی کو بچا لے۔ یہی وہ حالات تھے جو سرسید کی تحرک کا سبب بنے۔ دردمند دل رکھنے والے سرسید نے اپنے قوم کی رہبری کا بیڑا اٹھایا۔ ان کے سامنے مسلۂ تھا کہ قوم کو اس ذلت سے کیسے نکالا جائے۔ بہت غور وفکر کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ اس کا علاج صرف تعلیم ہے۔ اور وہ بھی جدید مغربی تعلیم سرسید نے مسلمانوں کو گمنامی اور جہالت کے چنگل سے نکالنے ان کو سیاسی وسماجی اعتبار سے ایک زندہ قوم بنانے کے لیے تعلیم کا سہارا لیا۔

سرسید احمد خاں مسلمانوں کو جدید علوم وفنون حاصل کرانا چاہتے تھے وہ اس بات سے اچھی طرح واقف تھے کہ ہندوستان کی دوسری قومیں اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے بہت آگے نکل چکی ہیں اور مسلمان ان سے بہت پیچھے ہیں۔ لیکن مغربی تعلیم سے مسلمانوں کو سخت نفرت تھی۔ انگریز جب ہمارے ملک میں آئے تو ہمارے بزرگ ان کی تہذیب واخلاق ان کے اطوار وکردار کو اچھی نظر

سے نہیں دیکھتے تھے۔ وہ سوچتے تھے کہ انگریزی تعلیم حاصل کرنے سے ہمارا مذہب کمزور ہوگا اور ہم عیسائی ہوجائیں گے۔ سرسید کے لیے اس تعصب کا توڑنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ جب سرسید نے اس منزل کی جانب اپنا پہلا قدم اٹھایا تو ہر طرف سے مخالفت کا طوفان برپا ہوگیا اوران کو کافر، لامذہب، دجال کے خطاب عطا ہوئے لیکن انہوں نے اس مخالفت کی ذرا پرواہ نہیں کی اور بڑے استقلال سے اپنا کام جاری رکھا۔ سرسید نے انگریزی تعلیم کی ضرورت اس وجہ سے بھی محسوس کی کہ بغیر انگریزی تعلیم کے مسلمان سرکاری ملازمت، تجارت اور درس و تدریس میں ترقی نہیں حاصل کر سکتے تھے۔ اس کو زیرنظر رکھتے ہوئے سرسید نے 1864ء میں غازی پور میں ایک سائنٹفک سوسائٹی قائم کی جس کا مقصد یہ تھا کہ انگریزی کی بہترین کتابوں کا ترجمہ اردو زبان میں کیا جائے تاکہ اردو داں طبقہ ان کو پڑھ کر انگریزوں کی تاریخی، ان کے سیاسی، تعلیمی اور معاشی رجحانات ومیلانات کو سمجھ سکے۔

سرسید اس خیال سے بخوبی واقف تھے کہ کوئی بھی قوم اس وقت تک ترقی نہیں کرسکتی جب تک کہ اس کو تمام علوم وفنون اس کی اپنی زبان میں نہ سکھائے جائیں۔ سرسید نے 1866ء میں انسٹی ٹیوٹ گزٹ بھی جاری کیا۔ اس اخبار کا مقصد موجودہ سیاسی، سماجی اور تعلیمی مسائل کا جائزہ لینا ہوتا تھا تاکہ مسلمان ان تمام مسائل کو بدلتے ہوئے حالات کی روشنی میں سمجھ لیں، اوران کے اندر بصیرت پیدا ہوسکے۔ سرسید نے انگلستان کا سفر بھی کیا۔ وہاں جاکر سرسید نے بڑی بڑی شخصیتوں سے ملاقات کی۔ وہاں کے بڑے بڑے کتب خانہ دیکھے۔ مقصد یہی تھا کہ وہاں کی تعلیمی ترقی کا گہری نظر سے مشاہدہ کیا جائے ان کے تعلیمی اصولوں کو سمجھا جائے تاکہ ان کی روشنی میں ہندوستانی مسلمانوں کے لیے ایک ایسا تعلیمی نصاب تیار کیا جائے جو مشرق اور مغرب دونوں کا سنگم ہو اور جو مسلمانوں ایک نیا طرز فکر دے۔ سرسید نے انگلستان سے واپس آکر دو عظیم الشان کارنامے انجام دیے۔ ان کا پہلا عظیم کارنامہ تھا انگلستان کی یونیورسٹیز کی طرز پر علی گڑھ میں 22 مئی 1875ء میں دی محمڈن اینگلواورینٹل کالج کا قیام۔ یہ صرف تعلیم گاہ نہیں تھا بلکہ تربیت گاہ بھی تھا جو اقامتی اصولوں پر قائم تھا۔ اس کالج نے قوم میں نئی بیداری پھیلادی۔ رفتہ رفتہ یہ کالج مسلمانوں کی روشن خیالی، تعلیم وتربیت، سیاست اور علم وادب کا مرکز بن گیا۔ اور یہ کالج ترقی کی منزلیں طے کرتے ہوئے ایک یونیورسٹی کی شکل اختیار کرلیتا ہے جسے آج پوری دنیا علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نام سے جانتی ہے۔

سرسید کا دوسرا کارنامہ تھا تہذیب الاخلاق کا اجراء جن کا مقصد نہ صرف معاشرت، تہذیب الاخلاق اور مذہبی خیالات کی اصلاح تھا بلکہ اس نے اردو ادب اور انشا پردازی میں انقلاب برپا کر دیا۔ تہذیب الاخلاق کے منظر عام پر آنے کے بعد سرسید کی زبردست مخالفت ہوئی کیونکہ اس میں فرسودہ رسم و رواج کی کڑی تنقید ہوئی تھی۔ اور قوم کو نیا درس عمل دیا جاتا تھا۔ سرسید کی تعلیمی گوشوں میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرس ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس کا مقصد تھا کہ مسلمانوں میں مغربی تعلیم کا شوق پیدا کیا جائے۔ سرسید نے ہمیشہ تعلیم اور تربیت کو دو الگ الگ چیز تسلیم کیا۔ وہ تعلیم کے بغیر تربیت کو ادھورا مانتے تھے۔ اس لیے انہوں نے تربیت پر بھی بہت زور دیا۔ سرسید نے جدید اور قدیم علوم میں کوئی فرق نہیں کیا بلکہ ان کو ہمیشہ جوڑنے کی کوشش کی وہ انگریزی زبان اور جدید علوم کو حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ مشرقی علوم اور مذہبی علوم کے درمیان ہمیشہ پل بنانے میں مصروف رہے۔ یوں تو عمر کے ساتھ ساتھ ان کے کام بھی بڑھتے گئے جو مختلف نوعیّتوں اور حیثیتوں کے تھے لیکن اصل کام جس پر ان کی پوری توجہ صرف ہوئی وہ تعلیم تھا۔ باقی سب تحریکیں خواہ مذہبی ہو یا سیاسی، معاشرتی اور ادبی سب اسی کے ذیل میں آجاتی ہیں۔ اس پس منظر میں جب ہم سرسید کے نظریۂ تعلیم کا جائزہ لیتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا نظریۂ تعلیم بہت ہمہ گیر اور وسیع تھا لیکن ان نظریات میں سیاسی اور سماجی حالات کی بنا پر تبدیلی بھی ہوتی رہی۔ سرسید تعلیم میں مکمل آزادی کے قائل تھے وہ چاہتے تھے کہ مسلمانوں کی تعلیم ان کے ہاتھ میں رہے وہ خود اپنی تعلیم کے مالک ہوں۔ آج مسلمانوں میں جو تعلیمی رجحان عام ہوا ہے اس کے مرد مجاہد سرسید احمد خاں ہی ہیں۔ سرسید نے تعلیم پر اس قدر زور نہیں دیا ہوتا تو آج ہماری قوم صدیوں پیچھے رہتی۔ آج ضرورت ہے تو صرف اس بات کی کہ سرسید کے تعلیمی مشن کو نہ صرف جاری رکھا جائے بلکہ سارے عالم میں پہنچایا بھی جائے ؎

روز روشن کی طرح روشن ہے سرسید کا نام
ان کی عظمت اور بصیرت کو تہہ دل سے سلام

☆☆☆

علما نصیب
ریسرچ اسکالر

عصر حاضر میں سر سید اور رفقائے سر سید کی معنویت

جنہیں ہم محبوب رکھتے ہیں ان سے توقعات بھی زیادہ ہوتی ہیں اور اگر وہ شخصیات مثالی ہوں تو توقعات کا دامن وسیع تر ہوتا جاتا ہے۔ سر سید اور ان کے رفقاء اسی زمرے میں شامل ہیں جنھوں نے اپنی زندگی قوم کی فلاح و بہبود کے لیے وقف کر دیں، اس لیے وہ ہم سب کو عزیز ہیں۔ انہوں نے اپنے عہد کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے مستقبل کے پیش نظر تعلیم و تعلم اور تعمیری نظام کا جو تصور پیش کیا وہ آج بھی ہمارے لیے آئیڈیل ہے۔ حالانکہ ان دانشوروں میں فکری نیز انتظامی امور میں اختلافات بھی تھے چاہے وہ یورپین اسٹاف کا مسئلہ ہو یا پھر جانشینی کا معاملہ سب کچھ حد ادب کے دائرے میں رہا۔ حیرت تو اس بات پر ہوتی ہے کہ مولوی سمیع اللہ خاں نے بھی پاس لحاظ کو پوری طرح ملحوظ رکھا۔ سبب یہ کہ قوم کی خدمت اور جدید علوم وفنون کے فروغ کے جذبے نے سب کو یکجا کر دیا تھا۔ ان کی علمی اور عملی کاوشوں نے یہ ثابت کر دیا کہ اگر ذہنی کشادگی اور قومی وملی خدمت کا جذبہ موجزن ہو تو اختلافات کوئی معنی نہیں رکھتے ہیں۔

رفقائے سر سید نے اپنے اپنے انداز سے یہ واضح کیا ہے کہ جب جب انقلاب برپا ہوتے ہیں اور قوموں کی تصویریں عروج وزوال سے گزرتی ہیں تب تب حساس افراد اپنا لائحہ عمل تیار کرتے ہوئے اپنی منزل مقصود کا تعین کرتے ہیں اور اس کو پالینے کا جذبہ انہیں ہر دم توانا رکھتا ہے۔ زندہ قومیں ہمیشہ اس مطمح نظر پر عمل کرتی رہی ہیں۔ وہ نصب العین تک پہنچنے کا تہیہ کرتی ہیں پھر یہی جستجو اور آرزو قوم کی پہچان بن جاتی ہے۔ منزل اور راستے کا احساس انسان ہی نہیں قوم کی زندگی کے بھی اہم جز ہیں۔ ان کے بغیر حساس افراد ہی نہیں قوموں کی زندگی بھی بے معنی ہو سکتی ہے یعنی منزل کو پالینے کا جذبہ بیدار ہونا ضروری ہے جس کی بنا پر انسان اس تک رسائی حاصل کرنے کی جد وجہد کر سکتا ہے۔

سرسید حال وماضی، جدید وقدیم کا موازنہ کرتے ہوئے اپنے ایک لیکچر میں فرماتے ہیں:

''تم اپنے حال کا اپنے بزرگوں کے حال سے مقابلہ کرو آپ کے بزرگ جس زمانے میں تھے انہوں نے اپنے تئیں اس زمانے کے لائق بنالیا تھا اس لیے وہ دولت وحشمت اورعزت سے نہال تھے اور جس زمانے میں کہ ہم ہیں، ہم نے خود کو اس زمانے کے لائق نہیں بنایا اور اس لیے شکست اور ذلت میں ہیں۔''

معاشرتی، تہذیبی، ادبی اور اخلاقی سطح پر برصغیر کو سرگرم عمل کرنے کے لیے سرسید احمد خاں نے ٹھوس عمل اقدام کیے۔ان کی کاوشوں کا اہم مقصد عام انسانوں خصوصاً مسلمانوں کو نئے فنون سے واقف کرانا اور سائنسی ایجادات واختراعات کے ذوق کی آبیاری کرنا تھا۔اس لائحہ عمل کا ایک اہم حصہ ''تہذیب الاخلاق'' کا اجراء تھا۔ مذکورہ رسالے میں شامل ہونے والے مقالات، خطبات، مکتوبات وغیرہ سرسید اور ان کے رفقاء کے غیر معمولی عزم کا ثبوت مہیا کرتے ہیں۔اس پرآشوب دور میں ہمہ جہت ترقی کے امکانات دریافت کرنا اور قوم کو فوقیت کے ساتھ چلنا سکھانا بظاہر آسان مگر بے حد مشکل مرحلہ تھا۔ارادے مضبوط ہوں تو دشواریاں خود بہ خود رفع ہوتی جاتی ہیں۔

حصول علم کے لیے''باب العلم'' پر نظر ٹھہری۔علی گڑھ میں علم کی بارش شروع ہوئی تو سبھی کے لیے رحمت بن گئی۔ جذبہ فلاح و بہبود اور حصول علم کی مقناطیسی کشش کی بدولت سید ولا کی بستی میں ایک سے بڑھ کر ایک گوہر آبدار جمع ہوتے گئے اور اگر ان کی ایک مختصر فہرست مرتب کی جائے تو اسے بلا تکلف سرسید کے نورتنوں سے تعبیر کیا جا سکتا ہے جس کی زمانی ترتیب کچھ اس طرح ہوگی۔

۱۔ محمد حسین آزاد
۲۔ ڈپٹی نذیر احمد
۳۔ ذکاءاللہ
۴۔ سمیع اللہ
۵۔ حالی
۶۔ محسن الملک
۷۔ وقار الملک

۸۔ چراغ علی

۹۔ شبلی

محمد حسین آزاد نے نہ صرف نظم جدید کی ابتدا کی بلکہ تاریخ، تہذیب، ثقافت اور روایت کی آمیزش سے نثر میں قابل قدر اضافہ بھی کیا۔ انشائیہ نگاری کو فروغ اور مضمون نگاری کو تقویت بخشتے ہوئے سرسید کے ہم سفر بنے۔ وہ اپنے عہد کی افراتفری اور خون آشام فضا سے سمجھ گئے تھے کہ اب نثر ہی ابلاغ کا بہترین ذریعہ ہے کہ اس کے توسط سے براہِ راست قاری تک رسائی حاصل کی جاسکتی ہے۔ لہٰذا انہوں نے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت حال اور ماضی کے گہرے مطالعے سے مستقبل کی راہوں کو روشن کیا۔

ڈپٹی نذیر احمد انشاء پرداز، خطیب اور عالم دین تھے۔ حقیقی زندگی کے قصوں کو اس طرح پیش کیا کہ وہ اردو ناول کا سنگ میل ثابت ہوئے۔ ان کے ناولوں میں خواہ فنی پختگی اور اس کے بنیادی تقاضوں کی پوری پابندی نہ ہو لیکن نذیر احمد کے ناول اس اعتبار سے اردو میں ایک نیا اور کامیاب تجربہ ضرور ہیں کہ ان میں پہلی مرتبہ محض دلچسپی اور تفریح کے مقصد کو نظر انداز کر کے معاشرتی وسماجی مسئلے کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ انہوں نے نئی تہذیب وتمدن کی آہٹ کو شدت سے محسوس کرتے ہوئے قاری کو متعارف کرانے کا مخصوص طریقہ کار اختیار کیا جو بلاشبہ کامیاب رہا۔

مولوی ذکاءاللہ نے تعلیم نسواں کی حمایت میں آواز بلند کی۔ بیواؤں کے لیے بلند شہر میں اسکول کھولا۔ مغربی علوم وفنون سے واقفیت کی بنا پر ریاضی، تاریخ، جغرافیہ۔ طبیعیات، علم الاخلاق وادب کے تعلق سے کثیر تعداد میں مضامین لکھے جن میں وسعت اور تحقیق کی رمق ہے۔ انہوں نے تصنیف وتالیف کے ذریعے اردو نثر کے سرمائے میں زبردست اضافہ کیا ہے بلکہ زندگی سے وابستہ بہت چھوٹے چھوٹے مسائل پر موثر انداز میں دوسروں کو لکھنے کی ترغیب دی۔

قوم کی بدحالی میں بے چین مولوی سمیع اللہ خاں سرسید کے رفیق وعزیز تھے۔ انہوں نے وکالت کی۔ ولایت گئے۔ سی ایس آئی کا تمغہ حاصل کیا اور علی گڑھ تحریک کو عملی جامہ پہنانے کے لیے سب کچھ نثار کر دیا۔ شجاع الدین فاروقی نے ''ناموران علی گڑھ'' میں لکھا ہے:

> ''انگریزی تعلیم کے لیے ایک مدرسہ قائم کرنے کا خیال اگرچہ سرسید کے ذہن میں آیا تھا مگر اس کے اولین محرک اور بانی ہونے کا شرف مولوی سمیع اللہ کو حاصل ہے۔''

حالیؔ اور سرسید کے رشتے کو کون نہیں جانتا اور محسن الملک نے خود اس کا اعتراف کیا ہے کہ ان سے زیادہ سرسید کو جاننے والا، ان کی عزت کرنے والا، ان کی خوبیوں کو سمجھنے والا کوئی دوسرا نہیں تھا پھر جزوی معاملات میں اختلاف تھا جو آخری دور میں بھی برقرار رہا۔

وقار الملک نے سرسید کے اصلاحی مشن کی وسعت و ہمہ گیری کو لامحدود قرار دیتے ہوئے کہا کہ:

''اس سے یہ مراد نہیں جو کچھ ہو علی گڑھ کی زمین میں ہو بلکہ علی گڑھ تحریک میں وہ ہر کام شامل ہے جو حقیقی و کامل و اکمل طور پر مسلمانوں کے حق میں مفید ہو۔'' [تحریکیں، انور سدید، ص 229]

مولوی چراغ علی بھی گوناگوں صفات کے مالک اور کامیاب مترجم تھے۔ سرسید پر ہونے والے مذہبی اعتراضات کا انہوں نے مدلل جواب دیا۔ وہ تحقیقی نظریے کو معتبر سمجھتے تھے۔ اسی لیے تہذیب و ثقافت کے محافظ کہلائے۔

شبلی نعمانی سرسید کے نورتنوں میں عمر کے لحاظ سے سب سے چھوٹے تھے مگر انہوں نے اپنی کثیر الجہات شخصیت اور بے پناہ صلاحیت کی بدولت ایک نئی تاریخ رقم کی۔ شبلی سرسید سے متاثر ہی نہیں تھے بلکہ انہوں نے شعور کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی سرسید کو اپنے خوابوں میں بسا لیا تھا۔

محدود ذرائع اور تھوڑے سے وسائل میں ہمارے بزرگوں نے کیا کچھ ایسے کارنامے کر دکھائے جو ہمارے لیے آج بھی باعث حیرت ہیں۔ وہ بزرگ روزمرہ کے کاموں میں مشغول رہ کر بھی تصنیفی ذوق اور تعمیری شوق کے لیے وقت نکال لیتے تھے۔

بلاشبہ آج کا منظرنامہ بدلا ہوا ہے۔ صارفیت کے اس دور میں ہر شخص ذاتی ترقی اور خوش حالی کو مقدم رکھ رہا ہے اور قدروں کی باتیں از کار رفتہ بنتی جارہی ہیں۔ ہماری نئی نسل جو بے حد ذہین، سند یافتہ اور متحرک ہے نہ جانے کیوں اپنی تاریخ، تہذیب اور اردو رسم الخط سے دور ہوتی جارہی ہے۔ ہم کس طرح انہیں اپنے بیش قیمت تہذیبی اور ثقافتی ورثہ سے منسلک رکھیں یہ ایک مسئلہ بنتا جارہا ہے۔ چمک دمک کے جس جال میں وہ گرفتار ہو رہے ہیں اس کی گرہیں اتنی مضبوط ہوتی جارہی ہیں کہ نجات کے ذرائع اپنی بےبسی پر اشک بار ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ بزرگ خاموش بیٹھے ہوئے ہوں۔ وہ امکانی جتن کر رہے ہیں مگر کامیابی ہر پل دور ہوتی محسوس ہو رہی ہے۔ آخر کیوں؟ اس کی ایک وجہ تو ذمہ داران کی چشم پوشی قرار دی جاسکتی ہے مگر دوسری وجہ خود پر اعتبار و

اعتماد کی کمی ہے۔ دراصل یہ جوہر ہی مشکل گھڑی میں کامیابی کی راہ ہموار کرتا ہے۔اس جذبۂ حر کت وعمل کو بیدار کرنے کا نام علی گڑھ تحریک قرار پایا۔ہم سب کو رفقائے سر سید کی طرح اس بابت سوچنا ہی نہیں عمل بھی کرنا چاہیے۔

۱۔ نئی نسل کو کس طرح قدروں کی اہمیت وافادیت اور معنویت کا احساس دلایا جائے۔
۲۔ انسانیت، محبت، مروت اور درگذر کے جذبے کو کیسے فروغ دیا جائے۔
۳۔ اپنی ایجادات سے کس طرح مثبت نتائج اخذ کیے جانے کا رجحان عام کیا جائے۔
۴۔ مادری زبان سے کس طرح رغبت اور اُنسیت پیدا کی جائے کہ وہ زندگی کا لازمی حصہ بن جائے۔

دودھاری تلوار جیسی راہ سے ہم آج بھی گزر رہے ہیں لہٰذا ہمیں عصر حاضر کے تبدیل ہوتے معاشرتی منظرنامے کی تاریک راہوں کے لیے سر سید اور ان کے معاصرین کے افکار و نظریات اور عملی جدو جہد کی شدت سے ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔

☆☆☆

کتابیات

۱۔	اردو ادب کی تحریکیں	انور سدید
۲۔	نامورانِ علی گڑھ	شجاع الدین فاروق
۳۔	سر سید احمد خاں اور ان کا عہد	پروفیسر ثریا حسین
۴۔	مطالعۂ سر سید احمد خاں	عبدالحق
۵۔	انتخاب مضامین سر سید	آل احمد سرور
۶۔	سر سید اور ان کے کارنامے	پروفیسر نورالحسن نقوی
۷۔	مطالعہ سر سید احمد خاں	ڈاکٹر طارق سعید

شہناز پروین
ریسرچ اسکالر

سرسید کے ہم خیال علماء کے دینی نظریات

ہم سب جانتے ہیں کہ سرسید احمد خاں ایک ذہین اور حساس شخصیت کے مالک تھے۔ ان کا تجربہ بہت وسیع اور مشاہدہ بہت عمیق تھا۔ ان کے دل میں اپنی قوم کے لیے خصوصاً مسلمانوں کے لیے بے پناہ محبت تھی۔ انہوں نے اپنی ہنگامہ خیز زندگی میں سیاسی، تعلیمی، مذہبی، ادبی اور تحقیقی ہر قسم کے علمی اور قومی مشاغل میں نمایاں حصہ لیا تب کہیں جا کر انہوں نے عمل کے ہر میدان میں اپنا نقش بٹھایا۔ چنانچہ ان کے مخصوص سیاسی خیالات نے مسلمانانِ ہندوستان کے اذہان کو بدلنے میں بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ خاص کر تعلیمی معاملات میں ان کے خاص نظریات نے علی گڑھ میں تعلیمی تحریک کی صورت اختیار کی اور آگے چل کر یہ تحریک سرسید کے نام سے جانی گئی۔

سرسید تحریک اردو ادب کی ایک مقبول اور فعال تحریک تھی اور اردو کی دیگر ادبی تحریکوں میں اس تحریک کے بڑے دیرپا نتائج برآمد ہوئے۔ سرسید اپنے عہد کے ایک صاحب بصیرت شخص تھے۔ اسی لیے سرسید کی نظر مسلمانوں میں پائی جانے والی کمزوریوں اور برائیوں پر تھی اور وہ اپنی قوم کو جہالت کی پستی اور تنگ نظری کے اندھیرے سے نکال کر اعلیٰ تعلیم کے اُجالے میں لانا چاہتے تھے۔ ان میں بلند خیالی اور وسعت نظر پیدا کرنا چاہتے تھے۔ وہ ہندوستانیوں کو پہلے ذہنی طور پر انگریزوں سے مقابلے کے لیے تیار کرنا چاہتے تھے اور ان کی موجودگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مغربی علوم وفنون سے اپنی قوم کو بہرہ مند کرنا چاہتے تھے۔

سرسید احمد خاں کی اہم خدمات یہ بھی ہیں کہ انہوں نے اردو نثر کی حدود کو وسیع تر کر دیا۔ چنانچہ انہوں نے اور ان کے رفقاء نے مختلف مضامین مثلاً مذہب، تاریخ، سیاست، تعلیم وغیرہ پر قلم اٹھایا۔ سرسید اور ان کے رفقاء نے مل کر مسلمانوں کے کھوئے ہوئے وقار کو واپس لانے کے لیے زندگی بھر جدوجہد کی۔ سرسید نے مسلمانوں کو خواب غفلت سے بیدار کیا۔ انہوں نے اور ان کے

رفقاء نے مل کر قوم کو فکر وعمل سے روشناس کرایا اور مسلمانوں کو اس غفلت سے نکالنے میں سر سید کی ان کے علماء نے بے حد مدد کی۔

سر سید اور ان کے ہم عصر علماء میں نواب محسن الملک، مولوی چراغ علی، ڈپٹی نذیر احمد، علامہ شبلی نعمانی اور الطاف حسین حالؔی کا نام قابل ذکر ہے۔ سر سید کے علماء نے اس تحریک کو آگے بڑھانے میں سر سید کی قدم قدم پر مدد کی۔ سر سید جس تحریک کے بانی تھے اس میں ان کے ساتھ ان کے دیگر رفقاء بھی برابر کے شریک تھے۔

نواب محسن الملک سر سید احمد خاں کے عزیز ترین دوستوں میں سے ایک تھے۔ نواب محسن الملک کا نام سید مہدی علی تھا۔ آپ کی ولادت 1837ء میں اٹاوہ میں ہوئی۔ آپ کے والد میر ضامن علی شیعہ تھے جنہوں بعد میں شیعہ مذہب ترک کر کے سنی ہونے کا اعلان کر دیا تھا۔ نواب محسن الملک علی گڑھ تحریک کے زبردست حامی اور پر جوش مبلغ تھے۔ یوں تو انہوں نے بہت سی تصانیف لکھی ہیں لیکن ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' میں پے در پے مضامین لکھ کر اردو زبان میں مقالہ نویسی کو مقبول عام بنایا اور اس کا معیار بلند کیا۔ محسن الملک 1864ء میں سید صاحب کی سائنٹفک سوسائٹی کے ممبر بنے اور اس کے لیے سرگرمی کے ساتھ کام کیا۔ انہوں نے '' خطبات احمدیہ'' کی تالیف میں بھی بہت مدد کی اور '' تہذیب الاخلاق'' میں سید صاحب کے مشن کی حمایت اس دلکشی اور پُر اثر انداز میں کی کہ لوگوں پر اس تحریک کا بہت اچھا اثر ہوا۔ آپ کی تصانیف میں مضامین تہذیب الاخلاق، مسلمانوں کی تہذیب، آیات بینات، مکمل مجموعہ لیکچرز، کتاب المحبت والشوق، تقلید عمل بالحدیث وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

سید مہدی علی پہلے ایک معمولی محرر تھے پھر غدر کی بعض خدمات کے بدلے سر رشتہ دار، تحصیل دار اور انجام کار ڈپٹی کلکٹر ہوئے۔ اٹاوہ میں تحصیل داری کے زمانے میں سر سید سے ملاقات ہوئی۔ 1874ء میں ریاست حیدرآباد نے مولوی مہدی علی خاں کی خدمات لیں اور یہیں پر ان کو ''محسن الملک اور محسن الدولہ'' کے خطابات سے نوازا گیا۔ 1893ء میں حیدرآباد سے پینشن لی اور علی گڑھ کالج کے معاملات میں سید صاحب کے دست بازو بن گئے۔ سر سید کے انتقال کے بعد علی گڑھ کالج کے سیکریٹری بنے اور 1907ء میں شملہ میں وفات پائی۔

مولوی چراغ علی کشمیری الاصل تھے۔ ان کے آباؤ واجداد کشمیر سے پنجاب آئے تھے اور ان کے والد مولوی محمد بخش پھر میرٹھ میں آباد ہوئے۔ مولوی صاحب کی اکثر کتابیں انگریزی

میں ہیں جب کہ ان کی تعلیم انگریزی میں نہیں ہوئی تھی مگر بڑے بڑے اہل قلم ان کی انشاء پردازی کی تعریف کیا کرتے تھے۔ان کے مضامین انگلستان کے بلند پایہ رسالوں میں شائع ہوتے تھے۔ ان کے مضامین میں تحقیق، وسعت نظر کی پوری پوری خوبیاں موجود تھیں۔مولوی صاحب رسالہ'' تہذیب الاخلاق'' کے اہم مضمون نگار تھے۔ان کی انگریزی کتابوں کے بعد ان کی سب سے بڑی قابلیت ان کے مضامین میں نظر آتی ہے۔یوں تو رفقائے سرسید سب کے سب اہم ہیں لیکن مولوی صاحب کو سید صاحب سے جو اتفاق تھا وہ شاید کسی اور کو نہ تھا اور اس لحاظ سے اگر نیچری کے لفظ کا اطلاق سید صاحب پر ہوسکتا ہو تو ہم مولوی چراغ علی کو ان سے کم نیچری نہیں کہہ سکتے۔

سرسید کی جماعت میں دو بزرگ ایسے تھے جنہوں نے دیگر شعبہ ہائے علوم کے علاوہ افکار دینی کی طرف بھی توجہ کی۔یہ دونامور مولوی نذیر احمد خاں اور علامہ شبلی نعمانی ہیں۔ان دونوں بزرگوں کا اصلی میدان عمل دوسرا تھا اور ان کی شہرت کا دارومدار بھی ان کی دوسری تصانیف پر ہی ہے جہاں نذیر احمد کا اصلی دائرہ عمل اصلاحی ناول نگاری تھا اور شبلی کا فن تاریخ مگر نذیر احمد اور شبلی دو نوں کی مذہبی تصانیف دینی ادب میں بھی بلند مقام اور حیثیت کی حامل ہیں۔نذیر احمد کی قابل ذکر تصانیف میں ترجمہ قرآن مجید اور ان کی مشہور'' کتاب الحقوق ولفرائض'' ہے اور نذیر احمد کو جو شہرت اپنے ناولوں کی وجہ سے ملی وہ قابل ذکر ہے۔ان کے مشہور ناولوں میں'' مراۃ العروس، بنات النعش، توبتہ النصوح، ابن الوقت، ایامیٰ اور رویائے صادقہ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

شبلی نعمانی غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک تھے۔درحقیقت سرسید کے بعد یہی بزرگ ہیں جن کی تصنیفات میں ہم جدت، آزادیٔ رائے اور فکری گہرائے پاتے ہیں۔چونکہ شبلی کا اشارہ پیچھے کی طرف تھا اور سرسید کا اشارہ آگے کی طرف۔شبلی نے سرسید سے اختلاف کرتے ہوئے ایک جدید علم الکلام کی بنیاد رکھی تھی۔اس موضوع پر بہت سے مضامین کے علاوہ انہوں نے چار کتابیں لکھیں۔علم الکلام، الغرابی اور مولانا سوانح روم۔شبلی آگے چل کر بعض مذہبی خیالات میں سید صاحب کے ہم آہنگ ہوگئے تھے اور پھر انہوں نے سرسید کی رہنمائی قبول کی۔

☆☆☆

راشد طرازؔ

غزل بہ یادِ سرسیدؒ

زمیں بنی تھی جہاں آسمانِ سر سید
چلو وہیں سے اٹھائیں نشانِ سر سید

زمانہ اس کو مٹا دینا چاہتا تھا مگر
کسی سے مٹ نہ سکی داستانِ سر سید

یہ بڑھ رہا ہے ہر اک نسل کے حوالوں سے
رکا نہیں ہے کہیں کاروانِ سر سید

متاعِ لفظ بھی محفوظ ہے کتابوں میں
ہیں پتھروں پہ نقوشِ بیانِ سر سید

زباں پہ قید ہے ڈالی ہوئی زمانے کی
ہمارا دل ہے مگر ترجمانِ سر سید

طرازؔ بس میں اگر ہوتی معجزہ سازی
دکھاتے بن کے کبھی ہم زبانِ سر سید

☆☆☆

افسانے

ڈاکٹر کہکشاں پروین

لاک ڈاؤن

گاؤں جہاں سے شروع ہوتا تھا وہیں پر بھولا کا گھر تھا۔ کالی سڑک سے زیادہ دور نہیں تھا۔ بھولا فرصت کے اوقات اپنے گھر کے سامنے سے سڑک کا نظارہ کرتا رہتا۔ سڑک سے ٹرک اور بس وغیرہ گزرتے تھے۔ ایک دو چار کبھی آٹھ بھی پار ہو جاتے تھے لیکن اب تو بالکل سناٹا پسرا ہوا تھا۔

لاک ڈاؤن ہوئے آج دسواں دن تھا۔ گاؤں میں بظاہر کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ ۔۔۔ البتہ شہر سے روزانہ طرح طرح کی خبریں آتی رہتی تھیں۔ روزمرہ کی زندگی گزر رہی تھی، سب کچھ معمول پر تھا۔ کسے پتہ تھا کہ ایسا انقلاب آئے گا۔۔۔۔ وہ لوگ تو بہت دن بے خبر ہی رہے جس کے گھر میں ٹی وی اور موبائل تھے ان سے نئی نئی خبریں عام ہو جاتی تھی لیکن جب تک خود پر کوئی پریشانی نہ آپڑے تب تک کچھ بھی سمجھنا اور محسوس کرنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ یہاں کے لوگ بھی نسبتاً سکون سے تھے۔ فکر تو بس ایک ہی تھی کہ اب پاس پڑوس کے گاؤں یا شہر جانا بند ہو چکا تھا۔ گاؤں میں زیادہ تر لوگ کھیتی کرتے تھے اور جو چھوٹی موٹی دکانیں کھول کر بیٹھے تھے وہ سامان کہاں سے لاتے۔ لہٰذا ان کی دکانیں تھوڑی دیر کے لیے کھلتیں۔۔۔۔ جن کے پاس کوئی سواری تھی وہ ان پر اندر اندر سامان کا انتظام کر کے لے آتے۔۔۔۔ ویسے زیادہ تر لوگوں کے پاس سائیکل ہی سواری کا ذریعہ تھا۔۔۔۔ بھولا بھی کھیتی باڑی کرتا تھا اور اس کے سامنے کی خالی زمین پر دو چار پیڑ لگے اور وہ بھی سبزی اُگاتا تھا۔ ان کی دیکھ بھال کرتے کرتے وہ سامنے سڑک کو نہارتا رہتا۔۔۔ سڑک چوڑی نہیں تھی لیکن ادھر سے ٹرک یا بس آرام سے گذر جاتی تھی۔۔۔۔ ٹریکٹر بھی گذرتی، ٹرک تو سامانوں سے لدا ہوا رہتا لیکن بس اور ٹیکر کی چھت پر بھی سامان کے ساتھ سواریاں بھری رہتیں۔ بھولا کو یہ نظارہ بڑا پسند تھا وہ اکثر انہیں دیکھ کر ہاتھ ہلاتا مسکراتا۔ کبھی کبھی دونوں ہاتھوں کو آشیرباد کے انداز میں ہلاتا۔۔۔۔ اس کے دل کی گہرائیوں میں ان مسافروں کے

لیے اپنی منزل تک پہنچ جانے کی خواہش شدید رہتی۔۔۔اپنے گھر کے احاطے میں کھڑا سوچتا کہ یہ مسافر جب اپنے گھروں پر پہونچیں تو کس قدر طمانیت قلب نصیب ہوگی جیسے وہ مطمئن اور خوش اپنے گھر میں ہے اسی طرح انہیں بھی وہ خوشی ملے گی۔۔۔۔ویسے بھولا ادھرادھر کم ہی جاتا تھا وہ جو کام کرتا تھا اس میں سفر کرنے کی زیادہ ضرورت بھی نہیں تھی۔گھر میں بیوی ماں، بیٹا اور دو بیٹیاں تھیں کسی طرح گذر بسر ہورہی تھی۔بس جب سے گاڑیوں کا آنا جانا بند ہوا تھا اسے اداسی نے گھیر لیا تھا۔رات کوٹرکوں کی آواز تو آتی لیکن انسانوں کی شکلیں دکھائی نہ دیتیں۔

اچانک یہ کون سا مرض پھیل رہا تھا۔۔۔۔اس کی سمجھ میں کچھ نہ آتا وہ تو برسوں پرانا معمول کی طرح صبح سویرے کھیتوں کی طرف چلا جاتا وہاں اس کی طرح بہت لوگ کھیتی میں مصروف رہتے۔دوپہر کا کھانا کبھی بیٹا کبھی بیوی پہنچا آتی۔شام کو وہ گھر آتا تو منھ ہاتھ دھوکر گھر کے باہر برآمدے میں بیٹھ جاتا۔لوہے کا کھمبا گاڑ کر ٹین کی چادر سے کچھ حصے کو ڈھک کر برآمدہ کی شکل دے دی گئی تھی باقی حصے میں دو چار پیڑ تھے اور سبزیاں بھی اُگتی تھیں اور سڑک کا نظارہ بھی ہو جاتا تھا۔صبح اور شام کچھ وقت بھولا کو یہاں پر رہنا ضروری ہو چکا تھا۔۔۔۔اس کی تفریح کا واحد یہی ذریعہ تھا۔لیکن اب وہ بھی چھن گیا تھا۔۔۔گرچہ گاؤں میں اب بھی کوئی سرکار کی ہدایت کے مطابق نہ ماسک لگاتا تھا اور نہ بار بار ہاتھ دھونے کی کسی کو سوجھتی تھی۔دن بھر محنت اور مشقت میں کسی کو بار بار ہاتھ دھونے کا نہ خیال آتا تھا اور نہ ہی اس کی ضرورت پڑتی تھی۔۔۔وہ بھی معمول کی طرح صبح اپنے کام میں لگ جاتا پھر دوپہر میں کھانا کھانے سے قبل اچھی طرح ہاتھ دھولیتا۔۔۔ اس کے بعد جب گھر لوٹتا تو گرمی کے موسم میں نہادھوکر فرصت کے اوقات گذارتا اور سردیوں میں بھی ہاتھ، پاؤں دھوکر اپنے مطابق وقت مصروف ہوجاتا۔۔۔غرض کہ کوئی تبدیلی کہیں نہیں آئی تھی۔۔۔جس کے گھر میں ٹی وی نہیں تھی وہ اب بھی پہلے کی طرح کسی ایک گھر میں جمع ہوجاتے اور ٹی وی کے سیریلوں سے لطف اندوز ہوتے۔

بھولا کو ٹی وی سے کوئی دلچسپی نہ تھی البتہ اس کی بیوی اور بیٹی پاس کے گھر میں ٹی وی دیکھنے چلی جاتیں اس کے پاس ایک پرانا ریڈیو تھا جسے وہ لگا کر خبریں سنتا رہتا۔ان خبروں کے ذریعہ ہی پوری دنیا میں پھیلی اس مہاماری کا علم اسے ہوا تھا۔۔۔وہ لاکھ سوچتا لیکن اس وائرس کا سر پیر اس کی سمجھ سے باہر تھا۔کھیتوں میں کام کرتے کرتے وہ یہ سوال آس پاس کے لوگوں سے بھی

کرتا۔

''بھائی یہ کیا بیماری ہے جو سب کو اتنا ڈرا رہی ہے سب لوگ گھر میں بیٹھ گئے ہیں اور کسی کو سمجھ میں نہ آ رہا ہے۔''

''ہم کو کا معلوم بھیّا یہ تو بڑے لوگ ہی جانتے ہیں۔ ہمری زندگی تو بس گذر رہی ہے بیماری سے سامنا ہووے تو پتہ چلے۔'' کوئی کہتا۔

''بھگوان نہ کرے کسی کو اس کا دیکھنا نصیب ہو۔ سب پر کرپا ہو اوپر والے کی۔۔۔ ہم تو بس پرارتھنا ہی کر سکتے ہیں۔۔۔ بھولا کہتا اور پھر سب اپنے کام میں مصروف ہو جاتے۔۔۔۔''

اس گاؤں میں کسی کو کچھ پریشانی ہوئی تھی تو بس لاک ڈاؤن سے راشن کے علاوہ کچھ ایسے سامان بھی ضروری ہو جاتے جو آمد و رفت بند ہو جانے کی وجہ سے نہیں آ سکتے تھے۔ گاؤں میں جس کی دکانیں تھیں وہ ایک آٹو رکشا بھی رکھتے تھے۔ لیکن شہر تو ویران پڑا تھا۔۔۔ ضروری سامانوں کے لیے اوقات مقرر کیے گئے تھے۔ لیکن اب آنے جانے کے لیے ای پاس بنوانا ضروری تھا۔ جس نے دیر سویر بنوالیا وہ نکل جاتے تھے مقررہ اوقات پر۔ باقی کو کہیں آنے جانے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ گاؤں میں ایک ڈاکٹر بھی تعینات تھا۔ جو کبھی کبھار آتا تھا یہاں ڈاکٹر سے زیادہ ایک کمپاؤنڈر کی چلتی تھی۔ ڈاکٹر کی عدم موجودگی میں وہی سب کام کر لیتا۔۔۔ وہ اسی گاؤں کا تھا، کام سیکھ کر کلینک میں ڈاکٹر کا دستِ بازو بن چکا تھا۔۔۔ اس کی وجہ سے ڈاکٹر کو بھی بہت سہولتیں حاصل تھیں۔ اس طرح سب کا کام خوش اسلوبی سے چل رہا تھا۔۔۔

بھولا بھی اپنی زندگی کے شب و روز سے مطمئن تھا لیکن اس صبح اس کی زندگی میں ہلچل مچ گئی۔ وہ جب منہ ہاتھ دھو کر باہر آیا تو دیکھا۔ کنارے کھڑی اس کی سائیکل غائب تھی، سبزیوں کی جگہ کہیں کہیں سے ادھڑی ہوئی تھی۔۔۔ ایسا لگتا تھا کہ کسی نے جلدی میں بغیر کسی قرینے کے انہیں توڑا بلکہ اکھاڑا ہے۔۔۔ بھولا تو سب سے پہلے اپنی سائیکل غائب دیکھ کر گھبرا گیا۔ بے تحاشہ چلا کر بولا۔ ارے اٹھو دیکھو۔ کون لے گیا میری سائیکل۔ گھر والے باہر آئے۔۔۔۔ تھوڑی دیر میں بہتوں کو خبر ملی کہ بھولا کے گھر میں چور گھسا تھا۔۔۔ کچھ لوگ ادھر ادھر چل کر دیکھ آئے لیکن پورا راستہ سنسان پڑا تھا۔

دور دور تک کالی سڑک ویران نظر آ رہی تھی۔ اور گاؤں کے اندر جانے والے راستوں کو تو دیکھنا بیکار ہی تھا۔ بھلا کون بیوقوف چوری کر کے گاؤں کے اندر آتا۔ پتہ نہیں رات کے کس پہر یہ واقعہ رونما ہوا تھا۔ سب اپنے حساب سے کچھ نہ کچھ بولتے ہوئے خیال آرائی کرتے رہے۔ پھر بھولا کو صبر کرنے کی تلقین کرتے ہوئے چل دیئے۔ بھولا کا دل بڑا اداس ہو رہا تھا۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا ویسے بھی اس گاؤں میں کبھی چوری ڈکیتی کا کوئی واقعہ نہیں ہوا تھا۔ لوگ اپنے گھروں میں بے فکری سے سوتے تھے۔ بھولا نے کبھی سوچا نہیں تھا اس نے بیٹا کی ضد پر سائیکل خریدا تھا۔ اس کا استعمال کم ہوتا مگر اس کی موجودگی سے ایک ڈھارس بندھتی کہ جب آس پاس جانا ہوا تو آسانی رہے گی۔ سائیکل زیادہ پرانی نہیں تھی اور بھولا نے جتن سے جمع کیے ہوئے پیسوں سے اسے خریدا تھا۔ اس لیے اسے بہت دکھ محسوس ہو رہا تھا۔۔۔۔ جب آس پاس کے لوگ چلے گئے تو اس نے تھکی ہوئی آواز میں کہا۔'' چل دے جھاڑو صفائی تو کر کے چلا گیا۔ مگر اس دھول کو ہٹانا ضروری ہے۔'' منی جھاڑو لینے گئی بیوی بیٹا اندر چلے گئے وہ برآمدے میں رکھی کھٹیا پر بیٹھ گیا۔ آج کھیت پر جانے کا سوال ہی نہیں تھا وہ سڑک کی طرف دیکھنے لگا۔۔۔ سڑک کا سونا پن برقرار تھا۔۔۔ بھولا بھی اب عادی ہو چکا تھا پھر بھی اس کی نظریں بھٹکتی رہتیں۔ اسی وقت منّی کی آواز آئی

''بابا یہ دیکھو۔۔۔ اس کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا۔'' کیا ہے۔'' بھولا نے پوچھا۔

یہ وہاں پڑا تھا اس نے گیٹ کے پاس جھاڑیوں کی طرف اشارہ کیا۔

''پھینک اسے'' بھولا کا موڈ تو خراب ہی تھا'' بابا کسی نے یہ چٹھی لکھی ہے''۔

منّی پڑھنا لکھنا جانتی تھی جب کہ بھولا تو بالکل اَن پڑھ تھا۔'' منھ کیا تک رہی ہے پڑھ کیا لکھا ہے اس میں۔''

بھولا تیز آواز میں بولا۔

منّی پڑھنے لگی۔

''بھیّا میں چور نہیں ہوں مجبوری سے آپ کی سائیکل لے کر جا رہا ہوں میرے گھر والے میرے بچے میرا انتظار کر رہے ہیں۔ مزدوری کرنے باہر گیا تھا بڑی مشکلوں سے اتنی دوری طئے کیا ہے میں تو کسی طرح آگے بڑھ جاتا۔ مگر میرا چھوٹا بھائی جو میرے ساتھ رہتا تھا وہ ایک قدم

اب نہیں چل سکتا۔ اسے سڑک کنارے بٹھا کر آیا ہوں۔ پہلی بار ایسا
کام کر رہا ہوں سمجھ لینا کہ تم نے ایک مزدور بھائی کی مدد کی ہے۔
اندھیرے میں جو ہوسکا لکھ دے رہا ہوں کیوں کہ دل پر ایک بوجھ ہے۔
بھائی معاف کرنا۔''

شکستہ تحریر کو منّی نے اٹک اٹک کر پڑھا پھر بھولا کی طرف دیکھ کر بولی۔

''پھینک دوں؟

''نہیں مجھے دے'' بھولا نے ہاتھ بڑھا کر چٹھی لے لی۔ میلا کاغذ پر آڑی ترچھی تحریریں کسی کی مجبوری، بے بسی اور ندامت کی داستان سنا رہی تھیں۔

واقعی وہ مجبور تھا۔۔۔ اور بھوکا بھی۔ ورنہ سائیکل کے ساتھ ساتھ اس کی کیاریوں کے ٹماٹر نہ لے جاتا۔ چٹھی میں ٹماٹروں کا ذکر نہ تھا لیکن ادھڑے ہوئے پودے اس کی گواہی دے رہے تھے۔۔۔

بھولا نے وہ چٹھی اپنی قمیض کے جیب میں ڈال لی۔۔۔ اس سے اب سائیکل کی یاد جڑ چکی تھی۔

☆☆☆

شعبۂ اردو کے طلبہ وطالبات پروفیسر اسلم جمشید پوری کی قیادت میں ایجوکیشنل ٹور پر محمد علی جوہر یونیورسٹی کے احاطہ میں شعبۂ اردو، جوہر یونیورسٹی کے اساتذہ اور طالب علموں کے ساتھ گروپ پوز دیتے ہوئے۔

فرخندہ شمیم

کراچی

مزدور کا دن

یکم مئی کو سرکاری تعطیل تھی .. بدرالدین کافی دیر سے جاگے اور پھر دیر تک کروٹیں بھی ڈھیلی کرتے رہے . بیگم اور بچے دو دن پہلے ہی ہفتہ اتوار کی چھٹیاں اکھٹی کر کے ڈرائیور کے ساتھ ناران، کاغان چلے گیے تھے، صاحب نے سرکاری گیسٹ ہاوس میں فیملی رومز بک کروا دے تھے اور بچے موسم کی رنگینیوں اور سروں کو چھوتے بادلوں کی نیرنگیوں سے کھیلنے کو بے قرار تھے .

بدر صاحب نے آنکھیں کھول کر پسندیدہ کافی کی خوشبو کو شامہ کیا جسے ملازم کچھ دیر پہلے طرفی میز پر رکھ گیا تھا، انہیں یاد تھا، آج یوم مئی کو ان کی مصروفیات کا شیڈول خاصا بھاری ہے ... سرکاری افسر ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ایک دانش ور بھی تھے، سماجیات کے نہ صرف مشاہدہ کار بلکہ نباض بھی سمجھے جاتے تھے ... ملازمت سے سبکدوشی کے بعد ان کا ارادہ قومی الیکشن لڑنے کا بھی تھا، اسی لیے ہر عوامی موضوع پر بے تحاشا مواد جمع کرتے رہتے تھے، ان عوامی موضوعات میں ایک بڑا موضوع مزدور اور اس کے حقوق کا بھی تھا، جس پر آج ایک سرکاری فورم نے گفتگو کا اہتمام کر رکھا تھا اور بدر صاحب تقریب کی صدارت کرنے والے تھے .....وہ عام سا لباس پہن کر تیار ہوے اور بنگلے میں پہلے سے کام پر لگے مزدوروں کو چھٹی دے کر مسکراتے ہوئے کہا " آج مزدوروں کا دن ہے، چھٹی کرو اور عیش کرو"

لیکن انہوں نے یہ نشاندہی نہیں کی کہ وہ پانچ مزدور کس طرح عیش کریں ... کیا آج تین اوقات کچھ خاص کھانا انہیں کوئی کھلاے گا، کیا کوئی یوم مئی کی خوشی میں ان کی اجرت سے کچھ زیادہ انہیں دے دے گا، کیا کوئی با اختیار ہستی ان کے ایک پڑھے لکھے نوجوان کو اپنے دفتر میں نوکری دے دے گی؟

مزدور کو ایک دن کی چھٹی سے کیا، اس نے کون سا بچوں کو پارک اور میلے میں لے کر جانا ہے، کون سا بیوی کو چوڑیاں پہنانی ہیں، کون سا کسی ضیافت پر پہنچنا ہے؟

اسے تو اس دن بھی فکر کرنی ہے ... فکرِ فردا کی، فکرِ دیہاڑی کی۔

بدر صاحب مزدوروں کو چھٹی دے کر فخریہ انداز میں باہر نکلے تو سرکاری گاڑی کا چاق و چوبند اور باوردی ڈرائیور اس طرح چوکس کھڑا تھا جس طرح بارڈر پر کھڑا سپاہی۔ امیر لوگوں کی حفاظت بھی تو خزانوں سے کم نہیں ہوتی .... جلدی سے اس نے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولا اور بدر الدین اپنے سادہ اور عام سے کپڑوں میں گاڑی کی سیٹ پر آ بیٹھے، ساتھ ہی انہوں نے اپنا برانڈڈ نیا تھری پیس سوٹ بھی پورے اطمینان کے ساتھ دیکھ لیا تھا جو گاڑی کی ایک جانب کھڑکی کے پاس ہینگ تھا۔ بدر الدین نے اسے رات ایک شاندار ہوٹل میں ایک عالی مرتبت شخصیت کی جانب سے دی گئی دعوت میں پہننا تھا ....

یوم مزدور کی تقریب میں مزدوروں کے صرف نمائندے تھے، مزدور خود نہیں تھے۔ اہل دانش روسٹرم پر آتے اور نہایت خوبصورت گفتگو کر کے چلے جاتے ... مزدور نمائندوں نے اپنے دیہاڑی داروں کے مسائل پر بات نہیں کی، ان کے فرائض پر زور دیتے رہے ... اہل فکر و نظر دینی تعلیمات کی روشنی میں مزدور کے حقوق بتاتے اور تالیوں کی گونج میں واپس نشستوں پر بیٹھ جاتے .... بدر الدین کا اسلوب سب سے انوکھا تھا .. وہ تخلیق کار بھی تھے، اپنے لکھے ہوئے ولولہ انگیز اشعار سنا کر کیا سماں باندھ دیا تھا تقریب میں انہوں نے ....ان کے پیچھے دیر تک تالیاں بجتی رہی تھیں ... تقریب ختم ہوئی تو بدر الدین کو ان کے ڈرائیور کا فون آیا۔

"سر، گاڑی اچانک خراب ہو گئی ہے، کوئی بڑا ٹیکنیکل مسئلہ لگتا ہے، ورکشاپ لے جانا پڑے گا"

اوہو "بدر صاحب کا موڈ سخت خراب ہوا''

''کتنا وقت لگے گا؟'' ان کے لہجے میں چڑچڑاہٹ تھی۔

" کچھ کہہ نہیں سکتا سر، ورکشاپ جا کر ہی پتہ چلے گا"

ڈرائیور نے سعادت مندی سے بتایا

بدر صاحب سخت جز بز ہوئے۔

اب کیا ہوگا ... گھر کی دوسری بڑی گاڑی تو بیگم صاحبہ کے ساتھ ناران کاغان گئی ہوئی تھی ... وہ پریشان ہو گئے۔

سر، اگر آپ مناسب سمجھیں تو کسی کولیگ سے لفٹ لے لیں" گھر تک پہنچیں، میں

گاڑی ٹھیک کراتے ہی کوٹھی پر پہنچ جاوں گا۔

ڈرائیور نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

تم جانتے ہو فیروز کہ میں نے کبھی کسی کا احسان نہیں اٹھایا. ہے ... یہ لوگ بعد میں دفتروں میں بتاتے پھرتے ہیں"

تو سر رائیڈ؟

رائیڈ پر چلے جائیں" وفادار ملازم نے ترنت مشورہ دیا۔

نہیں، نہیں مجھے صرف اپنی کار میں کمفرٹ ہے"

مگر سر، اس میں وقت لگ سکتا ہے، کیا آپ اتنا انتظار کر لیں گے؟

یہی تو مسئلہ ہے، رات کا فنکشن بھی تھوڑی دیر میں شروع ہونے والا ہے، وقت بہت کم ہے۔

اچھا سر پھر ایک اور حل ہے" ڈرائیور کو کچھ سوجھا۔

''کیا؟''

''سر، میٹرو بس سے چلے جائیں۔''

''کیا؟؟؟''

بدرالدین چیخ پڑے۔

''میں اور میٹرو بس؟"

''جی سر، بڑے بڑے لوگ اس میں بیٹھتے ہیں سر"

مگر میں نہیں بیٹھوں گا. بدرالدین بے زاری سے بولے آج لیبر ڈے ہے، فنکشن کے مزدور بھی میٹرو میں بیٹھے ہوں گے، مجھے پہچان لیں گے تو کیا کہیں گے"

''سر، میرے خیال سے تو وہ بہت خوش ہوں گے، آپ کو اپنے درمیان دیکھ کر"

''او بے وقوف! لیبر ڈے صرف ایک ایونٹ ہے۔ ایک دن کی زندگی ہے اس کی، پوری حیات تو نہیں تجی جا سکتی اس پر؟ ہاں؟؟''

اور ششدر ڈرائیور پر ناران کے پہاڑ ایک ایک کر کے گرنے لگے۔

☆☆☆

ڈاکٹر پرویز شہریار

لِو اِن ریلیشن سے پرے

بھوک کی جبلت نے اُن دونوں کوایک کروڑ بیس لاکھ کی گنجان آبادی والے بڑے شہر میں ایک چھت کے نیچے ایک ہی کمرے کے اندر بلکہ ایک ہی بستر پر سونے کے لیے مجبور کر دیا تھا۔ کہتے ہیں کہ بھوک چاہے ناف کے اوپر کی ہو یا ناف کے نیچے کی---- بھوک تو بھوک ہوتی ہے، جب لگتی ہے تو آدمی باغی ہو جاتا ہے۔تہذیب وثقافت کا سوال تو بہت بعد میں آتا ہے۔آگ چاہے پیٹ کی ہو یا جسم کی، سب سے پہلے اُسے بجھانا ضروری ہو جاتا ہے۔

جہاں انسانوں کی اتنی بڑی آبادی بستی ہو وہاں کون کس کی پرواہ کرتا ہے۔ویسے بھی لوک لاج کے لیے اپنے سماج کا ہونا ضروری ہے۔

لیکن جہاں انسانی آبادی کی ہر سو بھیڑ ہو، جہاں روزانہ لاکھوں کی تعداد میں لوگ باگ ترکِ وطن کر کے تلاشِ معاش میں بڑے شہروں میں ہجرت کر کے آتے ہوں اور آ کر یہیں بس جاتے ہوں، جہاں کامگاروں کا ہر دم ریلا چل رہا ہوتا ہو، جہاں بے روزگاروں کا ایک اژدہام سا لگا رہتا ہو اور جہاں بازاروادکسی دیوہیکل اژدر کی طرح اپنا جبڑا پھاڑے کھڑا ہو، وہاں موجود لوگوں کے جمِ غفیر میں بھلا ٹھہر کر سوچنے کے لیے کس کے پاس اتنا دماغ ہوتا ہے۔کہتے ہیں کہ —— بھیڑ کے صرف پاؤں ہوتے ہیں، آنکھیں اور دماغ نہیں ہوتے اور نہ ہی اُس کے پاس سننے والے کان ہوتے ہیں۔

ایسے ماحول میں موٹے بھدے پاؤں والے سیاہ فام شمبھو ناتھ سنگھ اور نازک اندام پدمجا جوسیف جو کہ کیرل کے ایک کیتھولک کرسچن فیملی سے تعلق رکھتی تھی، اُن کا ایک چھت کے نیچے ایک ہی کمرے میں ایک ہی بستر پر سونا کوئی اچنبھے کی بات بھی نہیں تھی۔

صارف سماج میں جہاں ہر چیز بکاؤ ہوتی ہے، جہاں ہر سامان کا مول بھاؤ ہوتا ہو،

وہاں اگر ایک نوعمر کھلنڈرے مرد کو کسی بھرپور عورت کے ساتھ گزر بسر کرنا پڑے تو بھلا اس میں کسی کو کیا حرج ہوسکتا ہے؟

کہتے ہیں، ضرورت ایجاد کی ماں ہوتی ہے۔

پدمجا کو بھی دُنیا بھر کے مردوں کی اوچھی نظروں سے خود کو بچانے کے لیے فوری طور پر ایک بوائے فرینڈ کی ضرورت تھی، جس کی مضبوط بانہوں اور چوڑے چکلے سینے کو وہ بوقتِ ضرورت اپنے تحفظ کے لیے ڈھال کے طور پر استعمال کر سکے۔ دوسری طرف گاؤں سے آئے ہوئے اکھڑ نوجوان شمبھو کو بھی ایک ایسی گرل فرینڈ درکار تھی جسے دیکھ کے دوست یار اس کی قسمت پر رشک کرنے لگیں۔ البتہ یہ بات اپنی جگہ مسلّم تھی کہ پدمجا عمر میں اس سے پانچ چھ سال بڑی تھی۔ لیکن جیسے کہ ہم سبھی جانتے ہیں کہ لڑکیوں کی عمر پچیس سال کے بعد اوپر کو تجاوز کرنا بند کر دیتی ہے۔ پدمجا بھی، دیکھنے میں شمبھو کے لیے حصہ بقدر جثّہ ہی معلوم ہوتی تھی۔ لہٰذا، وہ اپنی قسمت پر نازاں تھی کہ شمبھو جیسا چھ فٹہ گبرو جوان اسے اپنے نصیب سے مل گیا تھا۔ اوّل اوّل شمبھو کا حال یہ تھا کہ بستر پر ننگے پاؤں ایسے دھسڑ کے چڑھتا کہ بس معلوم ہوتا جیسے پل بھر میں نئی چادر کو مسک کر رکھ دے گا۔ مگر پدمجا خوش تھی کہ وحشی گھوڑے بھی انسانی محبت کے آگے اپنا سر تسلیم خم کر دیتے ہیں۔ اس نے شمبھو کو سدھانے کا کام روزِ اوّل سے ہی شروع کر دیا تھا۔ حتیٰ کہ جب کبھی وہ اپنی پسینے سے تر بنیائن اور جرابیں کرسی کے بیک ریسٹ پر بے خیالی میں رکھ دیتا تو پدمجا اس کی سرزنش شروع کر دیتی تھی۔ دھیرے دھیرے وہ اپنی جرابیں ہر روز دھونے لگا تھا۔ جس روز اس کی جرابیں نہیں دُھلتی پدمجا کمرے میں داخل ہونے نہیں دیتی تھی۔ اگر کسی مجبوری میں بہانے بنا کر وہ گھس بھی آتا تو وہ روم فریشنر لے کر چاروں طرف اسپرے کرنے لگتی تھی۔

اُسے آج بھی وہ دن یاد ہے۔

جب ویلنٹائن ڈے پر اُس نے رات کے گیارہ بجے پدمجا کو زرد گلابوں کا ایک گچھا پیش کیا تھا۔ اُس روز پدمجا کی نائیٹ شفٹ تھی۔ اُس وقت، راک لینڈ اسپتال کے تھرڈ فلور کا وارڈ خالی اور سنسان تھا۔ سیکوریٹی گارڈ نے اسے آنے سے نہیں روکا تھا کیوں کہ وہ سبھی جانتے تھے کہ شمبھو ناتھ سنگھ اس اسپتال کا اسسٹنٹ اڈمنسٹریٹو آفیسر تھا۔ شمبھو نے دلّی کے کسی پرائیویٹ انسٹیٹیوٹ سے ہوسپٹل اڈمنسٹریشن میں ڈپلوما کیا تھا اور ڈگری ملتے ہی راک لینڈ اسپتال جوائن کر لیا تھا۔

ظاہر ہے، یہ اُس کی پہلی نوکری تھی۔ پہلی تنخواہ، اوپر سے مستزاد یہ کہ کسی صنف نازک سے قربت بھی شاید پہلی پہلی ہی تھی۔ ورنہ پدمجا کے قریب جاتے ہوئے اس کا دل اتنے زوروں سے بھلا کیوں کر دھڑکتا۔ پدمجا کی زندگی میں ایسی جسارت اس سے پہلے کبھی کسی نے نہیں کی تھی۔ اگر پہلے کبھی کسی نے کی ہوتی تو پدمجا نے شاید اپنے حُسن اور جوانی کے زعم میں اُس کی حجامت بنادی ہوتی۔ لیکن ڈھلتی ہوئی عمر کی ڈھلان نے اسے ایسا کرنے سے ایک دم روک لیا تھا------ پہلے تو اس کا جی چاہا کہ اسے خوب ڈانٹ پلائے۔ لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے اپنی چور نگاہوں سے کاریڈور کے دونوں اطراف دیکھا، جب اُسے یقین ہوگیا کہ وہاں کوئی بھی نہیں ہے۔ صرف وہ دونوں تنہا ہیں۔ تو اس نے اپنی خشمگیں نظریں اُٹھا کر شمبھو کی آنکھوں میں دیکھنے کی کوشش کی تھی، جیسے بازار میں کوئی چیز خرید وفروخت سے پہلے دیکھی جاتی ہے۔ تبھی شمبھو کی آنکھوں میں ایک کمسن لڑکے کی ازلی معصومیت دیکھ کے اس کا کلیجہ کٹ سا گیا تھا۔ اُس کا جی چاہا تھا کہ اُسے اپنے سینے سے لگالے اور اتنا پیار دے کہ وہ اس میں ڈوب کے عورت کے قرب کو پالے۔ ماں کی ممتا کو بھول جائے----- لیکن وہ ایسا نہیں کرسکی تھی۔ شمبھو کا تاڑ جیسا ایستادہ قد دیکھ کے وہ اپنا دل مسوس کے رہ گئی تھی۔ اس نے زرد گلابوں کا گچھا شمبھو کے ہاتھوں سے لے لیا تھا۔

''اب تم جاؤ، تھینک یو!''

شمبھو واپس جانے کے لیے مڑا تھا کہ اُس وقت، اسے کچھ یاد آگیا....... چلتے چلتے اس نے کہا تھا:

'' ہپی ویلن ٹائن ڈے، میڈم!''

''مگر اب تو ڈے نہیں ہے، نائیٹ ہوگئی ہے؟'' پدمجا نے شوخی سے شرارت بھرے انداز میں کہا تو شمبھو نے اچانک حوصلہ پا کر اپنی غلطی درست کی:

'' ہپی ویلن ٹائن نائٹ!' اور قدرے خجالت کے ساتھ، وہاں سے جلد از جلد روانہ ہوگیا تھا۔

ادھر پدمجا نے کہا: ''ویل، گڈ نائیٹ''

اور شمبھو کے جاتے ہی، وہ ہنس ہنس کر دوہری ہوگئی تھی۔ شمبھو کے مضحکہ خیز انداز کو دیکھ کے اسے اتنی ہنسی آئی، اتنی ہنسی آئی کہ پیٹ میں بل پڑ گئے تھے۔ ہنستے ہنستے اس کی آنکھوں سے آنسو

نکل پڑے تھے۔ خاص طور سے اس وقت، جب اس نے ہوا میں اپنا دایاں ہاتھ لہراتے ہوئے کن انکھیوں سے دیکھ کے معنی خیز انداز سے مسکرایا تھا۔

''یونانی بوائے... میں تجھے چھوڑوں گی نہیں، دیکھنا...''

پدمجا نے اپنی ہنسی پر قابو پاتے ہوئے کہا تھا۔ تب تک شمبھو خوشی سے پاگل ہوتا ہوا یہ جا وہ جا ہو گیا تھا۔ شمبھو جب پدمجا کی آنکھوں سے اوجھل ہو گیا تو اُس نے زیرلب آہستہ سے کہا تھا:

''میں تیرا خون پی جاؤں گی۔''

وقت پنکھ لگا کر اُڑ جاتا ہے... اور ... کہتے ہیں کہ صرف وہ واقعات یاد رہ جاتے ہیں ...، جو ہمارے دل کو واقعی چھو جاتے ہیں۔

آج،.... اس واقعے کے تین سال گزر جانے کے بعد،.... پدمجا کا نیویارک کے لیے ویزا لگ گیا تھا۔

اب وہ ایک ہائی فائی زندگی کی تلاش میں ہندوستان کو ہمیشہ کے لیے الوداع کہنے والی تھی۔ وہاں امریکہ میں ایک خوشحال مستقبل اس کا انتظار کر رہا تھا۔ سوتے جاگتے ہر وقت اس کے دل و دماغ پر نیویارک کی تیز رفتار زندگی دستک دے رہی تھی۔ جیسے جیسے روانگی کا وقت قریب آتا جا رہا تھا۔ اُس کی دُنیا بدلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے خوب ساری شاپنگ کی تھی۔ رفتہ رفتہ ،اُسے پرانی چیزیں پرائی معلوم ہونے لگی تھیں۔

اِدھر شمبھو بھی کچھ کھویا کھویا سا رہنے لگا تھا۔

اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ ایک دن اُسے پدمجا کو بھول جانا پڑے گا۔ اور یہ کہ وہ دن اتنا جلدی آدھمکے گا۔ وہ تو جانے انجانے میں کب پدمجا سے پیار کرنے لگا اسے پتہ ہی نہیں چلا! اور اب یہ حالت ہو گئی تھی کہ اس کے تصّور کے بغیر وہ جی بھی نہیں سکتا تھا۔

اِس بات کا پدمجا کو بھی احساس ہو گیا تھا کہ شمبھو کچھ کھویا کھویا سا رہنے لگا ہے۔ لیکن جلد ہی اُس نے اِن فروعی باتوں کو اپنے ذہن سے جھٹک دیا تھا۔ اُسے لگا کہ جب ایک ساتھ اتنے دن اکٹھے گزارے ہیں تو بچھڑتے وقت انسان کو تھوڑے بہت دکھ کا احساس تو ہوتا ہی ہے۔ اس میں نئی بات کیا ہے۔

لیکن یکا یک، پدمجا کو سارے بھولے بسرے واقعات، اُس وقت بڑی شدت سے یاد

آنے لگے۔

شمبھو نے ڈاکٹر راجیش شرما کو کس بُری طرح سے پیٹا تھا جب وہ ورکنگ ویمنس ہوسٹل میں رہتی تھی۔ایک شام ڈاکٹر راجیش نے اس کے منع کرنے کے باوجود ڈرنک کے نشے میں زبردستی کسی ریو پارٹی میں لے جانے کی کوشش کی تھی۔اس آپادھاپی میں اس کی کلائی میں موچ آگئی تھی۔پدمجا نے اپنی کلائی پر دیکھا۔گھڑی کی چین کے ٹوٹنے سے اس کی کلائی سے خون بہہ نکلا تھا،جس کے زخم کا ننھا سا نشان اب بھی اس کی کلائی پر موجود تھا۔شمبھو کو جب یہ باتیں معلوم ہوئیں تو اس نے ڈاکٹر راجیش کو پب سے باہر نکال کر اتنی پٹائی کی تھی کہ ڈاکٹر راجیش کو آخر کار پدمجا سے معافی مانگنی پڑی تھی۔

یہ بات تو کسی طرح آئی گئی ہوگئی تھی۔

مگر پدمجا کو شمبھو نے کبھی یہ ظاہر نہیں ہونے دیا تھا کہ وہ پدمجا سے کتنا پیار کرتا ہے۔

اُس واقعے کے بعد شمبھو اور پدمجا نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اُس کا ویمنس ہوسٹل میں اکیلی رہنا ٹھیک نہیں ہے۔ڈاکٹر راجیش ہوسکتا ہے خود نہ آئے لیکن کسی دوسرے آدمی کے ذریعے اُسے کبھی بھی چوٹ پہنچا سکتا ہے۔اس کے کچھ ہی دنوں کے بعد وہ دونوں قطب انسٹی ٹیوشنل ایریا سے اپنے تمام ساز و سامان اُٹھا کر قریب کے ہی ایک گاؤں کاٹھ واڑیہ سرائے میں شفٹ ہو گئے تھے۔

کاٹھ واڑیہ سرائے،ویسے کہنے کو تو گاؤں تھا اور جہاں کہتے ہیں کہ کبھی مٹی کے گھروں اور دکانوں میں لالٹینیں جلا کرتی تھیں۔ان کے آنگن میں بھینسیں بندھا کرتی تھیں۔مرد مال بردار ٹرک چلایا کرتے تھے اور عورتیں دیواروں پر یہاں وہاں تمام اُپلے ٹھونکا کرتی تھیں۔لیکن آج یہاں کی زمینیں سونا اُگل رہی تھیں۔تنگ سے تنگ جگہوں پر بھی کئی کئی منزلہ عمارتیں بن کر کھڑی ہوگئی تھیں۔آس پاس ملٹی نیشنل کمپنیوں کے آجانے سے کرائے کے فلیٹ اتنے مہنگے ہو گئے تھے کہ تنخواہ کی آدھی سے زیادہ رقم ان کے کرایوں میں ہی چلی جایا کرتی تھی۔

پدمجا نے شمبھو کو سمجھایا تھا:

''ہم اپنے عزیزوں کو اپنے گاؤوں میں چھوڑ کے پیسے کمانے کی خاطر ہی اس شہر میں آئے ہیں،پیسے گنوانے کے لیے نہیں؟''

اس لیے کرائے پر پیسے پھینکنے کے بجائے وہ دونوں ایک ہی کمرے میں گزارا کر سکتے

ہیں۔ ویسے بھی انھیں دن بھر اسپتال میں رہنا تھا۔صرف سونے اور رین بسیرے کے لیے الگ الگ فلیٹ لینا کوئی عقلمندی نہیں تھی۔ اس پر شمبھو نے اعتراض کرتے ہوئے کہا تھا:

''اس میں مجھے کوئی حرج کوئی نہیں ہے مگر کیا گاؤں والے ہمارے ایک ساتھ ایک ہی کمرے کے فلیٹ میں رہنے کی اجازت دے دیں گے؟ مجھے تو نہیں لگتا کہ یہ گاؤں والے اس بات کی رضامند ہوں گے۔ان کے پاس پیسے ضرور آ گئے ہیں لیکن اپنی سوچ میں یہ آج بھی کٹر روڑھی وادی ہی ہیں۔''

''بے وقوف مت بنو۔اُنھیں کیسے پتہ چلے گا کہ ہم دونوں کا آپس میں کیا رشتہ ہے؟''

''میڈم! یہ امریکہ نہیں ہے... ''شمبھو نے جلدی سے اپنے خیال کا اظہار کیا۔

''ایسا صرف امریکہ میں ہوتا ہے کہ ایک ہی دفتر میں کام کرنے والے کولیگ اکثر فلیٹ بھی آپس میں شیئر کر لیتے ہیں۔''

''اِکزیکٹلی!'' پدمجا نے اس کی بات کو سراہتے ہوئے شمبھو سے دریافت کیا۔

''تم نے لِو اِن ریلیشن تو سنا ہی ہوگا؟''

''مطلب؟''

''مطلب یہ کہ ہم دونوں کافی میچیور ہیں۔ہم وہ سب کچھ کریں گے،... سوائے بچہ پیدا کرنے کے، جس سے اُنھیں ہمارے بارے میں غیر شادی شدہ ہونے کا کوئی شک نہ ہو۔ پدمجا نے بچہ والا فقرہ بہت دھیمی آواز سے ادا کیا تھا۔اتنی دھیمی کہ گویا اُسے خود اپنی باتوں پر اعتماد نہ ہو۔

''اگر کوئی پوچھے گا کہ آپ نے منگل سوتر نہیں پہن رکھا ہے۔آپ نے سیندور بھی نہیں لگا رکھا ہے، تو پھر... ؟'' شمبھو نے اپنا خدشہ ظاہر کر دیا تھا۔ کچھ اس طرح کہ گویا پدمجا کا دل کا بھید جاننے کے لیے کہا ہو جیسے۔

''کوئی نہیں ہم کہ دیں گے۔ ہماری ابھی اَنگیج منٹ ہو رکھی ہے۔'' کچھ توقف کے بعد وہ تحکمانہ انداز سے بولی۔'' ویسے بھی کرسچن ان فالتو کی رسموں میں کبھی یقین نہیں کرتے ہیں۔'' اس طرح پدمجا نے اِتمام حجت کی خاطر اپنی بات حتمی طور پر وہیں ختم کر دی تھی۔

پدمجا کو وہ بھی دن یاد آ رہے تھے، جب شروع شروع میں انھوں نے قسطوں پر گیس اسٹو، واشنگ مشین اور ایئر کنڈیشنر وغیرہ خریدے تھے۔ابتدا میں کچھ دنوں تک چھوٹی چھوٹی

باتوں کو لے کر آپس میں تکرار ہو جایا کرتی تھی۔مثلاً، نہانے کے لیے پہلے باتھ روم کون جائے گا اور پہلے واش روم کون جائے گا۔اس طرح کی باتوں میں خوب لڑائیاں ہوا کرتی تھیں۔ پدمجا کو لگتا کہ شمبھو واش روم سے جلدی نکلتا ہی نہیں ہے جبکہ شمبھو کو لگتا کہ پدمجا باتھ روم میں جا کر سو جاتی ہے۔

چھوٹے سے کمرے میں ڈبل بیڈ کے درمیان ڈھائی فٹ کا چوبی پارٹیشن لگایا گیا تھا۔جس پر مغل آرٹ کی نقاشی کی گئی تھی۔ رات بھر شمبھو کے خراٹوں سے تنگ آکر پدمجا نے نوز اوپنیر لا کر دے دی تھی، جسے شمبھو روز رات کو سوتے وقت پابندی سے اپنی ناک کے نتھنوں میں لگا لیا کرتا تھا۔صبح سویرے دودھ اور بریڈ کے لیے کوئی بھی اُٹھنا نہیں چاہتا تھا۔ایک دوسرے کو بستر سے دھکیلتے کہ وہ جائے اور دروازہ کھول کے دودھ کی تھیلی لے لے۔

لیکن گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ سب کچھ معمول پر آ گیا تھا۔ایک دوسرے کی عادت واطوار سے وہ دونوں اچھی طرح مانوس ہو گئے تھے۔ بلکہ کبھی کبھی تو پہلے آپ پہلے آپ والی صورت حال پیدا ہو جایا کرتی تھی۔ایک دودھ بریڈ لاتا تو دوسرا اخبار اُٹھا لاتا------ ایک بیڈ ٹی تیار کرتا تو دوسرا ٹوسٹ تیار کرتا---- حتیٰ کہ وہ ایک دوسرے کے سہارے کے اس قدر عادی ہو چکے تھے کہ ایک دوسرے کی عدم موجودگی میں خود کو لاچار محسوس کرنے لگتے تھے۔ انھیں ایک دوسرے کی عادت سی ہوگئی تھی۔ وہ ایک دوسرے کا بے حد خیال رکھنے لگے تھے۔اگر کوئی تھوڑی دیر کے لیے بھی نظروں سے اوجھل ہوتا تو موبائیل کی طرف ہاتھ خود بخود بڑھ جایا کرتے تھے۔

سوچ کی لہروں پر ابھرتے ڈوبتے، اچانک ایک خیال اس کے ذہن میں آیا تو پدمجا تنہائی میں بھی شرما سی گئی۔

پہلے پہل پارٹیشن پر وہ دونوں دستک دے کر لائٹ آف کرنے کی التجا کیا کرتے تھے۔ سونے سے پہلے گڈ نائٹ اور صبح سویرے جاگتے ہی گڈ مارننگ کہا کرتے تھے۔لیکن-------جب شمبھو ایک مرتبہ بہت بری طرح بیمار پڑ گیا تو اُس کی تیمارداری کی خاطر سب سے پہلے پارٹیشن کو ہی کھول کر ہٹانا پڑا۔شمبھو کے جسم کو گرمی کی سخت ضرورت تھی۔دراصل، وائرل فیور میں بھیگ جانے کی وجہ سے اسے نمونیہ ہو گیا تھا۔ پدمجا کو امریکن ایمبسی سے کال آئی ہوئی تھی اور اسے وقت پر پہنچنا بے حد ضروری تھا۔دلّی کی ٹریفک جام کا یہ عالم تھا کہ ذرا سی بارش ہوئی نہیں کہ سڑکیں جام ہو جایا کرتی تھیں۔لہٰذا، موسلا دھار بارش کے باوجود موٹر بائیک پر بیٹھ کے اسے شمبھو کے ساتھ کسی طرح

مقررہ وقت پر پہنچنا تھا۔ اُس دن، وہ وقت پر پہنچنے میں کامیاب تو ہو گئے لیکن دیر تک سڑکوں پر کھڑے پانی میں بھیگنے کی وجہ سے شمبھو کا وائرل فیور نمونیہ میں بدل چکا تھا۔ شمبھو کی طبیعت جیسے جیسے غیر ہوتی جاتی تھی۔ پدمجا خود کو اس کی ذمہ دار مانتی تھی۔ پدمجا کے اندر ایک احساسِ گناہ سر اُبھارنے لگا تھا۔ اُس کا دل اس بات سے اتنا ملول ہوا کہ اس نے شمبھو کی جان بچانے کی خاطر اپنے پورے تن من دھن سے تیمارداری شروع کر دی تھی۔ اس نے کئی رات جاگ کے اس کی سیوا کی تھی اور یسوع سے اپنی عقیدت اور اُس کی مسیحائی کا واسطہ دے کر شمبھو کے لیے زندگی کی بھیک مانگی تھی۔

اس دوران، ایک وقت ایسا بھی آیا، جب برانڈی سے بھی شمبھو کے ٹھنڈے جسم میں حرارت نہیں پیدا ہو رہی تھی تو پدمجا نے اس کے جسم کو ممتا سے لبریز ہو کر کچھ اس طرح سے اپنی آغوش میں بھر لیا، جیسے کوئی ماں اپنے شیر خوار بچے کو بھر لیتی ہے۔ اُس دم، وفورِ جذبات سے وہ اس قدر بھر گئی کہ اس کے اندر حرارت پیدا کرنے کے لیے اس نے اپنے گرم گرم بوسوں اور آنسوؤں سے اسے تر کر دیا تھا۔

شمبھو نے صحت یاب ہوتے ہی کہا تھا:

''پدمجا! میں نے تمھارے اندر اُس رات مریم کے روپ کو دیکھا تھا...

جس کے چہرے سے ہی نہیں بلکہ تمام جسم سے کرنیں سی پھوٹ رہی تھیں۔ تم اُس رات میرے پاس نہیں ہوتیں تو شاید....'' کہتے کہتے اُس کا گلا روندھ سا گیا۔ پھر اس نے اپنی ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے، اپنا جذبات سے بوجھل جملہ یوں مکمل کیا۔ ''تو شاید... آج میں زندہ نہیں ہوتا!''

اس واقعے نے ان کی زندگی کا رخ یکسر بدل کے رکھ دیا تھا۔

اب وہ ایک دوسرے کی سرحدوں میں آزادانہ گھوم پھر سکتے تھے۔ بلا روک ٹوک کوئی بھی کسی طرف آمد و رفت کر سکتا تھا۔ دراصل، اب ان کے باہمی رشتوں کے سفر میں ایک نیا موڑ آ گیا تھا جو ظاہر ہے کہ ان کے توقع سے ایک دم پرے تھا۔ اس کی دھیمی دھیمی آنچ انھیں اندر سے گدازیت بھی بخش رہے تھے۔ مگر ایک ان دیکھے خوف کے ساتھ جو ان کے مستقبل کے ایجنڈے میں کہیں دور دور تک بھی درج نہیں تھا۔

بہر حال،اس واقعے سے ان کے دلوں میں قربت کا احساس پیدا ہوا تو پھر ایک دوسرے کے دکھ درد میں بھی کام آنے لگے۔انسانی فطرت کا تقاضہ بھی یہی تھا کیونکہ وہ دونوں اسی انسانی خدمت کے پروفیشن سے وابستہ تھے۔پھر نہ جانے کب ایک نئی شروعات ہوگئی،سوتے وقت شب خوابی کے لباس میں ایک دوسرے کے ہاتھ پر بوسے دینے لگے۔جو صبح پہلے جگتا اُس کی ڈیوٹی تھی کہ وہ بیڈ ٹی بستر پر لا کے سرو کرے گا۔ایسا کرنے پر اُسے انعام کے طور پر ایک نرم گرم ہیگ کے ساتھ شکریہ ادا کیا جانے لگا۔اس کا پورا پورا فائدہ پدمجا کو مل رہا تھا کیونکہ شمبھو اس لالچ میں صبح سویرے اُٹھنے لگا تھا اور پدمجا کو بستر پر ہی گرم گرم چائے ملنے لگی تھی۔شمبھو کو اس کے احسان کا بھی قرض چکانا تھا،چنانچہ اب وہ زیادہ سے زیادہ پدمجا کا خیال رکھنے لگا تھا۔

ابتدا میں جانے انجانے میں ہلکی سی انگلی بھی مس ہو جاتی تو دل کی دھڑکنیں تیز ہو جایا کرتی تھیں۔لیکن چند ماہ کے اندر ہی اُن کے درمیان محبت کے فرشتے نے اپنے نرم ملائم پنکھ پھیلانے شروع کر دیئے اور دیکھتے ہی دیکھتے اُن کے دل کی لگی نے اپنی سحرانگیزی اس قدر بڑھا دی کہ اب اُن میں سے چند گھنٹوں کے لیے بھی اگر کوئی دور ہوتا تو اُن کے دل ڈوبنے لگتے تھے۔

ان تین برسوں کے ابتدائی دور میں ایک دو بار ایسا بھی ہوا کہ ان کے سارے اصول و ضوابط جو کبھی اُنھوں نے اپنے لیے بنائے تھے،وہ سب دھرے کے دھرے رہ گئے۔کرسمس کے موقعے پر شمپین کے سرور نے کبھی اُنھیں ایک دوجے میں مدغم کر دیا تو کبھی ہولی کے موقعے پر بھنگ اور رنگ نے مل کر ساری حدیں پھلانگ دیں۔لیکن ہر بار ہوتا یہ تھا کہ پدمجا چونکہ خود ہی نرس تھی چنانچہ کوئی نہ کوئی پری وینٹو ادویہ لے لیا کرتی تھی۔

وقت گزرتا گیا اور وہ ایک دوسرے کے قریب سے قریب تر آتے چلے گئے۔

باہری دُنیا کے ٹیمٹیشن اور ان کے خود کے ایمبیشن نے اُنھیں رفتہ رفتہ کب اس کھیل کا عادی بنا دیا۔یہ انھیں پتہ بھی نہیں چلا۔

کہتے ہیں محبت اپنا پہلا وار اتنی آہستگی سے کرتی ہے کہ گھائل ہونے والے شخص کو پتہ ہی نہیں چلتا ہے اور جب پتہ چلتا ہے تو اتنی دیر ہو چکی ہوتی ہے کہ وہاں سے واپسی ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہو جاتی ہے۔

شمبھو کو جب سے معلوم ہوا تھا کہ پدمجا جوسیف کا نیویارک جانے کے لیے ویزا آ گیا

ہے۔ وہ بہت غمگین ہو رہا تھا اور ایک اندرونی کشمکش کے عالم میں اُلجھا ہوا تھا۔ اُسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس طرح سے ری ایکٹ کرے۔'زندگی میں پیار ہی سب کچھ نہیں ہوتا ہے۔' آدمی کو چاہیے کہ وہ اپنی قوتِ عمل اور اپنی فہم و فراست سے بہتر زندگی کے سامان پیدا کرے۔ پدمجا کی محنت رنگ لائی تھی۔ وہ اُسے چھوڑ کے امریکہ جانا چاہتی تھی۔ اِدھر شمبھو بھی اس کی ترقی میں مخل ہونا نہیں چاہتا تھا۔ اُس نے جب بھی اپنے دل کو ٹٹولا ہر بار اس نے پایا کہ وہ پدمجا کے بغیر نہیں رہ سکتا۔

اِدھر پدمجا کی فلائیٹ کو اب صرف تین دن باقی رہ گئے تھے۔

بستر میں جانے سے پہلے، شب خوابی کے گلابی لباس میں، پدمجا چپ چاپ سی بیٹھی کوئی میگزین اُٹھا کر بے دِلی سے اس کی ورق گردانی کر رہی تھی۔ تبھی شمبھو نے بھانپ لیا کہ ----- وہ اپنے جذبات کو چھپانے کے لیے میگزین کا سہارا لے رہی تھی۔ شمبھو نے دوبارہ اُس کی طرف دیکھا۔ بچھڑنے کے کرب کے احساس سے بوجھل فضا میں بھی وہ بہت بھلی معلوم ہو رہی تھی۔ اس کے چہرے کے نور سے معلوم ہوتا تھا جیسے اس کے سینے میں کسی اینجل کا دل دھڑک رہا ہو۔ معصومیت، حلمیت، شفقت اور بچے کو اپنی شیریں لوریوں سے سلا دینے والی ممتا کے جذبوں سے اس کا سینہ بھرا بھرا سا لگ رہا تھا۔

یکایک، پدمجا نے شمبھو کے روہانسا چہرے کی جانب سمندر سی گہری محبت بھری نظروں سے دیکھا اور کھڑی ہو کر یسوع مسیح کی طرح اپنی دونوں بانہیں پھیلا دیں۔ اپنی آنکھوں کے اشارے سے اسے اپنے قریب بلایا۔ پھر اُس کے اُترے ہوئے چہرے کو اپنے سینے سے لگا کر اپنے کپکپاتے ہوئے ہاتھوں سے ڈھارس بندھانے کی خاطر تھپتھپاتی رہی...... کچھ دیر تک وہ ایک دوجے کے دل کی دھڑکنوں کو سمجھنے کی کوشش کرتے رہے کہ وہ کس کے نام سے دھڑک رہے ہیں۔ تبھی شمبھو نے نائیٹ بلب کی ملگجی روشنی میں اپنے گالوں پر دو گرم گرم آنسوؤں کے قطروں کو محسوس کیا---- یہ آنسو نہیں تھے بلکہ خالص سونے کے سیّال قطرے تھے جو سچّی محبت کی آنچ میں تپ کر ابھی ابھی دل کی بھٹی سے نکلے تھے۔

اُس رات پدمجا شمبھو کی اُنگلی تھام کے اُسے ایک ایسے حسیں اور جواں اقلیم کی سیر پر لے گئی جہاں سچّی محبت کرنے والے مرد اور عورت کے جوڑے ہی جا سکتے ہیں اور وہاں جانے کے بعد

پھر زندگی اور موت کا فرق کوئی معنی نہیں رکھتا ہے۔

صبح ہوئی۔

شمبھو کے دل کا تمام غبار نکل چکا تھا۔

آج، نا جانے کیوں صبح بے حد خوبصورت معلوم ہو رہی تھی۔

شمبھو نے حسبِ دستور بیڈ ٹی لے جا کر تپائی پر رکھی اور پدمجا کے ماتھے کو یکا یک جذبات سے مغلوب ہو کر آہستہ سے چوم لیا۔ سوئی ہوئی حالت میں آج وہ شمبھو کو بہت ہی پیاری لگ رہی تھی۔ ایک انگڑائی کے ساتھ وہ اُٹھ بیٹھی۔ شمبھو نے ایک گلاس پانی کے ساتھ اپنی ہتھیلی پر پری وینٹو پلس رکھ کر پدمجا کی طرف بڑھا دی۔

تبھی پدمجا نے فرطِ جذبات میں آ کر شمبھو کو اپنے گلے سے لگا لیا اور پوری قطعیت کے ساتھ یہ اعلان کر دیا-----

''اب مجھے پری وینٹو پلس کی ضرورت نہیں ہے۔''

اتنا کہتے ہی اس نے اپنے سرہانے سے نیویارک کا ویزا نکالا اور اسے فوراً ڈسٹ بن میں ڈال دیا اور اپنے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی۔

''اب میں نیویارک نہیں جاؤں گی۔''

اتنا سنتے ہی شمبھو کی باچھیں خوشی سے کھل اُٹھیں۔ اس کے مغموم چہرے پر جیسے خوشی کی ایک لہر سی دوڑ گئی اور وہ شادمانی کے عالم میں تقریباً چیخ اُٹھا۔

پدمجا نے شمبھو کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا:

''اسٹوپڈ! مجھے پیسہ نہیں ..... '' اتنا کہہ کے اُس نے شمبھو کے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ ثبت کر دیئے اور ایک طویل وقفے کے بعد اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا:

''پیار چاہیے،... پیار!''

☆☆☆

پروفیسر اسلم جمشید پوری

میرٹھ

ریلا

وہ ہمیشہ ہی سادگی کو پسند کرتی تھی۔اس کا روزمرہ بھی بہت سادہ تھا۔مگر اس میں بلا کی کشش اور جاذبیت تھی۔وہ گاؤں کے نوجوانوں کے دلوں پر راج کرتی تھی۔اس کی جوانی نے نوجوانوں کے ساتھ ساتھ عمر رسیدہ لوگوں کے بھی ہوش اڑا دیے تھے۔جب وہ گھر سے نکلتی تو سبھی اس کی ایک جھلک کو بے تاب رہتے۔ایک تو اس کا رنگ صاف تھا،اوپر سے سادگی نے سونے پر سہاگہ والی بات سچ ثابت کر دی تھی۔مگر اس کی اپنے آپ سے بے خبری نے کتنوں کو اس کا دیوانہ بنا رکھا تھا۔اسے یہ بھی خبر نہیں تھی کہ زمانہ اس کا دیوانہ ہے۔اس کا ریلا پن،اس کی معصومیت کو مزید صیقل کرتا تھا اور اسے ایک الہڑ دوشیزہ ثابت کرتا تھا۔

پوجا رانی نے گاؤں کشن پور میں آشا دیوی کے یہاں آنکھ کھولی تھی۔اس کے والد دیپ داس نے بڑے ارمانوں سے اسے پالا تھا۔مگر اس کا باؤلہ پن اس کے والدین کیلئے پریشانی کا سبب تھا۔کشن پور میں سبھی دھرموں کے لوگ رہتے تھے۔گاؤں کے باہر منڈیا میں دلت طبقے کے لوگوں کے گھر تھے۔یہ پورے گاؤں کی صفائی ستھرائی کرتے،محنت مزدوری کرتے اور کسی طرح اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پالتے۔اس کے والدین بلکہ کئی پشتوں کے لوگ گاؤں کے گھر گھر صفائی ستھرائی کا کام کرتے تھے۔پانچویں چھٹی تک اسے گاؤں کے اسکول میں پڑھانے کے بعد اس کے والدین نے ایک واقعے کے سبب،اس کی تعلیم ترک کر کے گھر بٹھا لیا تھا۔

☆

ہوا یوں کہ اس کی کلاس میں گاؤں کے پردھان حکم سنگھ کا بڑی عمر کا لڑکا پڑھتا تھا۔ادھو سنگھ کئی بار کلاس میں فیل ہو چکا تھا۔دراصل وہ پڑھتا وڑھتا تو نہیں تھا،صرف شرارت کرتا تھا۔کسی بھی لڑکی کو پکڑ لیتا اور اس سے بدتمیزی کرتا۔ماسٹر سے بھی ڈرتا نہیں تھا۔اس کے چند اوباش قسم کے دوست تھے۔وہ سب مل کر خوب ہنگامہ کرتے۔کسی بھی لڑکے کو مارتے،کسی لڑکی کو چھیڑتے

اور کسی کو بھی گالیاں بکتے۔ پوجا پڑھنے میں پھسڈی تھی، یہاں بھی اس کا پاگل پن حاوی تھا۔ سبھی ٹیچرز جانتے تھے کہ پوجا ایک کند ذہن بچی ہے۔

اس بار ادھو اور اس کے دوستوں نے پوجا کو بیت الخلا کی طرف دبوچ لیا۔

''ارے یہ کیا کر رہے ہو؟'' پوجا کو کچھ دیر بعد سمجھ میں آ گیا۔

''مجھے چھوڑ دو بھیا۔۔''

''آج تیری پوجا ارچنا کریں گے۔۔''

''میں ایسی لڑکی نہیں ہوں۔۔'' پوجا نے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔ مگر ان پر تو نشہ سوار تھا۔ ان میں سے ایک بولا۔

''سبھی لڑکیاں یہی بولتی ہیں۔۔'' ایک نے آگے بڑھ کر اس کا دوپٹہ اتار کر دور پھینکتے ہوئے کہا۔ ''اب ہم سے کوئی بچا نہیں پائے گا''۔

پوجا نے چاروں طرف سے خود کو گھرا ہوا پایا۔ تو گھبرا کر رونے لگی۔ وہ ان کی نیت کو سمجھ گئی تھی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ ادھو سنگھ آگے بڑھ رہا تھا۔ اور اسے گھسیٹ کر لے جانے لگا۔ پوجا نے لمحے کے سویں حصے میں فیصلہ کیا اور اس پر عمل بھی۔ اس نے زور سے ادھو سنگھ کے بازو میں اپنے دانتوں سے سخت حملہ کیا اور زور سے چلائی۔

''بچاؤ۔۔۔ بچاؤ''

ادھو اور اس کے دوست اس حملے کے لئے تیار نہ تھے۔ وہ تو پوجا کو ایک کمزور اور دبو قسم کی لڑکی سمجھ رہے تھے۔ ویسے بھی پوجا کا تعلق سماج کے اس طبقے سے تھا، جس میں پردھان کے کسی بھی ظلم کے خلاف سر اٹھانے کی ہمت نہیں تھی۔ پوجا نے چلّانے کے ساتھ پوری طاقت سے اسکول آفس کی طرف دوڑنا شروع کر دیا۔ ادھو کے دوست اس کے پیچھے لپکے بھی۔ لیکن وہ پوجا کو پکڑ نہ سکے۔ پوجا کے پورے جسم میں پر، سے اگ آئے تھے، مانو وہ دوڑ نہیں اڑ رہی ہو۔ اس نے ہیڈ ماسٹر کے کمرے میں رک کر ہی سانس لی۔ اس کی سانس تیز تیز چل رہی تھی۔ ہیڈ ماسٹر اپنی سیٹ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ انہیں معاملہ سمجھتے دیر نہ لگی۔ وہ پوجا کی حالت دیکھ کر ہی سب کچھ سمجھ گئے تھے۔ پوجا نے ادھو اور اس کے دوستوں کی نازیبا حرکتوں کے بارے میں ہیڈ ماسٹر کو بتایا۔ ہیڈ ماسٹر کے چہرے پر مختلف رنگوں کا آنا جانا لگا ہوا تھا۔ وہ آگ ببولا ہو کر آفس میں ادھر سے ادھر ٹہل رہے تھے۔ ان کے نتھنے پھول اور سکڑ رہے تھے۔ وہ ادھو اور اس کے دوستوں کے خلاف کچھ بھی

نہیں کر سکتے تھے۔

☆

ایک بار جب وہ نئے نئے آئے تھے۔ادھواوراس کے ساتھیوں نے ایک دلت لڑکے کو بہت مارا تھا۔انہوں نے ادھواوراس کے دوستوں کے خلاف زبردست ایکشن لیا تھا۔انہوں نے ادھواوراس کے دوستوں کی قیچی سے خبر لینی چاہی،لیکن سب بھاگ گئے تھے۔ہیڈ ماسٹر نے چار دنوں کے لئے ان کے اسکول آنے پر پابندی لگادی تھی۔اس کا انجام یہ ہوا کہ اسی دن شام کو اسے پردھان نے بلا بھیجا۔وہ جب پردھان حکم سنگھ کی بیٹھک پر پہنچے تو وہاں سینکڑوں لوگ جمع تھے۔گاؤں والوں نے پردھان حکم سنگھ کے جلوے دیکھے تھے،وہ کئی بار سے پردھان منتخب ہورہے تھے۔حکم سنگھ کے حکم کے بغیر گاؤں میں پتہ بھی نہیں ہلتا تھا۔گاؤں والے حکم سنگھ کے رعب داب کے سینکڑوں واقعات دیکھ چکے تھے۔آج گاؤں کے اسکول کے ہیڈ ماسٹر کو بلوایا گیا تھا۔

''آبے۔۔۔ہیڈ ماسٹر۔۔''

حکم سنگھ نے کچھ اس قدر تحقیر سے اسے بلایا،کہ اس کا ماتھا ٹھنکا۔اسے ادھواوراس کے دوستوں کے ذریعہ دلت لڑکے کی پٹائی اور اس خود کے ایکشن کی ایک ایک بات یاد آ گئی۔وہ بیٹھک پر بھیڑ دیکھ کر معاملے کی نزاکت سمجھ گئے تھے۔اس نے پردھان کے بڑے زمین دار ہونے اور سیاسی تعلقات کے بارے میں سن رکھا تھا۔وہ اندر اندر کانپ رہے تھے،مگر ان کے ضمیر اور اخلاق نے ان کی ہمت بندھا رکھی تھی۔وہ نجانے کیا کیا سوچ رہے تھے کہ اسی وقت پردھان کی آواز بلند ہوئی۔

''کیوں بے۔۔ہیڈ ماسٹر زیادہ چربی چڑھ گئی ہے۔تو ہمارے بیٹے کے خلاف ایکشن لیا۔۔تیری ہمت کیسے ہوئی۔۔؟''

''ادھواوراس کے دوستوں نے ایک لڑکے کو بے قصور مارا تھا۔۔۔''ہیڈ ماسٹر کا ضمیر ہمت کر کے بول پڑا۔اتنا سننے کی تاب پردھان میں کہاں تھی۔اسے محسوس ہوا کہ ہیڈ ماسٹر نے اس کی بےعزتی کر دی ہے۔وہ تو ہیڈ ماسٹر کو دوکوڑی سے زیادہ کا نہیں سمجھتا تھا۔اس کے سامنے کسی میں جواب دینے کی ہمت نہیں تھی۔اس کی بیٹھک پر جمع لوگ کیا سمجھیں گے۔میرے بیٹے نے کچھ بھی کیا،کبھی کسی کی سزا دینے کی ہمت نہ ہوئی۔وہ آگ ببولا ہوتے ہوئے ہیڈ ماسٹر سے مخاطب ہوا۔

''ایک تو میرے بیٹے کو سزا دیتے ہو ماسٹر، دوسرے منہ لڑاتے ہو۔ تمہیں اس کا انجام پتہ نہیں۔''

اور غیر متوقع طور پر پردھان کے ایک اشارے پر دو چار مشٹنڈوں نے ہیڈ ماسٹر کو دبوچا اور گھسیٹتے ہوئے پردھان کے قدموں میں لا کر ڈال دیا۔ ہیڈ ماسٹر نے کھڑے ہو کر اپنے کپڑے جھاڑتے ہوئے خفگی کے ساتھ کہا۔

''یہ کیا بدتمیزی ہے۔۔۔۔''

ابھی ان کا جملہ پورا بھی نہیں ہوا تھا کہ دو مشٹنڈے لپکے، لیکن پردھان کے اشارے پر وہیں کے وہیں جم کر رہ گئے گویا پردھان نے ''اسٹیچو'' کہہ دیا ہو۔ پردھان کو ماسٹر کی ہمت پر حیرانی ہو رہی تھی۔ اب تک کوئی ماسٹر ایسا نہیں آیا تھا، جس نے اس کے سامنے کھڑے ہونے کی بھی جرات کی ہو۔ ہو نہ ہو اس کی کوئی پشت پناہی کر رہا ہو۔ ہو سکتا ہے کوئی سیاسی ہاتھ اس کے پیچھے ہو۔ اچانک وہ پھر اپنی جون میں واپس آ گیا۔ کوئی بھی اس کے پیچھے ہو آج اسے سبق سکھانا بہت ضروری ہے۔ اگر اسے آج سبق نہیں سکھایا تو گاؤں والوں کے سامنے میری عزت خاک میں مل جائے گی اور کوئی بھی میرا رعب داب نہیں مانے گا۔ دوسری طرف ہیڈ ماسٹر کے دل میں بھی عجیب و غریب خیالات آ رہے تھے۔ پردھان ہوگا اپنے گھر کا، سمجھتا کیا ہے خود کو۔ میں سرکاری افسر ہوں۔ اپنی بے عزتی کو میں برداشت نہیں کر سکتا۔ ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ پردھان نے غصے میں آ کر اس کے گال پر کئی طمانچے رسید کر دیے۔ ہیڈ ماسٹر خاموشی سے اٹھ کر چلا آیا کہ وہاں رکنا اپنی اور بے عزتی کرانی تھی۔ پردھان کی دھمکیاں بہت دور تک اس کا پیچھا کرتی رہیں۔ اس نے تھانے پہنچ کر پردھان کے خلاف رپورٹ درج کروادی۔ اور ایک مہینے کی چھٹی لے کر اپنے گاؤں چلا گیا۔

☆

ایک ماہ بعد جب وہ آیا تو تھانے دار نے رپورٹ واپس لینے اور سمجھوتہ کرنے کا دباؤ بنایا۔ روز روز کے پولس اور عدالتوں کے چکر لگانے سے بہتر اس نے رپورٹ واپسی کے کاغذات پر دستخط کر دیے۔ مگر پردھان کے پاس نہیں گیا۔ خود کو حالات کے سپرد کر دیا۔ اور خود کے ٹرانسفر کی کوششیں تیز کر دیں۔ وہ ماضی کے صحرا سے نکل کر حال میں آ گئے۔ پوجا کی حالت دیکھ کر وہ سب سمجھ گئے تھے۔ ادھو اور اس کے دوستوں کے حوصلے کافی بڑھ گئے تھے۔ وہ خود کو بے بس اور مجبور پا

رہے تھے کہ علاقے کا تھانیدار بھی پردھان کا ہی آدمی تھا۔

☆

گھر پہنچنے پر پوجا کی حالت دیکھ کر آشا گھبرا گئی تھی۔مگر پورا واقعہ سن کر اس نے اپنی بیٹی جسے لوگ ریلا سمجھتے تھے، کی پیٹھ تھپ تھپائی۔شام کو جب دیپ داس گھر آیا تو آشا نے پورے واقعے کی تفصیل بتائی۔تو دیپ غصے کے مارے کمرے میں ٹہلنے لگا۔اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔انسان جب مخالف کا کچھ بھی نہیں کر پاتا ہے۔تو اس کا غصہ اپنے اوپر ہی اترتا ہے۔مارے غصے کے اس کا برا حال تھا۔اس کی زندگی کے دیپ کی لو تھرتھرا رہی تھی۔پردھان کا معاملہ نہ ہوتا تو وہ آج اپنی بیٹی کی عزت پر ہاتھ ڈالنے والے کے ہاتھ قلم کر دیتا۔اس کا قتل کر دیتا۔

دونوں سر جوڑ کر مسئلے کا حل ڈھونڈنے لگے۔یہ طے پایا کہ پوجا کا اسکول جانا بند کرا دیا جائے۔اور دونوں نے اپنی بیٹی کو سب کچھ سمجھا دیا۔پوجا کبھی بھی اپنے والدین کے خلاف نہیں جاتی تھی۔اسے ادھو اور اس کے دوستوں پر بہت غصہ تھا کہ ان کی حرکتوں نے اس کی تعلیم ادھوری چھڑوادی۔اس کے سارے خواب ادھورے رہ گئے۔لیکن انسان کی سب سے قیمتی شئے عزت ہوتی ہے۔گاؤں کے غریبوں کے پاس عزت ہی تو ہوتی ہے،جس سے وہ غریب ہو کر بھی باعزت زندگی گذارتے ہیں۔

☆

ادھو اور اس کے دوستوں کے ارمان ادھورے رہ گئے تھے۔گویا کسان کی امید بادل، بن برسے گذر گئے ہوں۔کھیتوں،کھلیانوں،راستوں سے اڑتی دھول،ادھو کے ارمانوں کی چادر پر جم گئی ہو۔ایک معمولی سی لڑکی نے انہیں چکمہ دے دیا تھا۔ایک معمولی سی لڑکی۔۔گاؤں اور خاص کر پردھان کے رحم و کرم پر اس کا پورا خاندان زندگی گذارتا تھا۔اس کی اتنی ہمت کہ وہ ہم کو کسی کام کے لئے نہ صرف منع کرے بلکہ ہمیں زخمی بھی کر دے۔پوجا،جو ریلا تھی کے اندر اتنی ہمت کہ وہ ہمارا سامنا کرے۔

مغرب کی طرف سے اٹھنے والے سیاہ بادلوں نے گاؤں کا پورا آسمان ڈھک لیا تھا۔دن میں رات کا منظر زندہ ہو گیا تھا۔فصلوں اور درختوں کے جھنڈ، یوں محسوس ہو رہا تھا، گویا کالے دیو ہوں جو گاؤں میں بڑی تباہی لانے کے لئے بے تاب ہوں۔تھوڑی ہی دیر میں بارش ہونے لگی۔پورے گاؤں میں جل تھل ہو گیا تھا۔چھتوں کے پتنالے بھر بھر کر گر رہے تھے۔کھیت

،راستے وغیرہ سب لبالب ہو گئے تھے۔برسات میں یوں بھی گاؤں کی زندگی زیادہ مشکل ہو جاتی ہے۔ادھر ادھو اور اس کے دوست پوجا سے انتقام لینے کے فراق میں تھے،ایسا انتقام کہ دنیا یادرکھے۔ادھو اسکول کی بات یاد کر کے تلملا جاتا،اپنے آپ پر غصہ کرتا۔دل مسوس کر رہ جاتا۔

ادھو اور اس کے ساتھی پوجا اور اس کے گھر والوں کو سبق سکھانے کے لئے موقع کی تلاش میں تھے۔وہ اسکول بھی چھوڑ چکے تھے۔پوجا جوانی میں داخل ہو رہی تھی۔اس کی اٹھان عمر سے زیادہ تھی۔وہ ابھی عمر کے پندرہویں پائیدان ہی چڑھی تھی مگر اٹھارہ برس سے کم کی نہیں لگتی تھی۔اس کا پاگل پن بھی کچھ کم ہوا تھا۔اس کی لمبائی مانو سرو کا پیڑ ہو،اس کا چہرہ گول مٹول،عارض پہ ایسی چمک کہ دیکھنے والا دیکھتا ہی رہ جائے۔آنکھیں ایسا لگتا گہرا سمندر ہو،جو ڈوبا سو ڈوب گیا۔ابرو جیسے کمان کا خم ہوں،اور پلکیں ایسی جھالر جو اٹھیں تو سویرا ہو جائے اور جھکیں تو شب کا اندھیرا پھیل جائے۔ہونٹ لگتا تھا رس سے بھری ہوئی سنگترے کی قاشیں ہوں کہ ذرا سا چھوا تو رس ٹپک پڑے گا۔دانت گویا سفید چمک دار موتی ہوں۔لمبے لمبے کالے بال،جنہیں ناگن سے تشبیہ دی جا سکتی ہے۔ان تمام کے ساتھ جوانی کی رونقیں۔گویا سونے کی انگوٹھی میں نیلم جڑ دیا گیا ہو۔ چال کی مست خرامی دیکھتے ہی بنتی تھی۔حسن بے پرواہ ،ہو تو پرواہ کرنے والوں کی کمی نہیں رہتی۔پوجا کے ساتھ بھی یہی معاملہ تھا۔اسے خود کو پتہ نہیں کہ وہ کتنی قاتل ہے۔اور اس پر مر مٹنے والوں کی تعداد کتنی ہے۔کتنے لوگ تھے جو اس کی پوجا کا ارمان دل میں پالے ہوئے تھے اور کئی تو اسے اپنے دل کی رانی بنانے کا خواب دیکھ رہے تھے۔

ان سب باتوں سے بے پرواہ پوجا ہمیشہ اپنے آپ میں مگن رہتی۔سادگی ہی اس کا زیور تھا کہ وہ غریبی کے ہاتھوں پلی تھی۔اس کے ماں باپ دن بھر محنت مزدوری کرتے،دوسروں کے گھر صفائی،ستھرائی کرتے اور بڑی مشکل سے گھر چلاتے تھے۔انہیں پوجا کے جوان ہوتے جسم کی فکر تھی۔وہ اب اس کا زیادہ خیال رکھتے۔جب سے ادھو نے پوجا کے ساتھ غلط کرنے کی کوشش کی تھی،وہ ڈر گئے تھے۔انہیں ہر وقت لگتا کہ کہیں سے ادھو نہ آ جائے۔اسی لئے ان دونوں نے ایسا روٹین بنایا تھا کہ ایک نہ ایک گھر پر موجود ہوتا اور پوجا کے ساتھ ساتھ ہر جگہ جاتا۔حتیٰ کہ جب وہ حاجت کے لئے کھیتوں میں جاتی،تو اس کی سہیلیوں کے ساتھ اس کی ماں بھی ہوتی۔اور ہر آہٹ پر کان لگائے رکھتی۔

☆

پوجا گذرتے وقت کے ساتھ جوانی،حسن اور سادگی کا ایسا امتزاج بنتی گئی کہ دیکھنے والے دیکھتے ہی رہ جاتے۔ پوجا کلی سے پھول بننے کے دور سے گذر رہی تھی۔آشا کو اس کی کافی فکر تھی۔وہ پوجا کو ہر نشیب وفراز سمجھاتی۔یہاں تک کہ وہ جوان ہونے والی لڑکیوں کی ہر بات اسے سمجھاتی۔اسے اس کی جوانی اور اٹھان فکر مند کرتی رہتی۔وہ پوجا کا ہر طرح کا خیال رکھتی۔اسے لڑکوں کے قریب بھی پھٹکنے نہیں دیتی۔کئی بڑے گھروں سے پوجا کے لئے کام کی آفر آئی مگر آشا نے سب کو منع کر دیا تھا۔وہ زمانے کو جانتی تھی۔پوجا کو وہ ہر بری نظر سے محفوظ رکھنا چاہتی تھی۔اس نے تو کسی طرح اپنی زندگی گذار دی تھی،اسے اپنے اوپر ہوئے ظلم وستم یاد آگئے۔وہ پردھان اور گاؤں کے امیروں کے چال چلن اور کردار سے خوب واقف تھی۔ان کی کمزوری بھی جانتی تھی۔جو کچھ بے عزتی اور استحصال وہ سہہ چکی تھی،اپنی بیٹی کو اس جہنم سے دور رکھنا چاہتی تھی۔یوں بھی پوجا بھی بہت سے معاملات سے واقف نہ تھی۔اس کا پاگل پن کچھ کم تو ہوا تھا،لیکن اب بھی وہ نری ریلا کی ریلا ہی تھی۔

ادھو کے دل ودماغ میں پوجا بسی ہوئی تھی۔وہ ایک بار اسے حاصل کرنا چاہتا تھا۔اس نے کافی ترکیبیں استعمال کیں۔کئی طرح کے جال بچھائے مگر سب کو آشا کی حاضر دماغی نے ناکام بنا دیا تھا۔اب وہ موقع کی تلاش میں تھا۔اور قسمت نے اسے وہ موقع عطا کر دیا تھا۔ہوا یوں کہ آشا کے بھائی کی ایک حادثے میں موت واقع ہو گئی تھی۔اور دیپ داس پردھان سے ایک دن کی بات کہہ کر گیا تھا۔کہ وہ روزانہ اس کے گھر کی صفائی ستھرائی کا کام کرتا تھا۔پردھان کے یہاں ٹوائلیٹ بن چکی تھی۔

☆

آشا نے پوجا کو ہر طرح سمجھا دیا تھا کہ وہ دروازہ نہ کھولے،خواہ کوئی بھی ہو۔اس نے بیٹی کو ہر اونچ نیچ بتایا تھا۔مگر پوجا کے لئے وہ رات کسی قیامت سے کم نہیں تھی۔اسے بہت ڈر لگ رہا تھا۔نجانے رات کا کون سا پہر تھا کہ اس کے آنگن میں چند سائے اتر آئے تھے۔اس نے زور سے پکارا۔

''کون ہے۔۔'' کوئی آواز نہیں آئی۔

اس نے باہر آنگن میں جھانکنے کے لئے جوں ہی دروازہ کھولا۔کئی سایوں نے اسے دبوچ لیا تھا۔وہ تعداد میں پانچ تھے۔اس نے بہت ہاتھ پیر مارے۔چیخنا اور چلانا چاہا مگر ان میں

سے ایک نے کپڑے سے اس کا منھ بند کر دیا تھا۔ پہلے ایک لڑکے نے اس کی عصمت کی بخیہ ادھیڑی۔ اس کے ہاتھ پیر باندھ دیے گئے تھے۔ وہ سب نقاب پوش تھے۔ مگر ایک نے ادھو کا نام لیا تو اس کے کانوں تک بھی آواز آ گئی۔ سب نے اس کے جسم کو بے دردی سے روندا۔ وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔ اس کے جسم پر لباس کی جگہ خراشیں تھیں۔ کئی جگہ سے خون بھی رس رہا تھا۔ اسے بے ہوش اور بے لباس چھوڑ کر سائے روپوش ہو گئے تھے۔ اس کی قسمت میں اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ اس کے چاروں طرف اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ وہ بے ہوش تھی۔ اس کے سارے جسم میں درد کی لہریں سمائی تھیں۔ جو رہ رہ کر اس کو بے پناہ تکلیف پہنچا رہی تھیں۔ اسے صبح اس وقت ہوش آیا جب کوئی دروازے کی کنڈی زور زور سے بجا رہا تھا۔ ساتھ ہی اس کا نام لے کر پکار رہا تھا۔ یہ اس کی ماں کی آواز تھی۔

''پوجا۔۔پوجا۔۔۔''

''بیٹی۔۔اٹھو۔۔دروازہ کھولو۔۔''

اس نے خود پر ایک نظر ڈالی۔ اس کے جسم پر لباس نہیں تھا۔ اس نے کسی طرح اپنا جسم چادر سے ڈھکا اور گھسٹتے ہوئے دروازے تک پہنچی۔ بڑی مشکل سے کنڈی کھولی اور وہیں گر پڑی۔ آشا جلدی سے اندر داخل ہوئی اور پوجا کو چارپائی تک لے گئی۔ اس کے تو اوسان خطا ہو گئے۔ اس نے پوجا کے والد کو بلایا۔

''سنتے ہو پوجا کے باپو۔۔ہم لٹ گئے، برباد ہو گئے۔۔''

آنسو اس کی آنکھوں سے رک نہیں رہے تھے۔ پھر بھی وہ پوجا سے پوچھنے لگی۔

''پوجا کون تھا وہ حرامی۔۔جس نے تیرا یہ حال کیا ہے۔۔؟''

''ماں ادھو اور اس کے۔۔'' اس کا جملہ بھی پورا نہیں ہوا تھا کہ وہ پھر بے ہوش ہو گئی۔۔

''پوجا کے باپو۔۔پوجا کو فوراً اسپتال میں داخل کرنا ہوگا۔۔''

وہ روئے جا رہی تھی، اس کے آنسو اور بیٹی کی حالت دیکھ دیپ کی امیدوں کی لو کانپنے لگی تھی۔

کسی طرح پوجا کو اسپتال میں داخل کیا گیا۔ اور دیپ نے تھانے میں ادھو کے نام رپورٹ لکھوا دی۔ پوجا کو کبھی ہوش آ جاتا اور کبھی وہ بے ہوش ہو جاتی۔ اسے اندرونی طور پر کافی چوٹ آئی تھیں۔ ہوش آنے پر اس نے پولس کو بیان دے دیا تھا۔ ادھو کے ساتھ پردھان حکم سنگھ بھی

پریشان ہو گئے تھے۔ پولس کئی بار پردھان کے گھر آ چکی تھی۔ پردھان اپنی حکمت اور سیاسی تکڑم لگانے میں مصروف تھا۔ اس نے سب سے پہلے ادھو اور اس کے دوستوں کو ممبئی اپنے ایک رشتہ دار کے یہاں بھیج دیا۔ پھر پولس والوں کا منھ بند کیا۔ اور علاقے کے بارسوخ اور امیروں سے رابطہ کر کے ایک پنچائت بلوائی۔ پنچائت میں دیپ داس کو بھی بلوایا گیا۔

☆

''بھئی پنچو۔۔ بڑا گمبھیر مسئلہ ہے۔ دیپ کا کہنا ہے کہ چند نقاب پوشوں نے ان کے گھر گھس کر اس کی بیٹی کی اجتماعی عصمت دری کی ہے۔''

''وہ نقاب پوش ادھو اور اس کے دوست تھے۔'' دیپ بھری پنچائت میں پھٹ پڑا۔

''اچھا۔۔ اچھا۔۔ مان لیا۔ لڑکی نے پولس کو بھی یہی بیان دیا ہے۔۔ ٹھیک ہے۔۔ پر یہ پورے گاؤں کی عزت کا معاملہ ہے۔۔''

''کیا میری بیٹی گاؤں کی بیٹی نہیں ہے؟ اس کی عزت بھی گاؤں کی عزت ہے۔۔'' دیپ داس نے غصے میں آتے ہوئے کہا۔

''دیکھو۔۔ وہ بھی ہماری بیٹی ہے۔۔ مگر اب جو ہو چکا، وہ ہو چکا۔۔ اب اس کا حل نکالنے کو پنچایت بیٹھی ہے۔۔''

''حل تو صاف ہے کہ پولس کو اپنی کارروائی کرنے دو۔۔''

''ہم چاہتے ہیں کہ سارا معاملہ یہیں ختم ہو جائے، پولس تک بات نہ جائے۔۔ گاؤں میں کبھی پولس نہیں آئی ہے''

سارے پنچوں کا دباؤ دیپ پر تھا۔ پورے مجمع پر سکوت طاری تھا۔ سب کی نگاہیں اس کی جانب اٹھی ہوئی تھیں۔ پردھان حکم سنگھ کو تو جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ وہ بھیگی بلّی بنا بیٹھا تھا۔ اس کی نظریں بھی جھکی ہوئی تھیں۔ دیپ داس آج خود کو منصف سمجھ رہا تھا۔ زمانہ اس کے قدموں میں پڑا تھا۔ پوری پنچایت، یہاں تک کہ پردھان بھی اس کی رضامندی کے منتظر تھے۔ یہ وہی پردھان تھا جس کے پیشاب میں کبھی چراغ جلا کرتے تھے۔ جس کے رعب داب کا کیا کہنا۔ مگر آج وہی پردھان نظریں نیچے کئے، خاموش اس کے جواب کا منتظر تھا۔ پردھان کی عزت آج اس کے ہاتھ تھی۔ وہ جو کہتے ہیں نا کہ کبھی کے دن بڑے تو کبھی کی رات بڑی۔ سب دم سادھے اس کا جواب سننے کے منتظر تھے۔

پنچوں میں سب سے عمر دراز نے کہنا شروع کیا۔

''دونوں طرف کے بیان کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ دیپ کی بیٹی کے ساتھ بہت بڑا ظلم ہوا ہے۔ ہم سب اس سے ہمدردی رکھتے ہیں۔ مگر جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ وہ لوٹ کے نہیں آنے والا۔۔''

سب سے عمر دراز پنچ یعنی سرپنچ کی آواز کچھ لمحوں کے لئے رکی۔ پنچایت گھر جو کچھا کھچ بھرا ہوا تھا، کی سانسیں بھی رکی ہوئی تھیں۔ ہوا رکی ہوئی تھی جیسے وہ بھی دم سادھے فیصلے کی منتظر ہو۔ پنچایت میں دیپ کی برادری کے لوگ بھی خاصی تعداد میں تھے۔ کچھ دیر بعد سرپنچ کی آواز پھر بلند ہوئی۔

''ہم سب پنچ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ قصور وار کو سزا ضرور ملنی چاہئے۔۔۔اں ۔ہاں۔ کھوں۔۔کھاں'' تھوڑی دیر وہ کھانستا رہا، آواز صاف کر کے پھر بولا۔

''سزا نمبر ایک۔۔ادھو اور اس کے دوست چھ ماہ تک گاؤں بدر رہیں گے۔۔سزا نمبر دو پردھان، دیپ کی بیٹی کی شادی کے لئے ایک لاکھ روپے نقد دیں گے۔ سزا نمبر تین پردھان ، پوجا بیٹی کے علاج کے لئے پچیس ہزار دیں گے۔۔۔''

''واہ واہ۔۔''

''کیا فیصلہ دیا ہے''

''پنچوں نے تو کمال ہی کر دیا۔''

فیصلے پر پردھان ناراض تھا۔ مگر پنچوں کے فیصلے کو چیلنج کرنا، ایک بہت بڑی بات تھی۔ پنچایت حقہ پانی بھی بند کر سکتی تھی۔ دیپ کی برادری کے بہت سے لوگ بھی فیصلے سے مطمئن تھے۔ دیپ خود پنچایت کے فیصلے سے متفق نہیں تھا۔ اس کے اندر ایک جوالا بھڑک رہی تھی۔ وہ پردھان اور اس کے بیٹے کا قتل کر دیتا۔ مگر انسان سماج کے سامنے کتنا مجبور ہے۔ وہ چاہ کر بھی کچھ نہیں کر سکتا۔ دیپ کے لئے پنچایت کا ہر فیصلہ فضول تھا، وہ تو پردھان کے بیٹے اور دوستوں کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے دیکھنا چاہتا تھا۔ پر سماج کے خلاف جانے کی اس کے اندر ہمت نہیں تھی۔ اور پھر اسے یک مشت سوا لاکھ روپے ملیں گے۔ سوا لاکھ، اتنی تو وہ شاید گنتی بھی نہیں جانتا تھا۔ اس کی بیٹی کا علاج اور شادی شان سے ہو سکتی ہے۔ اس کی برادری کے لوگ بھی فیصلہ کے حق میں تھے۔ وہ خاموش ہی رہا۔ جبکہ پردھان فیصلے پر تلملا رہا تھا۔ اتنے میں سرپنچ کی آواز پھر ابھری۔

''دونوں پکش کو فیصلہ منظور ہے۔۔۔''

پنچایت گھر میں خاموشی اور سناٹا پسرا تھا۔ادھر آسمان پر پرندوں کی ایک ڈار تیزی سے گذری۔اگر یہ خاموشی پانچ منٹ طویل ہو جاتی ہے تو پنچایت مان لیتی ہے کہ فیصلہ دونوں کو منظور ہے۔جب خاموشی طویل ہوگئی تو سرپنچ کی آواز ابھری۔

''اب وقت ہو گیا۔حکم سنگھ! جاؤ پیسہ لے کر آؤ۔۔۔''

کچھ ہی دیر میں پردھان کے کارندے پیسہ لے کر حاضر ہو گئے۔اور پورے سوا لاکھ روپے سرپنچ کے حوالے کر دیے۔سرپنچ نے پیسے دیپ داس کو دے کر ایک کاغذ پر تحریر لکھ کر دیپ کے انگوٹھے کا نشان اور پردھان کے دستخط کرا لئے۔دونوں کے درمیان سزا اور پیسے کے عوض سمجھوتہ ہو گیا تھا۔پیسہ لے کر جب دیپ اپنے گھر کی جانب چلا تو اسے روپوں کی گڈی میں تڑپتی ہوئی پوجا نظر آئی۔اس نے تیز قدموں سے گھر پہنچ کر پیسے سنبھال کر رکھے۔

☆

کچھ دن بعد پوجا گھر آ گئی تھی۔اسے جب پتہ چلا کہ اس کے باپو نے سوا لاکھ لے کر اس کی عصمت کا سمجھوتہ کر لیا ہے،تو اسے بڑی تکلیف ہوئی۔اسے مرد ذات سے ہی نفرت ہوگئی۔ایک نے اس کی عزت تار تار کی تو پنچوں نے سوا لاکھ اس کی عزت کی بولی لگائی۔ایک نے پیسے دیے،دوسرے نے خاموشی سے پیسے لے لئے۔قصہ ختم۔ایک کنواری لڑکی کی عصمت کی قیمت سوا لاکھ۔۔واہ ری دنیا۔۔اسے ساری دنیا ایک طوائف خانہ لگی جہاں سوا لاکھ میں ایک کنواری دوشیزہ کی عزت نیلام ہوتی ہے۔اور سماج اس کی مخالفت کرنے کے بجائے ایسا کرنے میں مدد کرتا ہے۔اسے ایسی پنچایتیں بھی چنڈو خانے سے کم نہیں لگ رہی تھیں،جہاں ایک عورت سے اس کی مرضی نہیں پوچھی جاتی۔مرد اور پیسہ عورت کے مقدر کا فیصلہ کرتا ہے۔وہ مجبور و بے بس تھی کہ اس کے پاس طاقت تھی نہ پیسہ۔لیکن انسان ہر وقت مجبور نہیں ہوتا۔

☆

وقت کا دریا بہتا رہا۔گاؤں کی صبحیں اور شامیں گذرتی رہیں۔کبھی گیہوں،کبھی چاول کبھی مکا اور کبھی گنے کی فصلیں بوئی اور کاٹی جاتی رہیں۔گائے بھینسیں،بکریاں چرتی رہیں۔بچے جوان،جوان بوڑھے اور بوڑھے بھگوان کے پاس جاتے رہے۔پوجا بھی عمر کے جھولے پر پینگیں بڑھاتی رہی۔وہ جسمانی طور پر بالکل فٹ ہوگئی تھی،مگر اس کی روح کے زخم بھرنے کا نام نہیں لے

رہے تھے۔ وہ اب بھی نیند میں کسمساتی، اسے ادھوا اور اس کے ساتھی نظر آتے۔ سب کے سب سیاہ رنگ کے نقاب زیب تن کئے ہوئے ہیں۔ اس کی طرف خوفناک ارادوں سے بڑھ رہے ہیں۔ اور وہ چیخ مار کر بیدار ہو جاتی۔ ایسے میں ایک آشا تھی جو اس کی ہمت اور ڈھارس بندھاتی۔

آشا اس کی ماں، اس کا سہارا، اس کا آسرا، اس کی امید۔۔۔ سب کچھ تھی اس کے لئے ۔۔ آشا صرف امید نہیں تھی بلکہ اس کے لئے ایک آسمان کی مانند تھی۔ وہ ایک ایسی چھت تھی، جس کے بغیر گھر کا تصور بھی محال تھا۔ آشا کو امید تھی کہ پوجا کی روح کے زخم بھی مندمل ہو جائیں گے۔ اور وہ عام لڑکیوں کی طرح برتاؤ کرے گی۔ اس کے دل میں پوجا کی شادی کے بہت سارے ارمان تھے۔ اس نے کیا کیا خواب سجائے تھے۔ اس نے سوچ رکھا تھا کہ وہ پوجا کی شادی ایسے لڑکے سے کرے گی جس کی پکی نوکری ہو۔ وہ پوجا کو ہمیشہ خوش دیکھنا چاہتی تھی۔ مگر اس حادثے نے اس کے ارمانوں کا خون کر دیا۔ پوجا کے ساتھ ساتھ اسے بھی گہرے زخم دیے تھے۔ وہ اندر سے زخمی ہو گئی تھی۔ اب تو وہ کسی بھی مرد کے ساتھ پوجا کو بیاہنے کو تیار تھی۔ کوئی بھی لڑکا مل جائے وہ جلد سے جلد پوجا کے ہاتھ پیلے کرنے کو تیار تھی۔ اس نے اپنی بیٹی کے لئے جہیز بھی تیار کر رکھا تھا۔

پوجا کا حال عجیب تھا، اس کے دل میں کوئی جذبہ اور ارمان نہیں تھا۔ اسے تو مرد ذات سے نفرت ہو گئی تھی۔ اس حادثے نے اس پر نفسیاتی اثر ڈالا تھا۔ اب اس کے اندر جذبات کی گرمی نہ تھی۔ وہ خود کے اندر ایک برف کی سل پاتی تھی۔ اس کے اندر مرد کا لمس پانے کی کوئی خواہش، جستجو یا لگن نہیں تھی۔ وہ اپنے آپ کو بالکل سرد پاتی تھی۔ یہی سبب تھا جب کئی سال بعد پڑوس کے قصبے کا ایک رشتہ آیا تو اس نے آشا سے شادی کے لئے سختی سے منع کر دیا۔ آشا کی ساری آشائیں، کانچ کے گلاس کی مانند گر کر چکنا چور ہو گئیں۔ وہ پوجا کو ہر اونچ نیچ سمجھاتی۔

''پوجا بٹیا میں کوئی ہر وقت تیرے ساتھ رہوں گی، کبھی میں مر گئی تو تیرا کیا ہوگا۔ میں تجھے زمانے کے رحم وکرم پر نہیں چھوڑ سکتی۔ مجھے چین سے مرنے کے لئے جروری ہے کہ تو اپنے گھر کی ہو جائے۔''

ماں کے سمجھانے پر یہ ہوا کے پوجا نے خاموشی اختیار کر لی۔ آشا نے اس کی خاموشی کا مطلب سمجھ لیا۔ اس نے دیپ داس کو ساری بات بتا دی۔ دونوں نے شادی کی تیاریاں شروع کر دیں۔ لڑکا موہن داس قصبے کی مل میں صفائی کا کام کرتا تھا۔ پکا ہونے والا تھا۔ دونوں نے چٹ منگنی اور پٹ بیاہ والی کہاوت پر عمل کرتے ہوئے پوجا کے ہاتھ پیلے کر رخصتی کر دی۔ موہن کا گھر پوجا

کے لئے بالکل عجیب تھا۔ رات کو جب موہن داس نے اس کے تاروں کو چھیڑا تو اس کے جسم کے دھتارے پر کوئی آواز نہ سرا بھرا۔ موہن نے بربط کے تاروں کو خوب کسا، اس کے پیچ کسے اور دوبارہ سنگیت بجانا چاہا، مگر پوجا کے جسم کا بربط بے ربط اور ٹھنڈا پڑا تھا۔ موہن کی تمام کوششیں ناکام ہوگئیں۔ نہ سُر نکلے، نہ آواز۔ اپنی سی کر کے تھک ہار کر وہ سو گیا۔

☆

پوجا خود حیران تھی کہ اسے کیا ہو گیا ہے۔ اس کے اندر کی عورت کو کیا ہوا؟ کیا اس کے اندر نسائی جذبات ختم ہو گئے ہیں۔ اسے موہن کے لمس کا بھی احساس نہیں۔ موہن جب بھی اس کے تاروں کو چھیڑتا ہے، تو ایسا لگتا ہے، ادھو اور اس کے ساتھی زبردستی اس کا ساز بجا رہے ہوں۔ موہن کا وجود کبھی ادھو تو کبھی اس کے دوست کی شکل اختیار کر لیتا، اور وہ بے بس سی، سپاٹ سی، جذبات سے عاری ایک جسم کے ساتھ پڑی رہتی۔ موہن نے اگلی رات بھی ساز بجانے کی پوری کوشش کی۔ لیکن برف جیسی سرد مہری ہی اس کا استقبال کر رہی تھی۔ اسے ایسا محسوس ہوتا گویا وہ ایک لاش کے ساتھ زبردستی اپنی خواہش کی تکمیل کر رہا ہے۔ کوئی حرکت نہ ہلچل۔ بس ٹھنڈے گوشت کی مانند، وہ پڑی رہتی۔ موہن نے ایک ہفتے، ایک ماہ انتظار کیا اور سارے تار، نشیب و فراز اور کساؤ جھنجھوڑ ڈالے۔ جھنجھلا کر اپنی کیفیت اور بے زاری دکھانے کی بھی کوشش کی لیکن سب بے سود ثابت ہوا۔ ساری محنت اکارت گئی تو اس نے پوجا کو طلاق دے کر گھر بھیج دیا۔

☆

پوجا کو خود پتہ نہیں تھا کہ اسے کیا ہو گیا ہے۔ اس کے واپس آنے سے آشا اور دیپ کی پوری برادری اور گاؤں میں بڑی بدنامی ہوئی۔ اور گھومتے گھومتے بات پورے گاؤں میں گھوم گئی کہ پوجا کے اندر کوئی کمی ہے جس وجہ سے اسے طلاق ہوئی ہے۔ کھوجی عورتوں نے راز پالیا تھا کہ پوجا ایک برف کی عورت بن چکی ہے۔ اس کے تار کا کساؤ صرف دیکھنے کا ہے۔ اس کے اندر کی گرمی چھومنتر ہو چکی ہے۔

آشا بہت پریشان تھی۔ وہ بدنامی سے بھی ڈری ہوئی تھی۔ کھیت کاٹتے ہوئے، صفائی کرتے ہوئے آشا کو بس پوجا کا ہی خیال آتا رہتا۔ اسے پوجا کی کیفیت کا بھی اندازہ تھا۔ پوجا کے اندر کوئی کمی نہیں تھی، وہ اس حادثے کے بعد نفسیاتی مریض بن گئی ہے۔ وہ اکثر سوچتی کہ پوجا کو اس چکرویو سے نکالا کیسے جائے؟ وہ رات کو پوجا کو اپنے پاس ہی سلاتی تھی۔ اس کے دماغ میں

ایک ترکیب آئی۔اس نے رات کو پوجا کے مخصوص اعضا پر ایک خاص قسم کے تیل کی مالش شروع کردی۔وہ روزانہ پوجا کے جسم کی مالش کرتی۔اسے ہر طرح سے تیار کرتی۔مگر پوجا کے جسم پر کوئی اثر نہ ہوتا۔

دونوں میاں بیوی پریشان تھے کہ ہمارے بعد پوجا کا کیا ہوگا؟وہ کیسے اپنی زندگی گذارے گی۔وہ اس کی دوسری شادی کی فکر میں تھے کہ کسی طرح پوجا کا گھر بس جائے۔پورے گاؤں اور برادری میں ان کی جو بے عزتی ہوئی تھی۔اس کی بھرپائی ہو جائے۔اس بار انہوں نے ایسا لڑکا پسند کیا تھا،جس کی بیوی اسے چھوڑ کر کسی کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔کلوا بہت شریف انسان تھا۔وہ منڈی سے پھل لا کر اپنے ٹھیلے پر بیچتا تھا۔اس کی معقول آمدنی تھی۔صرف ایک بوڑھی ماں اس کے ساتھ تھی۔دیپ داس اور آشا کو آس تھی کہ کلوا کے ساتھ پوجا خوش رہے گی اور پوجا کی زندگی میں بہار آسکتی ہے۔آشا کے دیپ جگمگانے لگے تھے۔

پوجا اب اور کسی تجربے کی بھینٹ نہیں چڑھنا چاہتی تھی۔وہ لفظ شادی کے بھی خلاف تھی۔اس نے تو گھر پر کپڑے سینے شروع کردیے تھے کہ وہ اپنا گذارا کرسکتی تھی۔وہ اپنی سہیلیوں سنگ بھی زیادہ نہ رہتی۔ہاں جنگل کے لئے وہ ضرور اپنی سہیلیوں یا ماں کے ساتھ جاتی کہ کیا پتہ کون سا مرد گھات لگائے بیٹھا ہو۔

وہ اپنی ماں آشا سے پریشان تھی کہ وہ ہر وقت اس کے بیاہ کی ہی بات کرتی تھی۔وہ تو اپنے باپو سے بھی نفرت کرتی تھی لیکن حیرت انگیز طور پر اس کی نفرت میں کمی آئی تھی،اسے ایک مجبور باپ کی بے بسی کی تصویر اپنے باپ میں نظر آتی۔جو ہر وقت اس کی بھلائی کے بارے میں ہی سوچتا تھا۔وہ دونوں صرف اس کی خاطر ہی تو دوسروں کے گھروں میں کام کرتے تھے۔فصل کے بعد کام والے گھروں سے کبھی اناج،کبھی کپڑے لیتے اور کبھی نقد پیسے مل جاتے۔وہ دونوں اس بات کا لحاظ رکھتے کہ کوئی نہ کوئی پوجا کے پاس رہے،تاکہ ایسا واقعہ دوبارہ نہ ہو۔اسے یہ بھی یاد تھا کہ ایک بار کنویں سے اس کی برادری کو پینے کا پانی دینے سے چودھری ملکھان نے منع کردیا تھا۔تو اس کی ماں کو کافی دور سے پانی لانا پڑتا تھا۔آخر کار اس کی برادری والوں نے مل کر ایک ہینڈ پمپ لگوایا تھا۔وہ اپنے ماتا پتا کی خاطر ایک بار پھر شادی کے لئے تیار ہوگئی۔دیپ کی روشنی سے آشا کے دیپ جل اٹھے تھے کہ پوجا اس بار ضرور رانی بنے گی۔

☆

پوجا اور کلوا کی زندگی کی وہ رات بڑی معنی خیز تھی ۔جب دونوں کا ملن ہونے والا تھا۔دونوں کو اس کا بڑی بے صبری سے انتظار تھا۔پوجا چاہتی تھی کہ اس بار اس کے والدین کو کوئی تکلیف نہ ہو۔خاص کر اس کی ماں آشا، کی زندگی کے دیپ کی لو سے اس کے من مندر کا کونا کونا منور ہو جائے ۔وہ پوجا کا گھر آباد دیکھنے کی خواہاں تھی۔وہ پوجا کو رانی بنا ہوا دیکھنا چاہتی تھی۔اس نے رخصتی کے وقت بہت ساری نصیحتیں کی تھیں۔

''بیٹا اپنے پتی کا ہر خیال رکھنا۔''

''پہلی رات ہی میاں بیوی کے مضبوط رشتے کی بنیاد ہوتی ہے۔''

''اب وہی تیرا اصلی گھر ہے۔ہم سب تو تیرے ہیں ہی۔لیکن پتی کیسا بھی ہو، پرمیشور ہوتا ہے۔''

''تمہیں ہر حال میں اپنی ساس اور پتی کا دل جیتنا ہے۔دیکھنا پھر تو رانی بن کر راج کرے گی''

پوجا اب کافی سمجھ دار ہو گئی تھی۔اس نے زمانے کے کافی نشیب وفراز دیکھے تھے۔اس کی نظر میں عورتوں کے وہ طعنے بھی تھے،جن سے آگ برستی تھی۔گاؤں کے لوگ اس انتظار میں تھے کہ پوجا کبھی بھی طلاق کے ساتھ واپس آسکتی ہے۔سب کو یہ امید تھی کہ پوجا اور کلوا کا بھی نبھاؤ مشکل ہے۔جب وہ موہن کے ساتھ نہیں رہی،تو کلوا کے ساتھ کیسے رہ سکتی ہے۔کلوا تو پھر بھی عمر دراز ہے۔پوجا بھی اب کوئی بچی نہیں رہی تھی۔اس نے بھی عمر کی پینتیس بہاریں دیکھ لی تھیں۔وہ بھی اب پختہ ہو چکی تھی۔مانا کہ اس حادثے نے پوجا کو توڑ کر رکھ دیا تھا۔مگر وہ کیا کرتی؟

☆

وہ رات بڑی قیامت کی رات تھی۔کلوا کو بھی اس رات کا بے صبری سے انتظار تھا۔اس کی بیوی کو گئے ہوئے کئی برس ہو گئے تھے۔جب سے اس نے اپنی زندگی میں کوئی خوشی نہیں دیکھی تھی۔وہ تو سمجھو کہ ماں تھی جو اسے وقت پر دو روٹی مل جاتی تھی۔ماں کو بھی اس کی بہت فکر تھی۔ماں دن رات اس کے لئے گھل رہی تھی۔ماں چاہتی تھی کہ اس کا گھر پھر سے بس جائے۔کوئی سگھڑ سی بہو آجائے جو کلوا کو سنبھال لے۔اس کا ہر طرح کا خیال رکھے۔پیسے کی کلوا کے پاس کمی نہیں تھی۔وہ روزانہ سو سوا سو روپے کما لیتا تھا۔بیماری اور علاج معالجے ہی میں اس کا بہت سا پیسہ لگ جاتا تھا۔اور وہ بھی الم غلم معجون استعمال کیا کرتا۔اسے بھی آج کی رات کا بے صبری سے انتظار تھا۔جب پوجا کی اس سے رشتے کی بات چلی،تو وہ خوش تھا۔گو کہ اسے یہ بھی علم تھا کہ پوجا ماضی میں ایک دردناک حادثے کا شکار ہو چکی ہے اور اس کی ایک شادی بھی خراب ہو چکی ہے۔ان سب کے باوجود اس نے پوجا کا رشتہ قبول کر لیا تھا کہ اب وہ بہت تھک چکا تھا۔وہ زندگی میں آرام

چاہتا تھا۔ اس کا دل چاہتا کہ کوئی عورت گھر پر اس کا انتظار کرے اور اس کے گھر پہنچنے پر خوش دلی سے اس کا استقبال کرے۔ اس کی ماں کی بھی دیکھ بھال کرے۔ بس یہی اس کے ارمان تھے۔ رات کو جب وہ دلہن کے کمرے میں پہنچا۔ کمرہ کیا تھا۔ مٹی کا ایک چھوٹا سا کمرہ اور اس کے آگے اسارہ۔ اسارے پر پھوس کی چھان۔ ماں اکثر اسارے میں ہی سوتی تھی۔

اس رات جب وہ دلہن کے کمرے میں پہنچا تو اسے وہ کمرہ عجیب سا لگا۔ یہ وہی کمرہ تھا جو ہمیشہ بے ترتیبی کا شکار رہا۔ کبھی ماں اسے سنوار دیتی تو وہ ماں سے کہتا۔

''ماں کیوں محنت کرتی ہو مجھے تو یہ کمرہ یوں ہی ٹھیک لگتا ہے''

لیکن آج کمرے کی صورت ہی بدلی ہوئی تھی۔ نواڑ کے پلنگ پے نفیس چادر بچھی تھی۔ چادر سے ملتے جلتے دو تکیئے تھے۔ شاید پوجا اپنے گھر سے لائی تھی۔ کمرے کی ہر چیز سے سلیقہ جھلک رہا تھا۔ پوجا دلہن بنی بیٹھی تھی۔ کلوا نے گھونگھٹ اٹھایا تو ایسا لگا کمرے میں ریڈیم کی کوئی چیز روشن ہوگئی ہو۔ رسمی گفتگو کے بعد کلوا نے اندھیرے میں اپنے گھوڑے دوڑائے۔ پورے میدان کو کھوندنے کے بعد جب وہ گول کرنا چاہتا تھا تب اس کے گھوڑے اوندھے منھ گر پڑے۔ پوجا کے کھیت میں ہل چلنے سے کوئی ہلچل نہ ہوئی جبکہ اس نے اپنی سی بہت کوش کی تھی۔ کلوا کے ہانپنے کی آواز، اس کی سانسوں کے زیر و بم کے ساتھ پوجا کے ویرانے میں سنائی پڑ رہی تھی۔ پوجا کے لئے یہ عجیب منظر تھا۔ اس نے یہ توقع نہ کی تھی کہ کلوا زبانی پہلوان ثابت ہوگا۔ اسے تو امید تھی کہ وہ بھی موہن کی طرح اسے بھنجھوڑ ڈالے گا۔ اور اسے بھی پوجا ارچنا میں اس کا بھرپور ساتھ دینا ہوگا۔ اس بار وہ تیار تھی کہ اپنی طرف سے کوئی کور کسر نہ چھوڑے گی۔ اور اگر کلوا کی جگہ اسے ادھو اور اس کے ساتھیوں کا عکس نظر آئے گا تو وہ اپنے ذہن سے اسے جھٹک دے گی۔ اور اپنی گرمی کا مکمل اظہار کرے گی۔ مگر کلوا نے کھیت میں ہل چلانے میں بڑی جلد بازی دکھائی۔ حالات اور اس کی ٹھنڈک اس کا منھ چڑھاتی رہی۔

جسے اس کی سرد مہری کی شکایت ہونی چاہئے تھی وہ تو خود ٹھنڈا ہو کے تھک تھکا کر نیند کی آغوش میں جا چکا تھا۔

☆☆☆

ڈاکٹر شاداب علیم

میرٹھ

وہ لڑکا

تیج گڑھی چوراہا، میرٹھ کا نہایت گہما گہمی والا چوراہا ہے، جس پر پورے دن بسوں، ٹیمپو اور کاروں کی آمد ورفت، کئی ہزار لوگوں کی سی سی ایس یونیورسٹی میں روز کی موجودگی، تھوڑا آگے جا کر میڈیکل کالج میں شہر کے علاوہ گاؤں دیہات کے لوگوں کی آوت، جاوت اور شہر کی بڑھتی ہوئی آبادی نے اس چوراہے کو شہر کے ہنگامی چوراہے میں تبدیل کردیا ہے۔

چوراہے کے بائیں ہاتھ پر پولیس چوکی کی شاندار نصف دائرہ نما عمارت ہے۔ پولیس چوکی سے متصل بنجاروں کی ایک چھوٹی سی بستی آباد ہے جس میں تقریباً بیس بائیس خاندان ہے جن کے گھر ہیں نہ در بس چھوٹی چھوٹی جھگیوں میں بڑے بڑے پریوار گھٹن بھری زندگی پر آنسو بہاتے ،لڑتے جھگڑتے بدرنگ زندگی کے دن کاٹ رہے ہیں۔بستی کی عورتوں کی زندگی مشقت سے لبریز ہے، وہ دن بھر پتھر توڑتیں، سل بٹے، چکی، چکلے،اوکھلی، ہامن دستے بناتیں۔مرد دارو پی کر جھولے پلنگوں پر پڑے مغلظات بکتے رہتے اور گٹکا چپا کر آس پاس کی فضا کو مزید مکدر کرتے رہتے ہیں۔بستی میں چھوٹے بڑے، بچوں کی ایک فوج نظر آتی ہے، شیر خوار بچے ماں کی چھاتیوں سے چپٹے ہوئے،قدرے بڑے بچے آس پاس کی نالیوں پر اکثر فراغت حاصل کرنے میں مشغول ہوتے۔نوجوان نسل کرکٹ کی شیدائی جو خود کو دھونی اور وراٹ سے کم نہ سمجھتے۔بستی کے وسط میں پیپل کا بوڑھا درخت ہے۔جس کی بوسیدہ شاخیں اس کی قدامت کا اعلان کر رہی ہیں،ایک سایہ دار بزرگ کی مانند کھڑا ہے پیڑ کے چاروں طرف پتھر کا گول ہالہ بنا ہے جس پر عقیدوں کے اعتبار سے مختلف دیوتا وراج مان ہیں۔روز صبح سورج دیوتا کی پوجا کے ساتھ ساتھ بستی کی عورتیں کوئی شیو لنگ پر پانی چڑھاتی،کوئی کالی ماں کے چرنوں میں ماتھا ٹیکتی تو کوئی سنکٹ موچک ہنومان جی کا پرشاد بانٹتی۔خدا کی بنائی یہ مخلوق دنیا میں پھیلی وبائی بیماری اور اس سے پیدا شدہ خوفناک مسائل

سے بے نیاز اپنی دنیا میں مگن نظر آتی ہیں۔

میرا ایک ماہ قبل آئی سی آئی سی آئی پروڈینشی ایل میں میرٹھ آگرہ سے بطور سیلس منیجر ٹرانسفر ہوا تھا۔ میرا آفس بنجارہ بستی کے بالمقابل ہے۔ آفس سے ملحق ان خانہ بدوشوں یعنی بنجارہ بستی کے لیے سوچھتا سنگرام کے تحت سرکار کی جانب سے بنایا گیا سارو جنک شوچالیہ ہے جس پر جلی حرفوں میں لکھا ہے:

''اب نہ سہیں گے اور اپمان، کھلے شوچ سے مکت کریں گے اپنا بھارت مہان''

ایک شام، میں حسب معمول آفس سے نکل رہا تھا، میرے بچپن کے بہت ہی قریبی دوست سنجیو شرما، پی وی ایس مال سے ایک بڑا شوپر ہاتھ میں لیے آتے دکھائی دیے جنھیں دیکھ کر میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ خوشی سے دل بلیوں اچھلنے لگا تھا۔ یوں بھی دیار غیر میں کوئی اچانک شناسا مل جائے تو کسی غیر معمولی نعمت سے کم نہیں ہوتا۔ علیک سلیک اور خیر و عافیت کے بعد آنے والے سنڈے اپنے گھر پر مدعو کر کے وہ چلے گئے۔ میں بھی گھر جانے کے لیے گاڑی میں بیٹھنا ہی چاہتا تھا کہ بشری ضرورت نے علم بغاوت بلند کیا۔ گھر تین کلو میٹر دور تھا تب تک اس بغاوت کو دبایا نہیں جا سکتا تھا۔ لہٰذا میں نے برابر کے سارو جنک شوچالیہ میں جانا مناسب سمجھا۔ شوچالیہ نہایت صاف ستھرا تھا۔ ایک ادھیڑ عمر کی خاتون اور ساتھ میں ایک خوبرو نوجوان نے بڑھ کر استقبال کیا۔ میں نے اپنا آفس بیگ نوجوان کے سپرد کیا اور فراغت کے لیے چلا گیا۔ لیکن نوجوان کی مستعدی، اس کا چہرہ، اس کا اخلاق میرے ذہن و دل پر حاوی رہا۔۔ بعد ازاں میں نے نوجوان کو کچھ رقم دی۔ اس نے نہایت مستعدی سے طے شدہ رقم لے کر باقی مجھ کو واپس کر دی۔ چلتے ہوئے میں نے اس کا نام دریافت کیا تو اس کے جواب نے مجھے حیرت و استعجاب کے سمندر میں دھکیل دیا۔

ارے....ارے بیٹے تم کس ذات سے ہو؟ میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

جی....صاحب......میں........میں شودر نہیں ہوں۔ اس نے سر جھکا کر قدرے شرمندگی سے کہا۔

پھر تم.........یہاں کیسے؟

ہمارے ملک ہندوستان میں تو زمانہ قدیم سے منوسمرتی رائج رہی ہے جس کے باعث اللہ کے بنائے ہوئے ایک جیسے بندوں کو چار طبقوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ برہمن، ویش، کھتری اور شودر۔ ہر ایک طبقے کے ذمے مخصوص کام اور خدمات تفویض کی گئی ہیں۔ اپنے کام سے روگردانی

کرنا مذہبی اعتبار سے گناہ کے مترادف قرار دیا جاتا ہے۔اس تقسیم کے باعث شودر طبقے کی ذمہ داری دردناک عذاب سے کم نہیں ہے اور نجات کی کوئی صورت نظر بھی نہیں آتی۔

وقت حالات کے ساتھ اپنی چال بدلتا رہتا ہے۔کیا کچھ ایسا ہی اس نوجوان کے ساتھ ہوا ہے؟ دل نے دماغ سے سوال کیا۔میں ابھی ان خیالات کے گھیرے میں تھا۔نوجوان کی آواز میری سماعت سے دو چار ہوئی اور میرے خیالات اناج کے دانوں کی طرح میری مٹھی سے نکل گئے۔

جی........صاحب سرکار نے ان سارو جنک شوچالوں کو ٹھیکے پر اٹھایا ہے۔یہ ٹھیکہ رام داس شودر کو چھوڑا گیا تھا۔اسے یہاں کی صفائی، ستھرائی اور نگہ داشت کے لیے ملازمین کی ضرورت تھی۔اس کے لیے ایک انٹرویو رکھا گیا۔میں نے انٹرویو دیا اور میری نیکتی ہوگئی۔لیکن تم........

لڑکے نے میرے تجسس بھرے انداز کو جھٹکتے ہوئے تسلی بخش انداز میں کہا

''صاحب دیکھتے نہیں دو سال سے کورونا مہاماری اس پر لاک ڈاؤن کی ستم ظریفی نے ھم جیسے نوجوانوں کو بے روزگار کر دیا۔فیکٹریوں پر تالے پڑ گئے۔بڑے بڑے مال بند ہو گئے۔ مالکوں نے کئی کئی مہینوں کی تنخواہیں ضبط کر لیں۔گورنمنٹ سے ملنے والی سہولیات صرف اعلانات تک محدود رہ گئیں۔اس پیٹ کی آگ کو کیسے بجھائیں۔یہ جھوٹی تسلیوں اور وعدوں سے نہیں بجھتی۔ اس کے لیے کچھ کرنا ہی پڑتا ہے۔صاحب! کام کوئی برا نہیں ہوتا، کام نہ کرنا برا ہوتا ہے۔یہاں چار ہزار روپے مہینہ تنخواہ طے پائی ہے جو ماں کی دوا، بچوں کی اسکول فیس اور ایک وقت کا چولہا جلا دیتی ہے۔''

میرے ماتحت سات لوگ آتے ہیں۔میں ان کا جمعدار ہوں۔وہ آگے کیا کیا کہتا رہا اور میں حیران پریشان کھڑا سوچتا رہا ہوں۔

یہ کس کے کرموں کا نتیجہ ہے؟ جسے نئی نسل بھگت رہی ہے؟

☆☆☆

محمد فرحت حسین

مظفر پور

وکاس کی گنگا

'' کاش پچھلا زمانہ لوٹ آتا'' کہتے کہتے سلیم ہو گیا۔ صبح اٹھا اور پارٹی کے دفتر پہنچا جہاں پر اور بھی کارکنان پہنچے ہوئے تھے، آج پارٹی کی طرف سے احتجاج کرنا تھا احتجاجی جلوس نکال کر حکومت وقت کو گھیرنا ،سوال کے کٹگھرے میں کھڑا کرنا تھا۔ انہوں نے پارٹی کا جھنڈا لئے پارٹی کے تمام کارکنان کے ساتھ شہر بھر میں احتجاج کیا۔

سلیم نے شہر کے آخر پڑاؤ میں ایک پر جوش تقریر کی۔'' آج ہمارے شہر میں سچ پوچھئے تو پورے ملک میں بہن بیٹیوں کی عزت وعصمت کھلے عام لوٹی جارہی ہے۔ یہ ملک اب رام کا نہیں رہا جس میں عورتوں کی عصمت کی حفاظت کی جاتی تھی، ہوس کے پجاری ہر طرف کھڑے ہیں کب کون بیٹی ہوس کا شکار ہو جائے کہا نہیں جا سکتا۔

''سرکار، اس کی پولیس ناکام ثابت ہو چکی ہے۔ سرکار کو عورتوں کے مان، سمان اور عزت سے کوئی مطلب نہیں ہے انہیں صرف ووٹ سے مطلب ہے۔''

''بھائیو! اب ہم اور دوسرا نر بھیا کانڈ نہیں ہونے دیں گے'' سرکار ہوش میں آؤ ہوش میں آؤ جیسے انقلابی نعرے کے ساتھ جلوس کا قافلہ واپس دفتر کی راہ لیا اور احتجاج اپنے انجام کو پہنچا۔

سلیم ابھی نیا تھا خون میں گرمی تھی سیاست میں آئے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا مگر وہ رکن اسمبلی بننے کا خواہاں تھا وہ چاہتا تھا کہ سامنے انتخاب ہے سال بھر کا وقت ہے جتنی زمین تیار کرنی ہو کر لو، سو وہ بہت محنت کرتا اور پارٹی نے بھی اس کی مستعدی وسرگرمی دیکھ ایک عام ممبر سے ضلعی سطح کا صدر بنا دیا۔

وہ علاقے کے رکن اسمبلی کے خلاف ،حکومت کرنے والی جماعت کے خلاف خوب بولتا اور سرکار کی ناکامیوں کو بتاتا اس لئے چھوٹے بڑے تمام حادثات میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیتا اور موقع غنیمت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ کیونکہ یہی وہ مواقع تھے جہاں پر سرکار کی ناکامیوں کو، اس کی غلط پالیسیوں پر لب کشائی کر کے عوام کے خیر خواہ اور ہمدرد بن سکتے تھے عوام کی ہمدردی

حاصل کر سکتے تھے۔ سلیم دفتر سے گھر گیا ٹی وی آن کیا ملک کے کچھ میڈیا چینلوں پر اس کے احتجاجی جلوس کو دکھایا جا رہا تھا یہ دیکھ کر سلیم پھولے نہیں سمایا۔

شوشل میڈیا پر بھی اس کی تعریف ہو رہی تھی ہر کوئی سراہ رہا تھا سراہنے والوں کی ایک لمبی قطار تھی ان سب کو دیکھ سلیم بہت خوش ہوا اور آنے والے انتخاب میں اپنی انتخابی زمین ہموار ہوتی ہوئی نظر آئی۔ ایک علاقائی میڈیا چینل نے بحث ومباحثہ (Debate) میں بطور مہمان شامل کیا جس میں ان سے پوچھا گیا۔ ''مہیلاؤں کے ساتھ زیادتی کب تک ہوتی رہے گی اور اس کا کوئی حل ہے یا نہیں، کونسا طریقہ یا قانون سرکار اپنائے جس سے اس کا حل نکلے''، سلیم صاحب۔

''شکریہ! آپ نے ہمیں بولنے کا موقع دیا۔ سر پہلے تو میں سخت لفظوں میں اس حادثہ کی مذمت کرتا ہوں جو زیادتی اس بیٹی کے ساتھ ہوئی۔ سر، سرکار سو رہی ہے سرکار کا زبانی دعویٰ کہ سرکار عورتوں کے، دیش کی ماں بہنوں کے حق میں ہے یہ حادثہ سرکار کے اس دعوے کے کھوکھلے پن کو اجاگر کر رہا ہے اور بتا رہا ہے کہ یہ نکمّی سرکار ان کے حق میں نہیں ہے۔

جہاں تک اس مسئلے کے حل کا مسئلہ اور معاملہ ہے تو وہ سرکاروں کو سخت قانون بنا کر عورتوں کی عصمت کی حفاظت کرنی چاہئے۔ ساتھ ہی لوگوں کو بیدار کرنے کی بھی اشد ضرورت ہے تاکہ عورتوں کو وہ حق حقوق، عزت دیں جن کی وہ مستحق ہیں۔

ہر ایک کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے گھروں کی ماں بہنوں کی عزت کریں وہ عزت دیں جن کی وہ حق دار ہیں، اپنے آپ کو مرد نہ ثابت کریں بلکہ پیار اور حسن سلوک سے پیش آئیں۔

ریحانہ کھانے کے ٹیبل پر سے بار بار آواز لگا رہی تھی ادھر سلیم فکر میں ڈوبا ہوا تھا بار بار کے بلانے پر بھی نہیں آیا تو ریحانہ خود اٹھ کر اس کے پاس آ گئی جس سے سلیم چڑھ گیا۔

''تم میری فکر نہ کرو، میں کہیں بھی کھا لیتا ہوں''، سلیم نے کہا۔

ریحانہ کو سلیم کے تیور اور مزاج میں تبدیلی سے فکر لاحق ہوئی۔ پرسوں بھی سلیم نے کہا تھا ''یہ سچ ہے کہ میں نے تم سے محبت کر کے شادی کی تھی پر تم میں اب وہ کشش باقی نہیں جو پہلے تھی جس پر میں فدا ہوا تھا۔ دیکھو تم کتنی موٹی ہو گئی ہو، تو ند باہر آ گیا ہے۔''

سلیم بغیر کھائے یہ کہہ کر نکلا کہ پارٹی اعلیٰ کمان نے بلایا ہے میں ملنے جا رہا ہوں تم دروازہ اندر سے لاک کر دینا اور سلیم اپنی کار سے سیدھے ایک ہوٹل میں پہنچا اور کار کو پارکنگ میں کھڑی کر سیدھے بالائی منزل پہنچا۔ بل ادا کیا اور کمرے کی چابی لے کر اپنے کمرے میں پہنچا جہاں پر کچھ دیر بعد ہوٹل والے نے شراب و کباب کے ساتھ ساتھ ایک کال گرل (طوائف) سے

اس کی میزبانی کی۔

ادھر سلیم پوری رات مسرت کے عالم میں کال گرل کی بانہوں میں گذاری ادھر ریحانہ بے چینی اور اضطراب کے عالم میں، تمام رات کسی انہونی سے گھبرا کر خوف کھا کر گزاری۔ وہ قد آدم آئینے کے سامنے اپنے جسم کو دیکھتی کہ کیا سچ مچ اس کے جسم میں کوئی کشش باقی نہیں ہے یا سلیم کی نظر کا دھوکا ہے۔ دل میں درد کی ایک ٹیس اٹھتی جس سے ریحانہ کلبلا کے رہ جاتی اور ایک لمبی آہ سرد کھینچتی!

انتخاب کی وہ مبارک گھڑی آ گئی جس کا بے صبری سے انتظار تھا اور جس کے لئے سلیم کڑی محنت، مشقت کرتا تھا۔ الیکشن کمیشن نے انتخاب کی تاریخ کا اعلان کر دیا۔ سب نے نامزدگی کا پرچہ بھرا سلیم نے بھی پرچہ بھرا اور خوب پرچار و پرسار کیا۔ پچھلی سرکار کو گھیرا اس کی ناکامیوں کو بتایا۔ سابق رکن اسمبلی کو نا کارہ و ناکام ثابت کیا اور لوگوں سے وعدہ کیا کہ اگر وہ جیت جاتے ہیں تو وہ اپنے علاقے کے سبھی مذہب وملت کے لوگوں کی بھلائی وخوشحالی اور علاقے کی ترقی ان کی اولین ترجیحات اور پہلا ہدف ہوگا۔

خاص کر عورتوں کی مان سمان، برابری، اختیار مطلق پر توجہ ہوگی۔ انتخاب میں سلیم کی فتح اکثریت رائے سے ہوئی اور وہ رکن اسمبلی بن گیا ان کی دیرینہ خواہش کی تکمیل ہوگئی۔

سلیم رکن اسمبلی بننے کے بعد ریحانہ سے زیادہ دوری بنالی کیونکہ اس کے دل میں ریحانہ کی تصویر نہیں رمّی تھی، جو ہی جیسے کال گرل کی تصویریں آویزاں تھیں۔ جن کی ایک ایک قاتلانہ اداؤں پہ سلیم جان چھڑکتا تھا اور ان کو زخمی کر رکھا تھا ان کی مصنوعی خوبصورتی، تصنع بھری مسکراہٹ سلیم کو خوب بھاتی وہیں ریحانہ کی مسکراہٹ زہر ہلاہل وزہر کا پھالا لگتی۔

سلیم نے عورتوں کے مان سمان، ان کے حق حقوق اور اختیار مطلق کا وعدہ عوام سے کر چکا تھا اور یہ ان کی خواہش بھی تھی سو وہ فیض پہنچا رہا تھا اور عورتیں ان کے فیض وکرم سے شرابور ہو رہی تھیں اب چاہے کال گرل ہی کیوں نہ ہو۔ آخر وہ بھی ایک ہندوستانی ناری اور مہیلا تھی وہ استحقاق رکھتی تھی کہ سلیم کے ترقیاتی کاموں کا چھینٹا ان پر بھی پڑ جائے وکاس کی گنگا میں وہ بھی ڈبکی لگائے۔ آخر کون ان کو سمان دلائے گا؟ ان کے حق حقوق کی باتیں کون کرے گا؟ کون ان کی مساوات و برابری کی باتیں کرے گا؟ آخر سرکار کی تمام تر عنایات واکرام سے یہ کیوں کر محروم ہوں گی؟ تمام تر سہولیات سے کیوں دور رکھا جائے گا؟

نیوز چینل نے ایک صبح اپنی اسکرین پر یہ سنسنی خیز خبر دکھائی کہ ''راگھوپور کے موجودہ

رکن اسمبلی کی ایک ہوٹل میں مشتبہ حالت میں موت۔‘‘

سلیم کا وہ زمانہ تو نہیں لوٹا جس میں عورتوں کی عصمت کی حفاظت ہوتی تھی لیکن سبھی کا بھلا کرنے والا وکاس کی گنگا بہانے والا، خاص کر عورتوں کے مان سمان اور عزت کی باتیں کرنے والا، ان کے حق حقوق اور اختیار مطلق عطا کرنے والا، حسن سلوک سے پیش آنے والا اپنی دیرینہ خواہش لئے دنیا سے چلا گیا اور سیاست کی سہیلی، وکاس اور ہوس کی گنگا بہتی رہی۔

☆☆☆

وکست بھارت 2047ء مہم کے تحت شعبے کے طالب علم اساتذہ وارا کین کے ساتھ گروپ پوز دیتے ہوئے۔

جشن سرسید پروگرام میں اظہار خیال کرتے ہوئے پروفیسر ابوسفیان علیگ۔ اسٹیج پر موجود ہیں دائیں سے جن ہت فاؤنڈیشن کی چیئرپرسن محترمہ انیتا رانا، پروفیسر اسلم جمشید پوری، میجر جنرل ریٹائرڈ محترم جاوید اقبال، محترم م افضل، پروفیسر بصیر احمد خاں، ڈاکٹر معراج الدین اور سہارا گروپ سے محترم عبدالماجد نظامی

رقیہ جمال

(۱) بوجھ

''ارے رامو! تم ٹائم پر دودھ کیوں نہیں لا کر دیتے ہو؟''

''کیا بتاؤں شیلا میم! ہماری بھینسیا بھوری، جو سب سے زیادہ دودھ دیتی تھی، ٹرین ایکسیڈنٹ میں اپنی ایک ٹانگ تڑوا بیٹھی ہے.... چھ مہینے ہو گئے...بہت علاج کرایا پر بیمار ہی رہتی ہے...دودھ بھی سوکھ گیا ہے...بس اس کی سیوا میں دیر ہو جاتی ہے۔''

''تو پھر تم کیا کرو گے اس کا؟'' شیلا میڈم کو تجسس ہوا۔

''سمجھ میں نہیں آتا ہم کیا کریں اس کا....روز کے دوا دارو کا خرچ...اوپر سے اس کی سیوا...بہت پریشانی ہوتی ہے میم!'' رامو نے غمگین لہجے میں کہا۔

''میرے خیال سے قصائی کو بیچ دو....اتنا پیسہ خرچ کر کے خریدا تھا، وہ تو گیا سمجھو....اب اس سے تمھیں کوئی فائدہ بھی نہیں ملنے والا...کب تک اپاہج کا بوجھ اٹھاتے رہو گے؟....اچھا ہے جاتے جاتے چار پیسے ہاتھ آ جائیں گے۔'' میڈم نے مشورہ دیا۔

رامو نے ترچھی نظروں سے شیلا میڈم کو دیکھا۔ اسے یوں لگا کہ جیسے وہ بھوری کی سیوا کر کے تھک گئی ہوں، اور اب جان چھڑانا چاہتی ہوں۔

شیلا دودھ کا پتیلا لے کر اندر آئی تو ڈرائنگ روم میں اپنے پتی کمار کو وہیل چیئر پر منتظر پایا، جو چھ ماہ قبل فالج کے حملے سے اپاہج ہو گیا تھا۔

آج وہ کمار سے نظریں چرا رہی تھی۔

☆☆☆

عارف نقوی

جرمنی

کورونا کا نتیجہ

وہ دونوں ایک دوسرے کو بہت چاہتے تھے۔ ہر وقت ایک دوسرے کے گن گاتے رہتے۔ ریٹا نے اپنے والدین کی مخالفت کے باوجود اپنے دفتر کے ایک خوبرو اور خوش مزاج ساتھی رحمان خاں کا انتخاب کیا تھا۔ رحمان نے بھی اپنے والدین کی آرزوؤں کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی جرمن ساتھی ریٹا کا انتخاب کیا تھا اور اسے شادی کی انگوٹھی پہناتے اور اس کے گال پر ہولے سے پیار کرتے وقت خود کو دنیا کا سب سے خوش قسمت انسان سمجھ رہا تھا۔ وہ ایک دوسرے سے پل کے لیے بھی جدا نہ ہوتے۔ ہر وقت ساتھ رہتے۔ لیکن اب تین برس کی کورونا کی قید اور گھٹن نے انہیں چڑچڑا بنا دیا تھا۔ بات بات پر ایک دوسرے کی غلطیاں پکڑتے اور الجھتے تھے۔

ریٹا کو اب اور زیادہ قرینہ آ گیا تھا اور رحمان کی بے پرواہی اور کاہلی بڑھ گئی تھی۔

ایک دن ریٹا کو نہ جانے کیوں چھینک آ گئی۔ رحمان کی زبان سے نکل گیا:

''اپنا ٹسٹ کراؤ۔ کہیں کورونا تو نہیں ہے۔''

دوسرے دن ریٹا نے کہا: ''مجھ سے دور رہو۔ لگتا ہے مجھے کورونا ہو گیا ہے۔ تم ڈرائنگ روم میں رہو۔ میں سلپنگ روم میں جاتی ہوں۔ یہ ٹی وی وہیں رکھ دو۔''

اب وہ سارا دن آرام کرتی۔ ناول پڑھتی۔ ٹی وی پر رنگ برنگے دلچسپ مزے دار پروگرام دیکھتی، ہنگامہ خیز جاسوسی فلمیں دیکھتی۔ رحمان باہر سے سودا لاتا، گھر میں صفائی کرتا، کھانا پکاتا اور ناشتہ اور کھانا تیار کر کے احتیاط سے ایک طباق میں اس کے کمرے کے سامنے میز پر رکھ دیا کرتا۔

ایک دن رات کو ٹی وی بند کر کے ریٹا سونے کا ارادہ کر رہی تھی کہ اس نے ڈرائنگ روم سے کچھ آہٹ سنی۔ اس نے جلدی سے ماسک لگایا اور دروازہ کھول دیا۔

رحمٰن ایک اجنبی دوشیزہ کے ساتھ کوچ پر بیٹھا تھا۔ دوسرے دن شام کو ریٹا قریب کے ایک ریستوراں میں اپنے کولیگ کے ساتھ بیٹھی تھی۔ ماسک منہ پر نہیں تھا۔

☆☆☆

نظمیں

طالب زیدی

فاصلے

فاصلے رکھو.... فاصلے رکھو
فاصلے قربتوں سے بہتر ہیں
قربتوں کی حقیقتوں سے کہیں
فاصلوں کے سراب بہتر ہیں
فاصلے ہیں تمام رنگ و نقوش
قربتیں ہیں سپاٹ اور بے رنگ
قربتیں مشتمل ہیں لمحوں پر
فاصلوں پر محیط ہیں صدیاں
قربتیں عیش فاصلے کوشش
قربتیں برف فاصلے آتش
فاصلوں کا وجود روزِ ازل
فاصلے مظہرِ خدائے عظیم
فاصلوں میں نہ کوئی خوف نہ ڈر
قربتوں میں تضاد کے پہلو
فاصلے عشق فاصلے احساس
فاصلے قیس فاصلے فریاد
قربتوں میں ہوس کی آویزش
فاصلے رکھو.... فاصلے رکھو
فاصلے قربتوں سے بہتر ہیں

☆☆☆

سید اطہر الدین اطہرؔ

فاصلہ زندگی کا ضامن ہے

فاصلہ زندگی کا ضامن ہے
فرد واحد کی زندگی ہی نہیں
پورے عالم کی زندگی کا امیں
فاصلہ موت کی بھی دستک ہے
وسعتوں میں خلا کی گر دیکھو
بے شمار انجم و کوا کب ہیں
ان جہانوں کی بھیڑ میں اطہر
برف ملتی ہے آگ ملتی ہے
زندگانی کہیں نہیں ملتی
اک صحیح فاصلے کے باعث ہی
صرف دنیا ہے ایسا سیارہ
زندگی رقص کررہی ہے جہاں
کشش مہر میں اگر دنیا
کچھ قدم اور بڑھ گئی ہوتی
حدت مہر سے حسیں دنیا
ایک شعلہ سا بن گئی ہو تی
ناچتی ہے جو زندگی ہر سو
کب کی شعلوں میں ڈھل گئی ہوتی
راکھ بن کر بکھر گئی ہوتی

زندگانی سے پُر یہی دھرتی
دور خورشید سے جو ہو جاتی
برف کی چادروں میں کھو جاتی
جسم تو جاگتے مگر اطہر
زندگی کی حسین رقاصہ
برف کی دیواروں میں کھو جاتی

الغرض قصہ مختصر یہ کہ
زندگی کی بقائے دائم کو
بیچ سورج کے اور دنیا کے
اک صحیح فاصلہ ضروری ہے
تیرا شکوہ درست ہے جاناں
اپنے اور تیرے درمیاں لیکن
جان کر فاصلہ میں رکھتا ہوں
اک مناسب سا فاصلہ اطہرؔ
فاصلہ زندگی کا ضامن ہے

☆☆☆

جشن نذیر میرٹھی پر بائیں سے پروفیسر نیلوجین گپتا، پروفیسر اسلم جمشید پوری، پروفیسر قاضی زین الساجدین، ڈاکٹر معراج الدین، فاروق بخشی و دیگر نذیر میرٹھی کو اعزاز سے سرفراز کرتے ہوئے۔

نذؔیر میرٹھی

تعلیم وتربیت

مانا کہ تو ہے اچھا شناور مرے بچے
پھر بھی یہ سمندر ہے سمندر ہے مرے بچے
سر پر مسلط ترے حالات کا سورج
سونا ہے نکھر جائے گا تپ کر مرے بچے
کیسی ہی مصیبت ہو نہ ہونا تو ہرا ساں
لڑنا ہے ہر اک غم سے برابر مرے بچے
کچھ بھی ہو شجاعت کا تقاضا تو یہی ہے
دشمن پہ ہر اک وار ہو کہہ کر مرے بچے
دنیا کے جو دھندے ہیں وہ ہوتے ہی رہیں گے
مومن ہے نمازیں بھی پڑھا کر مرے بچے
ماں باپ کی خدمت کا تجھے شوق بہت ہے
ہاں تو ہے مقدر کا سکندر مرے بچے
ماں بولی ترا جانا نذؔیر ایسے غلط ہے
جانا ہے تو جا مجھے بتا کرمرے بچے

☆☆☆

عادل رضا منصوری

اپنے ہونے کا دکھ

اور تو کوئی غم نہیں
صرف ایک دائمی ہے
لگا ہے جان کو ازل ہی سے
اور رہے گا
جب تک رہوں گا
میں
مگر کیا میرے بعد بھی
رہے گا
زندہ
اور
بھوگے گا کوئی اور؟
جیسے بھوگا میں نے
اپنے ہونے میں
سب کا دکھ

☆☆☆

روبینہ میر

بھائی

ایک ہی ماں کی کوکھ سے
جنم لینے کے باوجود
ایک ہی گھر میں ساتھ، ساتھ
پلنے بڑھنے کے باوجود
ایک ہی آنگن میں کھیل کود کر
جوان ہونے کے باوجود
وہ..........
میرے لیے کس قدر اجنبی ہوگیا تھا؟
کہ میں اسے دیکھ کر
پہچان نہ پائی
کچھ دیر دماغ پر
سخت زور ڈالنے پر
یاد آیا..........
کہ وہ میرا بھائی ہے
''بھائی''

☆☆☆

رُخسار، مظفر نگری

خدا کی نعمت

بہت مصروف رہنا بھی
خدا کی ایک نعمت ہے
ہجومِ دوستاں ہونا
کسی سنگت کا مل جانا
کبھی محفل میں ہنس لینا
کبھی خِلوت میں رو لینا
خدا کی ایک نعمت ہے
کبھی تنہائی ملنے پر
خود اپنا جائزہ لینا
کبھی دُکھتے کسی دل پر
تشفّی کا مرہم رکھنا
خدا کی ایک نعمت ہے
کسی آنسو کو چُن پانا
کسی کا حال لے لینا
کسی کا راز ملنے پر
لبوں کو اپنے سی لینا
خدا کی ایک نعمت ہے
کسی بچے کو چھو لینا

کسی بوڑھے کی سُن لینا
کسی کے کام آسکنا
کسی کو بھی دُعا دینا
خدا کی ایک نعمت ہے
کسی کو گھر بلا لینا
کسی کے پاس خود جانا
نگاہوں میں نمی آنا
بلا کوشش ہنسی آنا
خدا کی ایک نعمت ہے
تلاوت کا مزہ آنا
کوئی آیت سمجھ پانا
کبھی سجدے میں سو جانا
کسی جنت میں کھو جانا
خدا کی ایک نعمت ہے
مجھے زخموں سے محبت ہے
مجھے تو درد بھی راس ہے لوگو
میری زندگی کی آس ہے لوگو
کیونکہ درد کا بھی مل جانا
خدا کی ایک نعمت ہے
ایک ذرا ناکامیوں کے بعد
ہوئے ہو خاک جو قیدی
پھر یوں ناکامیوں کے بعد
کامیابیوں کا مل جانا
خدا کی ایک نعمت ہے
کون دشمن ہے یہاں مرشد
کسے دوست کہنا ہے

ایک ایسی کشمکش میں
پھر ایک دوست کا مل جانا
خدا کی ایک نعمت ہے
چلتے ہوئے سفر میں کبھی
نظر معذور پر پڑ جائے
پھر یوں اُس کے درد کو
درد اپنا ہی کہہ پانا
خدا کی ایک نعمت ہے
یوں اکتوبر کے مہینے میں
موسمِ پت جھڑ کا آنا
پھر اُجڑے ہوئے چمن میں
بہاروں کا لوٹ کر آنا
خدا کی ایک نعمت ہے

☆☆☆

پروگرام سے خطاب کرتے ہوئے معروف غزل سنگر مکیش تیواری اسٹیج پر موجود ہیں پروفیسر ہما مسعود، پروفیسر اسلم جمشید پوری، شہر قاضی پروفیسر زین الساجدین، پروفیسر ارتضٰی کریم، پروفیسر فاروق بخشی اور ڈاکٹر معراج

غزلیں

پروفیسر کوثر مظہر
جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی

ہم تو یارو زندگی بھر جام کے خوگر رہے
اس لیے ہم چاہتے ہیں سامنے ساغر رہے

جب چمن میں فصلِ گل آئے تو ہو ان سے ملن
ہم اسی حسرت میں ڈوبے دوستو! اکثر رہے

فکر کیا مجھ کو اگر ٹوٹا ہے پیانہ مرا
چشمِ مے گوں سے پلانے کو وہ راضی گر رہے

ہم بجھانے تو چلے تھے حسنِ افزوں کو مگر
سامنا جب ہوگیا ہم خاک میں مل کر رہے

دیکھنا دستک نہ دے واعظ کوئی دہلیز پر
''ساقیا! جب تک ہمارے ہاتھ میں ساغر رہے''
ہے یہ بیتابِ دلِ تشنہ بہ لب کی آرزو
ہر گھڑی یونہی کھلا ساقی تمھارا در رہے

درمیاں خوباں کے ہے چرچا یہی اب آجکل
سامنے ہر دم وہی بانکا جواں کوثر رہے

☆☆☆

رومانہ رومؔی

کراچی

تم اگر چاہو تو تصویر بھی ہوسکتی ہوں
زائچہ بن کے میں تقدیر بھی ہوسکتی ہوں

خواب دیکھو تو سہی شوق سے تم تا بہ سحر
میں ترے خواب کی تعبیر بھی ہوسکتی ہوں

مجھ کو پڑھنے کی طلب گر ہے ترے دل میں تو
دل کے کاغذ پہ میں تحریر بھی ہوسکتی ہوں

یہ اور بات کہ پھولوں کی طرح نازک ہوں
وقت پڑنے پہ میں شمشیر بھی ہوسکتی ہوں

تم قریب آنے کی کوشش نہ کرو جانِ غزل
میں ترے پاؤں کی زنجیر بھی ہوسکتی ہوں

مجھ پہ تہمت نہ لگا چھوڑ بھلے دے مجھ کو
تری اس بات سے دلگیر بھی ہوسکتی ہوں

شاعری میں گو تخلص میرا رومی ہے مگر
سوچتی ہوں میں کبھی میر بھی ہوسکتی ہوں

☆☆☆

ظفر اقبال ظفؔر

دے کے شیشے کا بدن پتھر کا گھر مجھ کو دیا
لمحہ لمحہ ٹوٹتے رہنے کا ڈر مجھ کو دیا

کشتیاں، پتوار، ساحل بادباں سب کے لیے
موجِ طوفاں سے گذرنے کا ہنر مجھ کو دیا

آندھیوں کے شہر میں رہنا تھا شاید اس لیے
بے در و دیوار کا رہنے کو گھر مجھ کو دیا

پہلے ٹھہرا یا گیا ہے یاس و نو میدی کو کفر
پھر گھنے تاریک جنگل کا سفر مجھ کو دیا

میری قسمت میں شہادت کا اجالا تھا ظفؔر
تھا سبکدوشی کا طالب اس نے سر مجھ کو دیا

☆☆☆

سید احمد شمیم

زخم تازہ تھا تو گہرا ئی کا اندازہ نہ تھا
اب گماں ہو تا ہے اس کو چاہنا اچھا نہ تھا

میں کہ دشتِ حال میں تھا، حال سے بھی بے خبر
پشت پر ماضی کی یادیں، سامنے فردا نہ تھا

وہ مری نس نس میں کیسے درد بن کر رہ گیا
میرے اس کے درمیاں، ایسا کوئی رشتہ نہ تھا

چاند سا معصوم چہرہ، آئینہ سا رو بہ رو
روح کی سر شاریاں تھیں،جسم آلودہ نہ تھا

دیکھتے ہی دیکھتے،یہ رُت بھی کیا زردا گئی
سبز موسم تھا تو صحرا میں بھی سناٹا نہ تھا

جب کھلیں آنکھیں تو ہر پہچان روشن ہے شمیم
میں نے یہ جانا کہ اس کو آج تک جانا نہ تھا

☆☆☆

رفیعہ شبنم عابدی

جو دل میں آ یا سو کہہ دیا، انتظار کیسا؟
کہ سوچ کیا؟ احتیاط کیا؟ اختصار کیسا؟

کوئی تو حلقہ ہے سحر انگیز چار جانب
وجود اندر وجود ورنہ حصار کیسا؟

وہ سوہنی پھر روایتوں کی ندی میں ڈو بی
جنازہ کیسا؟نماز کیسی؟ مزار کیسا؟

تری محبت نے رسمِ دنیا سکھا ہی دی تو
یقین کیسا؟کسی پہ اب اعتبار کیسا؟

خدا نے بھیجا ہے تم کو میرا خدا بنا کے
غرور کیسا؟یہ ناز اور افتخار کیسا؟

تمہی نے ہم سے رہائی چاہی تھی، یاد ہے نا؟
تو پھر یہ کیوں اضطراب آخر؟ تو آج یہ اضطرار کیسا؟

☆☆☆

رؤف رضا

اسی بکھرے ہوئے لہجے پہ گزارے جاؤ
ورنہ ممکن ہے کہ چپ رہنے سے مارے جاؤ

ڈوبنا ہے تو چھلکتی ہوئی آنکھیں ڈھونڈو
یا کسی ڈوبتے دریا کے کنارے جاؤ

وہ یہ کہتے ہیں صدا ہو تو تمہارے جیسی
اس کا مطلب تو یہی ہے کہ پکارے جاؤ

تم ہی کہتے تھے رضاؔ فرقِ دوئی ختم کرو
جاؤ اب اپنی ہی تصویر نہارے جاؤ

☆☆☆

جمیل مظہر سیانوی

کیوں عرضِ کرم غیر سے کرتا ہے مرے یار
بادل سے کہیں دودھ بکھرتا ہے مرے یار

سچائی تو سولی پہ بھی مرنے نہیں دیتی
جاں باز کہیں موت سے ڈرتا ہے مرے یار

دن رات گھلے جاتا ہے تو جس کی طلب میں
کیا چیز ہے وہ جس پہ تو مرتا ہے مرے یار

جب کوئی تجھے دیکھنے والا ہی نہیں ہے
پھر کس کے لیے بنتا سنورتا ہے مرے یار

ہر شخص سے بے باک ترا ملنا ملانا
لوگوں کو بہت شاق گزرتا ہے مرے یار

یہ کیسے بتاؤں کہ تری یاد کا شعلہ
دن ڈھلتے ہی سینے میں اترتا ہے مرے یار

مظہر ترے اشعار تو ہوتے ہیں بہت خوب
لیکن ترا انداز اکھرتا ہے مرے یار

☆☆☆

ڈاکٹر ذکی طارق

شہر کی گلیوں سے مل کر آسماں کھلنے لگا
کو بہ کو منظر بہ منظر اک جہاں کھلنے لگا

موسمِ گل میں جو تھے شاداب چہرے کیا ہوئے
بارشیں رکنے پہ موسم کا زیاں کھلنے لگا

تم ہواؤں کے پروں پر نام مت لکھنا کبھی
آندھیوں کے خوف سے ریگِ رواں کھلنے لگا

مشوروں کے یہ خنک سائے اب اپنے پاس رکھ
فکر کے سورج کا سر پر سائباں کھلنے لگا

بکھری یادوں کے حسیں دفتر سجا کر شام سے
بوڑھے برگد کے تلے اک بے زباں کھلنے لگا

اے ذکی محفوظ رکھنا تم لہو کا ذائقہ
رفتہ رفتہ بند زخموں کا دہاں کھلنے لگا

☆☆☆

عشرت معین سیما

جرمنی

جنونِ عشق کا منظر دکھائی دیتا ہے
ہر ایک نیزے پہ اک سر دکھائی دیتا ہے

فلک تو کھول دے کھڑکی اُمید کی کیونکہ
زمیں پہ خوف کا منظر دکھائی دیتا ہے

کمالِ فن سے سجایا حنائی رنگوں نے
ہتھیلیوں میں مقدر دکھائی دیتا ہے

قرینگی کی طلب در پہ لائی ہے تیرے
مکانِ دل مرا ابتر دکھائی دیتا ہے

نگاہِ یار تیری سادگی پہ میں قرباں
تجھے یہ اشک سمندر دکھائی دیتا ہے

☆☆☆

ڈاکٹر فریاد آزر

حدّ نظر تک اپنے سوا کچھ وہاں نہ تھا
میں وہ زمین جس کا کوئی آسماں نہ تھا

سب میں کرائے داروں کے پائے گئے نشاں
جسموں کے شہر میں کوئی خالی مکاں نہ تھا

بچپن کے ساتھ ہوگئے بوڑھے تمام ذہن
ہم مفلسوں کے گھر میں کوئی نوجواں نہ تھا

چہرے بتا رہے تھے کہ مہمان ہیں مگر
خود کے سوا کسی کا کوئی میزباں نہ تھا

لذت نہ مل سکی مری تخیل کو کبھی
ورنہ مرے گناہ کا موسم کہاں نہ تھا

☆☆☆

ڈاکٹر ارشاد احمد شررؔ

رُخ سے پردے کو ہٹانے میں بڑی دیر لگی
وہ جو روٹھے تو منانے میں بڑی دیر لگی

بجلیوں نے جو جلایا تھا نشیمن میرا
آشیاں پھر سے بنانے میں بڑی دیر لگی

خونِ دل سے جو لکھا نام ترا پانی پر
بارشوں کو بھی مٹانے میں بڑی دیر لگی

زُلف الجھی ہوئی سلجھی نہ کسی بھی طرح
آئینہ ان کو دکھانے میں بڑی دیر لگی

آنسوؤں سے جو تیری یاد میں دامن بھیگا
بھیگے دامن کو سکھانے میں بڑی دیر لگی

سن نہ پائے وہ میرے غم کی کہانی یارو
داستاں مجھ کو سنانے میں بڑی دیر لگی

لوریاں دیتی رہی ماں تو شررؔ بچوں کو
بھوکے بچوں کو سلانے میں بڑی دیر لگی

☆☆☆

سلیم اختر سلیم

سیانہ

غافلو اب ڈھل چکا وقتِ ظہر بیدار ہو
رہ گئی یہ زندگی اب مختصر بیدار ہو

کوئی مشکل سے ملے گا معتبر بیدار ہو
خود غرض ہیں آج کے یہ راہبر بیدار ہو

اک ہمیشہ کے لیے اک چند سانسوں کے لیے
رکھنی ہے دونوں جہانوں کی خبر بیدار ہو

تجھ میں ہی انساں کی اعلیٰ صفت ہیں کس قدر
تجھ میں ہی بیٹھا ہوا ہے جانور بیدار ہو

قوم کی خاطر اٹھو تم امن کا پرچم لیے
حوصلوں سے کسو اب اپنی کمر بیدار ہو

حال کی حالت تو اپنے سامنے ہی دیکھ لی
آنے والا وقت ہے زیر و زبر بیدار ہو

اب سمیٹو اپنی ہستی کا یہ شیرازہ سلیم
کتنا بکھرو گے ابھی اور ٹوٹ کر بیدار ہو

☆☆☆

ڈاکٹر قمر سرور
احمد نگر، مہاراشٹر

اک شخص انتہاؤں سے آگے نکل گیا
افسوس وہ جفاؤں سے آگے نکل گیا

کچھ چاپلوس اس کا قصیدہ پڑھا کیے
اور وہ بھی دیوتاؤں سے آگے نکل گیا

یوں معجزہ ہوا کہ اپاہج بھی دوڑ میں
ماں باپ کی دعاؤں سے آگے نکل گیا

سورج مجھے ڈرانے میں مصروف تھا مگر
میرا وجود چھاؤں سے آگے نکل گیا

کس کے طفیل آج سر بزم اے قمر
گونگا مری صداؤں سے آگے نکل گیا

☆☆☆

تبصرے

ہما

ریسرچ اسکالر دہلی یونیورسٹی

گئودان سے پہلے "اسلم جمشید پوری کا چوتھا افسانوی مجموعہ ہے ..اس کے علاوہ آپ کے تین افسانوی مجموعے "افق کی مسکراہٹ"، "لینڈرا"، "عیدگاہ سے واپسی" منظر عام پر آ چکے ہیں ....وہ اردو ادب میں ایک ناول نگار، افسانچہ نگار، افسانہ نگار اور تنقید نگار کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں......انہوں نے اردو افسانے لکھنے کے ساتھ ساتھ ہندی میں بھی کہانیاں لکھی ہیں .... آپ نے عموماً اپنے افسانوں میں گاؤں اور دیہات کو موضوع بحث بنایا ہے ....

زیر تبصرہ کتاب کا نام ایک افسانے کے عنوان سے لیا گیا ہے...اس مجموعے میں ایک پیش لفظ اور چوبیس افسانے ہیں .اس کتاب کا انتساب آپ نے اپنی اہلیہ محترمہ سائرہ بانو کے نام کیا ہے .....پیش لفظ میں آپ نے افسانے اور کہانی کے درمیان فرق کی وضاحت کی ہے ... کہ اصل میں یہ دونوں ایک ہی ہیں ....ان کو الگ شے تسلیم نہ کیا جائے .....بہرحال زیر تبصرہ افسانوی مجموعے میں ہمیں موضوعات کا تنوع دیکھنے کو ملتا ہے... آپ نے سیاسی سماجی، حالات حاضرہ، مذہبی، قرآنی آیات، جغرافیائی اور تاریخی حقائق نیز شوگر جیسی بیماری کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے ....دو تین افسانے کولاژ تکنیک پر بھی مشتمل ہیں...

"ابابیلیں اور کنکریاں" اس افسانوں مجموعے کا سب سے پہلا افسانہ ہے...اسی عنوان سے ترنم ریاض کا ایک افسانہ "ابابیلیں لوٹ آئیں گی" بھی ہے...اس کہانی کا عنوان آپ نے قرآن کی ایک آیت سورۃ فیل سے لیا ہے .. آپ نے اس افسانے میں بتایا ہے کہ ہر طرف ظلم و ستم کا بازار عام ہے...اور لوگوں کو ستایا جا رہا ہے ....اس کے باوجود ابابیلیں کیوں نہیں آ رہی ہے ..جس طرح خانہ کعبہ کی حفاظت کے لے ابابیلیں آئی تھیں ..اس طرح اس ملک کی حفاظت کے لیے بھی ابابیلوں کو آنا چاہئے ..جہاں کہیں بم دھماکہ ہو رہا ہے ....اسی طرح کے واقعات رونما ہو رہے ہیں .... لیکن اتنا سب ہونے کے بعد بھی ابابیلیں نہیں آ رہی ہیں...اسی وجہ سے اس ملک کے لوگوں نے خود ہی اپنی حفاظت کے لے کنکریاں اٹھالی ہیں ...

اقتباس کچھ اس طرح ہے .....

"ادھر ملک کی جنت نظیر ریاست میں روشنی کے نہتے اور بے بس رکھوالوں نے ابابیلوں کی امید چھوڑ دی ہے اور ہاتھوں میں کنکر اٹھا لے ہیں کہ اپنی ناموس ووقار کے لے انہیں خود ابابیل بننا پڑا ہے"..

" آدھی ادھوری کہانی" کولاژ تکنیک پر لکھا گیا افسانہ ہے... جیسا کہ اس کے عنوان سے ہی ظاہر ہے کہ کہانی ادھوری ہے... یعنی افسانہ نگار موجودہ دور میں ہونے والے واقعات میں سے کس ایک کا انتخاب نہیں کر پا رہا ہے کہ وہ کس موضوع پر قلم اٹھاے... ابھی وہ ایک واقعے پر لکھنا بھی شروع نہیں کرتا کہ اس کے سامنے دوسرا موضوع آجاتا ہے کہانی کار بہت بڑا الجھن کا شکار ہے .... وہ اس دور میں ہونے والے ظلم وستم سے پریشان آگیا ہے .... وہ سمجھنے سے قاصر ہے کس پر کہانی لکھے... ایک اقتباس ملاحظہ ہو ..

" کہانی کار کی ناکامی، جھنجھلاہٹ میں بدلنے لگی ..واقعات، خبروں، میسیجز کے آنے کی بیپ مستقل بج رہی ہے .... مظلوموں کا اژدہام دماغ کے دور تک پھیلے صحرا میں جمع ہو چکا ہے ... اخبارات کی سرخیاں... عصمت دری، قتل و غارت گری، لوٹ مار، فرقہ پرستی جیسے ہزاروں مسائل جمع ہو گئے ہیں"

گئو دان سے پہلے" یہ بھی ایک اہم ترین افسانہ ہے... اس کہانی کا عنوان پریم چند کے ناول گئو دان سے لیا گیا ہے ..اس میں انہوں نے مسلمانوں پر ہونے والے ظلم وستم کو بیان کیا ہے... کہ کس طرح انہیں موب لنچنگ کا شکار کیا جاتا ہے ..اس میں کہانی کے مسلم کردار کا قصور اتنا ہوتا ہے... کہ وہ ہرپال کے ساتھ اس کی گائے دان کرنے کے لے آشرم لے جارہا ہوتا ہے .. راستے میں کچھ نعرہ بازوں کے بیچ پھس کر انہیں جیل جانا پڑتا ہے .. ہرپال کی تو ضمانت ہوجاتی ہے .. لیکن مسلم ڈرائیور جس کا اس واقعے سے کوئی لینا دینا نہیں ہوتا .... وہ ہمیشہ کے لیے جیل کی سلاکھوں کے پیچھے ہو جاتا ہے ..اس افسانے میں ایک پہلو اوراجاگر ہوتا ہے .... کہ گائے دان کرنے سے پہلے ہرپال خوش وخرم ہوکر اپنی زندگی گزار رہا تھا .... لیکن جب گائے کے دان کے بعد وہ گھر لوٹتا ہے تو نہ وہاں گائے ہوتی ہے اور نہ ہی اس کی بیوی بیروتی .... کہانی اس طرح ختم ہوتی ہے .....

" تین دن بعد ہر پال گاؤں پہنچے... وہاں نہ گائے تھی نہ بیروتی... لیکن انہیں
ہر طرف، ہر شے میں اپنی گائے ہی نظر آ رہی تھی ....استھی کلش میں بھی اسے
گائے کا چہرہ تو کبھی بیروتی کی صورت دکھائی دیتی ..بیروتی اور گائے ایک
دوسرے میں ضم ہو گئے تھے"..

"قصوروار" اس افسانوی مجموعے کا سب سے آخری افسانہ ہے... اس میں انہوں نے ایک منفرد موضوع پر قلم اٹھایا ہے... ابھی تک اس طرح کے موضوع پر مشتمل افسانہ میری نظر سے تو نہیں گزرا ....اس میں انہوں نے ایک ایسے شخص کی کہانی بیان کی ہے ..جو ہندو ہوتا ہے ....اور وہ میدان حشر میں خدا سے مخاطب ہے کہ میرے کافر ہونے میں اصل قصوروار میں نہیں بلکہ وہ لوگ ہیں جو میرے ساتھ مسلم گھرانوں سے تعلق رکھنے والے لوگ رہتے تھے .... لیکن اس کے باوجود انہوں نے مجھے کبھی اسلام کے بارے میں نہیں بتایا... تو اصل مجرم میں نہیں وہ لوگ ہیں ....اس افسانے کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو ....

"پر میرے کپھر یا سرک میں میرا کسور کہاں ہے؟ میرا کسور جب ہوتا ..جب مجھے کسی
نے سمجھایا ہوتا ..مجھے کپھر بتایا جاتا، مجھے کپھر سے دور رہنے کو کہا جاتا"..

افسانہ پڑھنے کے بعد یہ حقیقت معلوم ہوتی ہے کہ اللہ نے ہمارے اوپر جو ذمہ داری عائد کی ہے کہ ہم لوگوں کو اسلام کے بارے میں بتائیں... اب وہ اس پر عمل کرے یا نہ کرے تو وہ ان کی ذمہ داری ہے... لیکن ہم اپنی ذمہ داری سے بری ہو جاتے ہیں... پھر رام پال جیسا شخص ہمیں قصوروار نہیں ٹھہرائے گا...

اسلم جمشید پوری نے اپنے افسانوں میں عام فہم اور سادہ اسلوب اختیار کیا ہے... افسانوں میں کرداروں کی بہتات نظر نہیں آتی ہے... مکالمے بھی آپ نے کرداروں کی زبان سے وہی ادا کرائے ہیں ..جو موقع و محل کے مطابق ہوں... افسانوں میں منظر نگاری بھی عمدہ ہے... کہانی کا پلاٹ بھی مربوط ہے ..موجودہ افسانے جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے کے علاوہ اس افسانوی مجموعے میں وطن واپسی، دانا، جنگل کتھا، آواز کا جسم، باعزت وغیرہ بھی شامل ہیں... کتاب میں کہیں کہیں ٹائپنگ کی غلطیاں ہیں .... مجموعی طور پر گئو دان سے پہلے افسانوی مجموعہ ہر اعتبار سے بہترین ہے... چاہے وہ موضوع کے اعتبار سے ہو یا تکنیک کے اعتبار سے۔

☆☆☆

ایم۔خالد فیاض
گجرات، پاکستان

''اسلم جمشید پوری: فن اور فن کار'' مرتب ڈاکٹر ارشاد سیانوی

ڈاکٹر اسلم جمشید پوری سے پہلے پہل میرا تعارف بہ طور نقاد اُن کی ایک کتاب ''اُردو افسانہ: تعبیر و تنقید'' کے حوالے سے ہوا۔ اس کتاب میں خاص طور پر افسانوں کے تجزیے اور افسانوی مجموعوں پر اُن کے تبصروں نے زیادہ متاثر کیا۔ چند الفاظ میں تخلیق کی بابت بنیادی نکات سمجھانے کا اُن کا انداز بہت اچھا لگا۔ اُسی کتاب کے اندرونی فلیپ سے اس بات کی خبر بھی ہوئی کہ اسلم جمشید پوری، تخلیق کار بھی ہیں لیکن باقاعدہ طور پر اُن کا کوئی افسانہ آج سے پہلے پڑھنے کو نہیں ملا تھا۔

ابھی حال ہی میں جب ڈاکٹر ارشاد سیانوی کی کتاب ''اسلم جمشید پوری: فن اور فن کار'' ملی تو اندازہ ہوا کہ اسلم جمشید پوری افسانے کے محض اچھے نقاد ہی نہیں، قابلِ ذکر افسانہ نگار بھی ہیں۔ اس کتاب میں ڈاکٹر ارشاد سیانوی نے جن چھ افسانوں کا انتخاب پیش کیا ہے وہ افسانہ نگار کی فکری اور فنی خوبیوں کا بہترین اظہاریہ کہا جا سکتا ہے۔ خاص طور پر ''لینڈرا'' اور ''عید گاہ سے واپسی'' کی قرأت نے بہت ہی متاثر کیا۔ اسی کے ساتھ ساتھ افسانچوں کے انتخاب کی ذمہ داری محمد شمشاد صاحب نے اپنے سر لی اور اُنھوں نے بھی کوشش کی کہ ایسے افسانچے پیش کیے جائیں جو اسلم جمشید پوری کے اس فن کو نمایاں کرنے اور داد سمیٹنے میں کارآمد ہوں۔

اصل میں یہ کتاب اسلم جمشید پوری کی شخصیت، اُن کے عہد اور اُن کی افسانہ نگاری کے تفصیلی مطالعہ پر مبنی ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ بنیادی طور پر یہ کتاب اسلم جمشید پوری کو بہ حیثیت افسانہ نگار متعارف کرانے کا ایک اہم اور بڑا وسیلہ یا ماخذ ثابت ہوئی ہے۔ بلا شبہ اس کتاب میں بہ طور افسانہ نگار اُن کا بھرپور مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ ذاتی طور پر میرا خیال ہے کہ اسلم

جمشید پوری کی بہ حیثیت نقاد بھی اگر ان مطالعات میں شمولیت ہو جاتی تو زیادہ بہتر ہوتا کہ اس طرح ادب کے قاری کو افسانے سے متعلق اُن کے خیالات اور نظریات سے واقفیت کا موقع بھی ہاتھ آتا۔ ڈاکٹر ارشاد سیانوی نے اپنے مضمون ''منفرد افسانہ نگار اور ممتاز ناقد: پروفیسر اسلم جمشید پوری'' میں بہرحال اس کمی کو پورا کرنے کی قدرے کوشش کی ہے۔

اگر ہم اس کتاب پر تفصیلی نگاہ ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر ارشاد سیانوی نے اس کتاب کے پہلے حصے کو اسلم جمشید پوری کی شخصیت اور عہد کو گرفت میں لینے کے لیے مختص کیا ہے۔ اس ذیل میں محمد بشیر مالیرکوٹلوی کی تحریر خاصے کی چیز ہے۔ دوسرا حصہ جو ''رموزِ فن'' کے عنوان سے ہے، اُس میں اسلم جمشید پوری کی افسانہ نگاری کی مختلف فکری اور فنی جہتوں کو نمایاں کرتے تنقیدی و تجزیاتی مضامین ہمارے سامنے آتے ہیں۔ اِن میں دیگر بہت سے ناقدین کے ساتھ پروفیسر حسین الحق، ڈاکٹر علی احمد فاطمی، پروفیسر صغیر افراہیم، پروفیسر صالحہ رشید، مشرف عالم ذوقی، ڈاکٹر مشتاق احمد وانی، ڈاکٹر عابد حسین حیدری، ڈاکٹر ابراہیم افسر، احمد بدر اور ڈاکٹر ارشاد سیانوی جیسے معروف افسانہ نگاروں اور نقادوں کی تحریریں شامل ہیں۔

کتاب کے تیسرے حصے میں اسلم جمشید پوری کے دو معروف ترین اور اہم ترین افسانوں ''لینڈرا'' اور ''عیدگاہ سے واپسی'' پر الگ سے آٹھ تجزیاتی نوعیت کے مضامین شامل کیے گئے ہیں جن سے ان افسانوں کی اہمیت کا بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ان میں پروفیسر قدوس جاوید اور عابد سہیل جیسے ناقدین کے تجزیے بھی شامل ہیں۔

اسلم جمشید پوری کے افسانوں پر تبصروں اور نیم تجزیوں پر مبنی تحریروں کا ایک الگ گوشہ بنا لیا گیا ہے اور اہم افسانوں پر مشاہیر ادب کی آرا سے ایک اور الگ گوشہ سجا لیا گیا ہے۔ ان میں ڈاکٹر اختر آزاد، انجم عثمانی، ڈاکٹر نزہت پروین اور ڈاکٹر تسنیم فاطمہ جیسے مشاہیر ادب کی آرا بھی شامل ہیں۔

آخر میں ''انٹرویو'' کے عنوان سے گوشہ ہے جس میں اسلم جمشید پوری سے کیے گئے دو انٹرویوز کے ساتھ اُن کے چھ منتخب افسانچوں اور چھ منتخب افسانوں کو بھی شامل کیا گیا ہے اور اُن کی کتب اور اعزازات کا بھی جائزہ لیا گیا ہے اور آخر میں چند اہم تصاویر بھی شامل کر لی گئی ہیں۔ یہاں میرے خیال سے اگر اسلم جمشید پوری کے افسانوی انتخاب کا حصہ الگ سے بنا لیا جاتا تو زیادہ متاثر کن ہوتا اور تصاویر کو بھی الگ سے پیش کر دیا جاتا تو بہتر رہتا۔ جب کہ کتب اور

اعزازات والا مضمون پہلے حصے کی زینت بنالیا جاتا تو زیادہ مناسب ہوتا۔

بہرحال اس میں کوئی شک نہیں کہ ڈاکٹر ارشاد سیانوی نے اپنی اس کتاب سے اسلم جمشید پوری کا بہ طور افسانہ نگار بہترین نقش مرتب کیا ہے۔ اور محض دوسروں کی تحریروں کو ہی ایک جگہ جمع کرنے اور پیش کرنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اپنی بھرپور تحریری شمولیت سے یہ ثابت کیا ہے کہ وہ اسلم جمشید پوری کی شخصیت اور اُن کی علمی و ادبی کارروائیوں سے کس قدر آگاہ ہیں۔ اس ذیل میں اُن کا مضمون ''منفرد افسانہ نگار اور ممتاز ناقد: پروفیسر اسلم جمشید پوری'' جہاں تعریف کے قابل ہے وہاں اُن کا کیا گیا افسانوی انتخاب بھی کمال کا ہے۔ اور ان سب سے سوا اُن کا طول طویل ''مقدمہ'' ہے جس میں اُنھوں نے اپنے طور پر اسلم جمشید پوری کی شخصیت اور تخلیقی وتنقیدی تحریروں کا بھرپور مطالعہ پیش کیا ہے۔ علاوہ ازیں اس مقدمہ میں اسلم جمشید پوری پر ہونے والے تحقیقی کاموں کا بھی تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ میرے خیال سے اسلم جمشید پوری کے افسانوی فن اور تنقیدی افکار اور اسلم جمشید شناسی کے حوالے سے اس قدر تفصیلی اور ہمہ جہت مطالعہ شاید ہی کسی اور نقاد نے کیا ہو۔ اس مقدمے کے آخر میں ڈاکٹر ارشاد سیانوی لکھتے ہیں:

> ''اسلم جمشید پوری کی فکری فنی کاوشوں پر لکھی گئی تحریروں سے یہ عیاں ہوتا ہے کہ اُن پر کوئی رسمی تحریریں وجود میں نہیں آئیں۔ اِسی انکشاف نے مجھے یہ سعادت بخشی کہ اُن پر لکھی گئی تحریروں کا انتخاب کتابی شکل میں پیش کیا جائے، تاکہ ان کے افسانوی افکار وتنقیدی نظریات تک ہماری رسائی ہو سکے اور میرا ایسا بھی یقین ہے کہ ان مضامین کے مطالعہ کے بعد پروفیسر اسلم جمشید پوری کو نئے تناظر میں دیکھا جائے گا اور یہ بھی امید ہے کہ اسلم جمشید پوری کی تفہیم میں یہ کتاب نئی راہیں ہموار کرے گی۔'' (صفحہ: ٦٥)

بلاشبہ یہ کتاب انہی راہوں کو ہموار کرتی نظر آرہی ہے۔ میں نے اسی کتاب کے ذریعے اسلم جمشید پوری کی افسانوی حیثیت کو جانا اور پہچانا ہے۔ ڈاکٹر ارشاد سیانوی اس حوالے سے مبارک باد کے مستحق ہیں۔ اُمید ہے اُن کے ایسے اور بھی تحقیقی کام ہمارے سامنے آتے رہیں گے۔

☆☆☆

فرحت اختر

ایم۔اے سال دوم

علی گڑھ سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی تک

مصنف: شمس الہدیٰ انصاری (علیگ)
صفحات: 160
قیمت: 300/روپئے
ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی110002

شمس الہدیٰ انصاری (علیگ) عرف چھوٹے حاجی صاحب دھنباد (جھارکھنڈ) سے تعلق رکھتے ہیں۔ کتاب ''علی گڑھ سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی تک''، شمس الہدیٰ انصاری کے مختلف النوع مضامین کا مجموعہ ہے جو ان کی ادبی، تاریخی، تحقیقی اور تنقیدی بصیرت کا غماز ہے۔ یہ مجموعہ۲۰۲۲ء میں شائع ہوکر منظر عام پر آیا۔ اس سے قبل ان کے افسانوں کا مجموعہ ''اندھے آدمی کا سفر'' کے عنوان سے ۲۰۰۷ء میں طبع ہوکر مقبول ہو چکا ہے۔

زیر تبصرہ کتاب کے ابتدائی صفحات میں انتساب، اظہارِ تشکر، فہرست اورعرضِ حال شامل ہیں۔ اس کے بعد اقبال کا مشہور شعر قلمبند ہے ۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

کتاب کی فہرست دو صفحات پر مشتمل ہے۔ جس میں شمس الہدیٰ انصاری کا عرضِ حال، ڈاکٹر معصوم شرقی، اشہر ہاشمی، اور ڈاکٹر عبدالحلیم انصاری کی تقریظات اور ۱۸ تحقیقی وتنقیدی مضامین شامل ہیں۔

پہلا مضمون ''علی گڑھ مسلم یونیورسٹی: سرسید کی خوابوں کی تعمیر'' ہے۔ اس میں مصنف نے مدرسۃ العلوم کی مسجد، اسٹریچی ہال، سالار منزل، بک منزل، مہدی منزل، برکت علی خان لیکچر روم، تصدق رسول عربک روم، آسمان منزل، نظام میوزیم، مشتاق منزل، کچی بارک، آدم جی پیر بھائی منزل، بابِ اسحٰق، باب رحمت، باب تعلیم اور علی گڑھ کے قدیم کنویں کا مختصر لیکن دلکش بیان

کیا ہے۔

''سرسید کی قومی و تعلیمی تحریک''اور ''علی گڑھ سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی تک'' مضامین میں مصلح قوم سرسید احمد خاں کی حب الوطنی، قوم پرستی اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی تعمیر و توسیع کی کوششوں کا پرسوز بیان ملتا ہے۔ ''علیگرین اور انٹروڈکشن'' ایک دلچسپ مضمون ہے۔ اس میں مصنف نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی ریگنگ (انٹروڈکشن) اور سینئریٹی جونیئریٹی کا پرلطف انداز میں بیان کیا ہے۔ یقیناً اس مضمون کو پڑھ کر آپ بھی محظوظ ہوں گے۔ ''اردو انشائیہ کی روایت اور سرسید احمد خاں'' میں سرسید کو اردو کا پہلا انشائیہ نگار قرار دیا گیا ہے۔ اس کے بعد سرسید کا سفرنامہ ''مسافرانِ لندن'' ہے جس میں سرسید نے اپنے سفر کی منظر کشی بہت ہی دلکش انداز میں کی ہے۔ ایک انگریز اخبار 'سینٹ جیمس گزٹ' نے ایک شمارے میں اس سفرنامے کے بارے میں لکھا ہے کہ:

> ''اس سفرنامہ کا خوابناک انداز ہمیں چند بہترین سفرناموں کی یاد دلاتا ہے''۔

اگلے مضامین بعنوان ''جدت پسند ادب کا بنیاد گزار: مولانا محمد حسین آزاد، ''۱۸۵۷ء اور اردو صحافت: ایک مختصر جائزہ''، ''خواجہ الطاف حسین حالی: ایک مطالعہ'' اور ''محسن اردو: ڈاکٹر مولوی عبدالحق'' ہیں۔ جن میں مصنف نے شخصیات اور ان کی ادبی خدمات کا مختصراً تعارف پیش کیا ہے۔

گیارہواں مضمون ''حسرت موہانی کی جیل یاترا'' ہے۔ جو حسرت موہانی کی خودنوشت ''داستانِ زنداں'' کے ایک باب سے ماخوذ ہے۔ جس میں انہوں نے زندان میں پیش آنے والی پریشانیوں کا دلسوز بیان کیا ہے۔ حسرت لکھتے ہیں:

ہے مشقِ سخن جاری چکی کی مشقت بھی
یک طرفہ تماشہ ہے حسرت کی طبیعت بھی

اس کے بعد مصنف نے بڑے خوبصورت انداز سے رشید احمد صدیقی، معین احسن جذبی، مجاز لکھنوی اور قاضی عبدالستار کی دلنواز شخصیت کے تمام پہلوؤں پر اجمالاً روشنی ڈالی ہے۔ کتاب کا آخری مضمون ''علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے مشاعرہ کا احوال'' ہے۔ جو کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کی زبانی ہے۔

شمس الہدیٰ انصاری (علیگ) کی اس تخلیقی کاوش کے عمیق مطالعے سے ہمیں علی گڑھ تحریک، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی تاریخ، سرسید کی عوامی اور ادبی کوششیں اور علی گڑھ سے وابستہ نامور شخصیات کے متعلق بہت سی نئی اور دلچسپ معلومات فراہم ہوتی ہیں۔ یہ کتاب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی تاریخ سے متعلق بہت اہم کتاب ہے۔

☆☆☆

نزہت اختر

ایم۔اے سال دوم

اردو کا آغاز، ارتقاء اور مدھیہ پردیش

مصنف - کوثر صدیقی
صفحات - ۱۳۶
قیمت - ۲۰۰/روپے
سنہ اشاعت- ۲۰۲۲ء
ناشر - کوثر صدیقی، ڈائرکٹر دبستان بھوپال

''اردو کا آغاز، ارتقاء اور مدھیہ پردیش'' کوثر صدیقی کی تحقیقی کتاب ہے۔ یہ کتاب ۱۳۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ ابتداء میں مصنف نے قطعہ کے ذریعہ تاریخ نکالی ہے اور دارالاقبال، بھوپال کے نام سے چند رباعیات پیش کی ہیں۔ کتاب کی فہرست ایک صفحہ پر دی گئی ہے جس میں ۹ مضامین شامل ہیں۔ پہلا مضمون'' اردو کا آغاز، ارتقاء اور مدھیہ پردیش'' ہے۔ جس میں ۱۳ ویں صدی سے ۱۷ ویں صدی عیسوی کے درمیان مدھیہ پردیش کے ان اضلاع کی نشاندہی کی ہے جہاں اردو کے تخلیق کار گزرے ہیں۔ اس میں انہوں نے ۹ ضلعوں کو شامل کیا ہے (۱) نماڑ (کھنڈوہ، کھرگون) (۲) برہان پور (۳) سیہور (۴) رائسین (۵) اوجین (۶) بھوپال (۷) راج گڑھ (سارنگ پور) (۸) شیوپوری اور (۹) گوالیار۔

دوسرا مضمون'' مدھیہ پردیش کا تخلیقی پس منظر'' جس میں انہوں نے برہانپور، مالوہ مع بھوپال اور گوالیار کو اردو کی ارتقاء اور قدامت کے لحاظ سے اہم بتایا ہے۔ جس میں برہانپور کو زیادہ اہمیت حاصل ہے کیونکہ مدھیہ پردیش میں سولھویں صدی تک دس ادبی شخصیات گزری ہیں۔ ان میں سے ۷ کا تعلق برہانپور سے تھا۔

تیسرا مضمون'' مدھیہ پردیش میں اردو کا فروغ اور شاعری کی اولیت'' پر مبنی ہے۔ جس میں روشن علی روشن، قاضی محمد صالح، مفتی خیراللہ صدیقی، شیخ سعدی دکنی، حضرت شیخ بہاء الدین باجن، شاہ سعد اللہ گلشن، شیخ نظام وغیرہ شعراء کا ذکر ہمیں دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس کے بعد اگلا

مضمون ''اردو نثر نگاری میں مدھیہ پردیش کی اولیت'' ہے جس میں قاضی محمد رائسین کو پہلا نثر نگار ان کی تصنیف ''تفسیر ہندی'' (۱۷۲۰ء) کی وجہ سے مانا گیا ہے۔

پانچواں مضمون ''اردو کا پہلا شاعر شیخ سعدی دکنی'' ہے جس میں شیخ سعدی دکنی کو اردو کا پہلا شاعر مانا گیا ہے۔ مولانا حالی نے بھی ''حیاتِ سعدی'' میں اِس کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے ''کہتے ہیں سب سے پہلے اُس نے شعر کہا ہے''۔ اور خود شیخ سعدی دکنی نے بھی اپنی ایک غزل کے مقطع میں ریختہ کے موجد ہونے کا دعویٰ کیا ہے ؎

سعدی طرح انگیختہ، شیر و شکر آمیختہ

در ریختہ دُر ریختہ، ہم شعر ہے ہم گیت ہے

اس کے بعد اگلا مضمون ''مدھیہ پردیش میں اُردو شاعری ولّی دکنی سے پہلے'' اور پھر ''تیرہویں صدی سے سترہویں صدی کے درمیان مدھیہ پردیش میں گزرے اکابرین کی مختصر حالات زندگی'' کا ذکر کیا گیا ہے اور پھر ''اردو کی پہلی مربوط نظم کا خالق'' کے حوالے سے مضمون دیا گیا ہے۔ جس میں روشن علی روشن کی تصنیف ''عاشورنامہ'' اور محمد افضل کی ''بکٹ کہانی'' کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے بعد آخری مضمون ''اردو کا بحیثیت زبان ارتقائی سفر'' اور غیر ہندی علاقوں کی زبانوں پر عربی، فارسی اور ترکی کے اثر کو دکھایا گیا ہے۔

کتاب کے آخر میں مشمولات - ضمیمہ ۱ - میں کتابیات جو دو صفحات پر مشتمل ہے۔ ضمیمہ ۲ میں تیرہویں صدی سے اٹھارہویں صدی تک مدھیہ پردیش کے قابل ذکر شعرائے کرام مع ولادت و وفات اور آخر میں مصنف کے کوائف بیان کئے گئے ہیں۔

اس کتاب میں مصنف نے حوالوں سے ثابت کیا ہے کہ اردو شاعری اور نثر کا آغاز مدھیہ پردیش سے ہوا ہے۔ غور طلب بات یہ ہے کہ اس سے قبل بھی ہمیں اردو کے آغاز و ارتقاء سے متعلق مختلف نظریہ دیکھنے کو ملتے ہیں۔ جس میں سب سے مستند نظریہ مسعود حسین خاں کا مانا جاتا ہے جنھوں نے اردو کی ابتداء دہلی اور نواح دہلی کے قرب و جوار میں بولی جانے والی ''کھڑی بولی'' سے بتائی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اردو کسی ایک مقام پر پیدا نہیں ہوئی۔ اردو کا آغاز بیک وقت پورے ملک میں جن علاقوں میں مسلمان گئے ہوں گے وہاں ہوا ہوگا۔ انہیں علاقوں میں سے ایک علاقہ مدھیہ پردیش بھی ہے اس لیے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اردو کے آغاز و ارتقاء میں مدھیہ پردیش کا بھی اہم کردار رہا ہوگا۔ کوثر صدیقی کی یہ کتاب کئی اعتبار سے اہمیت کی حامل ہے۔ مدھیہ پردیش میں شاعری یا نثر یا مدھیہ پردیش کی تاریخ پر کام کرنے کے دوران ہر طرح سے یہ کتاب مددگار ثابت ہوسکتی ہے۔

☆☆☆

شعبۂ اردو کی سرگرمیاں

مظہر سیانوی کا کلام سننے اور پڑھنے والا اس کو اپنے دل کی بات تصور کرتا ہے :عارف نقوی
مظہر سیانوی کی شاعری میں قدیم کے ساتھ جدید خیالات کی بھی ہم آہنگی ہے: پروفیسر اسلم جمشید پوری
شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی میں مظہر سیانوی کی یاد میں آف لائن و آن لائن پروگرام کا انعقاد
میرٹھ 2/نومبر 2023ء

مظہر سیانوی سادہ مزاج، سلیس انداز بیان اور صاف طبیعت رکھنے والے انسان تھے ۔جو بات دل میں رکھتے تھے بہت جلد زبان پر لے آتے ۔نہ خلوص چھپتا ہے' نہ نفرت' بناوٹ تو کوسوں دور رہتی ۔ہوس وحرص اور لالچ سے سخت نفرت ۔اعتدال پرست انسان تھے ۔زندگی کے ہر نشیب وفراز سے واقفیت رکھتے تھے ۔مظہر سیانوی کے کلام کی بڑی خوبی یہ ہے کہ سننے اور پڑھنے والا اس کو اپنے دل کی بات تصور کرتا ہے ۔یہ الفاظ تھے جرمنی کے معروف ادیب عارف نقوی کے جو آیوسا اور شعبۂ اردو کے زیر اہتمام منعقد ''مظہر سیانوی کی یاد میں تعزیتی جلسہ میں اپنی صدارتی تقریر میں آن لائن ادا کر رہے تھے ۔

اس سے قبل پروگرام کا آغاز ایم ۔اے سال دوم کے طالب علم محمد طلحہ نے تلاوت کلام پاک سے کیا ۔بعدازاں فرحت اختر نے ہدیۂ نعت پیش کیا اس ادب نما پروگرام کی سرپرستی معروف ناقد و افسانہ نگار اور صدر شعبۂ اردو پروفیسر اسلم جمشید پوری اور صدارت معروف ادیب عارف نقوی، جرمنی نے فرمائی اور مہمانان کے بطور ڈاکٹر یونس غازی، سلیم احمد سلیم نے آف لائن جب کہ آیوسا کی صدر پروفیسر ریشما پروین نے آن لائن شرکت کی ۔تعارف و استقبالیہ کلمات ڈاکٹر آصف علی، نظامت ڈاکٹر ارشاد سیانوی اور شکریے کی رسم فیضان ظفر نے انجام دی ۔

مظہر سیانوی پر مقالہ پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر ارشاد سیانوی نے کہا کہ جمیل مظہر سیانوی کا کلام ان خامیوں اور بناوٹی لب ولہجے سے پاک ہے جو آج کل زیادہ تر نوجوان شعراء کے کلام میں عام طور پر پائی جاتی ہیں ۔متانت، تہہ داری، حسن بیان، اور صحت الفاظی ان کے کلام کی اہم خصوصیات ہیں ۔شاعری کے حوالے سے مظہر سیانوی کی شخصیت اور فن کا عکس جس طرح ابھر کر قارئین کے سامنے آتا ہے اس کے لئے مجموعی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ جمیل مظہر سیانوی ایک باصفت با اخلاق انسان اور سرزمین سیانہ کے استاد شاعر کے علاوہ خاص و عام میں منفرد پہچان

رکھنے والے اہم شاعر تھے۔'' وہ اپنی تمام غزلیہ شاعری میں ایک فن کارانہ انتخابی نظر اور چابک دستی کا ثبوت دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ بالخصوص ردیف وقوافی کا نیا پن اور اس پر ان کا زور بیان عصری شاعری میں انفرادیت کا درجہ رکھتا ہے۔

ڈاکٹر ایشور چند گمبھیر نے کہا کہ بلاشبہ مظہر سیانوی ایک عمدہ شاعر تھے۔ میں انہیں دل کی گہرا ئیوں سے خراج عقیدت پیش کرتا ہوں۔ یہ شعبۂ اردو ہی ہے جو بلا تفریق ہر ادیب کو موقع فرا ہم کرتا ہے۔ اسی طرح کسی ادبی شخصیت کے گذر جانے پر انہیں خراج عقیدت بھی پیش کرتا ہے۔

آفاق احمد نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ہمارے وہ شعراء کرام جن کا اردو ادب میں اہم کردار رہا ہے ان کی یاد میں بڑی سطح پر پروگراموں کا انعقاد ہونا چاہئے اور ایسے تمام شعرا، نقاد اور ادیبوں کی ضرور پذیرائی ہونی چاہئے۔ شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی یہ فریضہ بڑی خوبصورتی سے انجام دے رہا ہے۔

ذیشان خان نے کہا کہ شعبۂ اردو ہمیشہ ایسی شخصیات کو یاد کرتا ہے جس نے معاشرے میں کسی نہ کسی سطح پر ملک کا نام روشن کیا ہو۔ خصوصاً ادبی شخصیات کے حوالے سے تو ہمیشہ پیش پیش رہتا ہے۔ آج بھی ایسی ہی عظیم شخصیت اور استاد شاعر مظہر سیانوی کو یاد کر رہا ہے۔ میں انہیں دل کی گہرائیوں سے خراج عقیدت پیش کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ باری تعالی انہیں جوار رحمت میں جگہ دے۔

پروفیسر اسلم جمشید پوری نے کہا کہ مظہر سیانوی کی یاد میں منعقد یہ پروگرام آن لائن و آف لائن اس وجہ سے کیا جا رہا ہے تاکہ دور دراز تک لوگوں تک پہنچ سکے۔ مظہر سیانوی اس شعبے سے بہت محبت رکھتے تھے اور بارہا یہاں کے پروگراموں میں شرکت کرتے رہے ہیں۔ وہ بہت دل عزیز شاعر تھے۔ جس محفل میں بھی وہ کھڑے ہو جاتے محفل لوٹ لیتے تھے۔ ہماری یہ کوشش ہونی چاہئے کہ ان کا جو غیر مطبوعہ کلام ہے اس کو بھی منظر عام پر لایا جائے۔ بات اگر ان کی شاعری کی، کی جائے تو ان کی زبان سے نکلنے والے اشعار خاص کیفیت کے حامل ہوتے تھے۔ انہوں نے دور حاضر میں انسانی قدروں کی شکست' مایوسی' ناکامی' تنہائی' کے تعلق سے سماج کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ مظہر سیانوی کی غزل گوئی کا تہہ داری سے مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ نہ صرف ان کی شاعری جدید رنگ تغزل میں ہلکی پھلکی نظر آتی ہے۔ ساتھ ہی ان کی شاعری میں صاف وسلیس زبان اور عمدہ اسلوب بھی نظر آتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ مظہر سیانوی کو موضوع کے

شعری آہنگ اور شاعری کے اسرار ورموز سے واقفیت ہونے کے سبب انہیں شعر کہنے کا ہنر معلوم تھا۔مظہر سیانوی کی شاعری میں جگہ جگہ قدیم خیالات کے ساتھ ساتھ جدید خیالات کی ہم آہنگی ہے۔ان کی شاعری پر کبھی کبھی میرؔ کا گمان ہوتا ہے۔

اس موقع پر ڈاکٹر محمد یونس غازیؔ، اسرار الحق اسرارؔ،مکیش تیواری،،ندیم رمزی،فرمان ظہیر،ریحان قریشی،شہزادانان پوری،راشد کیفی،ڈاکٹر فراست جمال،علی جوہر،عبدالقادر کٹھوروی اورانیس میرٹھی نے اپنے اشعار کے ذریعے مظہر سیانوی کو خراج عقیدت پیش کیا۔

☆☆☆

ڈراما میں آواز کے ساتھ ساتھ باڈی لینگوتج ،موومینٹ وغیرہ بھی نہایت ضروری ہوتا ہے: نیرج شرما

ہرانسان کے اندر ایک فن کار چھپا ہوتا ہے: پروفیسر اے کے چوبے

شعبہ اردو،اورسوانگ شالا کے مشترکہ اہتمام میں منعقد دس روزہ ڈراما ورکشاپ اختتام پذیر

میرٹھ 11/اکتوبر 2023ء

فلم کا کینوس ٹی وی اور ڈراما سے بڑا ہوتا ہے۔سبھی طرح کے ڈراموں میں اسپیچ نہایت ضروری ہوتی ہے۔جب تک آنکھ،کان،ناک وغیرہ اعضا کا بہترین استعمال نہیں ہوگا تو سامنے والا متاثر نہیں ہوگا۔ان اعضا کی حرکات کے بغیر کردار ادھورا تصور کیا جائے گا۔ڈراما میں آواز کے ساتھ ساتھ باڈی لینگوتج ،موومینٹ وغیرہ بھی نہایت ضروری ہوتا ہے۔ان سب چیزوں کے لیے ادب پڑھنا بھی لازمی ہے۔جتنا زیادہ علم ہوگا کردار بھی اتنا ہی نکھر کر سامنے آئے گا۔یہ الفاظ تھے معروف ڈراما نگار اور فلم اسکرپٹ رائٹر نیرج شرما کے جو خصوصی مقرر کی حیثیت سے شعبہ اردو،اور سوانگ شالا ایکٹنگ اکیڈمی، میرٹھ کے مشترکہ اہتمام میں منعقد دس روزہ ڈراما ورکشاپ کے اختتامی اجلاس میں ادا کر رہے تھے۔

اس سے قبل پروگرام کا آغاز ایم۔اے سال اول کے طالب علم ساجد ربانی نے تلاوت کلام پاک سے کیا۔ہدیہ نعت فرحت اختر نے پیش کیا۔آج کے پروگرام کی صدارت صدر شعبۂ اردو پروفیسر اسلم جمشید پوری نے فرمائی۔مہمان خصوصی کے بطور شعبۂ زولوجی کے سابق صدر پروفیسر اے کے چوبے اور مہمان اعزازی کے بطور ڈی ایس ڈبلیو پروفیسر بھوپیندر سنگھ نے شرکت کی۔مہمانوں کا تعارف ڈاکٹر الکا وششٹھ، استقبالیہ کلمات ڈاکٹر شاداب علیم، نظامت ڈاکٹر آصف علی اور شکریے کی رسم ڈاکٹر ارشاد سیانوی نے انجام دی۔

واضح ہو کہ اس دس روزہ ورکشاپ میں شعبہ اردو کے علاوہ فائن آرٹس، تاریخ، ہندی، زولوجی، فزکس، جغرافیہ، سماجیات، باٹنی، مائیکرو بایولوجی اور یوجی سیل کے بی اے کے مختلف موضوعات کے طلبہ وطالبات نے حصہ لیا۔

شعبۂ زولوجی کے سابق صدر پروفیسر اے کے چوبے نے کہا کہ ہر انسان کے اندر ایک فن کار چھپا ہوتا ہے اور یہ ایک آرٹ ہے جسے ہم محسوس کرتے ہیں اور ظاہر کرتے ہیں۔ ان دس دنوں کی ورکشاپ میں ضرور ایسے فن کار نکلیں گے جو آگے جا کر کامیاب ہوں گے۔ ان کے ذریعے نئی نسل تیار ہوگی جو اپنے ملک کا اپنے والدین کا اور اپنا نام روشن کرے گی۔

اس موقع پر اظہار خیال کرتے ہوئے سوانگ شالا ایکٹنگ اکیڈمی کی چیئر پرسن ڈاکٹر سدھا شرما نے کہا کہ اگر اسی طرح کی ورکشاپ ہوتی رہیں گی تو طلبا کو بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملے گا۔ ہماری کوشش ہونی چاہئے کہ ڈراموں میں اپنی دلچسپی بڑھائیں۔ فلم میں بولنا آسان ہے لیکن ڈراموں میں بولنا بہت مشکل ہے لیکن جب ہم لگاتار اس سے جڑیں گے تو یقیناً بولنا بھی سیکھ جائیں گے۔

اپنی صدارتی تقریر میں پروفیسر اسلم جمشید پوری نے کہا کہ ڈرامہ نہ صرف تفریح وسکون فراہم کرتا ہے بلکہ ڈراما کرنے والے کی زندگی میں بھی بہت سی خوشگوار تبدیلیاں لاتا ہے، آج 10 روزہ ڈراما ورکشاپ اختتام پذیر ہورہی ہے۔ اس ورکشاپ کے ذریعے ہم نے پوری کوشش کی ہے کہ ہمارے طلبہ وطالبات اس خوبصورت صنف سے کافی کچھ سیکھا۔ ڈراما اپنے آپ کو پیش کرنے کا اہم ذریعہ ہے۔ زندگی بھی ایک ڈراما ہے۔ ناٹک میں خوشی غم کے تاثرات کو پیش کیا جاتا ہے۔ فلمیں ڈرامے کی ہی ترقی یافتہ شکل ہیں۔ ڈراما ادب سکھانے کا ایک اچھا ذریعہ ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ دس دن کی ورکشاپ میں بھارت بھوشن شرما، انل شرما، سریندر شرما اور نیرج شرما وغیرہ کی محنت سے ہمارے طالب علموں نے بہت کچھ سیکھا۔ ایک ماہ بعد ڈراما ''تکرار'' پیش کیا جائے گا۔ آخر میں طلبہ وطالبات کو سرٹیفکٹ پیش کیے گئے۔

اس موقع پر ڈاکٹر جئے ویر رانا عمائدین شہر اور کثیر تعداد میں طلبہ وطالبات موجود رہے۔

☆☆☆

نذیر میرٹھی نے غریبوں، مزدوروں اور عام انسان کے درد کو محسوس کیا: پروفیسر زین الساجدین

حفیظ میرٹھی کی تمام صفات ہمیں نذیر صاحب کے کلام میں نظر آتی ہیں: پروفیسر فاروق بخشی

دبستان میرٹھ میں نذیر میرٹھی کی دوسری نظیر نہیں ملتی: پروفیسر مشتاق صدف

شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ میں جشن نذیر میرٹھی کا شاندار انعقاد

میرٹھ 19 / اگست 2023ء

نذیر میرٹھی ہمارے شہر کی معزز شخصیت کے ساتھ ساتھ با اخلاق انسان ہیں۔ایک شاعر عمدہ شاعری تب تک پیش نہیں کرسکتا جب تک اس کا کردار اور اخلاق اچھا نہ ہو۔نذیر میرٹھی عہد حاضر کے عظیم شاعر ہیں۔ادبی محفلوں میں ان کے کلام سے مستفیض ہونے کا شرف حاصل ہوا۔نذیر میرٹھی کا کلام ان کے جذبات واحساسات کی عکاسی کرتا ہے۔ان کی شاعری فنی اعتبار سے۔افکار ونظریات کے اعتبار سے اہم شاعری ہے۔ان کی شاعری میں غریبوں،مزدوروں کے مسائل شامل ہیں۔یہ الفاظ تھے شہر قاضی پروفیسر زین الساجدین کے جو شعبۂ اردو کے پریم چند سیمینار ہال میں منعقد''جشن نذیر میرٹھی'' پروگرام میں اپنی صدارتی تقریر کے دوران ادا کر رہے تھے۔انہوں نے مزید کہا کہ نذیر میرٹھی نے غریبوں،مزدوروں اور عام انسان کے درد کو محسوس کیا اور نذیر میرٹھی ظلم کے خلاف کھڑے نظر آتے ہیں۔انہوں نے حفیظ میرٹھی کی مانند ظلم کے خلاف کام کرنے کی کوشش کی ہے۔

آج کا یہ پروگرام دو سیشن پر مشتمل رہا۔پروگرام کا آغاز ایم۔اے سال اول کے طالب علم محمد طلحہ نے تلاوت کلام پاک سے کیا اور فرحت اختر نے نذیر میرٹھی کا نعتیہ کلام پیش کیا۔بعدازاں مہمانوں کا پھولوں کے ذریعے استقبال کیا گیا اور سبھی مہمانان نے مل کر شمع روشن کی۔پروگرام کی صدارت کے فرائض معروف شاعر اور سابق صدر شعبۂ اردو،مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی،حیدرآباد پروفیسر فاروق بخشی نے انجام دیے۔مہمانانِ خصوصی کے بطور معروف عالم دین اور شہر قاضی میرٹھ پروفیسر زین الساجدین اور دوشانبے تاجکستان سے تشریف لائے پروفیسر مشتاق صدف نے شرکت فرمائی جب کہ مہمان ذی وقار کے بطور سابق وزیر حکومت اتر پردیش ڈاکٹر معراج الدین اور کلچرل کاؤنسل،چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی،میرٹھ کی صدر پروفیسر نیلوچین گپتا شریک ہوئے۔تعارف ڈاکٹر ارشاد سیانوی،استقبالیہ کلمات ڈاکٹر آصف علی،نظامت ڈاکٹر شاداب علیم اور شکریے کی رسم ڈاکٹر الکا وششٹھ نے انجام دی۔

اس موقع پر مہمانان کے ذریعے صاحب جشن نذیر میرٹھی کی نئی شعری کاوش ''لالہ زار'' کا اجراء بھی عمل میں آیا جس پر معروف شاعر وادیب اور سابق صدر شعبۂ اردو،میرٹھ کالج میرٹھ پروفیسر یونس غازی نے منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔اسی دوران نذیر میرٹھی کو شال اور نشان یادگار پیش کر کے ان کا اعزاز کیا گیا۔

دوپہر 2:00 بجے سے دوسرے تکنیکی اجلاس کا آغاز ہوا جس کی مجلس صدارت پر معروف ادیب وناقد اور صدر شعبۂ اردو پروفیسر اسلم جمشید پوری، ڈاکٹر فرحت خاتون (صدر شعبۂ اردو، فیض عام ڈگری کالج) نذیر میرٹھی اور سید معراج الدین جلوہ افروز ہوئے۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر آصف علی (اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اردو، سی سی ایس یو) انجام دیے۔

پروگرام میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے پروفیسر مشتاق صدف نے کہا کہ ’’دبستان میرٹھ میں نذیر میرٹھی کی دوسری نظیر نہیں ملتی۔ انہوں نے شعروادب کی خدمات میں اپنی پوری زندگی صرف کر دی۔ ان کی شاعری میں ایک آفاق گم ہے اور میں اسلم جمشید پوری صاحب کو بھی بے حد مبارک باد پیش کرتا ہوں جنہوں نے پوری محنت و لگن سے اس شعبے کو سینچا ہے ان ہی کی محنت و کاوش کا نتیجہ ہے کہ آج شعبۂ اردو کی پوری اردو دنیا میں مختلف ومنفرد شناخت ہے۔ میں ان کے جذبے کو سلام کرتا ہوں۔

پروفیسر فاروق بخشی نے کہا کہ حفیظ میرٹھی کی تمام صفات ہمیں نذیر صاحب کے کلام میں نظر آتی ہیں اور جس انسان نے حفیظ میرٹھی جیسے اہم شاعر کے ساتھ وقت گذارا ہو اس کی شاعری کی معنویت میں کسی طرح کی کمی نہیں ہوگی۔ نذیر میرٹھی کا جشن اس جشن سے بھی بڑا ہونا چاہئے۔ پروفیسر نیلو جین گپتا نے کہا کہ نذیر میرٹھی اردو ادب کی ایک نظیر ہیں۔ انہوں نے اردو شاعری میں اہم رول ادا کیا ہے۔ آپ اردو کے بے مثال شاعر ہیں۔

پروفیسر اسلم جمشید پوری نے کہا کہ نذیر میرٹھی نے حفیظ میرٹھی کی اس روایت کو زندہ رکھنے کا کام کیا جس کی منفرد شناخت ہے۔ نذیر میرٹھی کا زیادہ تر سرمایہ غزل پر مشتمل ہے لیکن آپ نے نظموں میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ آپ کی غزلوں میں اثر بھی ہے اور درد بھی، شگفتگی بھی ہے اور دلگدازی بھی۔ آپ کی شعری خدمات کو دیکھتے ہوئے شعبۂ اردو نے یہ فیصلہ کیا کہ آپ پر ایک جشن ہو اور ہمیں یہ جشن کر کے بڑی خوشی کا احساس ہو رہا ہے اور ہم یہ بھی چاہتے ہیں کہ ہر دو ماہ میں میرٹھ کے کسی بڑے شاعر کا جشن منایا جائے۔

مجموعہ ’’لالہ زار‘‘ پر اظہار خیال کرتے ہوئے شاہد چودھری نے کہا کہ نذیر بھی حفیظ کی مانند قدروں کو مستحکم کر رہے ہیں۔ گلزار نے ایک بات کہی ہے کہ شاعروں کے سینے میں عورت کا دل ہوتا ہے‘‘ حفیظ میرٹھی نے بھی عورت کے جذبات پر کلام پیش کیا تو نذیر میرٹھی نے بھی عورت کے جذبات وخیالات کو اپنے کلام میں پیش کیا ’’لالہ زار‘‘ ایک اچھی کوشش ہے۔ اس میں بچوں

کے لیے بھی اچھی نصیحت اور منظوم کہانیاں ملتی ہیں۔نذیر حفیظ کے سچے جانشیں ہے اور حفیظ کے چھوڑے کام کو مکمل کرنے کی کوشش کی ہے۔

ڈاکٹر فرحت خاتون نے کہا کہ نذیر میرٹھی کی نظمیں ان کے احساسات کی ترجمانی کرتی نظر آتی ہیں۔سماج و معاشرے میں پھیلی تمام برائیوں اور مسائل کو آپ نے فن کاری سے پیش کیا ہے۔

سید معراج الدین نے کہا کہ ''لالہ زار'' میں زیادہ تر نظمیں بچوں پر مشتمل ہیں جو کہ اسماعیل میرٹھی کی یاد دلاتی ہیں۔ڈاکٹر معراج الدین احمد نے کہا کہ نذیر میرٹھی نے حفیظ میرٹھی کو زندہ کیا ہوا ہے۔میرٹھ کے بڑھتے ستاروں کو ہم نوازتے ہیں یہ بہت اچھی بات ہے اور یہ ہماری ذمہ داری بھی ہے۔

ڈاکٹر ذکی طارق نے کہا کہ جس نے میرٹھ کے ادبی بزرگوں کی روایت کو برقرار رکھا ہے اس کا نام نذیر میرٹھی ہے۔''لالہ زار'' میں آپ نے سماج و معاشرہ کے ساتھ ساتھ اوصاف جمیلہ، اردو، خواب، عورت وغیرہ کے ذریعے سماج کے مسائل کو پیش کیا ہے۔ان کے علاوہ نظم ''لاک ڈان'' بھی ایک طنزیہ نظم ہے۔انہوں نے لالہ زار کے ذریعے اپنے سماج کو آئینہ دکھانے کا کام کیا ہے۔پروگرام کے آخر میں نذیر میرٹھی نے کہا کہ میں آپ سبھی کا اور خصوصاً پروفیسر اسلم جمشید پوری کا بہت شکر گزار ہوں کہ آپ نے میرے تعلق سے اتنا عمدہ اور لاجواب پروگرام کیا۔شکریے کی رسم آفاق احمد خاں نے انجام دی۔

اس موقع پر نایاب زہرا زیدی، ایاز احمد ایڈوکیٹ، سعید احمد، عزیز احمد، شہناز پروین، طلبہ و طالبات اور کثیر تعداد میں عمائدین شہر نے شرکت کی۔

☆☆☆

ماحولیات کے تحفظ کے لیے سنجیدگی سے مثبت قدم اٹھانے ہوں گے۔عارف نقوی

شجر زمین کو زرخیزی عطا کرتے ہیں اور ماحولیات میں اعتدال بھی پیدا کرتے ہیں: پروفیسر وائی وملا

شعبۂ اردو، میرٹھ یونیورسٹی میں ''ماحولیات کا تحفظ اور ہماری ذمہ داری'' پر آن لائن پروگرام کا انعقاد

میرٹھ 17/اگست 2023ء

میں سب سے پہلے اتنے اہم موضوع پر پروگرام کے لیے اردو شعبے کو اور ان کی پوری ٹیم کو مبارک باد دینا چاہوں گا جنہوں نے پروفیسر وائی وملا کو مدعو کر کے جس خوبصورتی سے ماحولیات پر لیکچر دیا ہے وہ الفاظ میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔محترمہ نے ماحولیات کے تعلق، اس کی اہمیت

وافادیت اوراس کی ضرورت پر جس طرح روشنی ڈالی ہے اس نے ہماری آنکھیں کھول دیں۔ ماحولیات کے تعلق سے آج یوروپ والے کتنے حساس ہیں اس کا اندازہ اس واقعے سے لگایئے کہ برلن میں ہماری ایک رشتہ دار ہیں۔ ان کے یہاں جو پیڑ ہے وہ آج اس انجام کو پہنچ چکا ہے کہ ان کی چھت اور مکان اس سے متاثر ہیں۔ انہوں نے کئی بار پیڑ کاٹنے کی درخواست دی۔ لیکن انتظامیہ نے منع کر دیا۔ اس سے اندازہ لگایئے کہ ایک پیڑ بھی کتنا اہم ہوتا ہے۔ یہاں کے لوگ سردی کے عادی ہیں لیکن آج یہاں بھی ماحول بدل رہا ہے۔ حالات بہت نازک ہیں۔ وقت رہتے ماحولیات پر دھیان نہ دیا گیا تو اس کے نتائج خطرناک ہو سکتے ہیں۔ یہ الفاظ تھے جرمنی کے معروف ادیب وشاعر عارف نقوی کے جو شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی اور بین الاقوامی نوجوان اردو اسکالرز انجمن (آیوسا) کے زیر اہتمام منعقد ''ماحولیات کا تحفظ اور ہماری ذمہ داریاں'' موضوع پر اپنی صدارتی تقریر میں آن لائن ادا کر رہے تھے۔ انہوں نے مزید کہا کہ ہمیں ماحولیات کے تحفظ کے لیے سنجیدگی سے مثبت قدم اٹھانے ہوں گے۔

اس سے قبل پروگرام کا آغاز سعید احمد سہارنپوری نے تلاوت کلام پاک سے کیا۔ پروگرام کی سرپرستی صدر شعبہ اردو پروفیسر اسلم جمشید پوری نے فرمائی اور صدارت کے فرائض معروف ادیب وشاعر عارف نقوی جرمنی نے فرمائی۔ خصوصی مقرر کے بطور سابق نائب شیخ الجامعہ چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ پروفیسر وائی وملا نے آن لائن شرکت کی۔ اس موقع پر لکھنؤ سے آیوسا کی صدر پروفیسر ریشما پروین نے بھی اظہار خیال کیا۔ استقبالیہ کلمات ڈاکٹر شاداب علیم، نظامت اور شکریے کے فرائض ڈاکٹر الکا وششٹھ نے انجام دیے۔

خصوصی مقرر کا مختصر تعارف پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر آصف علی نے کہا کہ یوں تو آپ کا میدان باٹنی ہے مگر اس میں بھی پلانٹ ڈیولپمنٹ، سائیکلوجی،، پیتھو کیمسٹری اور ٹشو کلچر آپ کے مخصوص میدان ہیں۔ آپ کے زیر نگرانی 36 پی ایچ۔ ڈی 61 ایم فل، ایم۔ ایس سی کے سات مقالے اور آٹھ ریسرچ پروجیکٹ بھی آپ نے مکمل کیے ہیں۔ انتہائی اہم موضوعات پر آپ کے 87 مقالے بھی اب تک شائع ہو چکے ہیں۔ سینکڑوں نیشنل، انٹرنیشنل سیمیناروں اور کانفرنسوں میں آپ نے وقیع مقالے پیش کیے ہیں آپ یونیورسٹی میں مختلف عہدوں صدر شعبہ، ڈین فیکلٹی، ڈی ایس ڈبلیو، چیف پراکٹر، اور بہت سے دیگر عہدو پر بھی فائز رہیں۔

اس موقع پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے صدر شعبۂ اردو پروفیسر اسلم جمشید

پوری نے کہا کہ ہمیں نہ صرف ماحولیات کوخوبصورت اورخوشگوار بنانے کے لیے زیادہ سے زیادہ شجر کاری کرنی چاہئے بلکہ ماحولیات کے تحفظ کی ذمہ داری بھی نبھانی چاہئے۔ماحولیات ہمارے لیے بہت ضروری ہے۔پانی ہم بے دریغ استعال کرتے ہیں پانی کی ضرورت نہ صرف انسان کو بلکہ جانوروں ،کیڑےمکوڑوں اورپیڑپودوں کوبھی اس کی بہت ضرورت ہے۔اس کا بھی ہمیشہ دھیان رکھیں۔

پروفیسر ریشما پروین نے کہا کہ آج کا موضوع بہت ہی اہم ہے۔ہم سب کو اچھی ماحولیات کی سخت ضرورت ہے۔ہم دوسروں کوتو الزام دیتے ہیں لیکن ہم خود سے بھی یہ سوال ضرور کریں کہ ہم خوبصورت ماحولیات کے لیے کیا کررہے ہیں اور ہمیں کیا کرنا چاہئے۔اس طرح کے پروگرام وقتاً فوقتاً ہوتے رہنا چاہئیں۔

پروفیسر وائی وملا نے کہا کہ شجر زمین کو نہ صرف زرخیزی عطا کرتے ہیں بلکہ ماحولیات میں اعتدال بھی پیدا کرتے ہیں اور نہ صرف پیڑ بلکہ پودے بھی نہایت ضروری ہیں۔ جہاں جیسی مٹی ہواسی کے اعتبار سے پیڑ پودے لگائیں۔آج ہم تکنیک کے پیچھے تو بھاگ رہے ہیں لیکن اس سے انسانیت کو کتنے خطرے لاحق ہیں اس کی پرواہ کون کرے گے۔ بیشک ہم جدید تکنیک ضرور اپنائیں لیکن یہ بھی دھیان رہے کہ پیڑ پودوں کو اس سے نقصان نہ ہو۔کیونکہ پیڑ پودے ہی پانی کو بھی صاف رکھتے ہیں۔اس لیے ہمیں انسانی زندگی اور آنے والی نسل کو بچانے اور ماحول کو خوبصورت اور پاک رکھنے کے لیے زیادہ سے زیادہ شجر کاری کرنی ہوگی۔

پروگرام میں ڈاکٹر ارشاد سیانوی،محمد شمشاد، فیضان ظفر،طلحہ،نزہت اختر،فرحت اختر، لائبہ وغیرہ آن لائن جڑے رہے۔

☆☆☆

اگر آپ کو آگے بڑھنا ہے تو اپنے اندر تقریری صلاحیت پیدا کریں۔ پروفیسر اسلم جمشید پوری
عالمی یوم خواندگی کے موقع پر شعبۂ اردو اور کلچرل کاؤنسل کے مشترکہ اہتمام میں پروگرام کا انعقاد
میرٹھ 12/اگست 2023ء

دراصل تقریری مقابلے ہمیشہ بہت دلچسپ ہوتے ہیں خواہ موضوع مثبت ہو یا منفی ہمیشہ ہی طالب علم پوری تیاری اور دلائل کے ساتھ اپنی بات رکھتا ہے جیسا کہ کوئی اچھا وکیل عدالت میں بحث کرتا ہے۔میں نے محسوس کیا کہ بہت سے طلبا میں اعتماد کی کمی تھی۔اگر آپ کو آگے بڑھنا ہے تو اپنے اندر تقریری صلاحیت پیدا کریں اور اس کے لیے آپ خوب محنت کریں۔ بولتے وقت اتار چڑھاؤ بھی بہت ضروری ہے اور سبھی کو مخاطب بھی کرتے رہنا چاہئے۔تقریر کے

آداب اور تقریر کے طریقے سیکھنے چاہئیں۔ یہ الفاظ تھے صدر شعبۂ اردو پروفیسر اسلم جمشید پوری کے جو عالمی یوم خواندگی کے موقع پر شعبۂ اردو اور کلچرل کاؤنسل چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی کے زیر اہتمام منعقد تقریری مقابلہ ''زبان کے فروغ میں تکنیک کا کردار اور زبان کے فروغ میں ترجمے کا کردار'' موضوع پر اپنی صدارتی تقریر میں ادا کر رہے تھے۔انہوں نے مزید کہا کہ آپ سب لوگ مبارک باد کے مستحق ہیں کہ آپ نے کم از کم ڈائس پر آنے کی جسارت تو کی ہم بھی آپ کی رہنمائی اور آپ کے مستقبل کی تابناکی کے لیے کچھ بہتر قدم اٹھانے کے کوشش کریں گے

اس سے قبل پروگرام کا آغاز شمع افروزی سے کیا گیا۔ بعدازاں مہمانوں کا پھولوں کے ذریعے استقبال کیا گیا۔ پروگرام میں صدارت کے فرائض معروف فکشن نگار اور صدر شعبۂ اردو پروفیسر اسلم جمشید پوری نے انجام دیے۔مہمانان خصوصی کے بطور شعبۂ تاریخ کے استاد اور کلچرل کاؤنسل، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی کے صدر پروفیسر دگنیش تیاگی اور شعبۂ زولی کی صدر اور کلچرل کاؤنسل کی کنوینر پروفیسر نیلو جین گپتا نے شرکت کی۔تقریری مقابلے میں ججز کے فرائض معروف ڈراما ہدایت کار بھارت بھوشن شرما، معروف ہندی شاعر ڈاکٹر رام گوپال بھارتیہ اور مائنارٹی ایجو کیشنل سوسائٹی، میرٹھ کے صدر آفاق احمد خاں نے انجام دیے۔ جب کہ نظامت ڈاکٹر الکا وششٹھ اور شکریے کی رسم ڈاکٹر ارشاد سیانوی نے ادا کی۔

یہ مقابلہ بی۔اے اور ایم۔اے سطح پر منعقد ہوا۔ بی۔اے میں لاء ڈیپارٹمنٹ سے سیدہ جمال زہرا، سوم شعبہ اردو سے کہکشاں دوم اور یوہانسا تیاگی نے اول پوزیشن حاصل کی جب کہ ایم۔اے سطح پر شعبۂ اردو کے محمد طلحہ سوم، مکمل شرما دوم اور شعبۂ اردو کی لائبہ نے اول مقام حاصل کیا۔اس کے علاوہ اننیا، آدتیہ کمار، مہیما، شیوانند، وپن دھاما اور ساکشی وغیرہ نے تقریری مقابلے میں حصہ لیا

اس موقع پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے پروفیسر دگنیش کمار تیاگی نے کہا کہ میں اس مقابلے میں شامل سبھی طلبہ و طالبات کا استقبال کرتا ہوں اور ان کے بہتر مستقبل کی دعا کرتا ہوں جن کی آمد سے یہ پروگرام کامیاب ہوا اور میں اپنے ججز کا بھی بے حد مشکور ہوں کہ انہوں نے ہمارے لیے اپنا قیمتی وقت نکالا۔ پروفیسر نیلو جین گپتا نے کہا کہ آپ اس طرح کے مقابلوں میں ضرور حصہ لیں اور اپنی پوشیدہ صلاحیتوں کو نکھاریں۔آپ کا جو ہنر ہے وہ نکھر کر سامنے آئے۔ یہ پروگرام آپ کا ہے آپ ہی اسے کامیاب بنائیں گے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر شاداب علیم، ڈاکٹر

آصف علی، بھارت بھوشن شرما، آفاق احمد خاں، ڈاکٹر رام گوپال بھارتیہ اور ڈاکٹر اوم پال نے بھی اظہار خیال کیا۔

اس موقع پر عمائدین شہر اور کثیر تعداد میں طلبہ و طالبات نے شرکت کی۔

☆☆☆

حضرت امام حسین کے پیغام کو گھر گھر پہنچانا ہمارا فرض ہے۔: پروفیسر زین الساجدین

واقعۂ کربلا کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس نے متاثر نہ کیا ہو: مولانا سید اطہر علی کاظمی

قربانی کا جذبہ ہمیشہ جیت سے بڑا ہوتا ہے: پروفیسر نیلو جین گپتا

شعبۂ اردو سی سی ایس یو میں ''واقعات کربلا کی عصری معنویت:'' عنوان پر پروگرام کا انعقاد

میرٹھ 04/اگست 2023ء

واقعۂ کربلا کا کوئی پہلو ایسا نہیں جس نے متاثر نہ کیا ہو۔ ہمیں یہ سوچنا چاہئے کہ واقعہ کربلا نے ہماری زندگی پر کیسا اثر ڈالا۔ اس محفل کا مقصد نوجوان نسل میں قربانی امام حسین کے پیغام کی روح پیدا کرنا ہے تاکہ وہ ظالم طاقتوں کی بیعت قبول کرنے یا برائیوں کے سامنے گھٹنے ٹیکنے کے بجائے سر کٹانا منظور کرلیں اور ہمیشہ باطل کے سامنے سینہ سپر رہیں۔ یہ الفاظ تھے پروفیسر زین الساجدین کے جو شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی اور بین الاقوامی نوجوان اردو اسکالرز انجمن (آیوسا) کے زیر اہتمام منعقد ''واقعات کربلا کی عصری معنویت'' موضوع پر اپنی صدارتی تقریر کے دوران ادا کر رہے تھے۔ انہوں نے مزید کہا کہ سیدنا امام حسین نے باطل کا مقابلہ کردار سے کیا ہتھیاروں سے نہیں۔ جب کوئی انسان حق اور دیانت داری کے لیے لڑتا ہے تو یہ اس انسان کا امتحان ہوتا ہے۔ کیونکہ خدا بادشاہت یا کنگالی دے کر آزماتا ہے۔ حق کے لیے لڑنا اور باطل کو ختم کرنا ہی امام حسین کا ایمان تھا۔ شہادت انسان کا اعلیٰ عروج ہے مگر قربانی دے کر اس شہادت کو پانا اور بھی بڑا کام ہے۔ حضرت امام حسین کے پیغام کو گھر گھر پہنچانا ہمارا فرض ہے۔

اس سے قبل پروگرام کا آغاز بی اے سال اول کی طالبہ فاطمہ نے تلاوت کلام پاک سے کیا۔ ہدیہ نعت پی۔ ایچ۔ ڈی کی طالبہ فرح ناز نے پیش کیا۔ بعد ازاں میرٹھ کے معروف شاعر فخری میرٹھی نے منقبت پیش کی۔ پروگرام کی سرپرستی معروف ادیب و ناقد اور صدر شعبۂ اردو پروفیسر اسلم جمشید پوری نے فرمائی۔ صدارت کے فرائض معروف اسکالر اور شہر قاضی میرٹھ پروفیسر زین الساجدین نے انجام دیے اور مہمان خصوصی کے بطور منصبیہ عربی کالج کے مولانا سید محمد اطہر

کاظمی نے شرکت فرمائی۔ جب کہ مقررین کے بطور مولانا سید راشد علی زیدی، مولانا محمد جبرئیل اورمولانا انیس الرحمٰن نے شرکت کی۔ استقبالیہ کلمات ڈاکٹر آصف علی، نظامت کے فرائض ڈاکٹرعفت ذکیہ اورشکریے کی رسم ڈاکٹرشاداب علیم نے ادا کی۔

اس موقع پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے آفاق احمد خاں نے کہا کہ آج کا اجلاس تاریخ ساز ہے حالانکہ شعبے میں ہر موضوع پر پروگرام ہوتے رہتے ہیں لیکن آج کے پرو گرام کی نوعیت ہی الگ ہے۔ کربلا کا پیغام ایک آفاقی پیغام ہے جو باطل کے آگے نہ جھکنے کا درس دیتا ہے۔ امام حسین بھی تعداد کم ہونے کے باوجود باطل کے آگے نہیں جھکے اور اپنی قربانی پیش کر دی لیکن باطل کے سامنے ڈٹ کر کھڑے رہے۔

صدر شعبۂ زولوجی پروفیسر نیلوجبین گپتا نے کہا کہ قربانی کا جذبہ ہمیشہ جیت سے بڑا ہوتا ہے اور یہ احساس ہمارے طلبہ میں بھی پیدا ہو جائے۔ شعبۂ اردو نے بہت عمدہ پروگرام کا اہتمام کیا ہے۔ میں صدر شعبۂ کو اس کے لیے مبارک باد پیش کرتی ہوں اور شعبۂ اردو بڑے پروگرام منعقد کرے میں چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی کی کلچرل کاؤنسل کی جانب سے ہرممکن مدد کا وعدہ کرتی ہوں۔

مولانا انیس الرحمٰن قاسمی نے کہا کہ آج شعبۂ اردو نے جس موضوع کا انتخاب کیا وہ اہم بھی ہے اور وقت کا تقاضا بھی۔ حضرت امام حسین ایسے گھرانے سے تعلق رکھتے تھے جو علم و عمل سے منور تھا اور یہ وہی خوشبو ہے جو کربلا میں کام آئی۔ کربلا سے ہمیں حق، صداقت، ایمان اور انسانیت کا درس ملتا ہے۔

مولانا سید راشد علی نے کہا کہ ظاہری طور پر کربلا تلواروں کی جنگ ہے اور باطنی طور پر یہ کرداروں کی جنگ ہے۔ ہم نے تلواروں کی کربلا کو دیکھا ہے ہمیں کرداروں کی کربلا کو دیکھنا چاہئے۔ کربلا تلواروں کی جنگ نہیں کرداروں کی جنگ تھی۔ امام حسین نے پہلے اپنے اور یزید کے کردار کو واضح کیا پھر فرمایا کہ مجھ جیسا یزید جیسے بدکردار کی بیعت نہیں کرسکتا ہے۔ یزید ایسا انسان ہے جو فاسق ہے۔ فاجر ہے، جس کی نظر میں انسانیت کی کوئی وقعت نہیں ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ امام حسین نے اپنا اعلیٰ کردار پیش کر کے انسانیت کو نجات دی تھا کہ حق باطل کی تقلید نہیں کرسکتا۔ ہمیں آج اپنے عمل کے ذریعے اپنے اس کردار کو پیش کرنا ہوگا جو امام حسین کا کردار تھا کربلا میں انسانیت کا جو دشمن ہو رہا تھا اسی انسانیت کی بقا کے لیے آپ نے اپنی شہادت پیش کی۔

مولانا محمد جبرئیل نے کہا کہ اگر کسی کو محمدؐ سے محبت ہے تو اسے حسن اور حسین سے بھی محبت ہوگی۔ اگر محبت حسنین نہیں ہے تو وہ محبت نہیں ہے۔ شہادت اچھی چیز ہے مگر ظالمانہ شہادت کا سامنا کرنا پڑا یہ افسوس کی بات ہے۔ اسلام کے معنی ہی سلامتی کے ہیں جہاں جانور، پرندے، چیونٹی وغیرہ کی حفاظت کی جاتی ہے اور اسلام نے درختوں کو بھی کاٹنے سے منع کیا ہے۔ جس طرح

ظلم کرنا گناہ ہے اس طرح ظالم سے ہاتھ ملانا بھی ظلم ہے۔
مولانا محمد اطہر کاظمی نے کہا کہ واقعۂ کربلا کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس نے متاثر نہ کیا ہو جب جب ہمیں یزیدیت گھیرے گی ہمیں واقعات کربلا یاد آئے گا۔ اگر کوئی انسان پریشانی میں پھنسنے پر پروردگار کو بھول جائے وہ ایمان والا نہیں۔ اگر پریشانی کا حل مل سکتا ہے وہ کربلا کا میدان ہے۔ جب جب امت کی اصلاح کی ضرورت پڑے گی واقعات کربلا کو یاد کیا جائے گا۔۔ اگر یہ واقعہ نہ ہوتا ہمارے مذہب کی حقیقت ہم تک نہ پہنچتی۔
پروفیسر اسلم جمشید پوری نے کہا کہ واقعہ کربلا حق و باطل کے درمیان ایک خط امتیاز تھا اور اس نے ہمیشہ کے لیے یہ ثابت کر دیا ہے کہ باطل کتنا بھی بظاہر طاقتور کیوں نہ ہو جائے حق کو اپنے سامنے نہیں جھکا سکتا۔ امام حسین نے انسانی سماج اور اچھے معاشرے کی تشکیل کے لیے کام کیا، حق کو زندہ کرنے کی بات کی تو واقعہ کربلا اس کی عمدہ مثال ہے۔ آج ہمارے چاروں طرف یزیدیوں کی ایک فوج ہے جو ہمیں حق بات کہنے سے روکتی ہے۔ آج کا ماحول اتنا خراب ہو چکا ہے کہ حق پر رہنا دشوار ہو گیا ہے۔ واقعات کربلا میں شہید ہونے والے کرداروں کو اپنی زندگی میں اتارنے کی ضرورت ہے۔ آج ہمارے درمیان بہت سے لوگ چاہتے ہیں کہ حسین جیسا کردار سامنے نہ آئے۔ آج ہم قدم قدم پر یزیدیوں سے گھرے ہوئے ہیں۔
اس موقع پر نایاب زہرا زیدی، ڈاکٹر ارشاد سیانوی، ڈاکٹر ارشاد علی، عابد سیفی، چودھری عبدالقادر، محمد عابد، عمائدین شہر اور کثیر تعداد میں طلبہ و طالبات نے شرکت کی۔

☆☆☆

ادب ہو یا سائنس تحقیق کے بغیر ترقی کے اعلی مراحل طے کرنا ممکن نہیں ہے: پروفیسر سنجیو شرما
تحقیق کے ذریعے موضوع کی اہمیت اور اس کے فوائد و نقصان بھی سامنے لائے جاسکتے ہیں: پروفیسر ارتضی کریم
شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی میں پری پی۔ ایچ ڈی کورس ورک کا آغاز
میرٹھ یکم اگست 2023ء

ہر میدان میں کامیابی کی اعلیٰ سطحوں تک رسائی کے لیے تحقیقی عمل لازمی ہوتا ہے۔ تحقیق کے ذریعے اپنے موضوع کی اہمیت و افادیت کے ساتھ ساتھ اس کے فوائد و نقصانات بھی سامنے لائے جاسکتے ہیں اور ظاہر ہے کہ جو عمل جتنا مفید اور کارآمد ہو اس کے لیے اتنی ہی زیادہ احتیاط اور اس کے اصول و ضوابط کے بارے میں جاننا ضروری ہے۔ تحقیق کو اگر چہ حق اور صداقت کا مترادف معنی کہا جاتا ہے لیکن دونوں میں کافی فرق ہے۔ ہر سچائی تحقیق نہیں ہوسکتی۔ یہ الفاظ تھے

سابق ڈین فیکلٹی آف آرٹس اور صدر شعبۂ اردو پروفیسر ارتضیٰ کریم کے جو شعبۂ اردو کے پریم چند ہال میں پری، پی۔ایچ۔ڈی کورس ورک میں لیکچر سیریز کے دوران طلبا سے خطاب کرتے ہوئے ادا کر رہے تھے۔انہوں نے مزید کہا کہ ہمارے ادب میں ابھی تک بہت سی سچائیاں ایسی ہیں جو یا تو ابھی تک سامنے نہیں آئیں یا پھر ان کا سہرا دوسروں کے سر رکھ دیا گیا ہے۔آپ لوگوں کی ذمہ داری ہے کہ آپ ایسے تمام حقائق کو سامنے لائیں اور مستحقین کو ان کا حق دلائیں۔

اس سے قبل پروگرام کا آغاز کرتے ہوئے سابق شیخ الجامعہ مہاتما گاندھی سینٹرل یونیورسٹی، موتیہاری، بہار اور ڈین فیکلٹی آف آرٹس، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ کے پروفیسر سنجیو شرما نے کہا کہ تحقیق تمام ترقیات کی ضامن ہے۔ادب ہو یا سائنس تحقیق کے بغیر ترقی کے اعلیٰ مراحل طے کرنا ممکن نہیں۔انہوں نے مزید کہا کہ تحقیق کی ابتدا شک سے ہوتی ہے۔جب تک آپ کسی شے یا حقیقت کے سلسلے میں کوئی شک یا سوال پیدا نہیں کریں گے تب تک تحقیق کا عمل نامکمل رہے گا۔اس لیے آپ اپنے تحقیقی کاموں سے متعلق زیادہ سے زیادہ سوالات کھڑے کریں اور پھر ان کے جوابات کے لیے کتابوں اور دوسرے ذرائع کے علاوہ اپنے اساتذہ اور تجربہ کار لوگوں سے ان کا حل تلاش کریں۔انہوں نے سنسکرت کے ایک اشلوک کے ذریعے اس پورے عمل کی وضاحت کی۔

آخر میں صدر شعبۂ اردو اور معروف فکشن نگار پروفیسر اسلم جمشید پوری نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ادب بھی زندگی کا لازمی حصہ ہے اور اس کے بہتر امکانات تحقیقی کاموں کے ذریعے سامنے لائے جا سکتے ہیں۔لہٰذا تحریری مقالہ تحریر کرنے سے قبل تحقیق کے طریقۂ کار اور اس کے اصول وضوابط سے واقفیت لازمی ہے۔تحقیق ایک ایسا پیچیدہ عمل ہے جس کو عمل میں لانے کے لیے بہت سی باتوں پر غور کرنا ضروری ہوتا ہے۔تحقیق میں کسی اپنے پرائے کی جانب داری کو ساجھا نہیں کیا جا سکتا بلکہ ایمانداری سے کسی بھی موضوع کی حقیقی صورت حال کو اجاگر کرنا ضروری ہوتا ہے۔اسی مقصد کے پیش نظر ریسرچ اسکالرز کے لیے اپنا تحقیقی عمل شروع کرنے سے قبل تحقیق کے طریقۂ کار اور اس کے اصول وضوابط سے واقف کرانے کے لیے پری پی۔ایچ۔ڈی کورس ورک کرایا جاتا ہے اور یہ کورس سبھی اسٹریم کے ریسرچ اسکالرز کے لیے لازمی ہوتا ہے۔میں امید کرتا ہوں کہ آپ سبھی طلبا سنجیدگی اور محنت ولگن سے یہ کورس مکمل کریں گے۔

اس موقع پر ڈاکٹر آصف علی، ڈاکٹر شاداب علیم، ڈاکٹر الکا وششٹھ اور ڈاکٹر ارشاد

سیانوی موجود رہے۔

☆☆☆

منشی پریم چند کی تخلیقات اوران کے کردار ہمیں غور وفکر پر مجبور کرتے ہیں۔: پروفیسر ارتضٰی کریم
شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، جن وادی لیکھک سنگھ اور وی کمٹ میرٹھ کی مشترکہ پیش کش
بابائے فکشن منشی پریم چند کی یوم پیدائش کے موقع پر شعبۂ اردو، سی سی ایس یو میں شاندار پروگرام کا انعقاد
میرٹھ 31/جولائی 2023ء

منشی پریم چند کی تخلیقات اوران کے کردار ہمیں غور وفکر کرنے پر مجبور کرتے ہیں جو سچ ہوتا ہے وہی خوبصورت ہوتا ہے۔ان کے ادب میں سچ اور خوبصورتی کا ایک منفرد زاویہ نظر آتا ہے۔سماجی مسائل اور عام انسان کا دکھ درد پریم چند کے افسانوں میں جا بجا نظر آتا ہے۔یہ الفاظ تھے پروفیسر ارتضٰی کریم کے جو شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، جن وادی لیکھک سنگھ اور وی کمٹ میرٹھ کے مشترکہ اہتمام میں بابائے فکشن منشی پریم چند کی یوم پیدائش کے موقع پر شعبے کے پریم چند سیمینار ہال میں منعقد پروگرام بعنوان ''پریم چند کی عصری معنویت'' کے موقع پر مہمان خصوصی کی حیثیت سے ادا کررہے تھے۔انہوں نے مزید کہا کہ پریم چند کے بارے میں اور بھی باتیں ہوتی رہیں گی جب تک ہم اور ہمارا سماج زندہ ہے پریم چند سدا ہمارے ساتھ ہی رہیں گے۔

اس سے قبل پروگرام کا آغاز محمد شاکر نے تلاوت کلام پاک سے کیا۔بعد ازاں مہمانوں کا پھولوں سے استقبال کیا گیا اور مہمانوں نے مل کر شمع روشن کی۔پروگرام کی صدارت کے فرائض صدر شعبۂ اردو اور معروف فکشن نگار پروفیسر اسلم جمشید پوری نے انجام دیے۔مہمانان خصوصی کے بطور سابق ڈین فیکلٹی آف آرٹس اور صدر شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی پروفیسر ارتضٰی کریم اور صدر شعبۂ لائبریری سائنس، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ پروفیسر جمال احمد صدیقی اور سابق کمشنر آر کے بھٹنا گر نے شرکت فرمائی جب کہ مہمانان مکرم کے بطور سماجی تنظیم وی کمٹ، میرٹھ کی بانی اور چیئر پرسن رما نہرو، جن وادی لیکھک سنگھ، میرٹھ کے چیئر مین ایڈوکیٹ منیش تیاگی، این اے ایس کالج میرٹھ کی ڈاکٹر پرگیہ پاٹھک موجود رہیں۔استقبالیہ کلمات ڈاکٹر شاداب علیم، نظامت ڈاکٹر آصف علی اور شکریے کی رسم اٹل سکسینہ نے ادا کی۔

اس موقع پر منشی پریم چند کی معروف کہانی ''بڑے گھر کی بیٹی'' کی قرأت ڈاکٹر ارشاد سیانوی اور آج کے معروف فکشن نگار پروفیسر اسلم جمشید پوری کی کہانی ''بڑے گھر کی چھوٹی بیٹی''

کی قرأت سیدہ مریم الٰہی نے کی۔

ان کہانیوں پر بولتے ہوئے پروفیسر گیتا یادو نے کہا کہ بڑے گھر کی بیٹی'' ایک لاجواب کہانی ہے۔جس دور کی یہ کہانی ہےاس دور میں انسانیت زندہ تھی اور بڑی سے بڑی خطا کو بھی معاف کر دیا جاتا تھا یہی اس کہانی میں بھی ہے۔ بڑے گھر کی بیٹی کی سوچ بھی بڑی تھی۔ پریم چند نے عورت کے دل کو خوب پڑھا۔لیکن پروفیسر اسلم جمشید پوری کی کہانی ''بڑے گھر کی چھوٹی بیٹی'' اچھی کہانی ہے۔لیکن اسلم صاحب پریم چند سے آگے نہیں بڑھ پائے ہیں حالانکہ آج اگر پریم چند ہوتے تو شاید کہانی کا آخر کچھ اور ہوتا۔ کیونکہ کب تک معافی کا سلسلہ چلے گا۔ مجرم کو کیفر کردار تک پہنچانا بھی لازمی ہے۔لیکن یہ ضرور کہوں گی کہ یہ کہانی بھی خاندان کو لے کر چلنے والی کہانی ہے۔

ڈاکٹر پرگیہ پاٹھک نے کہا کہ پریم چند ہمیشہ ہی اپنے سماج سے کنکٹ رہے ہیں۔ جہاں کوئی شخص بھی ظلم کا شکار ہوا ہے پریم چند نے اس کی آواز بہت عمدہ انداز میں اٹھائی ہے۔ پریم چند کی عصری معنویت ہر دور میں برقرار رہے گی۔منشی پریم چند کی بہت سی کہانیاں ایسی ہیں جن میں فنی چابکدستی اور عمدہ اسلوب دکھائی دیتا ہے۔ پریم چند کے فن پر گفتگو کرنا آج کے عہد میں اس لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ انہوں نے آج کے مسائل کو بہت پہلے محسوس کرتے ہوئے یعنی اپنے زمانے میں ہی ایسا ادب تخلیق کیا جس کو ہم کسی بھی قیمت پر نظر انداز نہیں کر سکتے۔

ڈاکٹر رام گوپال بھارتیہ نے کہا کہ پریم چند نے دبے کچلے،مزدور۔مظلوم،اور خواتین کے مسائل کی زبردست نمائندگی کی۔حالانکہ آج بہت سے مصنفین ان کے راستے سے ہٹ گئے ہیں۔آج انسانیت ختم ہوتی جارہی ہے۔آج کا دور مطلبی دور ہے۔عہد حاضر میں پریم چند کی معنویت مزید بڑھ جاتی ہے۔

ایڈوکیٹ منیش تیاگی نے کہا کہ پریم چند نے سماج کے ہر ظلم کے خلاف آواز بلند کی۔ آج ہمیں ہندو اور مسلمان ہونے کی ضرورت نہیں بلکہ انسان ہونے کی ضرورت ہے۔ ایک دوسرے کے درد کو سمجھنے کی ضرورت ہے اور آج پریم چند کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ظلم کے خلاف آواز اٹھانے کی ضرورت ہے۔ رما نہرو نے منشی پریم چند کی کہانیوں اور ناولوں پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ سماج کا کوئی بھی پہلوان سے اچھوتا نہیں رہا۔انہوں نے سماج کی ہر پریشانی کو محسوس کیا اور اسے قلم بند کیا۔ پریم چند نے جو ادب تخلیق کیا وا واقعی سماج کا آئینہ ہے۔آج ان کی تخلیقات کی

معنویت مزید بڑھ گئی ہے۔

پروفیسر جمال احمد صدیقی نے کہا کہ پریم چند پر بے شمار تحقیقی کام ہوئے ہیں اور مسلسل ہو رہے ہیں اور کام کسی اہم شخصیت پر ہی ہوتے ہیں میں صرف اتنا کہنا چاہوں گا کہ ہمیں چاہیے کہ ہم پریم چند کو زیادہ سے زیادہ پڑھیں۔ علاوہ ازیں پریم چند جتنے باہر مقبول تھے اتنا ہی وہ گھر میں بھی مقبول تھے۔

صدر شعبۂ اردو پروفیسر اسلم جمشید پوری نے کہا کہ آج منشی پریم چند کے فن پر بہت سی کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں اور کافی مواد بھی منشی پریم چند کے تعلق سے ہمیں آسانی سے دستیاب ہو جاتا ہے۔ لیکن آج بھی منشی پریم چند کی تصانیف کی اہمیت وافادیت برقرار ہے۔ ان کے ناول ہوں یا افسانے ہمیں سماج کا سچا آئینہ دکھاتے ہیں۔ انہوں نے انسانیت کے تن مردہ کی جڑوں کو سینچنے کا فریضہ انجام دیا ہے۔۔ انہوں نے اپنے عہد کے مسائل، مصیبت اور تکالیف کو جو برداشت کیا وہی لکھا اور آنے والی نسلوں کو راہ دکھائی۔

☆☆☆

ہمارے ادبی اور ثقافتی ورثے کو زندہ رکھنے کے لیے اس طرح کی تقریبات ضروری ہیں: ڈاکٹر بھٹنا گر

بھارت بھوشن کے گیتوں میں عام انسانوں کا درد ہے۔ پروفیسر اسلم جمشید پوری

شعبۂ اردو میں بھارت بھوشن کے یوم پیدائش کے موقع پر'ایک شام بھارت بھوشن کے نام'

شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ میں تین ناولوں کی رسم اجراء

میرٹھ 07/جولائی 2023ء

ہمارے ادبی اور ثقافتی ورثے کو زندہ رکھنے کے لیے اس طرح کی تقریبات ضروری ہیں۔ ایسی تقریبات سے اتحاد و یکتا کی جڑیں مضبوط ہوتی ہیں۔ آپسی بھائی چارہ بڑھتا ہے اور ساتھ ہی ایسی تقریبات سے زبانیں بھی فروغ پاتی ہیں۔ یہ الفاظ تھے سابق کمشنر اور معروف سماجی کارکن ڈاکٹر بھٹنا گر کے جو شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، انڈین نیشنل ٹرسٹ فار آرٹ اینڈ کلچر ہیریٹیج اور انتر راشٹریہ ساہتیہ کلا منچ کے اشتراک سے بھارت بھوشن کی یوم پیدائش کے موقع پر منعقد ہو رہے'ایک شام بھارت بھوشن کے نام' پروگرام میں اپنی صدارتی تقریر کے دوران ادا کر رہے تھے۔

اس سے قبل پروگرام کا آغاز نوجوان شاعر اور نغمہ نگار پرشانت دکشت نے سرسوتی وندنا

سے کیا۔ پروگرام کی سر پرستی ڈین فیکلٹی آف آرٹس اور صدر شعبۂ ہندی پروفیسر نوین چندلوہنی، صدر شعبۂ اردو پروفیسر اسلم جمشید پوری، معروف شاعر کوشل کمار اور شاعرہ میرا شلبھ نے فرمائی۔ صدارت کے فرائض معروف سماجی کارکن اور سابق کمشنر ڈاکٹر بھٹنا گر نے ادا کیے۔ مہمانوں کا پھولوں کے ذریعے استقبال کیا گیا۔ نظامت کے فرائض معروف شاعر ڈاکٹر رام گوپال بھارتیہ اور شکریے کی رسم جنرل سیکریٹری چندر شیکھر میور نے کیا اور قومی ترانے پر پروگرام اختتام پذیر ہوا۔

پروگرام میں تین کتابوں، ڈاکٹر رام گوپال بھارتیہ کا ناول 26 جنوری، ڈاکٹر الکا وششٹھ کی نئی کتاب 'دلت ومرش' اور برج کشور راہ گیر کے گیتوں کا مجموعہ 'پیر کو اپنا پن دو' کا اجراء بھی مہمانان کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ ان کتابوں پر معروف نقاد شاہدا ے چودھری نے پرمغز تبصرہ پیش کیا۔

اس موقع پر شعبے کے پریم چند سیمینار ہال میں دور دراز سے آئے ہندی گیت پریمیوں کو مخاطب کرتے ہوئے معروف کوی کوشل کمار نے بھارت بھوشن کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ بھارت بھوشن ایک عظیم فن کار تھے۔ انہوں نے اپنے گیتوں کے ذریعے ہر خاص و عام لوگوں کے دلوں میں اپنی جگہ بنائی اور میرٹھ کا نام پوری دنیا میں روشن کیا۔ وہ اپنے گیتوں میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

صدر شعبۂ اردو پروفیسر اسلم جمشید پوری نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ بھارت بھوشن جی مجھے بہت پیار کرتے تھے اور شعبۂ اردو کو یہ فخر حاصل ہے کہ ہم نے پریاس میگزین میں ان کے بہت سے گیتوں کو جگہ دی اور ساتھ ہی شعبے نے انہیں اعزاز سے بھی نوازا۔ وہ عظیم فن کار تھے۔ ان کے گیتوں میں عام انسانوں کا درد تھا۔ آج جن تین کتابوں کا اجراء عمل میں آیا وہ تینوں کتابیں عمدہ کتابیں ہیں اور میں چاہوں گا کہ ہمارے طالب علم ان کتابوں کا ضرور مطالعہ کریں۔ ڈاکٹر الکا وششٹھ نے دلت ومرش میں دلتوں کے سارے درد کو سمیٹ دیا ہے۔ انہوں نے دلتوں کے ہر موضوع کو چھوا ہے۔ 26 جنوری میں دیش بھگتی نہیں ملے گی۔ لیکن دوسری بہت سی اہم چیزیں اس میں شامل ہیں۔ اسی طرح برج کشور راہ گیر کے گیتوں کا مجموعہ 'پیر کو اپنا پن دو' کے گیت بہت عمدہ ہیں اور واقعی انہوں نے اپنے گیتوں سے بھارت بھوشن کو سچا خراج پیش کیا ہے۔ میں تینوں ہی مصنفین کو دل کی گہرائیوں سے مبارک باد دیتا ہوں۔

پروگرام سے محترم سکسینہ، سابق جسٹس راجیش چندرا، کنوینز آنند جوہری، پروفیسر نوین چندلوہنی، پروفیسر وکاس شرما، آدرشنی شریواستو، میرا شلبھ،، معروف شاعر کشن سوروپ نے خطاب کیا۔

پروگرام کے دوسرے سیشن میں نغمہ نگاروں کی طرف سے نہایت رسیلی کمپوزیشن پیش کی گئی جس پر سامعین مسحور ہو گئے۔

پروگرام میں ڈاکٹر ایشور چند گمبھیر، غزل نگار اونکار گلشن، ڈاکٹر سدھاکر، امید پرست، ڈاکٹر آصف علی، ستیہ پال ستیم، سمنیش سمن، چرن سنگھ سوامی، ڈاکٹر سبودھ گرگ، سلطان سنگھ، ڈاکٹر اے کے گاندھی، جی سی شرما، کرنل اے کے تیاگی، نیلم مشرا، کویتا مادھور، ڈاکٹر انجو سنگھ، ڈاکٹر ریچو پنوار، منگل سنگھ، اجیت سنگھ، سشما سویرا، ڈاکٹر وجے پنڈت، پونم پنڈت اور کثیر تعداد میں طلبہ وطالبات موجود رہے۔

☆☆☆

میرٹھ ڈرامے کے میدان میں مسلسل ترقی کی راہ پر گامزن ہے: ڈاکٹر معراج الدین

اُپٹا، کی رنگ منچ کی دنیا کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کی بہترین کوشش کی ہے: پروفیسر اسلم جمشید پوری

شعبۂ اردو، سی سی ایس یو اور اُپٹا کے مشترکہ اہتمام میں ڈراما ''داروغہ جی چوری ہوگئی'' کا انعقاد

میرٹھ 10 / جون 2023ء

آج یہاں اٹل بہاری واجپئی آڈیٹوریم، واقع چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی میں شعبۂ اردو اور یونائیٹڈ پروگریسیو تھیٹر ایسوسی ایشن (UPTA) کے مشترکہ اہتمام میں مزاحیہ ڈراما ''داروغہ جی چوری ہوگئی'' اسٹیج کیا گیا جس کو ناظرین نے خوب پسند کیا اور تالیوں کی گڑگڑاہٹ سے اراکین ڈرامہ اور اداکاروں کو حوصلہ بخشا۔ ڈرامہ ''داروغہ جی چوری ہوگئی'' معروف ڈراما نگار جئے وردھن کا تحریر کردہ ڈراما ہے جس کا ڈائریکشن بھارت بھوشن شرما نے کیا۔

ڈراما کی کہانی ایک کلرک کے یہاں ہوئی چوری اور داروغہ کی تفتیش کے اردگرد گھومتی ہے۔ کلرک 20 ہزار کی چوری کو 50 ہزار کی بتا کر تھانے میں رپورٹ درج کرا دیتا ہے۔ اخبارات میں خبر شائع ہونے کے بعد چور پریشان ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اس کا پاٹنر اس سے نصف رقم کا مطالبہ کر دیتا ہے۔ پریشان طالب علم جو بی ٹیک کا اسٹوڈینٹ ہے کلرک کے گھر پہنچ کر اسے کہتا ہے کہ پاٹنر کو حقیقت بتا دے ورنہ وہ مصیبت میں پڑ جائے گا۔ کہاں سے دے گا اپنے ساتھی کو پچیس ہزار روپے۔ داروغہ کے ذریعے تحقیقات اور پڑوس میں ہی رہ رہے ایک لڑکے جو سی آئی ڈی سیریل دیکھ کر واردات کے بارے میں اندازہ لگاتا ہے کو بڑے ہی مضحکہ خیز اور مزاحیہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

ڈرامے میں انل شرما، سمر سیما، پوجا اور اجول سنگھ نے کمال کی اداکاری کی ہے اور شائقین کو تالیا بجانے پر مجبور کر دیا ہے۔ بھارت بھوشن کے چست ڈائریکشن نے ڈرامے کو بہت متاثر کن بنا دیا ہے۔ ابیر بھاردواج کی موسیقی، عابد سیفی اور لوی سیفی کے میک اپ نے ڈرامے میں جان ڈال دی ہے۔

اس سے قبل پروگرام کا آغاز مہمانان نے شمع روشن کر کے کیا۔اس موقع پر مہمانان خصوصی کی حیثیت سے سابق وزیرحکومت اتر پردیش ڈاکٹرمعراج الدین اورسابق وزیر پربھودیال بالمیکی اور صدر شعبۂ اردو پروفیسر اسلم جمشید پوری نے شرکت کی اور مہمانان اعزازی کے بطور ایڈوکیٹ مہیش تیاگی، ڈاکٹر آصف، علی، ڈاکٹر شاداب علیم اور ڈاکٹر الکا وششٹھ نے شرکت کی۔ پروگرام کی نظامت کے فرائض ونودکمار بے چین نے انجام دیے۔

اس موقع پر سماجی خدمات کے لیے سینئر رپورٹر وبھوتی رستوگی (خبر آج تک) اتر پردیش مزدور کانگریس کے صدر صفائی ملازمین لیڈر سبھاش چند چاوریا اور کلب 60 کے بانی سماجی کارکن مہیش چند رستوگی کو اُپٹا مخصوص خدمات 2023 اعزاز سے سرفراز کیا گیا۔

اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے پروفیسر اسلم جمشید پوری نے کہا کہ یونائٹیڈ پروگریسیو تھیٹر ایسوسی ایشن، میرٹھ کی ان کامیاب پیش کشوں نے، میرٹھ کی رنگ منچ کی دنیا کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کی بہترین کوشش کی ہے۔ سماجی مسائل پر مبنی مختلف ڈرامے پیش کر کے تہذیبی وراثت اور اخلاقی قدروں کو فروغ دینے کا کارنامہ انجام دیا ہے۔عوام کی اس پسندیدگی نے ہمیں حوصلہ عطا کرنے کے ساتھ اس تحریک کو جاری رکھنے کی ترغیب دی ہے۔

اس موقع پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے ڈاکٹر معراج نے کہا کہ میرٹھ ڈرامے کے میدان میں مسلسل ترقی کی راہ پر گامزن ہے اور آج کا ڈراما بہت خوب رہا اور سبھی اداکاروں نے بہترین اداکاری کی۔ان کا مستقبل شاندار ہے۔بہترین ڈراما کے لیے پوری ٹیم کو مبارک باد۔

اس موقع پر سریندر شرما، روپالی گپتا، درپن جین، ہمانشو لودھی، سنیل روہتگی، شاداب ویٹوی گل فراز خان اور کثیر تعداد میں طلبہ وطالبات موجود رہے۔

☆☆☆

طلبا اپنی زندگی کی قیمت کو سمجھتے ہوئے وقت کا صحیح استعمال کریں: پروفیسر اسلم جمشید پوری

الوداعیہ کی یہ تقریب زندگی کے ایک باب کی تکمیل کی علامت ہے: ڈاکٹر آصف علی

شعبۂ اردو، سی سی ایس یونیورسٹی میں الوداعی تقریب کا انعقاد

میرٹھ 20 رمئی 2023ء

اس میں کسی طرح کا شبہ نہیں کہ طلبا کی یہ عمر ہی پر جوش اور نئی امنگوں سے پُر ہوتی ہے اور اس میں ایک منفرد قسم کا اعتماد، چستی پھرتی ہوتی ہے۔ ذہانت کے اعتبار سے بھی بلندیوں پر ہوتا ہے۔بس ضرورت ہے آپ کو اپنی اسی قابلیت کو سمجھنے کی۔ یہ الفاظ تھے صدر شعبۂ اردو پروفیسر اسلم جمشید پوری کے جو پریم چند سیمینار ہال میں منعقد طلبا کی الوداعی تقریب میں اپنے صدارتی خطبے

میں ادا کر رہے تھے۔انہوں نے مزید کہا کہ اس عمر میں زیادہ تر بچے خواہشات اور خواب دیکھنے میں مگن رہتے ہیں مگر میں آپ سے امید رکھتا ہوں کہ آپ زندگی کی قیمت کو سمجھتے ہوئے وقت کا صحیح استعمال کریں گے اور پوری محنت اور لگن سے پڑھائی کرتے ہوئے اچھے نمبروں سے اپنا امتحان پاس کر کے اپنی تعلیم کا مثبت انداز میں استعمال کرتے ہوئے اپنے اساتذہ، خاندان، یونیورسٹی اور ملک وقوم کا نام روشن کرتے ہوئے بہترین اور شاندار مستقبل کی طرف گامزن ہوں گے۔

اس سے قبل پروگرام کا آغاز ایم اے سال اول کے طالب علم فاروق شیروانی نے تلاوت کلام پاک سے کیا۔ بعد ازاں ہدیۂ نعت عرشی ،نغمہ سعید احمد سہارنپوری اور خوبصورت نظامت کے فرائض ایم اے سال اول کی طالبہ عظمیٰ پروین نے ادا کیے۔پروگرام میں محمد عمران، دلکش، شبانہ، نایاب، الینا، روضہ، شفا، فرح ناز، نوازش نے مختلف پروگرام پیش کیے۔جن کو ناظرین نے خوب سراہا۔

اس موقع پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے ڈاکٹر آصف علی نے کہا کہ آج کی یہ تقریب اس بات کی علامت ہے کہ آج آپ کی زندگی کا ایک باب مکمل اور دوسرے باب کا آغاز ہے۔کیونکہ ایم اے کی ڈگری عالمی سطح پر روایتی تدریس کی اعلیٰ ڈگری ہے۔اس کے بعد حاصل کی جانے والی ڈگریاں آپ کے مستقبل اور آپ کی عملی زندگی کو تابناک بنانے کا وسیلہ ہوتی ہیں۔گویا آج کے بعد سے آپ کو اپنی عملی زندگی کی شروعات کرنی ہے۔اس سلسلے میں اقبال کا یہ شعر عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی آپ کی بھرپور رہنمائی کرے گا۔اگر اقبال کے اس پیغام کو آپنے عملی زندگی میں اتار لیا تو یقیناً آپ نہ صرف کامیاب ہوں گے بلکہ اپنے اہل خانہ، اساتذہ، یونیورسٹی اور قوم وملت کا نام روشن کریں گے۔الوداعیہ کی یہ تقریب زندگی کے ایک باب کی تکمیل کی علامت ہے۔

ڈاکٹر شاداب علیم نے کہا کہ واقعی آج کا دن بہت جذباتی ہے۔نہ صرف بچوں کو اپنے اساتذہ سے لگاؤ، محبت ہو جاتی ہے بلکہ اساتذہ کی کیفیت بھی یہی ہوتی ہے۔اسے بھی اپنے ہر طالب علم سے لگاؤ ہو جاتا ہے۔لیکن اس الوداعی گھڑی کو آنا ہی ہوتا ہے، کیونکہ ان کا بہتر مستقبل بانہیں پھیلائے ان کے استقبال کے لیے تیار رہتا ہے۔مجھے اپنے طالب علموں پر پورا بھروسہ ہے کہ وہ پوری محنت، ایمانداری، سچائی اور لگن سے عملی زندگی میں قدم رکھیں گے اور اپنا، والدین کا، شعبے کا اور اپنے اساتذہ کا نام روشن کریں گے۔

معروف افسانہ نگار و مشہور فکشن ناقد

اور

(صدر شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ)

کی

کی نئی تنقیدی کتاب

"فکشن تنقید پر ایک نظر"

صفحات 784

قیمت 1200/روپے

اور

پانچواں افسانوی مجموعہ

"شکوہ جواب شکوہ"

[قرآنی واقعات اور حیاتِ محمدؐ پر مبنی افسانے]

صفحات 176

قیمت 300

ملنے کا پتہ: شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ

موبائل نمبر: 8279907070

☆☆☆

यूजीसी केयर लिस्टेड

हमारी आवाज़

मुख्य सम्पादक

प्रो. असलम जमशेदपुरी

प्रकाशन वर्ष : 2023

उर्दू विभाग

चौधरी चरण सिंह विश्वविद्यालय, मेरठ।

संयुक्त अंक : 2023

ISSN : 2394-7381

हमारी आवाज

यूजीसी केयर लिस्ट में शामिल जर्नल

जुलाई—दिसम्बर 2023 तक

संरक्षक : प्रो. संगीता शुक्ला

उपसंरक्षक : प्रो. संजीव कुमार शर्मा

मुख्य संपादक : प्रो. असलम जमशेदपुरी

संपादिका : डॉ. अलका वशिष्ठ

निगराँ : डॉ. आसिफ अली, डॉ. शादाब अलीम

सलाहकार : डॉ. इरशाद स्यानवी

संपादकीय मंडल : इरफान, आरिफ, माहेआलम, उजमा सहर, शहनाज परवीन, सईदा मरियम इलाही, इलमा नसीब (शोधार्थी), मो. तलहा (एम. ए. द्वितीय वर्ष), मो. साजिद रब्बानी (एम. ए. प्रथम वर्ष)

कानूनी सलाहकार : प्रो. अंजलि मित्तल (डीन फैकल्टी ऑफ लॉ, सीसीएसयू), डॉ. मुहम्मद शुएब एडवोकेट

विशेषज्ञगण : प्रो. युसूफ आमिर (जामिया अजहर मिस्र), प्रो. इरतिजा करीम (उर्दू विभाग, दिल्ली यूनिवर्सिटी), प्रो. मोहम्मद गुलाम रब्बानी (ढाका यूनिवर्सिटी, बांग्लादेश), प्रो. नसीरा बसरी (जयपुर), प्रो. कौसर मजहरी (जामिया मिलिया इस्लामिया, दिल्ली), प्रो. कुद्दूस जावेद (कश्मीर यूनिवर्सिटी)

शब्द-संयोजक : सईद अहमद सहारनपुरी, मुहम्मद शमशाद।

प्रकाशक

रवि पब्लिकेशन्स

33, हरी नगर, मेरठ-250 002

मो.न. : 7906491408

Email-a2zcomputerbooks@yahoo.co.in

विवरणिका

क्र.सं	विषय	पृष्ठ
1.	मुख्य संरक्षक की ओर से—प्रो. संगीता शुक्ला	04
2.	मुख्य संपादक की कलम से—प्रो. असलम जमशेदपुरी	05
3.	संपादकीय—डॉ. अलका वशिष्ठ	07

लेख

1.	ग़ज़ल का आफ़ताब सियासत का इमाम हैरां काश्मीरी—शाहिद चौधरी	08
2.	साम्प्रदायिक दंगों का इतिहास (सवतंत्र भारत के संदर्भ में)—डॉ. सिरिल गोरन	13
3.	मानव संसाधन के वितरण एवं घनत्व में सहसम्बन्ध का विकासखण्ड हस्तिनापुर में एक भौगोलिक अध्ययन—डॉ. शालू	19
4.	नई शिक्षा नीति 2020—भारतीय उच्चतम शिक्षा हेतु एक नया और भविष्योन्मुखी दृष्टिकोण—डॉ. कुमुद रानी	25
5.	आर्थिक विकास का कृषि पर प्रभावः जनपद गाजियाबाद का अध्ययन—डॉ. अनिता मलिक	30
6.	प्राचीन काल में भारतीय शिक्षा का ऐतिहासिक अध्ययन—डॉ. महीपाल सिंह	41
7.	भारती राजनीति एवं अल्पसंख्यक मुस्लिम युवा वर्ग—डॉ. जयवीर सिंह	46
8.	'बलाक बागपत में अग्रणी कृषय एवं खाद्यान्न उत्पादन का एक भौगोलिक अध्ययन'—डॉ. प्रवीन कुमार	50
9.	व्याख्या	59

चौधरी चरण सिंह विश्वविद्यालय, मेरठ–250 004 (उ० प्र०)

(NAAC A++ Accredited)

प्रोफेसर संगीता शुक्ला
डी०एस सी०
कुलपति

पत्रांक : एस०वी०सी० / 21 /1008

दिनांक : 11.12.2023

‘सन्देश’

यह जानकर अत्यंत प्रसन्नता हुई है कि चौधरी चरण सिंह विश्वविद्यालय मेरठ का उर्दू विभाग अपने विभाग की अर्धवार्षिक पत्रिका “हमारी आवाज़” का 23वां अंक (जुलाई–दिसम्बर, 2023) प्रकाशित कर रहा है। हर्ष का विषय यह भी है कि उर्दू विभाग का “हमारी आवाज” जर्नल यूजीसी केयर सूची में शामिल हो चुका है। इसके लिए और उर्दू विभाग को बहुत–बहुत बधाई है।

किसी विभाग की पत्रिका विभाग द्वारा वर्ष भर में छात्र–छात्राओं के व्यक्तित्व के विकास के लिए आयोजित विभिन्न कार्यक्रमों विहंगम वर्णन के माध्यम से विद्यार्थियों में नई उमंग एवं उत्साह का संचार करती है तथा उनकी सकारात्मक एवं सक्रियता के संवर्धन में महत्वपूर्ण भूमिका निभाती है।

विश्वास है कि यह पत्रिका छात्र–छात्राओं की सृजनात्मक प्रतिभा के निखार का अवसर प्रदान करने के साथ–साथ ज्ञानोपयोगी लेखों को प्रकाशित करेगी। विभाग द्वारा विद्यार्थियों के व्यक्तित्व के सर्वांगीण विकास की दिशा में किया जा रहा यह प्रयास सराहनीय है।

विश्वविद्यालय के उर्दू विभाग परिवार को पत्रिका के प्रकाशन हेतु शुभकामनाएं।

(संगीता शुक्ला)

प्रो० असलम जमशेदपुरी
विभागाध्यक्ष, उर्दू विभाग,
चौधरी चरण सिंह विश्वविद्यालय,
मेरठ।

कुलपति आवास, विश्वविद्यालय परिसर, मेरठ–250 004 | कार्यालय : +91-0121-2760554, 2760551, फैक्स : 2762838 शिविर कार्यालय : +91-0121-2600066 फैक्स : 276057 | वैबसाइट : WWW.CCSUNIVERSITY.AC.IN ई–मेल : vc@ccsuniversity.ac.in

मुख्य संपादक की कलम से

'हमारी आवाज़' का नवीन संग्रह (जुलाई-दिसंबर 2023) आपकी सेवा में प्रस्तुत है। यह एक आम अंक है, लेकिन फिर भी इसमें एक छोटा-सा सर सैयद अहमद पर गोशा शामिल है। ज्ञात हो कि उर्दू विभाग लगभग 20 वर्षों से जर्नल **हमारी आवाज़** निकलता आ रहा है। अब तक इसके 23 अंक प्रकाशित हो चुके हैं। हमने कोशिश की है कि पश्चिमी उत्तर प्रदेश विशेष रूप से मेरठ और आस-पास के ऐसी शायरों और लेखकों, जिन पर काम नहीं हुआ है, उनको इस जर्नल के माध्यम से प्रकाश में लाया जा सके।

विगत वर्षों में हमने कई विशेषांक जैसे इंतजार हुसैन, हफ़ीज़ मेरठी, नई सदी की दो दहाइयों का उर्दू फिक्शन, गालिब और दबिस्तान-ए-मेरठ (शायरी) विशेषांक प्रकाशित किए हैं। यह खुशी की बात है कि हमारी आवाज जर्नल को वर्ष 2015 में ISSN 2394-7381 नम्बर मिल गया था और वर्ष 2021 में इसे यूजीसी द्वारा अपनी केयर लिस्ट में शामिल कर लिया गया था। हमें यह कहते हुए अत्यंत प्रसन्नता हो रही है कि चौधरी चरण सिंह विश्वविद्यालय, मेरठ के विभिन्न विभागों से पत्रिकाएँ और जर्नल प्रकाशित होते हैं लेकिन हमारी आवाज जर्नल विश्वविद्यालय का अकेला ऐसा जर्नल है, जो यूजीसी केयर लिस्ट में शामिल किया गया है।

यूँ तो इस अंक में जनाब आरिफ नकवी, जर्मनी, डॉ. आमना तहसीन, हैदराबाद, डॉ. कहकशां लतीफ, हैदराबाद, सिराज अनवर, महाराष्ट्र, डॉ. आजम अंसारी, लखनऊ, डॉ. आसिफ अली, डॉ. शादाब अलीम, डॉ. इरशाद स्यानवी, डॉ. जफर गुलजार और डॉ. शबिस्ता आस मोहम्मद के लेख एक शामिल हैं। कहानियों के भाग में डॉ. फरखंदा शमीम, कराची, डॉ. कहकशां परवीन, डॉ. परवेज शहरयार, मोहम्मद फरहत हुसैन साथ ही रुकैया जमाल के चार अफसानचे, तालिब जैदी, सैयद अतहरुद्दीन अतहर, नज़ीर मेरठी, आदिल रज़ा मंसूरी, रुबीना मीर और रुखसार मुज़फ़्फ़रनगरी की नज़्में और कौसर मजहरी, रोमाना रूमी, कराची, जफ़र इकबाल जफर, सैयद अहमद शमीम, रफ़िया, शबनम, आब्दी, रऊफ रज़ा, जमील मजहर स्यानवी, डॉ. जकी तारिक़, इशरत मुईन सीमा, डॉ फरियाद आरजू, डॉ. इरशाद अहमद शरर, सलीम अख़्तर सलीम, डॉ. मोहम्मद मुस्तमिर की ग़ज़लें भी शामिल हैं। साथ ही सर सैयद के गोशे में कई अहम लेख में सम्मिलित हैं।

बहुत दिनों के बाद **हमारी आवाज** जर्नल का आम अंक प्रकाशित हो रहा है। दरअसल, हम लोग उर्दू के साथ-साथ हिंदी की सेवा के लिए भी तत्पर हैं। आगे भी हमारा विचार **दबिस्तान-ए-मेरठ** (नस्र) और मशाहिर मेरठ विशेषांक निकालने का है। ताकि

हम मेरठ के लेखकों, कवियों, पत्रकारों, राजनीतिज्ञों और प्रसिद्ध व्यक्तियों, प्रसिद्ध इमारतों, ऐतिहासिक स्थलों आदि को अवाम के सामने ला सकें और साहित्य का एक ऐसा माहौल बनाया जाए जिसमें लेखक स्वतंत्र रूप से लिख सकें। उन पर किसी दृष्टिकोण का दबाव न हो। यूं भी उत्तरआधुनिकतावाद के बाद नयी शताब्दी में आधुनिक रुझानों ने अपनी जगह बनानी शुरू कर दी है। इसमें विशेष रूप से दलित विमर्श, अल्पसंख्यक विमर्श, कोलॉज तकनीक का प्रयोग साहित्य की गद्य विधाओं के साथ-साथ काव्य-विधाओं में भी हो रहा है। कोलॉज तकनीक पर भी नॉविल और कहानियाँ लिखी जा रही हैं। उर्दू शायरी और कथा-साहित्य में अल्पसंख्यक और दलितों पर होने वाले अत्याचार किसी से छुपे नहीं हैं। आज साहित्यकार समाज में होने वाली हर बेइंसाफी को न केवल अपनी रचनाओं में प्रस्तुत कर रहा है, बल्कि वो बेइंसाफी और जुल्म के खिलाफ़ आवाज़ भी बुलंद कर रहा है।

हमारी आवाज़ का यह अंक आपको कैसा लगा अपनी राय से ज़रूर अवगत करायें।

–प्रो. असलम जमशेदपुरी

संपादकीय

उर्दू विभाग, चौधरी चरण सिंह विश्वविद्यालय की विभागीय पत्रिका **हमारी आवाज़** का नवीन अंक भिन्न-भिन्न ज्ञानवर्द्धक विषयों पर आधारित अंक है। जिसे आपके समक्ष प्रस्तुत करते हुए अत्यंत हर्ष हो रहा है। उर्दू विभाग की सदैव यह कोशिश रही है कि विद्यार्थियों और पाठकों को ज्यादा-से-ज्यादा जानकारी भरे लेखों और विषयों से परिचित कराया जाए। परिणाम स्वरूप ज्ञानवर्द्धन कराने वाला यह सुंदर अंक आपके हाथों में है।

हर बार की तरह यह अंक भी हिंदी-उर्दू दोनों भाषाओं में प्रकाशित हुआ है। प्रस्तुत अंक के हिंदी संस्करण में मेरठ और मेरठ के आस-पास के क्षेत्रों जैसे—हस्तिनापुर, बागपत आदि के विषय में अत्यंत ज्ञानवर्द्धक सामग्री उपलब्ध कराने का प्रयास किया गया है। साथ ही नई शिक्षा नीति—2020 पर भी अत्यंत जानकारी भरा उपयोगी लेख प्रस्तुत किया गया है। इस अंक को आकर्षक एवं पठनीय बनाने में जिन लेखक-लेखिकाओं ने अपने शोध पत्रों, समीक्षाओं द्वारा हमारी सहायता की है, मैं उनका आभार व्यक्त करती हूँ। इस विशेषांक के संपादन में हमारे विभागाध्यक्ष प्रो. असलम जमशेदपुरी एवं अन्य साथी डॉ. आसिफ अली, डॉ. शादाब अलीम, डॉ. इरशाद अली ने कदम-कदम पर मेरी सहायता की है, जिसके लिए मैं उनको हार्दिक धन्यवाद ज्ञापित करती हूँ। सुंदर कंपोजिंग के लिए मुहम्मद शमशाद अहमद, सईद अहमद सहारनपुरी एवं छात्र-छात्राओं को धन्यवाद देती हूँ, जिनकी सहायता के बिना यह कार्य कठिन था।

पत्रिका का हिंदी भाग आपको कैसा लगा अपनी राय से अवश्य अवगत कराएँ।

—डॉ.अलका वशिष्ठ

1. ग़ज़ल का आफ़ताब सियासत का इमाम हैरां काश्मीरी

–शाहिद चौधरी

हैरां की शायरी में बला का सुरूर है

बेवजह हम किसी के तरफ़दार भी नहीं

सुरूर वो नशा होता है जो मुसलसल चढ़ता रहता है और ख़ुमार उतरता हुआ नशा होता है। वो शायरी ही क्या जिसका नशा उतर जाए। हैरां काश्मीरी की शायरी में वो सुरूर है जिसकी इंतिहा ख़ुमार नहीं। ये न आज की सियासत का जुमला है और न ही मुबालिगा। दरअसल, शायर दो क़िस्म के होते हैं-एक, फ़नकार, जो शायरी की फ़न्नी बारीकियों से वाकिफ़ होने के बायस अशआर तो मौजूं कर लेता है लेकिन उनमें अक्सर काफियापैमाई की कलाकारी ही होती है और मज़मून झूठ पर मबनी होते हैं। दूसरे वो शायर होते हैं जो बक़ौल फैज़ अहमद फैज़ 'परवरिश-ए-लौह-ओ-क़लम' करते हुए 'जो दिल पर गुजरती है' रक़म करते हैं। हैरां आख़िरी-उज़-ज़िक्र क़बील के शायर हैं। उन्होंने अपनी शायरी में ज़िंदगी की मसबत और रज़ाई क़ुव्वतों का इज़हार करके, नीज़ आपबीती को जगबीती बनाकर अपने शेर-ओ-शऊर की पुख़्तगी का सबूत दिया है। इसलिए उनकी शायरी का नशा सर चढ़कर बोलता है–

खाकेस्त्रे जज़्बात हूं और शोला फिशां हूं

ए दोस्त मैं खुद अपनी तमन्ना का धुआं हूं

लोगो! मुझे समझो क' मैं इस दौरे खिरद में

मिटती हुई तहज़ीब का धुंधला सा निशां हूं

पहली जंगे-अज़ीम के दौरान एक खानदान काश्मीर से मुन्तकिल होकर मेरठ के खैर नगर में बस गया। इसी खानदान में 1925 में एक लड़के का जन्म हुआ और उसे अब्दुल खालिक़ नाम दिया गया। 10 साल की उम्र तक अरबी, फारसी और उर्दू की इब्तदाई तालीम हासिल करने के बाद अब्दुल खालिक़ को दो स्कूलों–रफ़ा-ए-आम और फैज़-ए-आम में दाखिले दिलाए गए। लेकिन उनकी दिलचस्पी मनाज़रे और खेलकूद में ज़्यादा थी, इसलिए आठवीं जमाअत के बाद स्कूल को हमेशा के लिए अलविदा कहकर रफ़ूगरी और शायरी की अपनी खानदानी विरासत के मुहाफ़िज़ बन गए। अब्दुल खालिक़ के वालिद अब्दुल मलिक काश्मीरी 'अख्तर' तख़ल्लुस फरमाते थे और ज़रिया-ए-माश के लिए रफ़ूगिरी और ज़हन-ओ-क़ल्ब की तस्कीन के लिए शेरगोई किया करते थे। जंगे-आज़ादी के मुजाहिद उनके चचा फैज़ काश्मीरी भी शेर कहते थे। अस्तअज़ा में अपना अलग मक़ाम रखने वाले मुहम्मद यूसुफ सानी अब्दुल खालिक़ के नाना थे। इस

माहौल में यह मुमकिन न था कि अब्दुल खालिक़ को शायरी का रोग नहीं लगता। जब वह टूटे-फूटे मिसरे गिरह करने लगे तो उन्हें अल्लमा हकीम अहमद रशीद ज़ेबा के सुपुर्द कर दिया गया ताकि नोक-पलक दुरुस्त की जा सके। इस तरह अब्दुल खालिक़ हैरां काश्मीरी हो गए। कुछ अरसा बाद ज़ेबा ने हैरां को उनके मामूजाद भाई कौसर कुरैशी के हवाले कर दिया। कौसर के हैरां ऐसे मोतकिद हुए कि–

हज़रते कौसर से निस्बत है तो हैरां शेर में
हज़रते कौसर का कुछ रंगे-बयां आ ही गया।

हसास शायर के साथ ही हैरां मुखलिस सियासी व समाजी कारकुन भी थे। समाज में सियासी बेदारी के लिए वह 'नाहिद' नाम से एक हफ़्तावार अख़बार भी शाया किया करते थे, जिसकी हॉकर से लेकर मुदीर तक की तमामतर जिम्मेदारियां तन्हा उनके कांधों पर थी। लेकिन उनकी सियासी शऊर की पुख़्तगी नज़रियात तक महदूद न थी। इश्तराकियत से मुतास्सिर अपनी सियासी नज़रियात को अमली जामा पहनाने के लिए उनकी जद्दोजहद ताउम्र इस हद तक जारी रही कि जेल तक का सफ़र तय करना पड़ा–

जेल खाने में भी आना एक इज़्ज़त है मिरी
कू ब कू सहरा ब सहरा आज शुहरत है मिरी
क़ौम प' कुर्बान हो जाने में अज़मत है मिरी
हक़ को हक़ ही मैं कहूंगा इतनी जुर्रत है मिरी

दरअसल, हैरां की शख़्सियत में जो नुमायां खुसूसियात थीं, वही उनकी शायरी का तुर्रा-ए-इम्तियाज़ है। उनके दिल पर जो गुज़री उसे ही अशआर के पैकर में उन्होंने रकम किया। मसलन, तक़सीमें हिंद के बाद जब एक असरदार तबक़े ने उर्दू की ज़बरदस्त मुखालिफत शुरू की तो उर्दू के शैदा हैरां उर्दू के मज़बूत मुहाफ़िज़ बनकर उठे–

हर मुफलिसो मजबूर का हक़ मांग रहा हूं
क़ानून का दस्तूर का हक़ मांग रहा हूं
उर्दू कोई तहरीके बग़ावत नहीं हैरां
जम्हूर से जम्हूरका हक़ मांग रहा हूं।

उर्दू को उसका मुनासिब मक़ाम दिलाने के लिए हैरां दार तक जाने के लिए तैयार थे–

नाम से उर्दू के नफ़रत है तो नफ़रत ही सही
य' शरारत भी बअन्दाज़े शराफ़त ही सही

मैं तो हक़ बात सरे दार कहूंगा हैरां
आप कहते हैं बग़ावत तो बग़ावत ही सही।

लेकिन जब उर्दू पर ज़ुल्म जारी रहा तो हैरां के बर्दाश्त में ना था और उन्होंने एलानिया कहा—

फूलों के साथ या कभी बर्के तपां के साथ
रहता हूं इस चमन में बहारों खिजां के साथ
हैरां य' ज़ुल्म सह ना सकेगा मिरा ज़मीर
मेरी ज़बां भी काट लो उर्दू ज़बां के साथ।

हैरांके तीन मजमुआ-ए-कलाम मंज़रे आम पर आए, लेकिन अफ़सोस मुझे उनका एक मजमुआ 'निगारे-आतिश' और कुछ ग़ैर-मतबुआ कलाम ही देखने को मिला। इस मुख्तसर से सरमाये पर नज़र डालने से यह एहसास गोशगुज़ारहो गया कि हैरां अपनी फ़िक्र-ए-रसा की कमंद उर्दू की जुमला असनाफे सुखन पर कामयाबी के साथ डाली है। उनकी ग़ज़ल, नज़्म क़तअ और रुबाई के हवाले तो इस मज़मून में आ चुके हैं। अब एक गीत 'देख न जा' का एक बंद भी सुन लीजिए—

माना मैं आवारा शायर-नाकाम-ओ'-नाकारा शायर
मेरी आशा धन और दौलत, मैं बेकस बेचारा शायर
अपने निर्धन हैरां का संग छोड़ के साथी देख न जा

यह सिर्फ़ गीत ही नहीं है बल्कि हैरां की ज़िंदगी की तल्ख़ हक़ीक़त रही। दौलत और हैरां हमेशा ही नदी के दो किनारे रहे और टूटी हुई कश्ती कभी दरिया पार न कर सकी—

टूटी हुईकश्ती में दरिया का सफ़र कैसा
क्या पार उतरने तक तुम डूब ना जाओगे

ज़िंदगी में तल्खी भर देती है दौलत की कमी। हैरां में यक़ीनन ग़ज़ल का आफ़ताब और सियासत का इमाम बनने की सलाहियतें थीं, लेकिन उन्हें ख़ुद एहसास था कि मुफ़िलसी की वजह से उन्हें वह मक़ाम हासिल ना हो सका जिसके वह हक़दार थे—

लोग कहते हैं मुझे शायरे फ़ितरत लेकिन
मुझको हैरां मेरी गुरबत ने उबरने ना दिया

शायद इसी वजह से हैरां शीशे की दुकानों से परहेज़ करते थे–

तस्वीर दिखाती है य, मेरी ग़रीबी की
यूं बच के गुज़रता हूं शीशे की दुकानों से

इन अशआर से ज़ाहिर है कि हैरां ने अपनी ग़ज़लों में अपने ज़ाती तजुर्बे को अल्फ़ाज व बयान का पैकर अता किया है, लेकिन साथ ही उनमें असरी ज़िन्दगी के अलमनाक हालात की तस्वीरें भी हैं और उर्दू ग़ज़ल की रवायत का दामन भी नहीं छोड़ा गया है। इस बात का सबूत ये चंद शेर हैं–

रहमत ने बढ़ के ले लिया आग़ोश में मुझे
अक जुर्मे आशकी का खतावार देख कर
य, क्या खबर थी जलवा गहे दोस्त है यही
बैठा था मैं तो साया-ए-दीवार देखकर।
राज है खूनी दरिंदों जिधर भी जाइए
आदमी मिलता नहीं ढूंढे से भी संसार में
रुख प, ज़र्दी आंख में आंसू क़दम बहके हुए
ज़िंदा लाश फिर रही हैं कूचा-ओ-बाज़ार में।
क्या सिर्फ़ नुमाइश करने से तकमीले मुहब्बत होती हैं
एहसास भी सजदे करता है दिल से भी इबादत होती है
मैं आंखों ही आंखों में उन से रुदादे तमन्ना कहता हूं
कुछ उनका तक़ाज़ा होता है कुछ मेरी ज़रूरत होती है
जब रात ने गेसु फैलाये रूखसारे गुलेतर जलने लगा
य' बात मुझे मालूम न थी शबनम में हरारत होती है
तुम ज़माने से मिटा डालो मेरा नाम-ओ-निशां
हां यही होना है अंजामे वफ़ा मेरे लिए

बहरहाल, "तुमने हैरां को फ़क़त दूर से देखा यारो–हमने इस दौर के ख्य्याम से बातें की है।" हैरां से गुफ्तगू करते हुए मैंने पाया कि उनमें तज़ाद न था, जो दिल में था वही ज़बान पर और वही अमल में था। वो इंसान के किरदार में चार चीज़ों को ज़रूरी समझते

थे और मैं गवाह हूं कि वह अपने बनाए पैमाने पर खरे उतरते थे–

हक़ परस्ती साफ़गोई पाक नीयत और वक़ार
चार चीज़ें चाहिए इंसान के किरदार में

इनके अलावा मज़ाक और हाज़िर जवाबी भी उनकी शख्सियत के नुमायां पहलू थे। एक मर्तबा उन्होंने हफ़ीज़ मेरठी और दीगर दोस्तों को अपने दौलतकदे पर पाए की दावत पर मदु किया। मेहमान तो वक्ते मुक़र्रा पर हाज़िर हो गए, लेकिन किसी सियासी ज़रूरत की वजह से हैरां अपने घर मौजूद न थे। उनके इंतजार में दोपहर कहीं शाम ना हो जाए, बेगम हैरां ने मेहमानों की भूख का इंतजाम कर दिया। मेहमान जब खाने से फारिग़ हो चुके तो हैरां की वापसी हुई और उन्हें देखते ही हफ़ीज़ मेरठी बोले–"हैरां अब्बा हाय हाय, अब ना मिलेंगे पाए-वाए।" इस पर हैरां ने तपाक से जवाब दिया–"हफ़ीज़ भैया हाय हाय, पाए के बाद ना मिलेगी चाय-वाय।" और महफ़िल में ठहाका गूंज उठा–

एक ऐसी भी रात आती है
जिसमें सोना अज़ब होता है

हैरां की जिंदगी में वो रात 1994 में आई। वह काफ़ी अरसे से बीमार चल रहे थे लेकिन एक सच्चे पक्के मोमिन की तरह उन्हें मौत का कोई खौफ़ न था। मौत ज़िंदगी का इख्तिताम नहीं बल्कि महबूबे-हक़ीक़ी से मिलने का दरवाज़ा है। इसलिए एक मोमिन खंदाज़न होकर मौत का इस्तकबाल करता है–

जो मौत के ख्याल से दो-चार भी नहीं
ऐसी हयात का मैं तलबगार भी नहीं
माथे प' मौत का पसीना है आईना लाओ
हम ज़िंदगी की आखरी तस्वीर देखेंगे

14 जून, 1994 को हैरां ने कागज़ क़लम मांगकर एक शेर लिखा–"साथी गुल से टूट के पत्ता कोई गिरता है जब, मैं समझता हूं क, मेरी ज़िंदगी इतनी सी है।" और इसके आधा घंटे बाद हेरा काश्मीरी मुल्के-अदम के सफ़र पर निकल पड़े।

2. साम्प्रदायिक दंगों का इतिहास (स्वतंत्र भारत के संदर्भ में)

डॉ. सिरिल गोरन

इतिहास विभाग

आर.जी. (पी.जी.) कॉलेज, मेरठ

sirilgauran@gmail.com

सारांश

भारत देश की भूमि विभिन्न धर्मों सम्प्रदायों की जननी रही है। भारतीय संस्कृति मिली-जुली संस्कृति है क्योंकि बाहर से बहुत से धर्म यहां आये और यहां आकर बसे गये। सबसे पहले भारत में सिन्धु सभ्यता (हड़प्पा सभ्यता) अस्तित्व में आयी, उसके बाद आर्य लोग भारत आये आर्यों के बाद से अनेक जाति, समूह के लोग भारत आये। लगभग सात हजार वर्ष पूर्व कुछ किसान ईरान से भारत में आये और यहाँ आकर बस गये उसके बाद अनेक संस्कृतियां भारत में आयी और यहाँ आकर बसी, इसी में ही अंग्रेज भी भारत आये और उन्होंने इस सोने की चिड़ियां (भारत को पहले इस नाम से भी जाना जाता है) को खूब लूटा और फिर व्यापार द्वारा यहां पर अपनी बस्तियाँ बसायी और फिर देश का विभाजन कराकर वापिस अपने देश लौट गये। भारतीय संस्कृति मिश्रित संस्कृति है यहां बहुत-सी सभ्यता पनपी है, पली बढ़ी है। भारत विविध धर्मों की उपासना का केन्द्र है। इस्लाम में कहा गया कि मौहम्मद पैगम्बर को भारत भूमि से अध्यात्म की खुशबू आयी इसलिए उन्होंने इसे “दारूल अमन” (शान्ति की धरती) माना है।

प्रस्तावना

साम्प्रदायिकता का जन्म राजनीतिक, आर्थिक, सामाजिक, सांस्कृतिक आदि परिस्थितियों के कारण हुआ हैं। धर्म के अलग-अलग मामलों में राजनीति होने के कारण साम्प्रदायिकता का फैलाव हुआ है। देश के विभाजन के समय की अपेक्षा आज साम्प्रदायिकता का विष पूरे राष्ट्र में फैल गया है। साम्प्रदायिकता को सिर्फ समसामायिक, सामाजिक, धार्मिक और राजनीतिक सन्दर्भ में ही नहीं समझा जा सकता इसे समूचे तौर पर समझने के लिये समग्र दृष्टिकोण अपनाने की जरूरत है। राजा-महाराजा धर्मों के आधार पर बँटे हुये थे अपने राजनीतिक स्वार्थों और सामन्ती वर्चस्व के कारण ये आपस में लड़ते रहे। इसका कारण यह है—इस देश के हिन्दू को बताया गया कि हिन्दुओं का पतनकाल मुसलमानों के आगमन और आक्रमणों से शुरू हुआ नहीं तो भारतीय इतिहास में ‘हिन्दू-काल’ उनका स्वर्णकाल था। उसी तरह कट्टरपन्थी (मुस्लिम) यह मानते है कि मुस्लिम भारतीय इतिहास का स्वर्णयुग है, नहीं तो उनके आने से पहले तक भारत

अंधकार में डूबा हुआ था। मुसलमानों ने आकर उन्हें सभ्य एवं सम्पन्न बनाया। इस तरह का साम्प्रदायिक नजरिया इतिहास को तोड़-मरोड़ना ही नहीं बल्कि धार्मिक भावनाओं को भड़काना भी है। साम्प्रदायिकता का उद्देश्य अपने धर्म की रक्षा और सिर्फ अपनी जाति का विकास करना होना है। साम्प्रदायिक अनुयायी दूसरे धर्म के प्रति जहर फैलाने का काम करते है। भारत देश में विविध भाषा, जातियों के लोग रहते है अतः साम्प्रदायिकता हमारे राष्ट्रीय जीवन में एक चुनौती है। ऐसे व्यक्ति साम्प्रदायिक है जो देश की सुरक्षा, शन्ति और अखण्डता (एकता) को खतरे में डालते है। ईश्वर उपासना धार्मिक, तीर्थों के दर्शन, होम ध्वज, भजन, कीर्तन, धार्मिक पुस्तकें पढ़ने से कोई साम्प्रदायिकता उत्पन्न नहीं होती। हिन्दुत्व कोई धर्म नहीं है, यह जीवन की परिभाषाशैली है। इसी विचारशैली ने गौतमबुद्ध, महावीर स्वामी, चैतन्य महाप्रभु, शंकराचार्य, दयानन्द, विवेकानन्द, रामतीर्थ परमहंस जैसे महान आत्माओं को जन्म दिया। जब हिन्दू समाज की रचना गीता के उच्च आदर्शों पर हो जायेगी तो उसी दिन से वर्णभेद तो क्या धर्म और राष्ट्र के भेद भी खत्म हो जायेंगे। इस्लाम एक पंथ भी है और धर्म भी है। परन्तु हिन्दू धर्म केवल धर्म है व जीवन निर्वाह की एक पद्धति है। वास्तव में भारत में अधिकांश मुस्लिम वहीं है जो पहले हिन्दू हुआ करते थे, क्योंकि भारत में इस्लाम सूफी सन्तों के द्वारा, व्यापार के द्वारा और मुगलों की खराब नीतियों के कारण फैला। जबरन धर्म परिवर्तन करके इस्लाम को बढ़ाया गया जो उस समय की स्थिति रही होगी वैसे भारत में सूफी-सन्तों ने इस्लाम का प्रचार शान्तिपूर्वक करना चाहा वे जबरदस्ती किसी को मुस्लिम बनाने के पक्ष में नहीं थे। ऐसे ही ईसाई धर्म भारत में आया लेकिन वे भारत में व्यापार के साथ बसने व ईसाईयों की संख्या बढ़ाने के उद्देश्य से भारत आया।

साम्प्रदायिक दंगों का प्रारम्भिक चरण

राष्ट्रीय आन्दोलन के प्रारम्भिक दिनों में चार विचारधाराओं का उदय हुआ। उदारवाद, उग्रवाद, आतंकवाद तथा सम्प्रदायवाद। सम्प्रदायवाद का प्रभाव सम्पूर्ण राष्ट्रीय आन्दोलन पर दिखाई दिया। मुस्लिम सम्प्रदाय का उदय राष्ट्रीय आन्दोलन के प्रारम्भिक चरण में हुआ। सन् 1857 के असफल विद्रोह के पश्चात् अधिक समय तक देश में राजनीतिक गतिविधियां शान्त रही भारत के दोनों ही बड़े सम्प्रदाय हिन्दू और मुस्लिम अपने आप को नई व्यवस्था में ढालने के लिये प्रयत्नशील हो गये। हिन्दु जो सामाजिक व्यवस्था में अत्यन्त लचीले थे, शीघ्र ही स्वयं को नई परिस्थिति में परिवर्तित कर लिये, परन्तु मुस्लिम ऐसा न कर सके और इस कारण हिन्दुओं ने मुस्लिम वर्ग से अधिक शिक्षा और नई राजनीतिक व्यवस्था का लाभ उठा लिया। इससे दोनों सम्प्रदायों में प्रतिद्वन्द्विता उत्पन्न हो गई मुस्लिमों की स्थिति सुधारने के लिये सर सैय्यद अहमद ने ब्रिटिश सरकार

से सहयोग एवं भारतीय राष्ट्रीय कांग्रेस का विरोध करना प्रारम्भ किया। ऐसा करने में उनका दृष्टिकोण घोर साम्प्रदायिकतावादी था। सर सैय्यद अहमद का दृष्टिकोण पाश्चात्य शिक्षा के प्रति उदार था। उन्होंने कहा भारत के लिये प्रजातन्त्र पूर्णतः अनुपयुक्त था। यह विचार की प्रतिनिधि संस्थाएं केवल उन देशों के लिये उपयुक्त होती है, जिनकी जनसंख्या में एकरूपता हो। भारत में जहाँ विभिन्न जाति व धर्म के लोग रहते है, प्रतिनिधि संस्थाएं सामाजिक व राजनीति ढांचे को खतरे में डाले बिना स्थापित नहीं की जा सकती।

ब्रिटिश सरकार की स्थापना से पूर्व कई सदियों तक भारत में मुस्लिमों का आधिपत्य था। अधिकांश मुस्लिम जो बाहर से आये थे, वे भारत में ही बस गये। इन्होंने हिन्दुओं का धर्म परिवर्तन कर अपनी जनसंख्या भी बढ़ायी। शनैः शनैः वे हिन्दू समाज में घुल-मिल गये एवं प्राचीन सभ्यता व संस्कृति में अपना योगदान दिया। दोनों सम्प्रदायों के रहन-सहन एवं रीति-रिवाजों में काफी समानता आ गयी। अंग्रेजों के आगमन से पूर्व भारत में मुस्लिमों का शासनकाल था, अतः अंग्रेजों का मुस्लिमों से विद्वेष स्वाभाविक था। अंग्रेजों ने हर सम्भव तरीके से मुस्लिमों का दमन करने का निश्चय किया एवं हिन्दुओं का पक्ष लेना आरम्भ कर दिया, मुस्लिमों को जान-बूझकर सरकारी पदों से वंचित रखा गया। हिन्दुओं को पश्चिमी शिक्षा दी गई। मुस्लिम वर्ग ने इस शिक्षा का विरोध किया। जिस कारण मुस्लिम शैक्षिक व सामाजिक क्षेत्र में पिछड़ गये। न्यायालय की भाषा अंग्रेजी कर दी गयी जो पहले अरबी या फारसी हुआ करती थी। सर सैय्यद अहमद खाँ ऐसे प्रथम व्यक्ति थे जिन्होंने इस बात पर बल दिया कि भारत एक देश नहीं बल्कि उपमहाद्वीप है।

भारत में साम्प्रदायिक तनाव उत्पन्न करने में सर सैय्यद अहमद खाँ की अहम् भूमिका रही। उन्होंने मुस्लिमों को कांग्रेस के राष्ट्रीय आन्दोलनों से पृथक रहने की सलाह दी, क्योंकि कांग्रेस का आन्दोलन हथियार विहीन एक गृहयुद्ध था। कांग्रेस का विरोध करने का अभिप्राय यह था कि यदि भारत में चुनावों को सहायता दी गई तो सरकार में हिन्दुओं का बहुमत हो जायेगा। प्रतियोगी परीक्षाओं का विरोध इस आधार पर किया कि मुसलमानों के लिये प्रतियोगी परीक्षा में उर्दू व फारसी का प्रयोग करने की अनुमति प्रदान की जाये। सर सैय्यद अहमद पहले भारतीय थे जिन्होंने मुसलमानों के अन्दर भय उत्पन्न कर दिया कि उन्हें हिन्दुओं से खतरा है। जबकि वास्तविकता यह थी कि 'मुसलमानों को प्रत्येक क्षेत्र में समान अवसर प्राप्त थे। सन् 1880 में धार्मिक कट्टरता के कारण हिन्दू-मुस्लिम तनाव बढ़ गया।

इतिहासकार का मानना है भारत में इस्लाम के आगमन से भारतीय समाज का विभाजन हो गया। इस्लाम ने भारतीय समाज को ऊपर ने नीचे तक दो स्पष्ट विरोधी समाज में विभक्त किया। दो सम्प्रदाय एक-दूसरे से भिन्न ही नहीं, अपितु एक-दूसरे के

विरोधी भी थे। जबकि 1857 की क्रान्ति से पूर्व दोनों के बीच मधुर सम्बन्ध थे। अंग्रेजों ने अपने व्यापार और राज करने के हिन्दू-मुस्लिम में फूट डाला। बंगाल विभाजन जो 1905 में हुआ था। बंगाल के मुसलमानों ने बंगाल विभाजन का स्वागत किया। पूर्वी बंगाल में जहाँ-जहाँ मुसलमान बहुसंख्यक थे वहाँ उन्होंने बंगाल-विभाजन पर हर्ष व्यक्त किया। मुसलमानों का कहना था कि पश्चिमी बंगाल का शिक्षित उच्च वर्ग सरकारी सेवाओं, वाणिज्य शिक्षा एवं अन्य व्यवसायों पर अपना पूर्ण अधिपत्य स्थापित किये हुये था। इसलिये पूर्वी बंगाल के मुसलमान विभाजन को वरदान मानते थे। परन्तु जब बंगाल विभाजन की समाप्ति का समाचार मुसलमानों तक पहुँचा तो उनमें बहुत निराशा हुई। उनको लगा कि अंग्रेजों ने उन्हें धोखा दिया।

विकार-उल-मुल्क ने 1906 में मुस्लिम लीग के अधिवेशन का उद्घाटन भाषण दिया जिसमें मुस्लिम लीग के बनने के कारणों पर प्रकाश डालते हुये कहा—"भविष्य में जब ब्रिटिश सरकार का भारत से शासन समाप्त हो जायेगा, तो देश का शासन हिन्दू समुदाय के हाथों में चला जायेगा जो संख्या में हमसे चार गुना अधिक है। तब हमारा जीवन, सम्पत्ति, सम्मान एवं हमारा धर्म खतरे में होगा। जब अंग्रेज अपनी प्रजा की रक्षा कर रहे है उस समय भी हमें अपने हितों की रक्षा के लिये बहुत कठिनाई होती है। जब शासन हमारे पड़ोसियों के हाथ में आ जायेगा तो हमें अपने पूर्वजों के कृत्यों का भी जवाब देना पड़ेगा। इसलिये हमें अपने हितों की रक्षा करने के लिये अंग्रेजी सरकार से पूर्ण सहयोग प्राप्त करना होगा। कांग्रेस को भी सरकार का विरोध करना छोड़ देना चाहिए। यदि कांग्रेस सरकार का विरोध करना नहीं छोड़ती है, तो कांग्रेस राजनीतिज्ञों की इस विरोधी प्रवृत्ति का मुसलमानों को मुकाबला करना होगा और ऐसा करने में मुसलमान केवल शब्द का ही प्रयोग नहीं करेगें।

मुस्लिम लीग की स्थापना साम्प्रदायिक घृणा के आधार पर हुई। मुसलमान किसी ऐसे संगठन के साथ नहीं रहना चाहते थे जिसमें हिन्दू-मुस्लिम साथ रह सके। मुसलमानों ने एक "लाल इश्तहार" प्रकाशित किया जिसमें हिन्दूओं के प्रति बड़ी उत्तेजक बातें कही गयी थी इसमें प्रकाशित किया गया कि 'मुसलमानों के पतन का कारण हिन्दुओं के साथ मेल-मिलाप है।" उन्हें हिन्दुओं का परित्याग करना चाहिए। मुसलमानों उठो। एक ही स्कूल में हिन्दुओं के साथ मत पढ़ों, और न उनसे कोई वस्तु खरीदों एवं न ही हिन्दुओं को अपने यहाँ पर नौकर रखो। अगर तुम ज्ञान प्राप्त कर लो तो हिन्दुओं को तुम जहन्नुम भेज सकते हो। हिन्दुओं ने हमारे साथ कौन-सी भयानक शरारत नहीं की है। उन्होंने हमारी सम्पत्ति एवं सम्मान को लूट लिया एवं अब वे हमारे जीवन को समाप्त करते जा रहे है।

इस प्रकार के प्रकाशित 'इश्तहार' से कोमिला में 4 मार्च, 1907 को दंगा भड़क गया जो चार दिन तक चला मुस्लिमों ने हिन्दू पर आक्रमण करके उनकी दुकानों, सम्पत्ति को लूट लिया। एच. डब्ल्यू नेविन्सन जो 'मानचेस्टर गर्जियन'' अखबार के संवाददाता थे उन्होंने लिखा 'कोमिला और जलालपुर' के दंगों के दौरान हिन्दुओं को मारा गया, मन्दिरों को अपवित्र किया गया, दुकानों को लूटा गया एवं मुसलमान अनेक हिन्दू महिलाओं और विधवाओं को जबरदस्ती उठाकर ले गये।

1909 का अधिनियम एवं साम्प्रदायिक प्रतिनिधित्व

गांधी के अनुसार–"मार्ले मिण्टो ने हमारा अहित किया। 1909 के अधिनियम में मुसलमानों को पृथक प्रतिनिधित्व का अधिकार दे दिया गया। कुछ विद्वानों का कथन है कि 1947 का भारत विभाजन इसी कारण से हुआ। यद्यपि भारत में मुसलमान अन्य जातियों के व्यक्तियों से मिलते रहे है, परन्तु उनकी राष्ट्रीयता की पृथक पहचान रही है उनके रीति-रिवाज बिल्कुल अलग रहे है। इस कारण भारत के मुसलमान अपने को किसी वर्ग या जाति के व्यक्तियों के साथ नहीं रख सकता, और न ही वह किसी ऐसी नीति का अनुसरण करने को तैयार हो सकते है, जो बहुसंख्यक व्यक्तियों ने तैयार की हो।

निष्कर्ष

सामाजिक समरसता को बढ़ावा देकर साम्प्रदायिक दंगों को रोका जा सकता है समुदाय विशेष में आपसी मेलजोल बढ़ाकर, सांस्कृतिक कार्यक्रमों में भागीदारी करके धार्मिक क्षेत्रों में एकता स्थापित करके और सभी समुदायों में शान्ति बनाये रखकर साम्प्रदायिक हिंसा को रोका जा सकता है।

संदर्भ ग्रन्थ सूची

1. दिवाकर, 'साम्प्रदायिक समस्या', राष्ट्रीय पुस्तक न्यास (भारत), संस्करण–2013, पृष्ठ 01
2. वही, पृष्ठ 113, 122
3. राय, विभूति नारायण, 'साम्प्रदायिक दंगे और भारतीय पुलिस', राधाकृष्ण पेपर बैक्स, नई दिल्ली, संस्करण–2016, पृष्ठ 19-24
4. चन्द्र, विपिन, 'कम्यूनलिज्म इन मॉर्डन इण्डिया', विकास पब्लिशिंग हाउस, नई दिल्ली संस्करण–1984, पृश्ठ 65, 68, 72
5. भट्ट, प्रो. शंकर गौरी, 'भारत में साम्प्रदायिकता', लखनऊ, संस्करण–1972, पृष्ठ 32, 35

6. प्रभु, पी.एच., 'मेरठ मण्डल के साम्प्रदायिक दंगे', अलीगढ़, 1978, पृष्ठ 104, 108

7. राय, विभूति नारायण, 'साम्प्रदायिक दंगे और भारतीय पुलिस', राधाकृष्ण पब्लिशिंग हाउस, नई दिल्ली, संस्करण—2016, पृश्ठ 70-71

8. दैनिक जागरण (रिपोर्ट), 'मुजफ्फरनगर मेरठ साम्प्रदायिक दंगा शुरू', 18 सितम्बर 1982, मेरठ, पृष्ठ 1, 11

9. नवभारत टाइम्स (रिर्पोट), 'मुजफ्फरनगर में तीसरे दिन भी कर्फ्यू में ढील नहीं', 20 सितम्बर, 1982, नई दिल्ली, पृश्ठ 1-2

10. अमर उजाला (रिर्पोट), 'मुजफ्फरनगर में गोलीबारी व हत्याओं को जोर जारी', 22 सितम्बर, 1982, मेरठ, पृश्ठ 1-11

11. हिन्दुस्तान (रिर्पोट), 'मुजफ्फरनगर में रात का कर्फ्यू', 31 सितम्बर, 1982, नई दिल्ली, पृष्ठ 3

शिक्षक दिवस के अवसर पर शिक्षक और छात्र

गीत सम्राट भारत भूषण के नाम एक शाम में तीन पुस्तकों का विमोचन

3. मानव संसाधन के वितरण एवं घनत्व में सहसम्बन्ध का विकासखण्ड हस्तिनापुर में एक भौगोलिक अध्ययन

डॉ. शालू

असिस्टेंट प्रोफेसर

भूगोल विभाग

चौ. चरण सिंह विश्वविद्यालय, मेरठ

सारांश

किसी भी देश के संसाधनों में मानव संसाधन सबसे महत्त्वपूर्ण संसाधन है क्योंकि मानव सबसे गतिशील उत्पादक कारक व हितगाही दोनों ही है। उत्पादक कारक के रूप में मानव अपना शारीरिक एवं मानसिक श्रम लगाकर प्रकृति की सम्पत्ति एवं सहायता से प्रकृति का निर्माण करता है जो अवरोधों के प्रभावों को कम करती है। हितगाही के रूप में मानव विकासों-मुख सभ्यता के लाभों का उपयोग करता है।

प्रस्तावना

विश्व के विभिन्न भागों में प्रकृति वातावरण को सम्बोधित करके सांस्कृतिक भू-दृश्यों का सृजनकर्ता मानव भौगोलिक अध्ययन का केन्द्र बिन्दु है। सामाजिक विकास प्रत्येक ऐतिहासिक सोपान पर जनसंख्या की न मात्र, संख्यात्मक वरन्, गुणात्मक स्थिति में भी परिवर्तन मिलता है। किसी प्रदेश की जनसंख्या वृद्धि उसके आर्थिक विकास, सामाजिक क्षेत्र सांस्कृतिक पृष्ठभूमि, ऐतिहासिक घटनाक्रम तथा राजनीतिक विचारों का सूचक है।

वास्तव में संसाधनों की परिभाषा की पृष्ठभूमि में यह अभिवव्यक्ति अनुपयुक्त न होगी कि मानव के अभाव में कोई भी संसाधन विद्यमान नहीं रह सकता है। जनसंख्या के आधार पर ही संसाधनों का उपभोग निश्चित होता है। 2011 के अनुसार हस्तिनापुर विकासखण्ड की जनसंख्या 90564 व्यक्ति है जो जनपद में 11 वें स्थान पर है।

अध्ययन के उद्देश्य

1. अध्ययन क्षेत्र के मानव संसाधनों का विकासखण्ड स्तर पर अध्ययन करना।
2. अध्ययन क्षेत्र में मानव संसाधन के गांव स्तर पर जनसंख्या वितरण एवं घनत्व में आपसी सहसम्बन्ध का अध्ययन करना।

अध्ययन क्षेत्र का परिचय

जनपद मेरठ के 3 तहसीलों में मवाना एक प्रमुख तहसील है। इस तहसील के अन्तर्गत विकासखण्ड हस्तिनापुर आता है। विकासखण्ड हस्तिनापुर जनपद मुख्यालय के दक्षिण-पूर्व कोने पर मुख्यालय से 35 किमी. की दूरी पर स्थित है। इस विकासखण्ड की सीमाएँ पूर्व में चान्दपुर (बिजनौर) विकासखण्ड, पश्चिम में विकासखण्ड मवाना, उत्तर में जनपद मुजफ्फरनगर का विकासखण्ड जानसठ एवं तथा दक्षिण में परीक्षितगढ़ विकासखण्ड है। विकासखण्ड हस्तिनापुर का भौगोलिक क्षेत्रफल 343-28 वर्ग किमी. है। जो मेरठ जनपद के ग्रामीण क्षेत्रफल का 7-94 प्रतिशत है।

विकासखण्ड हस्तिनापुर में कुल 10 न्याय पंचायत एवं 42 ग्राम पंचायतें गठित हैं विकासखण्ड में कुल 110 राजस्व ग्राम है। जिनमें 90 आबाद ग्राम एवं 20 गैर आबाद ग्राम है। (मानचित्र सं. 1)

अध्ययन विधि तन्त्र

प्रस्तुत अध्ययन को पूर्ण करने के लिए जनसंख्या वितरण एवं जनसंख्या घनत्व के 2011 की जनगणना के आंकड़ों को गांव स्तर पर एकत्रित किया गया है। वितरण एवं घनत्व की तालिकाओं का निर्माण करने के पश्चात् स्पीयरमैन की कोटि अन्तर सह-सम्बन्ध विधि का प्रयोग किया गया है।

जनसंख्या वितरण

जनसंख्या वितरण से मनुष्य के धरातल पर स्थिति जन्य प्रारूप का बोध होता है। किसी क्षेत्र विशेष का समुचित विकास एवं नियोजन जनसंख्या वितरण द्वारा पूर्णतः प्रभावित होता है। जनसंख्या वितरण एक अस्थिर अवस्था है जो क्षेत्र विशेष के प्राकृतिक साधनों के मूल्यांकन, उपभोग तथा सामाजिक-आर्थिक विशेषताओं के पारस्पारिक प्रभाव से समय-समय पर परिवर्तित होती रहती है। इस प्रकार जनसंख्या वितरण प्राकृतिक, आर्थिक सामाजिक एवं सांस्कृतिक वातावरण से पूर्णतः प्रभावित होता है। जनसंख्या वितरण में विकासखण्ड हस्तिनापुर जनपद मेरठ के स्थान पर है।

जनसंख्या घनत्व

जनसंख्या घनत्व से आशय जनसंख्या एवं धरातल के निश्चित अनुपात से है। यह जनसंख्या की स्थिति का मापन है, जिसे प्रति इकाई क्षेत्र में कुल व्यक्तियों की संख्या के रूप में व्यक्त किया जाता है। किसी भी भौगोलिक क्षेत्र में जनसंख्या घनत्व एक ऐसा मापदण्ड है जो भूमि पर जनसंख्या के खाद्य संसाधनों के मध्य परिवर्तनशील सम्बन्धों को

भी स्पष्ट करता है। जनसंख्या घनत्व में जनपद मेरठ में हस्तिनापुर विकासखण्ड (26-3) 12 वें स्थान पर है।

सह-सम्बन्ध

जब दो या दो से अधिक समूहों, वर्गों तथा श्रेणियों के बीच एक निश्चित सम्बन्ध होता है तो उसे सह-सम्बन्ध कहते है।

क्र.सं.	गांव का नाम	जनसंख्या वितरण	कोटि घनत्व	जनसंख्या	कोटि अन्तर	कोटि	कोटि अन्तरों के वर्ग ()
1.	सैफपुर फिरोजपुर	13828	1	1110	9	8	64
2.	मीवा	5002	2	971	10	8	64
3.	गणेशपुर	4820	3	1483	5	2	4
4.	सैफपुर कर्मचन्द	4038	4	2029	3	1	1
5.	मौ खुर्द	3847	5	2113	2	3	9
6.	अकबर गढ़ी	3028	6	346	44	38	1444
7.	मटोरा	2989	7	1136	8	1	1
8.	बहोडूपुर	2962	8	2162	1	7	49
9.	शाहपुर	2957	9	29	75	66	356
10.	रानी नंगला	2825	10	745	17	7	49
11.	माखन नगर	2804	11	854	14	3	9
12.	अलीपुर मोरना	2577	12	245	53	41	1681
13.	लपीफपुर	2478	13	1354	6	7	49
14.	बटावली	2429	14	571	25	11	110
15.	रहमापुर	2367	15	1195	7	8	64
16.	पलड़ा	2334	16	593	24	8	64
17.	गूढ़ा	2179	17	352	43	26	676
18.	तारापुर	2118	18	621	22	4	16
19.	पाली	2115	19	944	12	7	49
20.	बसतोरा नारंग	2107	20	376	40	20	400
21.	ठकवारा	1951	21	227	54	33	1089
22.	स्दरपुर	1905	22	962	11	11	110
23.	महमूदपुर सिखेड़ा	1849	23	212	57	34	1156
24.	गजरौला	1754	24	1152	4	20	400
25.	मो. सकिस्त	1717	25	813	16	9	81
26.	बाजमपुर	1632	26	293	48	22	484
27.	करीमपुर	1608	27	527	28	1	1
28.	निढ़ावली	1589	28	670	19	9	81
29.	कूडी कमालपुर	1577	29	540	26	3	9
30.	मौडकला	1522	30	521	31	1	1
31.	हुमायूँपुर	1519	31	378	39	8	64

32.	समसपुर	1409	32	487	32	0	0
33.	कंकरखेड़ा	1356	33	922	13	20	400
34.	कुन्हेडा	1352	34	364	42	8	64
35.	खोडराय	1253	35	670	18	17	289
36.	नंगला चाँद	1209	36	839	15	21	441
37.	रठोडा खुर्द	1192	37	534	27	10	100
38.	भण्डोरा	1103	38	432	35	3	9
39.	दौलतपुर	1042	39	410	37	2	4
40.	किशोरपुर	1005	40	185	61	21	441
41.	दयालपुर	924	41	296	47	6	36
42.	मामेपुर	879	42	372	41	1	1
43.	सरायखादर	876	43	256	52	9	81
44.	दूधली खादर	778	44	188	60	16	256
45.	नगली खादर	742	45	481	33	12	144
46.	झड़ाका	733	46	642	20	26	676
47.	हस्तिनापुर पांडवान	726	47	76	70	23	529
48.	खेड़ा कला	706	48	175	62	14	196
49.	घूमा नगरी	703	49	633	21	28	784
50.	गजरौली	657	50	336	45	5	25
51.	चामरोद	651	51	425	36	15	225
52.	हटूपुरा	639	52	262	50	2	4
53.	जलालपुर	620	53	258	51	2	4
54.	ऐदलपुर	578	54	614	23	31	961
55.	फलेहपुर हंसपुर	547	55	265	49	6	36
56.	मानपुर	534	56	221	56	0	0
57.	रठौडा कला	513	57	194	59	2	4
58.	जलालपुर जोरा	480	58	77	69	11	110
59.	सिरजेपुर	473	59	77	69	10	100
60.	बामनौली	466	60	922	13	47	2209
61.	अकबर इच्छाबाद	462	61	197	58	3	9
62.	रूस्तमपुर भीकुण्ड	459	62	86	67	5	25
63.	दबखेडी	419	63	54	71	8	64
64.	फाजलपुर	370	64	500	30	34	1156
65.	सुजातपुर	296	65	222	55	10	100
66.	भागूपुर	282	66	92	66	0	0
67.	फलेहपुर प्रेम	221	67	79	67	0	0
68.	हरिपुर प्रेम	219	68	97	65	3	9
69.	शाहपुर सुल्तानपुर	195	69	29	75	6	36
70.	किशनपुर	184	70	322	46	24	576
71.	बधवा	184	70	79	68	2	4
72.	परसापुर हंशपुर	160	71	111	64	7	49

73.	गजुपुरा	150	72	35	73	1	1
74.	हादीपुरा	139	73	22	76	3	9
75.	मु.पु. खैडी	124	74	37	72	2	4
76.	नाई पूठा	112	75	112	63	12	144
77.	बधवी	100	76	19	77	1	1
78.	दुपहरी चांव	71	77	34	74	3	9
79.	बहशूमा	50	78	9	79	1	1
80.	हस्तिनापुर कोरवान	35	79	4	80	1	1
81.	पहाडपुर कुतम्ब	23	80	15	78	2	4
82.	बहबलपुर	13	81	9	179	2	4
83.	शेरपुर	11	82	1-92	82	0	0
84.	बसी विरान	07	83	4	80	30	9
85.	जलालपुर	05	84	1-5	82	2	4
86.	गोकलपुर	05	84	3-18	81	3	9
87.	बामनौला	03	85	348	81	4	16
छत्र 87							23008

$$P = 1\frac{-6\Sigma D^2}{N(N^2-1)}$$

$$\frac{1-6\times 23008}{87(7569-1)} = \frac{6\times 230008}{87\times 7568} = \frac{6\times 23{,}0008}{87\times 7568} \text{ व } \frac{1380{,}048}{658{,}416} = 2.096$$

$$1-2096 = -1.096$$

विकास खण्ड हस्तिनापुर के जनसंख्या वितरण एवं जनसंख्या घनत्व में सहसम्बन्ध ऋणात्मक (Negative) सहसम्बन्ध पाया गया है।

निष्कर्ष–अध्ययन से स्पष्ट होता है कि अध्ययन क्षेत्र में जनसंख्या वितरण एवं जनसंख्या घनत्व में ऋणात्मक संहसम्बन्ध पाया गया है। जनपद मेरठ के 12 विकासखण्ड में हस्तिनापुर जनपद मेरठ में 11वें स्थान पर तथा जनघनत्व में 12 स्थान पर है। जबकि भौगोलिक क्षेत्रफल में दूसरे स्थान पर है। शोध अध्ययन से स्पष्ट होता है कि अध्ययन क्षेत्र में जनसंख्या वितरण एवं जनसंख्या घनत्व में आपसी सहसम्बन्ध ऋणात्मक पाया गया है। क्योंकि जनसंख्या वितरण क्षेत्र में पायी जाने वाली जनसंख्या की संख्या से तथा घनत्व तथा क्षेत्र के भौगोलिक क्षेत्रफल से सम्बन्ध पाया जाता है। तथा जनसंख्या घनत्व क्षेत्र में प्राकृतिक सामाजिक, आर्थिक तथा अन्य कारकों से सम्बन्धित होता है। हस्तिनापुर विकासखण्ड में बाढ़ ग्रस्त क्षेत्र है। परिवहन साधनों की कमी है।

सन्दर्भ ग्रन्थ सूची

1. Thewartha, G.T., "A case for population Geography", Annals of the Association of America Geographers, vol. 43, 1953, p-71-97.

2. Singh, R.B., "Geography of Rural Development, the Indian Micro-level Experience," New Delhi, 1986, p-40.
3. Trwartha, G.T. "A geography of Population," world patterns, John wiltey & Sons, New York, 1969, P-78
4. Zimmerman, E.W., "Introduction to world Resources 1962, p-435.
5. Halbwadis, M, "Population & Society 1957, p- 135-145.
6. सांख्यिकी पत्रिका मेरठ जनपद 2016

अदबनुमा का एक कार्यक्र

'लाल जार' पुस्तक का विमोचन कार्यक्रम

4. नई शिक्षा नीति 2020–भारतीय उच्चतम शिक्षा हेतु एक नया और भविष्योन्मुखी दृष्टिकोण

डॉ. कुमुद रानी

असिस्टेंट प्रोफेसर,
बी.एड. विभाग,
डी.एन. (पी.जी.) कॉलिज,
मेरठ

शिक्षा शिक्षार्थियों के राष्ट्रीय विकास, न्यायसंगत समाज व न्यायपूर्ण समाज के विकास को बढ़ावा देने हेतु आवश्यक है। यह शिक्षा नीति भारतीय मूल्यों द्वारा विकसित शिक्षा प्रक्रिया है, जो सभी मानवों को उच्च गुणवत्ता वाली शिक्षा उपलब्ध कराकर भारत को ज्ञान के रूप में महाशक्ति बनाकर, भारत को एक जीवंत समाज में परिवर्तन करने हेतु प्रत्यक्ष रूप से योगदान करेगी। यह नीति हमारे उच्च शिक्षण संस्थानों के पाठ्यक्रम व शिक्षण विधि जो विद्यार्थियों में अपने मौलिक दायित्वों व संवैधानिक मूल्यों के बदलते हुए विश्व में उत्तम नागरिक की भूमिका का उत्तरदायित्व बढ़ाती है। इस शिक्षा नीति का विजन यह है कि छात्रों में, भारतीय होने का गर्व केवल विचारों में ही ना रहकर व्यवहार, कौशल तथा बुद्धि में भी रहे, जो मानव अधिकार के स्थाई विकास, जीवन यापन तथा वैश्विक कल्याण के लिए प्रतिबद्ध हों जिससे समाज में एक योग्य व संस्कारवान नागरिक का विकास हो।

प्रस्तावना

शिक्षा पूर्ण मानव क्षमता को प्राप्त करने का एक साधन है, जो राष्ट्रीय विकास, न्यायसंगत समाज व न्यायपूर्ण समाज के विकास को बढ़ावा देने हेतु एक बेसिक आवश्यकता है। राष्ट्रीय शिक्षा नीति 2020 को प्रस्तुत करते हुए शिक्षा मंत्री डॉ. रमेश पोखरिया निशंक ने कहा कि–"देश के प्रधानमंत्री नरेन्द्र मोदी जी ने एक नए भारत निर्माण की बात की है, जो स्वच्छ, स्वस्थ, सशक्त, समृद्ध व श्रेष्ठ भारत होगा। यह शिक्षा नीति–2020 नए भारत के निर्माण में मील का पत्थर साबित होगी।" शिक्षार्थियों को इस प्रकार की शिक्षा दी जाये जो उनके सभी पक्षों व क्षमताओं को संतुलित करे इसके लिए पाठ्यक्रम में गणित व विज्ञान के साथ-2 सभी विषयों जैसे शिल्प, मानविकी, बुनियादी कला, शारीरिक शिक्षा व योग, भाषा, संस्कृति व साहित्य जैसे मूल्यों का समावेश किया जाये। शिक्षा से विद्यार्थियों में नैतिकता, चरित्र निर्माण, तार्किकता तथा संवेदनशीलता जैसे गुणों का विकास होना चाहिए और इसके साथ छात्रों को आत्मनिर्भर भी बनाना चाहिए।

21वीं शताब्दी की पहली राष्ट्रीय शिक्षा नीति–2020 का लक्ष्य देश के विद्यार्थियों की अनिवार्य आवश्यकताओं को पूर्ण करना है। जिसके अन्तर्गत भारत की परंपरा व सांस्कृतिक

मूल्यों को संरक्षित रखते हुए एसडीजी 4 लक्ष्यों को शामिल किया गया हैं यह शिक्षा पर ध्यान केन्द्रित करते हुए आर्थिक, सामाजिक व पर्यावरणीय आयामों को शामिल करता है इसका लक्ष्य "समावेशी व समान गुणवत्ता वाली शिक्षा को सुनियोजित व सुनिश्चित करना तथा सभी शिक्षार्थियों के लिए आजीवन सीखने के समान अवसर को समृद्ध करना है।"

राष्ट्रीय शिक्षा नीति के आधार सिद्धान्त—यह सिद्धांत निम्न हैं—

- प्रत्येक छात्र की विशिष्ट योग्यताओं को स्वीकार करना, पहचान करना तथा उनके विकास के लिए बहुआयामी प्रयत्न करना।
- बुनियादी शिक्षा व पाठ्यक्रम में लचीलेपन को प्राथमिकता देना।
- एक बहु-विषयक व समग्र शिक्षा का विकास करना।
- नवाचार को प्रोत्साहित करने हेतु रचनात्मकता तथा तार्किक सोच को प्रोत्साहन देना।
- छात्रों में नैतिकता, मानवीयता तथा संवैधानिक मूल्यों तथा जीवन कौशल का विकास करना।
- शिक्षार्थियों में गुणवत्तापूर्ण शिक्षा का विकास करने के लिए उच्च स्तर शोध करना।
- शिक्षा के माध्यम से छात्रों में राष्ट्रहित की भावना को विकसित करना।

राष्ट्रीय शिक्षा नीति का विजन-भारतीय मूल्यों को उच्चतर, गुणवत्तापूर्ण शिक्षा उपलब्ध कराने से है जो भारत को वैश्विक ज्ञान से परिपूर्ण कर एक जीवंत, न्यायसंगत ज्ञान समाज में बदलने के लिए समक्ष रूप से योगदान करेगी। शिक्षार्थियों में विचारों के अलावा व्यवहार, बुद्धि व कार्यों, मूल्यों में भी भारतीय होने का गर्व होना। जिससे प्रत्येक नागरिक उत्तम बन सके।

भारतीय उच्चतर शिक्षा का भविष्योन्मुखी दृष्टिकोण-उच्चतर शिक्षा छात्रों और सामाजिक कल्याण के विकास में महत्वपूर्ण भूमिका निभाती है तथा उच्चतर शिक्षा शिक्षार्थियों को आर्थिक विकास तथा आजीविकाओं को स्थायित्व देने में महत्वपूर्ण भूमिका देती है। उच्चतर शिक्षा का उद्देश्य छात्रों में चिंतनशील, बहुमुखी प्रतिभा तथा रचनात्मकता का विकास करना है जो उनको विशिष्ट क्षेत्रों में गहन स्तर पर अध्ययन करने में सक्षम बनाती है तथा साथ ही साथ उनमें 21वीं सदी की योग्यताओं जैसे चरित्र, नैतिक और संवैधानिक मूल्यों, बौद्धिक क्षमता या विकास, वैज्ञानिक दृष्टिकोण, रचनात्मकता, सृजनात्मकता, सेवाभाव और विभिन्न विषयों-विज्ञान, सामाजिक विज्ञान, मानविकी, कला, भाषा, व्यवसायिक तकनीकी से सम्बन्धित गुणों का विकास करना है। उच्चतर गुणवत्ता वाली शिक्षा के द्वारा व्यक्तिगत उपलब्धि तथा ज्ञान, सार्वजनिक सहभागिता तथा समाज में उत्पादक योगदान को सक्षम करना चाहिए। इसके द्वारा छात्रों को अधिक सार्थक व संतोषजनक जीवन जीने योग्य तैयार करना है।

विद्यार्थियों में सर्वांगीण विकास हेतु पूर्व विद्यालय से उच्च शिक्षा तक, प्रत्येक चरण में

सीखने के कौशल व मूल्यों को क्रमबद्ध तरीके से शामिल किया जाए। इसी के साथ सामाजिक स्तर पर उच्चतर शिक्षा के माध्यम से राष्ट्र को प्रबुद्ध व जागरूक करना है जो नागरिकों का उत्थान कर सके और प्रत्येक नागरिक अपने स्तर की समस्याओं को स्वयं सुलझाकर उत्तम निर्णय ले सके। सामाजिक स्तर पर राष्ट्र को भी प्रबुद्ध, जागरूक, जानकार व सक्षम बनाना है जिससे राष्ट्रीय अर्थव्यवस्था के विकास में एक मुख्य भूमिका का निर्वाह हो सके। राष्ट्रीय शिक्षा नीति-2020 व्यक्तिगत रोजगार के अवसरों के सृजन करने के साथ-साथ सामाजिक रूप से जुड़े हुए समुदायों का भी प्रतिनिधित्व कर सकने में सहायक होगी।

उच्चतर शिक्षा के वृहद ढाँचे में रचनात्मकता को करने के लिए शिक्षण संस्थानों व संकायों को शिक्षण विधि, पाठ्यक्रम व मूल्यांकन, आंकलन आदि को नये विचारों का सृजन करने की स्वायत्ता प्रदान की जायेगी, जो सभी शिक्षण संस्थानों, मुक्त दूरस्थ शिक्षा (ODL), ऑनलाइन कार्यक्रमों व पारस्परिक कक्षा-कक्ष में समान रूप से लागू किया जाएगा। उसके लक्ष्यों को प्राप्त करने के लिए प्रत्येक कार्यक्रम में रचनात्मक आंकलन का उपयोग किया जाएगा। विकल्प आधारिक क्रेडिट प्रणाली की संरचना करने के लिए नवाचार व लचीलेपन के रूप में संशोधित किया जायेगा। नई शिक्षा व्यवस्था में पाठ्यक्रम व आंकलन महत्वपूर्ण आयाम हैं, इसमें पाठ्यक्रम के अन्तर्गत शिक्षार्थियों के विकास, बहु विषयक अनुभव शिक्षण और तार्किक क्षमता को बढ़ावा देने के साथ-साथ व्यावसायिक शिक्षा की साथ-साथ इंटर्नशिप भी दी जायेगी। राष्ट्रीय शैक्षिक अनुसंधान और प्रशिक्षण परिषद (NCERT) के स्कूली शिक्षा के लिए राष्ट्रीय पाठ्यक्रम रूपरेखा तैयार की जायेगी। विद्यार्थियों की प्रगति के आंकलन के लिए मानक-निर्धारक निकाय के रूप में 'परख' नामक एक नय राष्ट्रीय आंकलन केंद्र की स्थापना की जायेगी। छात्रों की प्रगति के मूल्यांकन हेतु और भविष्य से जुड़े निर्णय लेने में सहायता करने हेतु कृत्रिम बुद्धिमता आधारित सॉफ्टवेयर का उपयोग किया जायेगा।

राष्ट्रीय शिक्षा नीति-2020 के अन्तर्गत उच्च शिक्षण संस्थानों में सकल नामांकन अनुपात (GER) को 26-3 प्रतिशत वर्ष 2018 से बढ़ाकर 50 प्रतिशत तक वृद्धि करने का लक्ष्य रखा गया है तथा देश के उच्च शिक्षण संस्थानों में 35 करोड़ नई सीटों को जोड़ा जायेगा। नई शिक्षा नीति 2020 के अन्तर्गत पाठ्यक्रम में मल्टीपल एंट्री और एग्जिट सिस्टम (MEES) को अपनाया गया है, जिसके अन्तर्गत 3 या 4 वर्ष के स्नातक पाठ्यक्रम में विद्यार्थियों को कई स्तरों पर छोड़ सकेंगे और उसी के अनुसार डिग्री या प्रमाण-पत्र दिया जायेगा (1 वर्ष के पश्चात् प्रमाण पत्र, 2 वर्षों के पश्चात् एडवांस डिप्लोमा, 3 वर्षों के पश्चात् स्नातक की डिग्री तथा 4 वर्षों के पश्चात् शोध के साथ स्नातक)। अनेक उच्च शिक्षण संस्थानों से मिले अंकों या क्रेडिट को डिजिटल रूप प्रदान करने हेतु "एकेडमिक बैंक ऑफ क्रेडिट" दिया जायेगा, जिससे छात्रों की बहुप्रतिभा के

आधार पर उन्हें अलग-अलग संस्थानों में डिग्री प्रदान की जा सके।

राष्ट्रीय शिक्षा नीति के अन्तर्गत भारतीय उच्च शिक्षा आयोग में उच्च शिक्षा संस्थानों के लिए एक भारतीय उच्च शिक्षा परिषद (Higher Educatin Commission of India-HECI) की परिकल्पना बनाई गई है। इसके अन्तर्गत कई कार्यक्षेत्र होंगे जो विभिन्न भूमिकाओं को पूरा करेंगे। चिकित्सा तथा कानूनी शिक्षा के अलावा पूरे उच्च शिक्षा क्षेत्र के लिए एक एकल निकाय के रूप में कार्य करेगा।

भारतीय उच्च शिक्षा परिषद की कार्यशैली के प्रभावी निष्पादन हेतु चार निकाय–

- राष्ट्रीय उच्चतर शिक्षा नियामकीय परिषद (NHERC)–शिक्षक शिक्षा व उच्च शिक्षा क्षेत्र के लिए नियामक का कार्य करेगा।
- सामान्य शिक्षा परिषद (GEC)–यह उच्च शिक्षा कार्यक्रम के लिए अपेक्षित सीखने के परिणामों का ढाँचा तैयार करेगा, अर्थात् उनके मानक निर्धारण का कार्य करेगा।
- राष्ट्रीय प्रत्यायन परिषद (NAC)–यह संस्थानों के प्रत्यायन का कार्य करेगा जो मुख्य रूप से बुनियाद मानदंडों, सार्वजनिक सुशासन व परिणामों पर आधारित होगा।
- उच्चतर शिक्षा अनुदान परिषद (HGFC)–यह निकाय कॉलेजों एवं विश्वविद्यालयों के लिए वित्तपोषण का कार्य करेगा।

देश में आई.आई.टी. व आई.आई.एम. के समकक्ष वैश्विक मानकों के 'बहुविषयक शिक्षा एवं अनुसंधान विश्वविद्यालय' की स्थापना की जाएगी। उच्चतर शिक्षा संस्थानों के लिए सरकार द्वारा उठाये गये कुछ कदम–

- एसईजीजी की शिक्षा के लिए समुचित सरकारी निधि का निर्माण करना।
- उच्चतर जीईआर तथा एसईडीपी के लिए लक्ष्यों का निर्धारण करना तथा प्रवेश प्रक्रिया में जेंडर संतुलन को बढ़ावा देना।
- उच्चतर शिक्षण संस्थानों गुणवत्ता का निर्माण व विकास करना।
- दोनों प्रकारों के (सार्वजनिक व निजी) उच्चतर शिक्षण संस्थानों में एसईडीजी (Socio–Economically Disadvantaged Group) को अधिक वित्तीय कोष सहायता व छात्रवृत्ति प्रदान करना।
- छात्रों के बेहतर भविष्य के लिए उनकी भागीदारी व सीखने के परिणामों हेतु प्रौद्योगिकी का निर्माण व विकास करना।

सभी उच्चतर शिक्षण संस्थानों द्वारा स्वयं उठाए जाने वाले महत्वपूर्ण कदम–

- उच्चतर शिक्षा प्राप्त करने से जुड़ी लागत व इस दौरान हुई आर्थिक अवसरों की हानि को कम करना।
- उच्च शिक्षा संस्थानों में प्रवेश प्रक्रिया को और अधिक समावेशी बनाना, छात्रों को

छात्रवृत्ति के लिए जागरूक करना, गरीब छात्रों को अधिक वित्तीय सहायता प्रदान करना तथा शिक्षा कार्यक्रमों को रोजगार परक बनाना।

- ऐसे छात्र जो वंचित शैक्षिक पृष्ठभूमि से आये हैं, उनके लिए ब्रिज कोर्स निर्मित करना।
- दिव्यांगजन छात्रों के लिए व्हीलचेयर, सभी सम्बन्धित इमारतें व अन्य बुनियादी सुविधाएं सुलभ कराना।
- ऐसे नियम जो भेदभाव व उत्पीड़न से सम्बन्धित हैं उनके खिलाफ सख्ती से नियम लागू करना।
- एसईडीजी (Socio-Economically Disadvantaged Groups) से बढ़ती भागीदारी को सुनिश्चित करने से जुड़े विशिष्ट योजनाओं को शामिल करके संस्थागत विकास योजनाओं का निर्माण करना, जिनमें उपरोक्त बिन्दु शामिल हो लेकिन इन्हीं तक सीमित न हों।

शिक्षा नीति में परिवर्तन की आवश्यकता क्यों?

शिक्षा के विषय में गांधी का तात्पर्य बालक तथा मनुष्य के शरीर, मन तथा आत्मा के सर्वांगीण विकास से है, तो ये जरूरी हो जाता है कि पहली शिक्षा नीति में परिवर्तन कर नई शिक्षा नीति तैयार की जाए जो छात्रों के अनुकूल हो तथा शिक्षा के क्षेत्र में नवाचार, गुणवत्ता में सुधार व अनुसंधान की गई तकनीकियों को बढ़ावा देने के लिए आवश्यक हो। ज्ञान आधारित अर्थव्यवस्था की आवश्यकता की पूर्ति हेतु भी परिवर्तन की आवश्यकता है। भारतीय शिक्षण व्यवस्था की वैश्विक स्तर पर पहुँच सुनिश्चित करने के लिए शिक्षा के वैश्विक मानकों को अपनाने के लिए शिक्षा नीति में परिवर्तन की आवश्यकता है।

संदर्भ सूची

- https://www.bbc.com/hindi/India-53581084
- https://www.uttamhindu.com/Politics/150172/new-education-policy-foundations-of-new-India.
- https://www.drishtias.com नई शिक्षा नीति, 25 अगस्त, 2020 अगस्त, 2020
- दृष्टि, The vision (चर्चित मुद्दे) नई शिक्षा नीति, 2020
- https://www.drishtias.com दृष्टि, The vision (नई शिक्षा नीतिः महत्त्व व चुनौतिया, 31 जुलाई, 2020)
- https://www.uttamhindu.com/Politics/150172/new-education-policy-foundations, 2 Aug. 2020
- https://www.education.gov.in
- https://www.hindi.nvshq.org

5. आर्थिक विकास का कृषि पर प्रभावः जनपद गाजियाबाद का अध्ययन

डॉ. अनिता मलिक

विभागाध्यक्षा भूगोल विभाग,

मेरठ कॉलेज, मेरठ

सारांश

गाजियाबाद आर्थिक विकास के साथ-साथ सामाजिक, सांस्कृतिक व कृषि विकास में एक सम्पन्न क्षेत्र है। जिसमें औद्योगिक विकास के उच्च स्तर पर विराजमान है, जिसके कारण राष्ट्रीय राजधानी नई दिल्ली का बच्चा के नाम से भी पुकारा जाता है। क्योंकि गाजियाबाद दिल्ली राष्ट्रीय राजधानी क्षेत्र में सम्मिलित होने साथ ही यह दिल्ली के उत्तर-पूर्वी भाग में एक नवीन नगरीय व औद्योगिक क्षेत्र है। इस क्षेत्र में सभी प्रकार के छोटे-बड़े उद्योगों के साथ कृषि आधारित उद्योगों का अधिक विकास हुआ है। गाजियाबाद को प्रशासनिक दृष्टि से प्रमुखतः चार विकासखण्डों में विभाजित किया गया है–1.भोजपुर, 2. रजापुर, 3. लोनी, तथा 4. मुरादनगर आदि। इन सभी चार विकासखण्डों में से रजापुर व लोनी दोनों क्षेत्रों में कृषि विकास व कृषि आधारित उद्योगों विकास बहुत कमी से हुआ है, क्योंकि यह दोनों क्षेत्र गाजियाबाद के नगरीय क्षेत्रों का प्रतिनिधित्व करते हैं। भोजपुर व मुरादनगर में कृषि आधारित औद्योगिक विकास अधिक हुआ है। इन क्षेत्रों में शुगर मिल व अनेक प्रकार के छोटे-बड़े गुढ़ कोल्हू, तेल मिल तथा खाण्डसारी उद्योग आदि।

परिचयः मानव की आर्थिक क्रियाओं में कृषि प्राथमिक क्रिया है, जिसे मानव अपनी प्राथमिक आवश्यकताओं की पूर्ति करने के लिए कृषि कार्यों को प्रारम्भ किया था। किसी भी क्षेत्र या प्रदेश के सम्पूर्ण विकास में कृषि कार्यों का सबसे महत्त्वपूर्ण योगदान होता है। क्योंकि मानव जीवन की मूलभूत आवश्यकताओं की पूर्ति के लिए भोजन की प्राप्ति के लिए पूर्ण रूप से कृषि पर ही निर्भर रहते हैं। कृषि से ही विभिन्न प्रकार के उद्योग धन्धों के लिए कच्चे माल की प्राप्ति भी कृषि से ही होती है। इस प्रकार क्षेत्र के विकास में कृषि की महत्त्वपूर्ण भमिका होती है। क्योंकि वर्तमान समय में भी देश की लगभग 58 प्रतिशत जनसंख्या प्रत्यक्ष या अप्रत्यक्ष रूप से कृषि पर ही निर्भर है। इसी प्रकार जनपद-गाजियाबाद की भी लगभग 52 प्रतिशत जनसंख्या प्रत्यक्ष या अप्रत्यक्ष रूप से कृषि से ही रोजगार प्राप्त करती है। इस प्रकार आज भी इस क्षेत्र की अत्यधिक जनसंख्या कृषि कार्यों में संलग्न है। जनपद गाजियाबाद आर्थिक, सामाजिक व सांस्कृतिक विकास का स्तर उत्तर प्रदेश ही नहीं भारत में भी उच्च स्तर पर स्थित है। गाजियाबाद के प्रत्येक दिशा व

क्षेत्र में अनेक प्रकार के छोटे-बड़े उद्योगों का तीव्र विकास हुआ है। इस क्षेत्र में औद्योगिक विकास के साथ कृषि विकास अधिक हुआ है, परन्तु जनसंख्या वृद्धि ने औद्योगिक विकास व कृषि विकास को अधिक प्रभाव किया है। क्योंकि पिछले 50 वर्षों से लगातार बढ़ती जनसंख्या ने इस क्षेत्र की कृषि भूमि में नकारात्मक वृद्धि दर्ज की है। बढ़ती जनसंख्या की आवास की आपूर्ति तथा रोजगार आपूर्ति हेतु औद्योगिकरण व नगरीकरण को बढ़ावा मिला है। जिसके कारण कृषि भूमि पर दिन-प्रतिदिन जनसंख्या का दबाव बढ़ता ही जा रहा है। एक ओर रोजगार के अवसरों में वृद्धि हुई है, परन्तु दूसरी ओर खाद्यान्न उत्पादन में कमी दर्ज की जा रही है। वर्तमान समय में कृषि क्षेत्र में रोजगारों की संख्या में कमी हो रही है। जिसका प्रमुख कारण कृषि भूमि पर जनसंख्या का अधिक दबाव, साक्षरता के स्तर में वृद्धि, द्वितीय एवं तृतीयक रोजगार के अवसरों की बढ़ती संख्या आदि। किसी भी क्षेत्र के आर्थिक व औद्योगिक विकास का प्रभाव मुख्य रूप से कृषि क्षेत्र पर स्पष्ट होता है।

अध्ययन के उद्देश्य

1. जनपद गाजियाबाद में कृषि पर आर्थिक विकास के प्रभावों का अध्ययन करना।
2. अध्ययन क्षेत्र में औद्योगिक विकास का कृषि विकास पर प्रभावों का अध्ययन करना।

विधि तन्त्र

प्रस्तुत शोध प्रपत्र में द्वितीयक आंकड़ों के माध्यम से वर्तमान समस्याओं एवं आर्थिक विकास के प्रभावों प्राप्त किया गया है। शोध प्रपत्र को पूर्ण करने के लिए प्राथमिक व द्वितीयक आंकड़ों का प्रयोग किया गया है। द्वितीयक आंकड़ों को जिला सांख्यिकी पत्रिका, विकासखण्ड सांख्यिकी पत्रिका, जनपद-गाजियाबाद की सांख्यिकी मानचित्रावली, कृषि विभाग, जनपद-गाजियाबाद, वार्षिक कृषि योजना, लघु उद्योगों के क्षेत्रीय कार्यालय, मृदा कार्यालय, क्षेत्रीय जल कार्यालय तथा विभिन्न क्षेत्रीय औद्योगिक कार्यालयों तथा इण्टरनेट के माध्यम से प्राप्त किये गये हैं।

अध्ययन क्षेत्र

स्थिति एवं भौगोलिक सीमाऐं–जनपद-गाजियाबाद का भौगोलिक विस्तार 28°35" उत्तरी अक्षांश से 28°55'' उत्तरी अक्षांश तक तथा 77°10" पूर्वीदेशान्तर से 77°42" पूर्वी देशान्तर के मध्य स्थित है। (www.ghaziabad.nic.in) इसका कुल भौगोलिक क्षेत्रफल 910 वर्गकिलोमीटर है (www.ghaziabad.nic.in)। जिसका

125-79 वर्गकिलोमीटर क्षेत्र नगरीय तथा 784.21 वर्गकिलोमीटर क्षेत्र ग्रामीण है। वर्तमान में गाजियाबाद में एक नगर निगम तथा चार नगर पालिका एवं चार नगर पंचायत और 215 ग्राम पंचायत है। यह क्षेत्र राष्ट्रीय राजधानी क्षेत्र दिल्ली से लगभग 5 से 20 किलोमीटर दूरी में विस्तृत है। यह क्षेत्र प्चिमी उत्तर प्रदेश का महत्वपूर्ण औद्योगिक क्षेत्र है। इस क्षेत्र में दिन प्रतिदिन तीव्र गति से बढ़ती जनसंख्या के कारण भूखमरी, बेरोजगारी, पर्यावरण प्रदूषण, कृषि क्षेत्र में परिवर्तन, आवास की समस्या, मनोरंजन के साधनों की समस्या आदि प्रकार की समस्याओं का जन्म हुआ है। यह क्षेत्र यमुना नदी तथा इसकी सहायक छो नदी के मध्यवर्ती क्षेत्र पर बसा है। यमुना की सहायक हिण्डन नदी इस क्षेत्र के लगभग मध्य भाग से प्रवाहित होती है। यमुना व हिण्डन नदी इस क्षेत्र में जल प्रदूषण का सबसे प्रमुख कारण है। यह यमुना नदी और जल भराव की स्थिति और कृषि विकास के लिए कठोर पर्यावरणीय परिस्थितयों के अवसादों से बना एक ढ़ाल मैदान है।

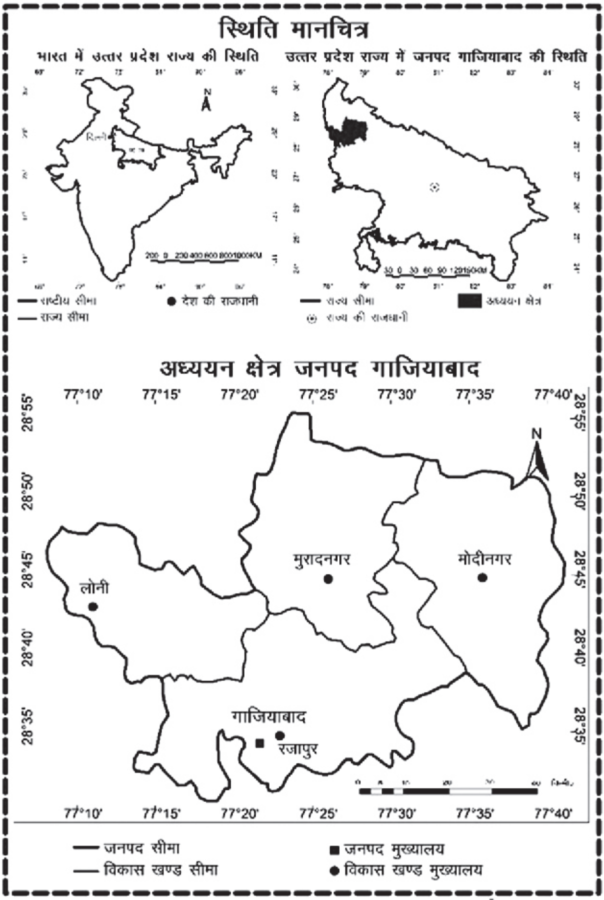

मानचित्र संख्या–1

कृषि आधारित औद्योगिक विकास

जनपद-गाजियाबाद में औद्योगिक विकास के लिए कृषि का बहुत अधिक महत्त्व है, क्योंकि हमारे विभिन्न प्रकार के उद्योगों को कच्चा माल प्रदान करती है। जिनका विकास पूर्ण रूप से कृषि विकास पर ही निर्भर करता है। इन उद्योगों में प्रमुखता लघु उद्योगों की होती है, जिनमें चीनी उद्योग, एल्कोहल उद्योग, जूट उद्योग, कपड़ा उद्योग, तेल उद्योग, दूध उद्योग, कागज उद्योग, आटा उद्योग, बेकरी उद्योग तथा वनपस्ति तेल उद्योग आदि का विकास पूर्ण रूप से कृषि पर ही निर्भर करता है। औद्योगिक क्षेत्रों में लगे व्यक्तियों के लिए खाद्यान्न की आपूर्ति भी कृषि क्षेत्र से ही होती है।

ग्रामीण क्षेत्र औद्योगिक व नगरीय क्षेत्रों में निर्मित वस्तुओं का प्रमुख बाजार होता है। अतः कृषि क्षेत्र का विकास होने पर किसी भी क्षेत्र के औद्योगिक विकास भी होता है। लेकिन पिछले कुछ वर्षो से उद्योगों के लिए कृषि के महत्त्व में कमी आयी है, क्योंकि अनेक ऐसे उद्योगों का विकास इस क्षेत्र में हो गया है, जो कृषि पर निर्भर नहीं है। जैस–इस्पात उद्योग, लोहा उद्योग, रसायन उद्योग, मशीनी औजार उद्योग, रबड़ टायर उद्योग, तथा अन्य इन्जीनियरिंग उद्योग, विनिर्माण उद्योग, सूचना प्रौद्योगिकी आदि का विकास तीव्र गति से हो रहा है। वर्तमान समय में तो गाजियाबाद मानो ऑटोमोबाइल उद्योग के हब बनता जा रहा है। इस क्षेत्र में कृषि आधारित उद्योगों का विकास आज धीमा पड़ता जा रहा है। क्योंकि कृषि क्षेत्र से इन उद्योगों की कच्चे माल की आपूर्ति पर्याप्त नहीं है। इस क्षेत्र में आज गुड़ कोल्हूओं की संख्या में कमी का सबसे प्रमुख कारण गन्ना का क्षेत्रफल तथा का उत्पादकता में कमी का होना रहा है।

मानचित्र सं. 02

कृषि व्यवसायीकरण

कृषि का व्यवसायीकरण से तात्पर्य परिवार की खपत के स्थान पर बाजार में बिक्री के लिए कृषि फसलों का उत्पादन को बढ़ावा देना। कृषि उत्पादों के विपणन के लिए इस प्रकार खपत पर उत्पादन का अधिशेष आवश्यक होता है। सामान्य शब्दों में कृषि व्यवसायीकरण का अर्थ कृषि कार्यों का उद्देश्यों को जीवन निर्वाह से बाजार उन्मुख होना रहा है। स्वतन्त्र के पूर्व भारत में यह प्रक्रिया विदेशी बाजारों के कच्चे माल की आपूर्ति के लिए अपनायी गयी थी। परन्तु स्वतन्त्रता के बाद हमारे देश में वापस कृषि अपने जीवन निर्वाह का एक साधन बनकर ही रह गई। क्योंकि भारतीय कृषि विभिन्न प्रकार की समस्याओं से चारों तरफ से घिरी हुई थी। जिसका विकास बिना योजना बनाये सम्भव नही हो सका।

इस क्षेत्र में कृषि का व्यवसायीकरण तथा विकसित करने में कुछ महत्त्वपूर्ण कारकों का योगदान रहा है जिसके कारण इस क्षेत्र की कृषि का विकास के देश के अन्य क्षेत्रों से तीव्र गति से हुआ है। वर्तमान समय तो इस क्षेत्र के ग्रामीण क्षेत्रों से होकर गाजियाबाद-मेरठ 8 लेन बाइपास हाईवे बनाया गया जिससे भविष्य में अत्यधिक तीव्र गति से कृषि विकास तथा औद्योगिक विकास होने की सम्भावना है। इस क्षेत्र में ग्रामीण क्षेत्रों से कृषि उत्पादों को नगरीय क्षेत्रों तथा गाजियाबाद के साहिबाबाद क्षेत्र में स्थित साहिबाबाद मण्डी क्षेत्र की सबसे बड़ी मण्डी तक पहुँचाने के लिए पर्याप्त परिवहन साधनों का विकास किया गया। जिससे इन क्षेत्रों में साग-सब्जियों के क्षेत्र तथा उत्पादन में तीव्र वृद्धि हो रही है। गन्ना क्षेत्रों से गन्ना शुगर मिल तक पहुँचाने के लिए शुगर मिल मालिकों ने सभी गांवों को मुख्य सड़क मार्गों से जोड़ा है। जिससे कृषि विकास के साथ-साथ ग्रामीण क्षेत्रों के आर्थिक, सामाजिक विकास को भी बढ़ावा मिला है। परिवहन के उचित विकास के आधार पर ही किसी क्षेत्र का विकास निर्धारित किया जाता है। जनपद-गाजियाबाद अपने आस-पास के क्षेत्रों से भली-भांति सड़क परिवहन, रेल परिवहन, तथा वायु परिवहन के माध्यम से जुड़ा हुआ है।

इन परिवहन के साधनों के द्वारा ही इस क्षेत्र से अन्य क्षेत्रों को तैयार माल तथा कच्चा

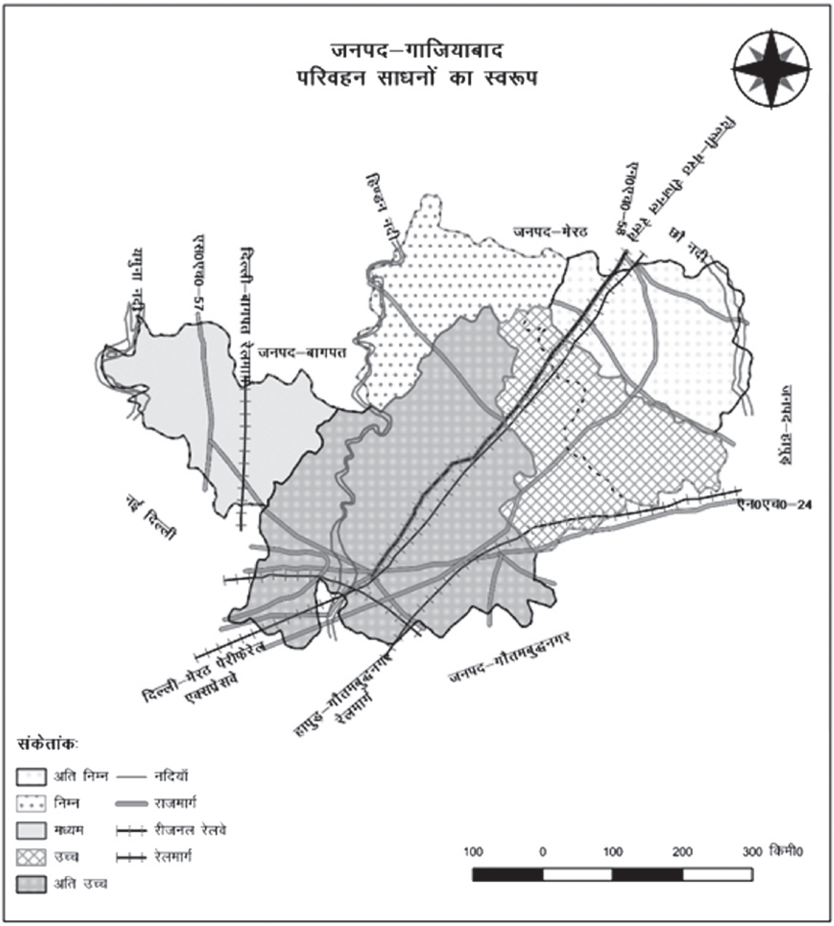

मानचित्र सं. 03

का परिवहन अन्य प्रदेशों तथा क्षेत्रों को किया जाता है। तथा तैयार माल, मशीनरी, कपड़े, खाद्यान्न, कोयला, लोहा आदि का आयात किया जाता है। इस प्रकार परिवहन के साधन के अभाव में किसी भी प्रकार के विकास की कल्पना करना भी सम्भव नहीं है। जैसे मानव शरीर में खून के प्रवाह के लिए धमनी शिराओं की आवश्यकता होती है, वैसे ही क्षेत्रीय या स्थानीय विकास के लिए परिवहन के पर्याप्त साधनों की आवश्यकता होती है। इस प्रकार आज जनपद-गाजियाबाद अपने विकास के साथ-साथ आप-पास के विकास कार्यों में भी सहयोग प्रदान कर रहा है।

तालिका सं. 1

जनपद-गाजियाबाद

सड़क परिवहन का विकास (वर्ष 2011 से 2020 तक)

वर्ष	पक्की सड़कों की लम्बाई
2011-12	1973
2012-13	2089
2013-14	2116
2014-15	2515
2015-16	2418
2016-17	4513
2017-18	4728
2018-19	5472
2019-20	4767

स्रोत–अर्थ एवं संख्या प्रभाग, एवं सांख्यिकी पत्रिका, गाजियाबाद (उ.प्र.)।

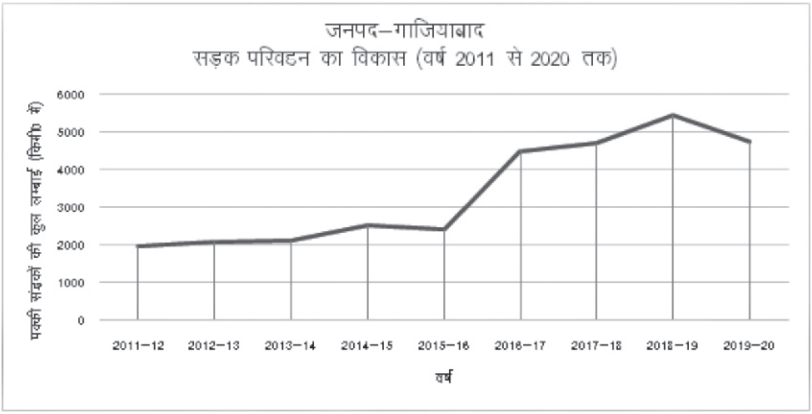

तालिका सं. 1 तथा आरेख सं. 1 के अध्ययन से स्पष्ट हो जाता है कि जनपद-गाजियाबाद में सड़क परिवहन का विकास वर्ष 2011 से वर्ष 2020 तक लगातार तीव्र गति से हुआ है। वर्श 2011 में इस क्षेत्र में उपलब्ध पक्की सड़कों की कुल लम्बाई 1973 किमी. थी। जिसमे थोड़ी वृद्धि होकर वर्ष 2013 में 2089 किमी. हो गई। इसी प्रकार इस क्षेत्र में सड़कों की लम्बाई में प्रत्येक वर्ष वृद्धि देखी गई जो इस प्रकार है–वर्ष 2013-4 में

2116 किमी., वर्ष 2014-15 में 2515 किमी., वर्ष 2015-16 में 2418 किमी. हो गई। वर्ष 2015-16 में एक वर्ष के समय में लगभग 97 किमी. सड़क कम हो गई। वर्ष 2016-17 में तीव्र वृद्धि के साथ सड़क की कुल लम्बाई 4513 किमी. हो गई, वर्ष 2017-18 में 4728 किमी., तथा वर्ष 2018-19 में वृद्धि के साथ 5472 किमी. सड़कों निर्माण हो गया है। परन्तु वर्ष 2019-20 की अवधि में इस क्षेत्र के सड़कों लम्बाई में कुछ कमी देखी गई जो घटकर 4767 किमी. हो गयी। इस प्रकार कृषि के विकास में सड़क परिवहन के साधनों का विशेष योगदान होता है। क्योंकि सड़क परिवहन के साधनों के द्वारा खेतों से ही फसल उत्पादन को गाड़ियों के माध्यम से बाजारों तक पहुँचाया जा सकता है। इस क्षेत्र में परिवहन के अन्य साधनों में रेल परिवहन का प्रमुख विकास हुआ है, परन्तु कृषि विकास में उसकी भूमिका सीमित है। क्योंकि रेलों के माध्यम से केवल कृषि व्यापार को एक क्षेत्र राज्य से दूसरे राज्य तक अनाज, तिलहन आदि का परिवहन किया जाता है। जो स्थानीय रूप से कृषि विकास में प्रत्यक्ष प्रभाव न होकर अप्रत्यक्ष रूप से प्रभावित करता है।

अध्ययन क्षेत्र जनपद-गाजियाबाद को सामाजिक-आर्थिक आधार पर प्रमुख 5 क्षेत्रों में विभाजित किया गया है—1. अति निम्न विकास का स्तर, 2. निम्न विकास का स्तर, 3. मध्यम स्तर, 4. उच्च स्तर तथा 5. अति उच्च विकास का स्तर। प्रथम अति निम्न विकास स्तर के अन्तर्गत जनपद-गाजियाबाद का मध्य-उत्तरी क्षेत्र जिसमें विकासखण्ड-मुरादनगर का 70 प्रतिशत क्षेत्र तथा विकासखण्ड-भोजपुर का 18 प्रतिशत क्षेत्र सम्मिलित है। इस क्षेत्र में कृषि व शिक्षा का विकास तीव्र गति से हुआ है, परन्तु औद्योगिक विकास निम्न स्तर पर हुआ है। इस क्षेत्र में सबसे अधिक प्रसिद्ध मुरादनगर ओर्डिनेश्न फैक्टरी है, जिसमें विभिन्न प्रकार सुरक्षात्मक उद्देश्य हेतु टाईम बम्ब, पिस्टल, तथा अन्य हथियार तैयार किये जाते हैं।

द्वितीय निम्न स्तर सामाजिक-आर्थिक विकास के अन्तर्गत गाजियाबाद का उत्तर-पूर्वी भाग जिसमें विकासखण्ड-भोजपुर का 63 प्रतिशत क्षेत्र सम्मिलित किया गया है। इस क्षेत्र में मुख्य रूप से कृषि तथा लघु उद्योगों का विकास हुआ, परन्तु इस क्षेत्र में शिक्षा का स्तर कम रहा है। जिसके कारण इस क्षेत्र की अत्यधिक जनसंख्या कृषि कार्यों में संलग्न है। इस क्षेत्र जनपद-गाजियाबाद को प्रमुख ग्रामीण क्षेत्र भी है, जिससे अन्य क्षेत्रों को कृषि उत्पादों की प्राप्ति होती है। पिछले कुछ वर्षों में इस क्षेत्र का विकास तीव्र गति से हुआ है, क्योंकि इस क्षेत्र के मध्यवर्ती भागों से होकर 96 किमी. लम्बा दिल्ली-मेरठ पेरीफेरेल एक्सप्रेस वे 14 लेन वाला देश का सबसे चौड़ा एक्सप्रेस वे है। इस एक्सप्रेस वे के निर्माण में लगभग 8000 से 10000 करोड़ रुपये की लागत से हुआ है। वर्तमान समय में यह

एक्सप्रेस वे को सभी के लिए खोल दिया गया है, परन्तु दो पहिया वाहन को प्रतिबन्धित किया गया है। इस एक्सप्रेस वे का निर्माण सभी गांवों से बचाया गया है, जिससे क्षेत्र में दुर्घटनाओं को कम किया जा सके। यह एक्सप्रेस वे क्षेत्र के सामाजिक-आर्थिक विकास में मील का पत्थर साबित होगा।

मध्यम सामाजिक-आर्थिक विकास के अन्तर्गत अध्ययन क्षेत्र के दक्षिण-पूर्वी जनपद-हापुड़ से संलग्न क्षेत्र को सम्मिलित किया गया है। इस क्षेत्र में शिक्षा, कृषि तथा औद्योगिक विकास मध्यम स्तर है। यहां पर सम्पूर्ण रोजगार का लगभग 48 प्रतिशत भाग कृषि से, 29 प्रतिशत औद्यागिक इकाईयों से, 19 प्रतिशत तथा 4 प्रतिशत अन्य कार्यों में संलग्न हैं। इस प्रकार यह क्षेत्र कृषि में तकनीकी यन्त्रों का उपयोग कर अधिक उत्पादन प्राप्त करते हैं। इस क्षेत्र के ग्रामीण क्षेत्रें में अनेक शैक्षणिक संस्थाओं का निर्माण किया गया है, जिनके कारण ग्रामीण जनसंख्या को स्थानीय स्तर पर ही शिक्षा प्राप्त हो जाती है।

उच्च सामाजिक-आर्थिक विकास के अन्तर्गत जनपद-गाजियाबाद के विकासखण्ड-लोनी का 90 प्रतिशत क्षेत्र को सम्मिलित किया गया है। इस क्षेत्र में अनेक रेडीमेट कपड़ा बनाने, रंगाई करने, बेकरी उद्योग, अनेक प्रकार की मशीनरी निर्माण इकाईयां, कृषि आधारित उद्योगों का, अधिक विकास हुआ है। जिसके कारण इस क्षेत्र में बाहरी क्षेत्रों से जनसंख्या का तीव्र आगमन हुआ है। इस क्षेत्र में गन्दी बस्ती में निवास करने वाली जनसंख्या में तीव्र वृद्धि हुई है। यह क्षेत्र जनपद-गाजियाबाद व दिल्ली के मध्यवर्ती भाग में उत्तर-पश्चिमी भाग में स्थित है। यह क्षेत्र जनपद-गाजियाबाद के चारों विकासखण्डों में सर्वाधिक संघन बसा क्षेत्र तथा सर्वाधिक प्रदूशित क्षेत्र के रूप में प्रसिद्ध है। इस क्षेत्र में अन्य क्षेत्रों की तुलना में जनसंख्या वृद्धि भी अधिक मिलती है जिसका प्रमुख कारण यहां पर मुस्लिम जनसंख्या की अधिकता तथा बाह्य क्षेत्रों से रोजगार की तलाश में आने वाली जनसंख्या को माना गया है। इस प्रकार यह क्षेत्र मध्य विकास के अन्तर्गत रखा गया हैं, क्योंकि यहां पर विकास के साथ-साथ विकास से सम्बन्धित अनेक प्रकार की समस्याओं ने भी जन्म लिया है।

अति उच्च सामाजिक-आर्थिक विकास के अन्तर्गत गाजियाबाद के सम्पूर्ण नगरीय क्षेत्र जिसमें विकासखण्ड-रजापुर, मुरादनगर, लोनी तथा भोजपुर सभी के क्षेत्र सम्मिलित किया जाता है। यह क्षेत्र जनपद-गाजियाबाद के मध्य-दक्षिणी भाग में स्थित सम्पूर्ण गाजियाबाद का लगभग 36 प्रतिशत भाग है। इस क्षेत्र में देश की प्रमुख बड़ी-बड़ी औद्यागिक इकाईयों जैसे-राष्ट्रीय तम्बाकू शोध सस्थान, विद्युत पुर्जे उद्योग, ऑटोमोबाइल पिस्टन एवं रिंग उद्योग, होम फर्निशिंग उद्योग, ऑटोमोटिव फैब्रिक उद्योग, फौन उपकरण उद्योग, प्लास्टिक फर्नीचर उद्योग, स्टेनलेस स्टील वायर एवं बार्स, हाई एवं लो कार्बन स्टील वायर

उद्योग, हैण्डलूम सम्बन्धित उद्योग, रबर-टायर उद्योग, जल प्योरिफायर उद्योग, विभिन्न प्रकार की कैण्डी निर्माण इकाईयाँ, बेकरी उद्योग तथा फ़्रैन डिजानररिंग इकाइयों आदि का तीव्र विकास हुआ है। यह क्षेत्र शैक्षणिक संस्थाओं के निर्माण में भी अग्रणी है। यहां पर सभी प्रकार की शैक्षणिक संस्थाओं, स्वास्थ्य सेवाओं तथा बैंकिंग संस्थाओं का तीव्र विकास हुआ। यह क्षेत्र विकास के चर्म पर पहुँने के लिए अग्रसर है तथा आने वाले 10 से 15 वर्षों में देश के हाईटेक सिटी में अपना नाम बनाने के लिए भी तैयार है, क्योंकि वर्तमान समय इस क्षेत्र की सबसे बड़ी उपलब्धि भारत की प्रथम रीजनल रेल सेवा का निर्माण कार्य का तीव्र गति से विकासित होना है। यह रेलवे लाईन दिल्ली-गाजियाबाद-मेरठ के मध्य लगभग 92 किमी. लम्बा मार्ग होगा जो वर्तमान में कार्यशील है। इस रेलमार्ग का कुछ भाग पूर्ण हो चुका, जबकि अन्य शेष भाग तीव्र गति के साथ कार्यशील है। इस रेलमार्ग को भारत सरकार द्वारा वर्ष 2024 के जनवरी माह में शुरू करने के अनुमान किया गया है।

निष्कर्ष

- गाजियाबाद में आर्थिक विकास ने कृषि विकास को पूर्ण से प्रभावित किया है, क्योंकि कृषि क्षेत्र में कमी के साथ कृषि में तकनीकी यन्त्रों का अधिक उपयोग को बढ़ावा मिला है। जिसका मुख्य कारण कृषि परिवार की आर्थिक स्थिति पर निर्भर करता है।
- अध्ययन क्षेत्र में आर्थिक विकास के आधार पर ही कृषक परिवारों को मुख्य रूप से तीन श्रेणियों में विभाजित किया जा सकता है। जिसके आधार पर कृषक परिवारों के आय स्तर कर गणना की जा सकती है, तथा कृषक परिवारों की आर्थिक स्थिति की गणना की जा सकती है।
- क्षेत्र के आर्थिक विकास ने कृषि कार्यों व कृषि उत्पादन को भी प्रभावित किया है। आज गाजियाबाद में बढ़ती जनसंख्या से कृषि क्षेत्र पर बढ़ते दबाव को स्थिर करने में सहयोग किया है।
- क्षेत्रीय आर्थिक विकास ने कृषक परिवारों की आय स्तर में वृद्धि की है, जिसके कारण कृषक परिवार ने कृषि में अनेक तकनीकी यन्त्रों का उपयोग किया है।

सन्दर्भ–ग्रन्थ सूची

- सिंह इंदिरा, कृषि भूगोल डिस्कवरी पब्लिशिंग हाउस, नई दिल्ली।
- हुसैन, माजिद (2004), “कृषि भूगोल” रावत पब्लिशिंग नई दिल्ली।

- यादव, रवीन्द्र (2006), “मऊ जनपद का समेकित ग्रामीण विकासः एक भौगोलिक अध्ययन” शोध प्रबन्ध, वीर बहादुर सिंह पूर्वांचल विश्वविद्याल, जौनपुर।
- Ajay Kumar Chhaukar (2007), “Planning For The Growth of Agricultural Productivity and Economic Development in Dadri Tehsil, Haryana, 50 Years of Indian Agriculture”, Concept Publishing Company, New Delhi.
- Agrawal, A.N. (1995). Indian Economy: Problems of Development and Planning. New Delhi: Vishwa Prakashan.
- Dobbs, T. L. (1993). Agricultural Systems in the Context of Sustainable Development: A Case of Low Input Sustainable Agriculture. Paper presented at the APO study meeting on Sustainable Agriculture, Tokyo: Japan, February 23- March 5.

नाटय कार्यशाला के उद्घाटन समारोह का चित्र

6. प्राचीन काल में भारतीय शिक्षा का ऐतिहासिक अध्ययन

डॉ. महीपाल सिंह
असिस्टेंट प्रोफेसर,
विधि अध्ययन संस्थान,
चौ0 चरण सिंह विश्वविद्यालय परिसर,
मेरठ

प्राचीन काल में भारत विश्व में शिक्षा का प्रमुख केन्द्र रहा है। अपनी शिक्षा पद्धति के आधार पर ही भारत ने विश्व पटल पर अपना स्थान बनाया है, जिसके कारण भारत को विश्वगुरु कहा गया है। प्राचीनकाल से ही दुनिया के देशों से यहां पर विद्यार्थी शिक्षा ग्रहण करने आते थे। शिक्षा ग्रहण करके वे अपने वतन (देश) लौट जाते और वे अपने देश की सेवा में लग जाते। भारत की शिक्षा पद्धति के कुछ उद्देश्य थे, जो निम्न प्रकार हैं–

1. चरित्र निर्माण करना–भारतीय शिक्षा का प्रमुख उद्देश्य विद्यार्थी के चरित्र का निर्माण करना होता था, क्योंकि विद्यार्थी का चरित्र ही उसका आभूषण होता है। चरित्र एवं आचरण के आधार से ही हमेशा हीन व्यक्ति की निन्दा की गई है। सत्कर्मों से ही चरित्र का निर्माण सम्भव है, शिक्षा के द्वारा विद्यार्थी जो ज्ञान और शिक्षा ग्रहण करता है, उससे विद्यार्थी में मौलिक गुणों का उदय होता है। भारतीय विचारकों ने चरित्र को विद्या से अधिक महत्वपूर्ण माना है। विद्यार्थी के लिये शिक्षा की व्यवस्था कुछ इस प्रकार की गई है, विद्यार्थी गुरूकुल में आचार्य के सान्निध्य में रहता था। आचार्य न केवल विद्यार्थी की बौद्धिक प्रगति का ध्यान रखता था, बल्कि उसके नैतिक आचरण की भी निगरानी करता था, और यह ध्यान रखता था कि विद्यार्थी दिन प्रतिदिन के जीवन में शिष्टाचार एवं सदाचार के नियमों का पालन करे। इसके द्वारा विद्यार्थी को अपना चरित्र निर्माण करने में सहायता मिलती थी। ब्रह्मचर्य आश्रम में रहते हुए शौच, आचार, स्नान, सन्ध्योपासना आदि विद्यार्थी के चरित्र के मूल आधार थे जो उसके चरित्र का उत्थान करते थे।

2. व्यक्तित्व का सर्वांगीण विकास करना–प्राचीन काल की शिक्षा का एक मुख्य उद्देश्य विद्यार्थी के व्यक्तित्व के विकास का पूरा अवसर प्रदान करना है। भारतीय व्यवस्थाकारों ने व्यक्तित्व को दबाने का कभी भी प्रयास नहीं किया। प्राचीन शिक्षा पद्धति में विद्यार्थी के बौद्धिक विकास के साथ-साथ शारीरिक विकास का भी पूरा ध्यान रखा जाता था, 'स्वस्थ्य मस्तिष्क का अधिष्ठान स्वस्थ शरीर होता है।' शिक्षा के द्वारा विद्यार्थी में आत्मसम्मान, आत्म-संयम, विवेक-शक्ति, न्याय-शक्ति आदि गुणों का उदय होता था। जो उसके व्यक्तित्व को विकसित करने में सहायक थे। विद्याध्ययन के अवसर पर ही

विद्यार्थी में आत्मविश्वास उत्पन्न किया जाता था, उसे यह बोध कराया जाता था कि उसके कर्तव्य के निर्वाह लक्ष्य की प्राप्ति में देवगण उसकी सहायता करेंगे। भविष्य जीवन की कठिनाइयों का भय उसे कर्तव्य पथ से विचलित नहीं कर सकता था विद्यार्थी में आत्म सम्मान की भावना जगायी जाती थी, उसे यह आभास कराया जाता है कि वह अपने राष्ट्र और राष्ट्र की संस्कृति का रक्षक है। संस्कृति का विकास तब ही सम्भव है, जब कि वह अपने कर्तव्यों का विधिवत पालन करे। विद्यार्थी को जीवन की चिन्ता नहीं सताती थी उसके निर्वाह का उत्तरदायित्व समाज अपने कन्धों पर वहन करता था, ब्रह्मचारी जहाँ कहीं भी जाता था उसकी पूजा होती थी, विद्यार्थी यदि व्यवसायिक शिक्षा ग्रहण करता तो उसकी वृति पूर्व निर्धारित थी यदि वह धार्मिक शिक्षा ग्रहण करता तो निर्धनता उसके मार्ग में बाधक नहीं होती थी। उसकी आवश्यकताएं सीमित थी तथा समाज उसकी आवश्यकताओं की पूर्ति करता, विद्यार्थी सादा जीवन उच्च विचार का आदर्श सामने रखता था।

आत्मसंयम एवं आत्मानुशासन की प्रवृत्तियां थी, व्यक्ति के निर्माण में सहायक होती थी, उसे अपनी इन्द्रियों की उचद्दंखल प्रवृतियों पर नियन्त्रण रखना पड़ता था, आहार, विहार, वस्त्र, आचरण आदि सभी को उसे नियमित करना होता था। शुद्धता एवं सादगी उसके जीवन के मुख्य ध्येय थे। गीता में स्पष्ट कहा गया है कि यथायोग्य आहार-विहार करने वाले, कर्मों में यथायोग्य प्रयास करने वाले, यथा योग्य शयन करने वाले और यथा योग्य जागने वाले व्यक्ति के लिये ही योग दुःखों का विनाशक बनता है। आत्म संयम से ही व्यक्ति में विवेक एवं न्याय शक्ति का उदय होता है।

इसी तरह हम देखते हैं, कि भारत के चिन्तकों ने विद्यार्थी की प्रवृतियों एवं भावनाओं को दबाने का प्रयास नहीं किया। आत्म नियन्त्रण एवं आत्मानुशासन से उनका तात्पर्य यथोचित एवं यथावश्यक आहार-विहार, वस्त्राभारण निद्रा, शयन आदि से था। इससे विद्यार्थी को उच्द्दंखल होने से बचाया जाता था। आचार्य विद्यार्थी को प्रताड़ित करने के बजाय प्रेम एवं सद्भावना द्वारा सन्मार्ग में प्रवृत करता था।

3. नागरिक एवं सामाजिक कर्तव्यों का बोध कराना–प्राचीन शिक्षा का उद्देश्य व्यक्ति को नागरिक एवं कर्तव्यों का बोध कराकर उसे सुयोग्य नागरिक बनाना भी था। अध्ययन की समाप्ति पर समावर्तन संस्कार का आयोजन किया जाता था, जिसमें आचार्य विद्यार्थी के समक्ष उसके भावी कर्तव्यों को अत्यन्त प्रभावशाली ढंग से प्रस्तुत करता था, तैतिरीय उपनिषद में इसे इस प्रकार वर्णन किया गया है–सत्य बोलना धर्म का आचरण करना अपने परिश्रम में आलस्य न करना। गुरु दक्षिणा देने के बाद सन्तति उत्पादन की परम्परा को विच्छिन्न न करना। सत्य मार्ग से विचलित न होना, धर्म के मार्ग से विचलित

न होना, लाभकारी कार्यो में प्रमाद न करना, महान बनने का अवसर न खोना, अध्ययन-अध्यापन के कर्तव्यों की उपेक्षा ना करना, देवताओं तथा पितरों के यज्ञ श्रद्धादि की उपेक्षा ना करना, माता को देवी मानना। आचार्य को देवता मानना, पिता को देवता मानना, अपने अतिथि को देवता समझना। केवलदोष रहित कार्यो को रोकना। हमें लोगों के अच्छे कार्यो का अनुकरण करना, दान करना, श्रद्धा, विश्वास, आनन्द, विनम्रता, भय तथा दयालुता से करना। कर्तव्य एवं आचरण में किसी प्रकार के सन्देह होने पर उत्तम विवेक वाले ब्राह्मणों की भांति आचरण करना। इस प्रकार आचार्य विद्यार्थी को उसके सभी सामाजिक कर्तव्यों का बोध करा देता था। अध्ययनोपरान्त वह गृहस्थ जीवन में प्रवेश करता तथा आचार्य द्वारा बताये गये मार्ग का अनुसरण करते हुए राष्ट्र तथा समाज के प्रति अपने कर्तव्यों तथा उत्तरदायित्वों का निर्वाह करता था। सामाजिक कर्तव्यों पर विशेष बल दिया जाता था। चिकित्सा से अपेक्षा की जाती थी कि वह अपने जीवन के मूल्यों पर भी रोग एवं कष्ट का निदान करे। योद्धा वर्ग प्राणोत्सर्ग द्वारा देश एवं समाज की रक्षा करने की शिक्षा प्राप्त करता था।

4. सामाजिक सुख तथा कौशल में वृद्धि कराना–भारतीय शिक्षा का उद्देश्य सामाजिक सुख एवं निपुणता का प्रोत्साहन करना भी था। केवल संस्कृति एवं मानसिकता और बौद्धिक शक्तियों को विकसित करने के लिए ही शिक्षा नहीं दी जाती थी बल्कि इसका मुख्य उद्देश्य विभिन्न उद्योगों, व्यवसायों आदि से लोगों को दक्ष बनाना था, भारतीय समाज में श्रम विभाजन का सिद्धान्त स्वीकार किया गया था। पेशे प्रायः वंशानुगत होते थे। विभिन्न वर्णों के लोग अपनी-अपनी आवश्यकताओं के अनुरूप शिक्षा प्राप्त करके अपने-अपने कार्यों में निपुणता प्राप्त करते थे। अतः गीता में कहा गया है कि अपने-अपने कर्मो में रत मनुष्य ही सिद्धि को प्राप्त करता है। भारतीय शिक्षा पद्धति का सदैव उद्देश्य रहा है कि नई पीढ़ी के युवकों को उनके अनुवांशिक गुणों में कुशल बनाया जाये। सभी प्रकार के कार्यों के लिये शिक्षा देने की प्रथा प्राचीन भारत में थी।

5. संस्कृति का संरक्षण तथा प्रसार–भारतीय शिक्षा संस्कृति के परिरक्षण तथा परिवर्धन का प्रमुख माध्यम होता है। जिसके द्वारा प्राचीन संस्कृति जीवित बनी हुई है। जिसके फलस्वरूप पूर्णकालिक परम्पराओं में जीवन शक्ति आती है। अतः प्राचीन शिक्षा पद्धति ने इस उद्देश्य को सम्यक् रूप से पूरा किया है। विभिन्न वर्णों के लोगों का कर्तव्य था कि अपनी सन्तति को अपने वर्ण से सम्बन्धित सभी प्रकार के शिल्पों एवं प्रति के विषयों में प्रारम्भ से ही शिक्षित कर दे। आर्य जाति की शिला का मुख्य उद्देश्य वैदिक सहित्य को सुरक्षित बनाये रखना था। प्रत्येक विद्यार्थी वेदों को कण्ठस्थ करे तथा उसे अपने मस्तिष्क में सुरक्षित रखे। कुछ लोग काव्यशास्त्र, व्याकरण लौकिक साहित्य, तर्क

विद्या, दर्शन में निपुण होकर प्राचीन ज्ञान विज्ञान को सुरक्षित रखते थे। भारत में वेद तथा अन्य धर्म ग्रन्थ जिस प्रकार से आज तक जीवित हैं उसकी समानता किसी अन्य देश की सभ्यता में देखने को नहीं मिलती।

भारतीय समाज में तीन ऋणों का सिद्धान्त प्रचलित था। इन्होंने प्राचीन पीढ़ियों की सर्वोत्तम परम्पराओं को सुरक्षित रखने तथा इनके प्रचार-प्रसार में महत्वपूर्ण योगदान दिया है। माना जाता है, कि जन्म के समय से ही तीन ऋण लद जाते हैं—देव ऋण, ऋषि ऋण तथा पितृऋण। इनसे मुक्त होना प्रत्येक का कर्तव्य होता था। इनके लिये कुछ कार्य को सम्पन्न करना पड़ता था। देव-ऋण से मुक्ति यज्ञों का अनुष्ठान कराने पर होती थी। ऋषि ऋण से मुक्ति ब्रह्मचर्य के पालन से तथा पितृ ऋण से मुक्ति सन्तानोत्पन्न करने पर मिलती है। इन ऋणों के विधान द्वारा इस बात की पूरी व्यवस्था की गयी थी कि भावी पीढ़ियां अपनी संस्कृति तथा परम्पराओं को सुरक्षित रखे तथा उनका प्रचार-प्रसार भी करती रहें।

भारत की प्राचीन सांस्कृतिक परम्पराओं को सुरक्षित रखने के कुछ अन्य उपाय भी थे जैसे स्वाध्याय तथा ऋषि तर्पण का विशेष रूप से उल्लेख किया जा सकता है। स्वाध्याय में प्रत्येक व्यक्ति से यह उम्मीद की जाती थी कि वह विद्यार्थी जीवन में अर्थात पाठों में कम से कम एक भाग का प्रतिदिन पुनरावृत्ति करे तथा द्वितीय में यह विधान किया गया है कि वह प्राचीन कालीन प्रार्थनाओं में पूर्व काल के मनीषियों के प्रति कृतज्ञता ज्ञापित करे। आगे चलकर जब वैदिक संस्कृत का प्रचलन बन्द हो गया तब लोक भाषा में पुराण आदि साहित्यों को प्रस्तुत किया गया जिसके माध्यम से वैदिक संस्कृति तथा परम्पराओं को सामान्य जन तक पहुंचाया गया। जिसके परिणाम स्वरूप भारत की प्राचीन संस्कृति जीवित रही है।

6. निष्ठा तथा धार्मिकता का संचार—प्राचीन भारत की संस्कृति धर्मप्रिय रही है, यहां पर धर्म ने संस्कृति के सभी पहलुओं को व्यापक रूप से प्रभावित किया है। शिक्षा पद्धति भी धर्म से प्रभावित रही है। इसका मुख्य उद्देश्य विद्यार्थियों में निष्ठा एवं धार्मिकता की भावना जागृत करना था। विद्यारम्भ से गुरूकुल में विद्यार्थी के लिये जो अनुष्ठान एवं वृत निर्धारित थे तथा उसकी जो प्रतिदिन की प्रार्थना होती थी, इन सबके द्वारा उसके मस्तिष्क में पवित्रता एवं धार्मिकता का उदय होता था। यह अध्यात्मिक भावना उसे भौतिक जीवन के आकर्षणों से विरत करती थी। विद्यार्थी सत्यनिष्ठा के साथ अपना आचार-विचार संयमित रखते हुए अध्ययन करता था और सुचरित्र का निर्माण करता था, लेकिन इसका अर्थ यह बिल्कुल नहीं था कि प्राचीन शिक्षा शिक्षार्थी को संसार त्याग कर सन्यास ग्रहण करने की प्रेरणा देती हो।

अतः हम देख सकते हैं कि प्राचीन भारतीय शिक्षा पद्धति के उद्देश्य उच्च कोटि के थे, प्राचीन काल में शिक्षा समाज-सुधार का सर्वोत्तम माध्यम थी। प्रत्येक आर्य के लिए उपनयन जरूरी था, जिससे विद्यारम्भ होती थी मनुष्य पितृऋण से मुक्त केवल सन्तानोत्पन्न करने से ही नहीं होता था बल्कि इसके लिये उसे अपने पुत्रों की उचित शिक्षा की भी व्यवस्था करनी पड़ती थी और यह भी कहा गया है, कि जो माता-पिता अपनी सन्तान को ठीक समय पर शिक्षा नहीं प्रदान करते वे उसके सबसे बड़े दुश्मन होते थे, इस प्रकार के अनेकों प्रमाण देखने को मिलते हैं। संदर्भ ग्रन्थ सूची–

1. श्रीवास्तव, के.सी., प्राचीन भारत का इतिहास तथा संस्कृति, यूनाईटेड बुक डिपो इलाहाबाद, नवम् संस्करण–2000
2. नारायण झा द्विजेन्द्र, श्री माली कृष्णमोहन, प्राचीन भारत का इतिहास, कार्यालय निदेशालय, दिल्ली विश्वविद्यालय, द्वितीय संस्करण–1984
3. महाजन, वी.डी., प्राचीन भारत का इतिहास, एस. चन्द कम्पनी लि., 7361, राय नगर, दिल्ली, प्रथम संस्करण–1962
4. सिन्हा, डॉ. विपिन बिहारी, भारत का इतिहास, ज्ञान प्रकाशन, दरियागंज, दिल्ली, संस्करण–2001
5. शर्मा, एल.पी., प्राचीन भारत, प्रथम संस्करण–1979
6. पाण्डेय विमल चन्द, प्राचीन भारत का राजनैतिक एवं सांस्कृतिक इतिहास, सेन्ट्रल पब्लिशिंग हाउस, इलाहाबाद, 1985
7. अग्निहोत्री, डॉ. प्रभु दयाल, पतंजलि कालीन भारत, बिहार राष्ट्रभाषा परिषद, पटना, 1963
8. शर्मा, आर.एस., प्राचीन भारत, राष्ट्रीय शैक्षिक अनुसंधान और प्रशिक्षण परिषद, 1999

7. भारती राजनीति एवं अल्पसंख्यक मुस्लिम युवा वर्ग

डॉ. जयवीर सिंह,

सहायक आचार्य,

राजनीति विज्ञान विभाग

चौ. चरण सिंह विश्वविद्यालय, परिसर

मेरठ (उ0प्र0)

अल्पसंख्यक वर्ग की समानता एक सार्वभौमिकता समस्या है। आज संसार में कोई देश नहीं है जहां पर किसी न किसी प्रकार के अल्पसंख्यक न रहते हो।

के.के. हेनरी के अनुसार, "अल्पसंख्यक वर्ग की निरन्तरता एक ऐसा तथ्य है जिस पर हमें अपना अनुसंधान शुरू करना चाहिए" इस समस्या ने राजनीतिज्ञों, चिन्तकों और सामाजिक वैज्ञानिकों के मस्तिष्क को अधिक परेशान किया है। इस समस्या को सुलझाने के लिए गलत तरीके इस्तेमाल करने के फलस्वरूप कई बार युद्ध का सामना करना पड़ा। अल्पसंख्यकों की सुरक्षा के लिए भिन्न-भिन्न ऐतिहासिक अंतरालों पर अनेक राष्ट्रीय एवं अन्तर्राष्ट्रीय संधिया एवं समझौते सम्पन्न हुए है। अतः आधुनिक सरकारों के सामने सबसे मुख्य कार्य अल्पसंख्यकों के लिये उपर्युक्त एवं प्रभावशाली सुरक्षा उपलब्ध कराना है और उन्हें प्रशासन में भागीदार बनाना है।

लोकतंत्र में ही विभिन्न अल्पसंख्यक वर्गों को मान्यता मिलती है और समान अधिकार प्राप्त होते है। प्रजातंत्र की कार्यकुशलता अल्पसंख्यकों के साथ उचित व्यवस्था करने में निहित है। दूसरी और सर्वाधिकार वाली सरकारों में अल्पसंख्यकों समुदाय अपना अलग अस्तित्व कायम नहीं कर सकता। उन्हें अपने राज्य में मिला देता है।

सन् 1953 में इनसाइकिलोपीडिया ब्रिटेनिका में अल्पसंख्यक पर दिये गये एक लेख में इस प्रकार का परिभाषित किया गया है–"किसी भी राजनीति इकाई में रहने वाले वे समुदाय जो आपस में समाज उद्गम, भाषा और धार्मिक निष्ठा के द्वारा आपस में जुड़े हो और इन सभी रूपों में अपने को उस इकाई में रहने वाले बहुसंख्यक समुदाय में विभिन्न होने की भावना रखते है।" इस परिभाषा में भावना शब्द पर विशेष जोर दिया है। व्यक्तियों का वह समूह है समान बन्धनों से जुड़ा हो और बहुसंख्यक समुदाय से अपने आपको भिन्न समझता हो अल्पसंख्यक कहे जायेगें। इसके अतिरिक्त भावना, अपने रूप में ही एक व्यक्तिगत शब्द है। यह परीक्षण मनोवैज्ञानिक ज्यादा है और वैज्ञानिक कम है। इस मूलधारणा को भारतीय गणतंत्र में विधिवत् संवैधानिकता प्राप्त है। मूल अधिकारों से

सम्बन्ध में संविधान के तीसरे भाग में कहा गया है कि धर्म, जाति, लिंग जन्म स्थान अथवा इनमें से किसी भी कारणवश किसी के भी साथ भेद-भाव नहीं किया जायेगा। और रोजगार के मामले में सभी नागरिकों को अवसरों की समानता की गारंटी होगी, यह सब-अनुच्छेद 15 से 16 के अन्तर्गत रखे गये है इसके अतिरिक्त अनुच्छेद 29 और 30 स्पष्ट रूप से भाषालिपि, संस्कृति और शिक्षा संस्थाओं की स्थापना तथा उनके प्रशासन के लिए अल्पसंख्यकों के अधिकारों को संरक्षण प्रदान करते है। अतः संविधान धार्मिक और अन्य अल्पसंख्यकों को न केवल मान्यता प्रदान करता है बल्कि उनके अधिकारों को सुरक्षा भी प्रदान करता है।

भारतीय समाज के अल्पसंख्यकों को मोटे रूप से हम दो श्रेणियों में विभाजित कर सकते है। धार्मिक अल्पसंख्यक तथा भाषायी अल्पसंख्यक यद्यपि कुछ क्षेत्रों में अनुसूचित जातियों, अनुसूचित जनजातियों और पिछड़े वर्ग को भी अल्पसंख्यकों की श्रेणी में लिया गया था तथा अधिक उपर्युक्त वही है कि उन्हें पृथक वर्ग में रखा जाये। समाज के कमजोर तथा दुर्बल वर्ग में इनकी गणना करना उचित होगी।

अल्पसंख्यक की राजनीति संवेदनशीलता, सहभागिता व जागरूकता लगभग शून्य हैं संकुचित दृष्टिकोण, रूढ़िवादिता, पर्दा-प्रथा और अशिक्षा के अंधकार में डूबा हुआ यह अल्पसंख्यक मुस्लिम समुदाय इन तथ्यों से सर्वथा अनभिज्ञ प्रतीत होता है कि उनके क्या अधिकार है? उनका देश के प्रति क्या कर्तव्य है।

यदि अल्पसंख्यक मुस्लिम समुदाय अपना भला चाहते हो और भारतीय राजनीति व्यवस्था में सम्मानपूर्ण भागीदारी चाहता है तो मुस्लिम युवा को इस बात का अहसास होना चाहिए कि वह इतिहास के दल-दल से निकलने के लिए रास्ता ढूंढ़े। उर्दू या मुस्लिम पर्सनल लॉ या बाबरी मस्जिद जैसे मामले में उलझने के बजाय वह सत्ता में भागेदारी और सरकारी नौकरियों और शिक्षा संस्थानों में आरक्षण की मांग रखे।

अल्पसंख्यकों को सामाजिक, आर्थिक और राजनीतिक तौर पर भी चौकस होना चाहिए तथा उन्हें अब जज्बाती मुद्दों और वोटों की राजनीति के भंवर से निकलकर अधिक व्यवहारिक और ठोस मुद्दों पर ध्यान देना चाहिए। विभिन्न पार्टियों के भीतर से अपनी आवाज उठानी चाहिए कि भीख नहीं, भागीदारी चाहिए। अल्पसंख्यकों को हर क्षेत्र में अपनी छाप छोड़नी होगी शायद यही रास्ता है।

अल्पसंख्यकों को ठोस मुद्दों पर ज्यादा ध्यान देना होगा। मानसिक संकीर्णता को दूर करना होगा, धार्मिक मुद्दों पर ज्यादा ध्यान न देकर अपनी समुदाय के स्त्री, पुरुष दोनों को सामाजिक व राजनीतिक जानकारी देकर उन्हें अपने अधिकारों के प्रति जागरूकता

लानी होगी और महिलाओं को पर्दा प्रथा से बाहर निकल कर उन्हें समाज में बराबर का योगदान देने की आज़ादी देनी होगी।

संदर्भ ग्रन्थ सूची

1. अहमद अज़ीज़, इस्लामिक कल्चर एण्ड सोसाइटी, मनोहर पब्लिकेशन्स, नई दिल्ली, 1983
2. अहमद इम्तियाज, कास्ट एण्ड सोशियल स्ट्राटिफिकेशन अमंग मुस्लिम इन इण्डिया, मनोहर बुक सर्विस, दिल्ली, 1978
3. अहमद इम्तियाज, कास्ट अमंग द मुस्लिम, मनोहर पब्लिकेशन्स, नई दिल्ली, 1978
4. अहमद इम्तियाज, फैमली किनशिप एण्ड मैरिज अमंग मुस्लिम इन इण्डिया, मनोहर बुक सर्विस, 1976
5. बेनर्जी बानी, मॉडिनाइजेशन ऑफ मुस्लिम, यूथ सरूप एण्ड सन्स, नई दिल्ली, 1997
6. ब्लन्ट ई.ए.एच., कास्ट सिस्टम ऑफ नार्दन इण्डिया, ताराचन्द एण्ड कम्पनी, दिल्ली, 1969
7. दूब एवं मुखर्जी, भारतीय सामाजिक संस्थायें, प्रेक्टिस ऑल ऑफ इण्डिया, नई दिल्ली, 1978
8. चन्द तारा, इन इन्फ्लुएन्स ऑफ इस्लाम इन इण्डियन कल्चर, दिल्ली पब्लिकेशन डिवीजन, 1946
9. इंजीनियर अली आगर, इण्डियन मुस्लिम ए स्टडी ऑफ माइनोरटी प्रोबलम इन इण्डिया अजन्ता पबिलकेशन, दिल्ली, 1985
10. हरमन नूर, प्लाइट मध्यकालीन भारत का इतिहास, अटलान्टिक पब्लिकेशन्स, नई दिल्ली, 1998
11. मुहम्मद नूर, इण्डियन मुस्लिम, रवत पब्लिकेशन, नई दिल्ली, 1999
12. मैक्सवेबर, एस्सेज इन सोसियोलॉजी, केगन पॉल लि. ब्रोडो लन्दन, 1967
13. राय, एम.पी., भारतीय सरकार एवं राजनीति, कॉलिज बुक डिपो, जयपुर, 1989
14. साकिर मोइन, पॉलिटिक्स ऑफ माइनोर्टीज, अजन्ता पब्लिकेशन, 1980

15- श्री निवास एम.एन., कास्ट इन मॉर्डन इण्डिया, एशिया पब्लिकेशन हाउस, बम्बई, 1957

पत्र, पत्रिकायें एवं लेख

1. ईयर बुक ऑफ ह्यूमन राइटस, यू.एन. पब्लिकेशन, नई दिल्ली।
2. इनसाइक्लोपीडिया ऑफ अमेरिका, वॉल्यूम, 19
3. कुमार, सुशील, 'युद्ध होते ही रहेंगे', राष्ट्रीय सहारा हस्तक्षेप, 19 जून, 1999
4. कुमार, संजय, 'मुस्लिम समाज में जाति', हिन्दुस्तान 10, अक्टूबर, 2003
5. वर्मा, ए.के., 'मुस्लिम आरखण का सवाल', दैनिक जागरण, 4 नवम्बर, 2003
6. अनवर, अल, 'कौम के नेताओं से चन्द सवाल', हिन्दुस्तान, 17 अक्टूबर, 2003

क्रांतिधरा मेरठ साहित्यिक महाकुंभ समारोह

वाद–विवाद प्रतियोगिता समारोह

8. 'ब्लाक बागपत में अग्रणी कृषक एवं खाद्यान्न उत्पादन का एक भौगोलिक अध्ययन'

डॉ. प्रवीन कुमार
अतिथि प्रवक्ता
भूगोल विभाग,
चौधरी चरण सिंह, वि.वि.मेरठ।

मनीष
शोध छात्र, भूगोल विभाग
कु. मायावती गर्ल्स डिग्री कालिज,
बादलपुर, नोएडा।

डॉ. मीनाक्षी लोहनी
एसोसिएट प्रोफेसर, भूगोल विभाग,
कु. मायावती गर्ल्स पीजी कॉलेज, गौतम बुद्ध नगर।

सारांश–अध्ययन क्षेत्र विकासखण्ड बागपत में ही नहीं अपितु सम्पर्ण देश में स्वतंत्रता से पूर्व कृषि की दशायें अत्यन्त निकृष्ट थी। भारतीय कृषि को मानसून का जुआ कहा जाता था। कृषि जोतो का आकार छोटा और प्रकीर्ण था। नवीन कृषि यंत्रों की तो जानकारी ही नहीं थी और ना ही इससे सम्बन्धित ज्यादा अविष्कार हुए थे। कृषक की आर्थिक अर्थ व्यवस्था इतनी सुदृढ़ नहीं थी जोकि कृषि यंत्र खरीद सकें। उक्त बीजों और रासायनिक उर्वरकों का उपयोग तो किसान करता ही नहीं था और न ही उसें वो यंत्र पर्याप्त मात्रा में उपलब्ध होते थे। कृषक और कृषि मजदूर दोनों और प्रदेश की 75 प्रतिशत से अधिक जनसंख्या प्रत्यक्ष और परोक्ष रूप से कृषि आधारित थी, परन्तु कृषि का उत्पादन अत्याधिक कम था। प्रस्तुत शोध पत्र के माध्यम से ब्लॉक बागपत में उगाई जाने वाली खाद्यान्न फसलों के उत्पादन का भौगोलिक अध्ययन प्रस्तुत किया गया है। इस ब्लॉक में न्यायपंचायतवार फसल उत्पादन का विश्लेषण किया है।

प्रस्तावना–कृषि के उद्भव का विश्लेषण करने से यह ज्ञात होता है कि इसकी शुरूआत मानव की आवश्यकता को पूरा करने के लिए हुई। प्रारम्भ में इसकी भूमिका वन्य फल-फूल संग्रहण एवं आखेट से प्राप्त भोज्य पदार्थ के सम्पूरक के रूप में थी एवं इससें खाद्यान्नों की खेती को महत्त्व दिया जाता था। आदिम कबीलों के बीच की लडाइयाँ तो अन्न भण्डार को लूटने के लिये ही हुआ करती थी। जैसे–जैसे कृषि का विकास होता गया और खाद्यान्न का उत्पादन बढ़ता गया वन्य वस्तु संग्रहण एवं आखेट आदि व्यवसाय मन्द पड़ते गये, मानव के यायावरी जीवन में स्थायित्व आने लगा उसमें सामुदायिक भावना का विकास हुआ जिससे सभ्यताओं के युग की शुरूआत हुई। कुछ विद्वान प्रारंभिक नगरीकरण के उद्भव का मूल कारण खाद्यान्न आधिक्य को बताते हैं जिससे व्यापार, परिवहन आदि कृषयेतर पेशे अस्तित्व में आए। कृषि में खाद्यान्नों की खेती का वर्चस्व आदिकाल से लेकर आज तक बना हुआ है। परन्तु सभ्यता के विकास, नगरीकरण एवं औद्योगिकरण के कारण उसकी आवश्यकताओं की सूची लम्बी होती गई है।

तदनुसार खाद्यान्नों के अतिरिक्त कृषि में अन्य फसलों के उत्पादन पर ध्यान दिया जा रहा है। इनमें रेशेदार, पेय, व्यापारिक, फसलों, फल सब्जियाँ, मसालें, औषधियाँ पौधों आदि की खेती का उल्लेख किया जा सकता है। विकसित देशों में इन्हें काफी प्रोत्साहन मिला है तथा विकासशील देशों में भी जागरूक किसानों का ध्यान इधर आकृष्ट हुआ है। खाद्यान्नों की तुलना में आर्थिक दृष्टि से अधिक लाभदायी होने के कारण जहाँ कुछ क्षेत्रों में इस प्रकार की कृषि से कृषकों की आमदनी के सम्पूरक का अवसर मिला है वहीं कतिपय क्षेत्रों में खाद्यान्नों के क्षेत्र को इनमें चले जाने के कारण खाद्यान्न संकट के उत्पन्न होने की आांका बढी है। अध्ययन क्षेत्र ब्लॉक बागपत में कृषि क्षेत्रों के वर्गीकरण के आधार पर अग्रणी कृषक एवं नवीनतम तकनीकी के सन्दर्भ में मशीनीकरण तथा आधुनिकता जैसे कारकों ने हरित क्रान्ति व श्वेत क्रान्तियों का सफल समावेश किया है। इस प्रकार खाद्यान्न फसलों के उत्पादन के साथ-साथ अनेक क्षेत्रों का वर्गीकरण किया गया है। कृषि विशिष्टीकरण की प्रक्रिया क्षेत्र प्रधान है परन्तु कृषकों की इन नवीन परिवर्तनों के प्रति जागरूकता भिन्न-भिन्न है। उच्च वर्गीय कृषक, मध्यम वर्गीय कृषक, लघु वर्गीय कृषि तथा सीमान्त कृषक जोत सीमा के आधार पर निर्धारित किये गए हैं। इन कृषक श्रेणियों में वांछित धनराशि जिसका सम्पर्क में न होने कारण परिवर्तन की प्रवृत्ति में अन्तर पाया जाता है। इस प्रकार कृषि क्षेत्रों में अन्तर के साथ-साथ कृषकों की क्षमता भी परिवर्तन के लियें महत्त्वपूर्ण भूमिका निभाती है।

अध्ययन क्षेत्र का परिचय—प्रस्तुत अध्ययन क्षेत्र जनपद बागपत के बागपत ब्लॉक का अध्ययन किया गया है। इस ब्लॉक का भौगोलिक क्षेत्रफल 206.23 वर्ग किलोमीटर है। इस ब्लॉक के अर्न्तगत 7 न्यायपंचायतें आती है। इस ब्लॉक की सात न्यायपंचायतों के अर्न्तगत 44 ग्राम पंचायत आती है। वर्ष 2011 की जनगणना के अनुसार कुल जनसंख्या 167091 है जिसमें पुरुषों की संख्या 90201 तथा महिलाओं की संख्या 76890 पायी गई है।

आँकडा आधार एवं विधितंत्र—दिये गये शोध पत्र में द्वितीयक आँकड़ों का प्रयोग किया गया है जिसके अर्न्तगत ब्लॉक बागपत की सांख्यकीय पत्रिका के माध्यम से उक्त ऑकड़ों को प्राप्त किया गया है साथ ही जिला उद्यान कार्यालय बागपत से भी सम्बन्धित आँकड़ों को लिया गया है। विधितंत्र के रूप में सांख्यकीय एवं मानचित्रीय विधि का प्रयोग कर कृषि से सम्बन्धित नवीनतम तकनीकों के उपयोग से होने वाले किसानों के लाभ को वर्णन किया गया है।

उद्देश्य—प्रस्तुत शोध पत्र के द्वारा निम्नलिखित उद्देश्यों को प्राप्त करने का प्रयास किया गया है—

1. पूर्वकालीन कृषि तकनीक तथा खाद्यान्न उत्पादन का अध्ययन करना।
2. वर्तमान कृषि तकनीक तथा खाद्यान्न उत्पादन का अध्ययन करना।

विश्लेशण एवं निष्कर्ष

मशीनीकरण का प्रभाव–कृषि के मशीनीकरण के अन्तर्गत कृषि कार्यो में मानव एवं पशु श्रम का स्थान यंत्र शक्ति ले लेता है। कृषि के मशीनीकरण द्वारा मिटटी के गुण और गहराई, उर्वरक उपभोग के विस्तार सिंचाई सघनता और जुताई की अवधि पर निर्भर है, अपितु जुताई की न्यूनतम अवधि से भी सम्बन्धित है जोकि केवल शक्तिशाली यांत्रिक उपकरणों से ही सम्भव है। मिटटी की सम्भाव्य उपज का पूर्ण लाभ देने के लिए इनकी उपलब्धता अनिवार्य है। मशीनीकरण द्वारा मिटटी की नमी के उचित संरक्षण के फलस्वरूप उपज में वृद्धि होती है। इसके लिये एक उपर्युक्त जुताई उपकरणों की आवश्यकता होती है। ट्रैक्टर इस हेतु एक उपर्युक्त यंत्र है ट्रैक्टर की अतिरिक्त शक्ति, गति एवं व्यवसाय कृषि कार्य को तीव्रता से निष्पादित करता है। इस प्रकार संक्षेप में हम कह सकते है कि प्रगतिशील कृषि यंत्रीकरण के बिना सम्भव नही है। अध्ययन क्षेत्र ब्लॉक बागपत में भी प्राचीनकाल से ही कृषि के लियें आदर्श दशायें रही है। यहाँ पर प्राचीनकाल से ही खेती करने के लियें प्राचीन औजारों का उपयोग किया जाता था। स्वतंत्रता प्राप्ति से पहले क्षेत्र में एक फाल वाले हल का प्रयोग किया जाता था। जिससे जुताई कार्य में श्रम और समय अधिक लगता था। कृषि कार्यो में निराई गुडाई के फावडा तथा खुरपी आदि यंत्रो का उपयोग किया जाता रहा है। सिचाई के लिये पूर्व में रहट, नहर, राजवाहा, राजकीय जनकूप, पक्के कुँए तथा स्वम के टयूबवैल आदि के माध्यम से सिचाई कार्य को किया जाता है। स्वतंत्रता प्राप्ति के बाद देश में खाद्यान्नों पर अत्याधिक जोर दिया गया जिसके अन्तर्गत हरित क्रान्ति को लाया गया। हरित क्रान्ति के आने से देश के किसानों को कृषि को आधुनिक विधि से करने के लिये प्रोत्साहित किया जाने लगा। केन्द्र तथा राज्य सरकारों के द्वारा किसानों 50 प्रतिशत की छूट के साथ कृषि यंत्र उपलब्ध कराये जाने लगे। इन सभी गतिविधियों के कारण अध्ययन क्षेत्र में नवीनतम तकनीक का प्रयोग कृषि कार्यो में होने लगा। अध्ययन क्षेत्र ब्लॉक बागपत में नवीनतम कृषि यंत्रों के बढ़ते उपयोग का विवरण अग्रलिखित सारणी में दिया गया है–

ब्लॉक बागपत में कृषि उपकरणों का विवरण (2020-21)

वर्ष	हल		उन्नत हैरो एवं कल्टीवेटर	उन्नत थ्रेसर मशीन	स्प्रेयर संख्या	उन्नत बुआई यंत्र	ट्रैक्टर
	लकड़ी	लोहा					
2010	3557	1826	668	847	210	168	488
2015	2585	1887	1268	912	338	840	987
2021	1226	1987	2124	768	468	915	1430

स्त्रोत—सांख्यकीय पत्रिका ब्लॉक बागपत।

दी गई सारणी का अध्ययन करने पर यह ज्ञात होता है कि ब्लॉक बागपत के किसानों ने पुरानी तकनीकि को छोड़ते हुए कृषि में प्रयुक्त होने वाली नवीनतम तकनीक की तरफ अग्रसर हुए हैं। वर्ष 2010 में लकड़ी के हलों की कुल संख्या 3557 थी जो वर्ष 2015 में घटकर 2585 हो तथा वर्ष 2021 में ये संख्या ओर घटी जो कुल 1226 हो गई। लोहे के हलों का विवरण भी कुछ इस प्रकार रहा—वर्ष 2010 में लोहे के कुल हलों की संख्या 1826 थी जो वर्ष 2015 में घटकर 1667 रही तथा वर्ष 2021 में इस संख्या में बढ़ोत्तरी दर्ज की गई जो 1987 हो गई। उन्नत हैरो एवं कल्टीवेटरों की कुल संख्या वर्ष 2010 में 668 थी जो वर्ष 2015 में बढ़कर 1268 हो गई और वर्ष 2021 में इस संख्या में थोडी ओर बढ़ोत्तरी दर्ज की गई जो 2124 हो गई। उन्नत थ्रेसर मशीनों की संख्या ब्लॉक बागपत कुछ इस प्रकार रहा। वर्ष 2010 में कुल उन्नत थ्रेसर मशीनों की संख्या 841 थी जो वर्ष 2015 में बढ़कर 912 हो गई इसी क्रम में वर्ष 2021 में उन्नत थ्रेसरों की संख्या थोड़ी कमी दर्ज की गई जो 768 थी। स्प्रिेयर की कुल संख्या के अर्न्तगत वर्ष 2010 में इनकी कुल संख्या 210 थी जो वर्ष 2015 में बढ़कर 336 हो गई तथा वर्ष 2021 में इस संख्या में और बढोत्तरी दर्ज की गई जो 468 हो गई। उन्नत बुआई यंत्रो की संख्या वर्ष 2010 में 168 थी जो वर्ष 2015 में बढ़कर 840 हो गई तथा वर्ष 2021 में इस संख्या में और इजाफा हुआ जो 915 हो गया। ब्लॉक बागपत में वर्ष 2010 में कुल ट्रैक्टरों की संख्या 486 थी जो वर्ष 2015 में 987 हो गई। वर्ष 2021 में इस संख्या में और वृद्धि दर्ज की गई जो 1430 हो गई।

ब्लॉक बागपत में उगाई जाने वाली प्रमुख फसलो के उत्पादन को अग्रलिखित तालिका में द्र्ाया गया है—

विकासखण्ड बागपत—न्यायपंचायतवार मुख्य फसलों के अर्न्तगत क्षेत्रफल (हेक्टेयर में) वर्ष (2020-21)

क्र.सं.	न्यायपंचायत	फसल का नाम							
		चावल	गेंहू	उर्द	कुल दालें	कुल खाद्यान्न	लाही/सरसों	गन्ना	आलू
1	निरोजपुर गुर्जर	232	6584	68	58	7023	84	1241	16
2	सरूरपुर कला	243	9033	75	144	5462	118	1456	19
3	मीतली	298	8351	86	341	9256	154	8897	29
4	गॉधी	721	8845	71	210	9865	225	6352	65
5	सूजरा	424	7426	61	63	8645	210	6541	45
6	धनौरा सिल्वरनगर	187	7845	66	120	9976	187	4567	54
7	सुल्तानपुर हटाना	194	6598	84	145	7894	169	5546	61
योग ग्रामीण		2299	54682	511	1081	58120	1213	34600	289

स्त्रोत–ब्लॉक साख्यकीय पत्रिका।

दुग्ध उत्पादक

ब्लॉक बागपत के अर्न्तगत आने वाली सभी न्यायपंचायतों में दूध उत्पादन का कार्य यहाँ पर निवास करने वाले कृषकों के द्वारा मुख्य रूप से किया जाता है। इस सम्पूर्ण क्षेत्र में कृषि फसल उत्पादन के लियें अत्यधिक उपजाऊ भूमि होने के साथ-साथ गाय व भैंस पालन के लियें उपर्युक्त दशाएँ भी व्याप्त है। इसके अलावा इस जिले की समीपता राष्ट्रीय राजधानी दिल्ली से होने के कारण यहाँ पर निवास करने वाले कुछ कृषकों ने दूध उत्पादन को प्रमुख व्यवसाय के रूप में अपना रखा है। दूध उत्पाद को उपभोक्ता तक समय पर पहुँचाने के लिये इस जिलें की सड़क तथा रेलमार्ग मार्ग द्वारा पहुँच होना भी एक महत्त्वपूर्ण तथ्य है जो इस उत्पाद के उत्पादन को बढ़ावा देने में सहायक सिद्ध होता है। ब्लॉक बागपत के अर्न्तगत आने वाली न्यायपंचायतों में दूध उत्पादन का विवरण निम्नवत है–

ब्लाक बागपत दूध उत्पादन लीटर में वर्ष (2017-2021)

क्र. सं.	न्यायपंचायत का नाम	वर्ष				
		2017	2018	2019	2020	2021
1	निरोजपुर गुर्जर	148264	151254	157321	167425	170231
2	सरूरपुर कला	161523	162325	171421	171478	173723
3	मीतली	141958	152974	150756	156952	167065
4	गॉधी	126546	128541	129752	130421	130789
5	सूजरा	154786	156788	156981	157888	158145
6	धनौरा सिल्वरनगर	157842	158246	158898	160344	161863
7	सुल्तानपुर हटाना	158961	159456	159568	160784	161456

स्त्रोत–पशुपालन विभाग जनपद बागपत।

दी गई तालिका में ब्लॉक बागपत के अर्न्तगत आने वाली न्यायपंचायतों में दूध उत्पादन से सम्बन्धित आँकड़ों को दर्शाया गया है। सर्वप्रथम न्यायपंचायत निरोजपुर गुर्जर में वर्ष 2017 में 148264 लीटर दूध का उत्पादन हुआ जो वर्ष 2018 में 151254 लीटर, वर्ष 2019 में 157321 लीटर, वर्ष 2020 में 167425 लीटर, वर्ष 2021 में 170231 लीटर दूध का उत्पादन हुआ। इस प्रकार से एक न्यायपंचायत के आँकड़ों का अध्ययन करने पर यह ज्ञात होता है कि वर्ष 2017 से वर्ष 2021 तक ब्लॉक बागपत के अर्न्तगत आने वाली सभी न्यायपंचायतों में दूध उत्पादन में वृद्धि दर्ज की गई है। इसी क्रम में न्यायपंचायत सरूरपुर कला में वर्ष 2017 में 161523 लीटर दूध का उत्पादन हुआ जो वर्ष 2021 में बढ़कर 173723 लीटर को गया। न्यायपंचायत मीतली में वर्ष 2017 में 141958 लीटर दूध का उत्पादन हुआ जो वर्ष 2021 में बढ़कर 167065 लीटर हो गया।

न्यायपंचायत गाँधी में वर्ष 2017 में 126546 लीटर दूध का उत्पादन हुआ जो वर्ष 2021 में बढ़कर 130789 लीटर हो गया। न्यायपंचायत सूजरा में वर्ष 2017 में 154786 लीटर दूध का उत्पादन किया गया जो वर्ष 2021 में 158145 लीटर हो गया। आगे के क्रम में न्यायपंचायत धनौरा सिल्वरनगर में वर्ष 2017 में 157842 लीटर दूध का उत्पादन किया गया जो वर्ष 2021 में बढ़कर 161863 हो गया। न्यायपंचायत सुल्तानपुर हटाना में वर्ष 158961 लीटर दूध का उत्पादन किया गया जो वर्ष 2021 में बढ़कर 161458 लीटर हो गया।

उपरोक्त आँकड़ों के अध्ययन से यह ज्ञात होता है कि ब्लॉक बागपत के अर्न्तगत आने वाले सभी न्यायपंचायतों में दूध उत्पादन में वृद्धि दर्ज की गई है। जिससें यह निष्कर्ष निकलता है कि इस ब्लॉक की सम्पूर्ण जनसंख्या कृषि कार्यों के साथ-साथ दूध उत्पादन पर भी विशेष ध्यान दे रही है। दूध उत्पादन में होने वाली पर्याप्त आमदनी किसानों को इस और आर्कषित कर रही है। दूध उत्पादन में देश की दो सबसे बड़ी कम्पनियों ने कम्प्यूटरीकृत खरीदारी ने किसानों को तो अधिक दाम प्रदान किये वही दूध की फैक्ट्ररियों को भी उच्च्य गुणवत्ता युक्त दूध की प्राप्ति हुई। इसके परिणाम स्वरूप 900 करोड़ रुपये की एक परियोजना का शिलान्यास किया गया। इस परियोजना के आने से ब्लॉक बागपत की जनसंख्या को दो प्रकार से लाभ होगा। प्रथम यहाँ पर निवास करने वाली जनसंख्या को रोगजार की प्राप्ति होगी। दूसरा यहाँ के किसानों को दूध के उत्पादन में और भी अधिक वृद्धि होगी।

सब्जी उत्पादक

आज विश्व स्तर पर सब्जी उत्पादन या सब्जी उगाना आवश्यक एवं अपरिहार्य है। सब्जी उगाने वालें क्षेत्र को सब्जी उत्पादक प्रक्षेत्र या कछवारा कहते हैं। इस प्रकार सब्जी उगाने की कला एवं तकनीक को सब्जी विज्ञान (Olericulture) कहते हैं। इसके विशेषज्ञ को सब्जी विशेषज्ञ (Olericulturist) कहतें है। भारत में मुख्यरूप से निम्नलिखित सब्जियों का उत्पादन किया जाता है–

1. टमाटर, 2. बैगन, 3. मिर्च, 4. भिण्डी, 5. खीरा एवं कददू, 6. परवल एवं कुन्दरू, 7. सेम वर्गीय सब्जियाँ, 8. फराशबीन, 9. सेम, 10. लोबिया, 11. ग्वार, 12. मटर, 13. मूली, 14. गाजर, 15. शलजम, 16. चुकन्दर, 17. प्याज, 18. लहसुन, 19. पालक, 20. मेथी, 21. फूल गोभी, 22. पत्ता गोभी, 23. आलू इत्यादि फसलें उगाई जाती है। ब्लॉक बागपत के किसानों के द्वारा उपरोक्त सभी सब्जियों का उत्पादन किया जाता है। भारत में तथा ब्लॉक बागपत की न्यायपंचायतों में उगाई जाने वाली सब्जियों का विवरण निम्नवत है–

भारत एवं ब्लॉक बागपत में सब्जियों का उत्पादन, वर्ष 2021 (क्षेत्र हेक्टेयर, उत्पादन मीट्रिक टन)

सब्जियाँ	भारत उत्पादन	क्षेत्रफल (हेक्टेयर)	ब्लॉक बागपत उत्पादन	क्षेत्रफल (हेक्टेयर)
टालू	269702	885	2105	225
टमाटर	63988	83	365	125
प्याज	25387	287	565	103
ल्हसुन	3839	81	887	54
मटर	5455	95	2444	198
धनिया	3924	22	25	10
मूली	3115	23	65	23
गाजर	6651	28	256	30
शलजम	1521	20	55	08
चुकन्दर	3314	31	65	21
पालक	2624	16	71	10
मेथी	2312	19	87	15
फूलगोभी	4423	41	54	19

स्त्रोत–जिला उद्यान कार्यालय बागपत।

दी गई तालिका का अध्ययन करने पर यह ज्ञात होता है कि सम्पूर्ण ब्लॉक बागपत की न्यायपंचायतों में सब्जियों का उत्पादन एक वहत क्षेत्र पर किया जा रहा है जिसका मुख्य कारण यह पाया गया है कि राष्ट्रीय राजधानी दिल्ली की समीपता होने के कारण इस ब्लॉक के लघु एवं सीमान्त किसानों के द्वारा सब्जियों की फसल का उत्पादन प्रमुख रूप से किया जाता है। वर्तमान में यहाँ के किसान कृषि कार्य में प्रयुक्त होने वाली तकनीकी उपकरणों, का उपयोग जमीन की जुताई निराई गुड़ाई इत्यादि कार्यों में करता है। साथ कृषि फसलों में लगनें वाले कीटों के लियें कीटनाशकों का प्रयोग भी व्यापक रूप में कर रहा है।

निष्कर्ष

कृषि तकनीक तथा कृषि फसलों का उत्पादन से सम्बन्धित अध्ययन करने पर यह ज्ञात होता है कि पौराणिक काल की कृषि, मध्यकाल की कृषि तथा वर्तमान काल की कृषि उत्पादन में बहुत अन्तर पाया गया है। पौराणिक कृषि जीवन निर्वाह कृषि होती थी जबकि वर्तमान कृषि व्यापारिक रूप में उगाई जा रही है। इस दृष्टिकोण ने ब्लॉक बागपत के किसानों की सोच को परिवर्तित कर दिया। ब्लॉक बागपत के किसानों ने रबी, खरीफ

व जायद की फसलों के साथ-साथ सब्जियों की फसलों में अधिक से अधिक उत्पादन कर अपनी आजिविका को सुदृढ बनाया। इसके साथ-साथ यहाँ के किसानों के आर्थिक व सामाजिक विकास में भी बढ़ोत्तरी देखने को मिलती है। इस क्रम में सर्वप्रमुख उनके पक्के घरों को देखकर यह जानकारी प्राप्त की गई कि ये मकान उक्त किसानों की आय के स्रोतो की स्पष्ट झलक है। यहाँ पर कृषि में मशीनीकरण व आधुनिकता के साथ-साथ परिवर्तन की प्रवृत्ति तीव्र हुई है। बाजार-मूल्यों तथा अल्पावधि की फसलों की ओर कृषक स्वाभाविक रूप से उन्मुख पाये जाते है। कृषि विकास के कारण ही इस क्षेत्र में हरित क्रान्ति, श्वेत क्रान्ति तथा औद्योगिक क्रान्ति सम्भव हुई है। परिणामस्वरूप कृषि ग्रामीण विकास की धुरी बनकर कृषकों में दुग्ध, वस्त्र, परिवहन तथा मरम्मत जैसे कार्यों को मापने में सफल सिद्ध हुई है।

फसलों के कोटिकरण के अर्न्तगत गन्ना प्रथम, गेहूँ द्वितीय, चावल तृतीय तथा दलहन चतुर्थ कोटिक्रम फसल के रूप में पाया गया है। ग्रामीण क्षेत्रों में क्रियाशीलता की वृद्धि यमुना के निकटवर्ती न्यायपंचायतों में सर्वाधिक पायी जाती है। कृषि के अतिरिक्त गैर-कृषि कार्यों में ग्रामीण जनसंख्या का अनुपात मुख्य रूप से महानगरीय प्रभाव क्षेत्रों में देखने को मिलता है। यहाँ पर सेवा कार्यों, व्यापारिक प्रतिश्ठानों, परिवहन कार्यो तथा अन्य मरम्मत जैसे कार्यो में ग्रामीण जनसंख्या का अनुपात निरन्तर बढ़ रहा है।

सिंचाई सुविधाओं जैसे नहरों, निजी नलकूपों, हैरों तथा कल्टीवेटर, थ्रेसिंग मशीन तथा उन्नत बीजों का प्रयोग बहुतायत में पाया जाता है। अध्ययन क्षेत्र में सर्वाधिक सिंचाई के साधनों में निजी नलकूपों की अधिकता देखने का मिलती है जबकि भूस्तरीय पम्पसैटो की कमी पाई गयी है। इसी प्रकार अधिकांश कृषि क्षेत्रों में ट्रैक्टर, हैरों, कल्टीवेटर तथा थ्रेसिंग मशीन का उपयोग पाया गया है।

अध्ययन से स्पष्ट है कि ब्लॉक बागपत में मुख्य रूप से चार प्रकार के कृषि क्षेत्र पाए जाते हैं–1. खाद्यान्न प्रधान, 2. व्यापारिक व औद्योगिक फसल प्रधान, 3. बागवानी प्रधान, 4. सब्जी एवं चारा प्रधान। ब्लॉक बागपत में बड़े, मध्यम, लघु तथा सीमान्त कृषकों को अध्ययन का आधार बनाया गया है। जनपद में सर्वाधिक क्षेत्रफल 7-52 हेक्टेयर व्यापारिक फसलों के अर्न्तगत, तत्पश्चात खाद्यान्न फसलों के अर्न्तगत तथा सबसें कम बागवानी के अर्न्तगत पाया गया।

संन्दर्भ ग्रन्थ सूची

1. Agarwal, A.L. (1970) : Marketed Agriculture Surpluses in Relation to Size of Land
2. Holdings – A Case Study of U.P. ASI, Vol.25 (1) April.

3.	Agrawal, S.N.	:	Population, National Book Trust of India, New Delhi, 1967.
4.	Bhatta, S.S.	:	Agricultural Statistics in India, 2nd Ed. New Delhi : Arnold
5.	Heineman, 1974, 30 – 90.		
6.	Bhende, Asha A &	:	Principles of Population Studies, Economic Geography 14, 39-
7.	Kanitkar		56.
8.	Chauhan, V.S. (1971)	:	Crop Combination in the Yamuna Hindan Tract, The
9.	Geographical Observer7, 66 – 72.		
10.	Dayal, P (1950)	:	Agricultural Harvest in Bihar, Indian Geographical Journal, 25
11.	(1,2,3& 4).		
12.	Dubey, S.C.	:	Indian Village, Routedge and Kegan Paul Ltd. London, 1954.
13.	Ganguli, B.N. (1938)	:	Trends of Agriculture and Population in the Gages Valley
14.	London PP 39-9.		
15.	Gori G.K. (1951)	:	Irrigation in Mysore Geographer, 4.
16.	Ghos Arabind (1974)	:	Concerntration and Growth of Indian Industries, The Journal of
17.	Industrial Economics.		
18.	Jha. D. (1963)	:	Economics Economics of Crop Pattern of Irrigated Farms in
19.	North Bihar, Indian Journal of Agriculture Economics, Vol.		
20.	XVII, No.P.168.		
21.	Mathur R.M. (1936)	:	Food Resource and Population in Lower Ganga-Ghagra Doab,
22.	Indian Geographical Journal, Vol.I,XVM.		
23.	Rao, S.K. (1978)	:	Population Growth and Economic Development E.P.W.,
24.	Special Number, August.		
25.	th-Vh-d`'.kk dqekjh	%	iapo'khZ; ;kstuk,a vkSj d`f'k mRiknu] ;kstuk tuojh] 2007 vad 10]
26.	ist&16-		
27.	eksnh] vuhrk	%	fo"o O;kikj laxBu vkSj Hkkjrh; d`f'k dq:{ks=] tuojh&2007] vad
28.	& 3 ist&38A		

व्याख्या

उर्दू विभाग की प्रगति व्याख्या

- अंतर्राष्ट्रीय सेमिनार–19 अगस्त, 2023 को 'जश्न-ए-नजीर मेरठी' विषय पर एक दिवसीय अंतर्राष्ट्रीय सेमिनार का आयोजन किया गया। इस अवसर पर नजीर मेरठी द्वारा लिखित पुस्तक 'लालाजार' का विमोचन किया गया। इस में देश विदेश के अनेक विद्वानों शिरकत की।
- राष्ट्रीय सेमिनार–04 अगस्त 2023 को 'कर्बला की घटनाओं का सामाजिक महत्व' विषय पर एक दिवसीय राष्ट्रीय सेमिनार का आयोजन किया गया।
  -20-21 अक्टूबर 2023 को सर सैयद के जन्म दिवस के अवसर पर दो दिवसीय राष्ट्रीय सेमिनार का आयोजन किया गया। इसके अंतर्गत 'सहारा समूह' को पत्रकारिता के लिए 'सर सैयद इंटरनेशनल पुरस्कार', सामाजिक कार्यों के लिए 'जनहित फाऊंडेशन, मेरठ' एवं शैक्षिक कार्यों के लिए 'के. एल. इंटरनेशनल स्कूल' के प्राचार्य सुधांशु शेखर को 'सर सैयद राष्ट्रीय पुरस्कार' से सम्मानित किया गया।
- नाटक–25 सितंबर 2023 को उर्दू विभाग और स्वांग शाला एक्टिंग अकेडमी के संयुक्त तत्त्वावधान में अटल बिहारी वाजपेई प्रेक्षा गृह में प्रसिद्ध लेखक चिरंजीत द्वारा लिखित नाटक दूसरी शादी का मंचन हुआ। तथा 18 दिसंबर 2023 को काकोरी के क्रांतिकारियों के शहीदी दिवस की पूर्व संध्या पर नाटक 'सरफरोशी की तमन्ना' का आयोजन किया गया। जिसमें मुख्य अतिथि के तौर पर मेजर जनरल मनीष लूथरा एवं दैनिक जागरण, मेरठ के संपादक श्री रवि प्रकाश एवं अन्य गणमान्य व्यक्तियों ने सहभागिता की।
- नाटय कार्य शाला–29 सितंबर 2023 से 11 अक्टूबर 2023 तक 10 दिवसीय 'नाटय कार्य शाला' का आयोजन किया गया। जिसका उद्देश्य छात्र-छात्राओं में नाटक एवं रंगमंच के प्रति अभिरुचि जागृत करना था। कार्य शाला में अतिथि स्वरूप दूरदर्शन से जुड़े श्री नीरज शर्मा, दिल्ली और रंगमंच से जुड़े श्री अनिल शर्मा गाजियाबाद ने छात्र-छात्राओं को विशेष व्याख्यान दिया और नाटक एवं रंगमंच संबंधी बारिकियों परिचय कराया। श्री भारत भूषण शर्मा, श्री अनिल शर्मा, श्री सुरेंद्र कुमार शर्मा आदि ने विद्यार्थियों को शिक्षित किया।
- 7 जुलाई 2023 को सी. सी. एस. यू. कैंपस के उर्दू विभाग में गीतकार भारत भूषण के जन्म दिवस की पूर्व संध्या पर 'इंडियन नेशनल ट्रस्ट फॉर आर्ट एंड कल्चर हेरिटेज', 'अंतर्राष्ट्रीय साहित्य कलामंच' एवं 'उर्दू विभाग' के संयुक्त तत्वावधान में 'गीत ऋषि भारत भूषण के नाम एक शाम' कार्यक्रम आयोजित किया गया। इस अवसर पर अंग्रेजी विभाग के प्रो. विकास शर्मा ने कहा–कि भारत भूषण के गीत अमर हैं उनके

भाव पूर्ण गीत उन्हें साहित्य जगत में उच्च स्थान दिलाते हैं। हमें उन्हें गीतकार के रूप में सम्मान देना चाहिए। उनका योगदान अतुलनीय है। भावी पीढ़ी तक उनके योगदान को पहुंचाया जाना चाहिए। इस अवसर पर तीन पुस्तकों–'26 जनवरी'–डॉ. राम गोपाल भारतीय, 'पीर को अपनापन दो'–बृज किशोर 'राहगीर', 'दलित विमर्श'–डॉ. अलका वशिष्ठ का विमोचन किया गया। शाम को मुशायरे का सफल आयोजन किया गया।

- 31 जुलाई, 2023 उर्दू विभाग, चौधरी चरण सिंह विश्वविद्यालय, अखिल भारतीय कायस्थ सभा, जनवादी लेखक सिंह एवं वी कमिट मेरठ द्वारा संयुक्त तत्वावधान में कथा साहित्य के सम्राट मुंशी प्रेमचंद की जयंती पर शानदार कार्य क्रम का आयोजन किया गया। इस अवसर पर प्रेमचंद की 'बड़े घर की बेटी' तथा प्रो. असलम जमशेदपुरी की 'बड़े घर की छोटी बेटी' का वाचन हुआ तथा शाम को अखिल भारतीय मुशायरे का आयोजन भी किया गया।
- अदबनुमा–उर्दू विभाग चौधरी चरण सिंह विश्वविद्यालय अंतर्राष्ट्रीय यंग उर्दू स्कॉलर संगठन के संयुक्त तत्वावधान में विविध विषयों पर साप्ताहिक ऑन लाइन संगोष्ठी का आयोजन 2 वर्षों से निरंतर किया जा रहा है। 7 दिसंबर 2023 को अदबनुमा 100 एपिसोड संपन्न हो चुके हैं। आज भी यह है ऑन लाइन संगोष्ठी निरंतर जारी है।
- वाद-विवाद प्रतियोगिता–12 सितंबर, 2023 को 'विश्वसा क्षरता दिवस' के अवसर पर साहित्यिक-सांस्कृतिक परिषद एवं उर्दू विभाग के संयुक्त तत्वावधान में वाद-विवाद प्रतियोगिता का आयोजन किया गया। जिसमें बी.ए. स्तर के विद्यार्थियों में यूहांसा त्यागी ने प्रथम, कहकशां ने द्वितीय एवं सैयदा जमाल जहरा ने तृतीय स्थान प्राप्त किया। एम. ए. स्तर के विद्यार्थियों में लाइबा ने प्रथम, मुकुंद शर्मा ने द्वितीय एवं मोहम्मद तलहा ने तृतीय स्थान प्राप्त किया। 14 सितंबर 2023 को हिंदी विभाग में हुई भाषण प्रतियोगिता में उर्दू विभाग की में द्वितीय वर्ष की छात्रा फरहत अख्तर को द्वितीय स्थानऔर 1000 का नगद पुरस्कार प्राप्त हुआ।
- पुरस्कार–प्रोफेसर असलम जमशेदपुरी के कथा संग्रह 'गोदान से पहले' को पश्चिम बंगाल उर्दू अकादमी द्वारा 'जावेद निहाल' सम्मान से सम्मानित किया गया।

  शोक सभा–26 अक्टूबर, 2023 को प्रोफेसर शारिब रूदौलवी एवं 2 नवंबर 2023 को प्रसिद्ध शायर मजहर स्यानवी ऑन लाइन ऑफ लाइन श्रद्धांजलि प्रस्तुत की गई और उन की साहित्यिक सेवाओं और योगदान के लिए याद किया गया।